

# سے افق

ک سو سانی  
ڈاٹ کام

WWW.PAKSOCIETY.COM

aanchalpk.com aanchalnovel.com

عزیز میر

READING  
Section

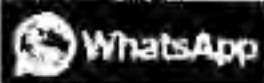
قیمت = 50 روپے

شماره اگست ۲۰۱۵

رجسٹریشن نمبر - ایس ایس ۱۰

سے افق





0314-8250376

ریجنل آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی  
ریجنل کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹر  
ریجنل چیف ایڈیٹر آف پاکستان



پاکستان (فی پرچہ) ..... 50 روپے  
پاکستان (سالانہ) ..... 600 روپے

اشتراکات اور دیگر معلومات  
0300-8264242

[aanchalpk.com](http://aanchalpk.com)

[aanchalnovel.com](http://aanchalnovel.com)

[naeyufaonline](https://www.facebook.com/naeyufaonline)

[aanchalpk.com/blog](http://aanchalpk.com/blog)

[onlinemagazinepk.com/recipes](http://onlinemagazinepk.com/recipes)

# نئے افق



مستحق احمد قریشی  
مدیر  
سران احمد  
مدیر معاون  
اقبال بھٹی  
مدیر مصروف  
طہر احمد قریشی  
مستحق  
نور الدین



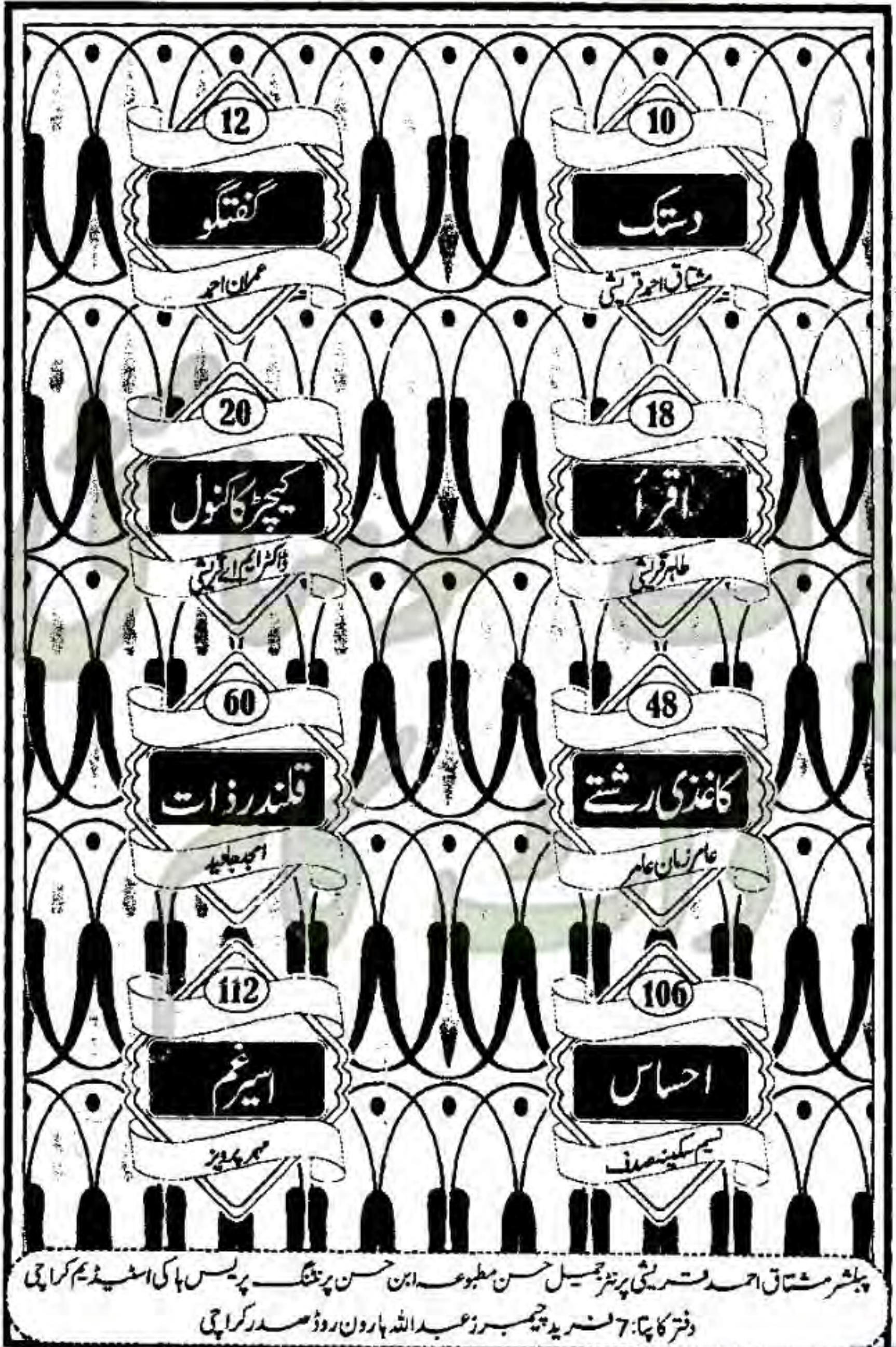
|      |       |
|------|-------|
| 39   | جلد   |
| 09   | شمارہ |
| 2015 | اگست  |



READING  
Section

SCANNED BY AMIR





پبلشر مشتاق احمد ستریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی  
دفتر کا پتہ: 7 نسرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ صدر کراچی

READING  
Section

SCANNED BY AMIR





خط و کتابت کا پتہ: ”آنچل“ پوسٹ بکس نمبر 75 کراچی 74200 فون: 021-35620771/2  
 فیکس: 021-35620773 کیے از مطبوعات نئے افق پبلی کیشنز۔ ای میل: info@aanchal.com.pk

SCANNED BY AMIR

READING  
Section



# دست

مشتاق احمد قریشی

ہم نے اپنے پیر پر خود کھارڑی ماری ہے

گزشتہ دنوں آصف علی زرداری صاحب نے اپنے قد سے اونچاڑنے کی کوشش کی تو منہ کے بل گرے وہ اپنی موج مستی میں بھول گئے کہ جس دھرتی پر وہ کھڑے ہیں وہاں بہت سے کان بہت سی آنکھیں انہیں دیکھ اور سن رہی ہیں ان کے حامیوں کے علاوہ بہت زیادہ ہیں انہوں نے اپنے سے بڑا نکتہ نکلنے کی کوشش کی جو ان کی ہی نہیں بلکہ ان کی پارٹی کے دیگر افراد اور اراکین کے گلے میں پھنس کر رہ گیا انہوں نے تیل کے آگے بین بجانے کے بجائے تیل کے آگے سرخ لمبل لہرا دی انہیں گمان تھا کہ سرکاری تیل و مہ با کر بھاگ نکلے گا ان کے لیے میدان صاف چھوڑ جائے گا لیکن اس طرح الٹی آنتیں گلے پڑ گئیں لینے کے دینے پڑ گئے انہیں اور ان کے ساتھیوں کو خطرہ لاحق ہو گیا کہ کہیں گڑے مردے نہ اکھاڑ دیے جائیں۔ اسی سبب اب ان کے حواریوں نے کان دبا کر رات کے اندھیرے میں دبی کارخ کر لیا ہے۔ دبی ان کا ہمیشہ سے کمیشن آفس جو رہا ہے۔

سندھ میں آج کل زرداری صاحب کے حامیوں کی نہیں بلکہ ان کے کمداروں کی حکومت ہے جو زرداری صاحب کی انگلیوں کے اشاروں پر ناچتی ہے۔ زرداری صاحب آپ چاہیں ماضی دیکھیں یا حال یا مستقبل وہاں صرف دونوں ہاتھ سے دولت کا ہرنا جائز طریقے سے سمیٹنا ہی دکھائی دیتا ہے۔ لوٹ کی کمائی کو وہ اپنے خون پسینے کی کمائی تصور کرتے ہیں عاقل اور دانشمند لوگ کہتے ہیں کہ دولت جس طرح آتی ہے اسی طرح چلی بھی جاتی ہے شاید یہی سبب ہے کہ بقول ڈاکٹر شاہد مسعود کے زرداری صاحب صرف ایک رات کی موج مستی کے لیے لاکھوں ڈالر خرچ کر دیتے ہیں۔ ویسے بھی پیسے کا درد تو انہیں ہوتا ہے جس کی حلال کمائی ہوتی ہے۔ لوٹ مار، بھتہ مافیا کے ذریعہ حاصل ہونے والی دولت تو اسی طرح لٹائی جاتی ہے۔ زرداری صاحب کا تو آوے کا آواہی بگڑا ہوا ہے شاہ سے زیادہ شاہ کے وفاداروں نے لوٹ مچا رکھی ہے۔ سندھ میں گرمی کی شدت سے مرنے والوں کی تعداد سیکڑوں سے نکل کر ہزاروں تک پہنچ گئی ہے۔ لیکن حکمرانوں کو تو بجلی کے ساتھ ساتھ ایئر کنڈیشننگ کمرے میسر ہیں۔ انہیں عوام جو بجلی پانی کی نایابی کا شکار ہیں کی پریشانی کا احساس تک نہیں۔ گرمی کی شدت سے ہر روز سیکڑوں لوگ مر رہے ہیں قبرستانوں میں دفن کرنے کے لیے جگہ نہیں رہی، سرد خانوں میں میتیں رکھنے کی گنجائش نہیں رہی، ایمبولینس میٹوں کو لانے لے جانے کے لیے کم پڑ رہی ہیں، میت دفنانے کے گورکن منہ مانگے دام مانگ رہے ہیں۔ مرنے والوں کے لواحقین پر دہری



مشکل آن پڑی ہے نہ اگلے بن رہی ہے نہ نکلے بن رہی ہے، لاشیں گلنے سڑنے لگی ہیں کہ کہاں اور کیسے دفنائی جائیں، ہر طرف ہابا کار مچی ہوئی ہے۔ کوئی پرسان حال نہیں۔ وفاق صوبے کو اور صوبہ وفاق کو ذمہ دار ٹھہرا رہا ہے ایک دوسرے پر ملبہ ڈال جا رہا ہے مرنے والوں کا ان کے عزیز واقارب کا کوئی پرسان حال نہیں عوام جو پہلے ہی مہنگائی کا شکار ہیں رمضان کے روضے اور دیگر عبادات پر بھی توجہ نہیں دے پا رہے گرمی کی شدت سے مرنے والے تو مر ہی رہے ہیں لیکن ان کے پیچھے رہ جانے والوں کو گرمی کی شدت کے ساتھ ساتھ مرنے والے کی تدفین اور کفالت کی مصیبت کے عذاب کا بھی سامنا کرنا پڑ رہا ہے نہ جائے رفتن ناپائے مانند ایسے موقع پر حکومت کو چاہیے تھا کہ گرمی کی شدت کا شکار ہونے والوں کی تدفین کا بندوبست سرکاری طور پر کرتی اور کسی نئی جگہ کو قبرستان بنا کر وہاں سرکاری خرچہ پر تمام انتظامات کرتی۔ یوں عوام کو دہری مشکل تو نہ پیش آتی۔ کیا اپنے پیاروں کی موت کا صدمہ کم ہوتا ہے کہ انہیں آخری منزل پہنچانے کی پریشانی بھی کسی طرح کسی شدید صدمے سے کم نہیں اور تو اور سنا ہے کہ قبرستانوں میں گورکنوں کا سینن لگا ہوا ہے وہ بھی دونوں ہاتھوں سے مرنے والوں کے عزیز واقارب کو لوٹ رہے ہیں۔ خبروں کے مطابق ایک ایک قبر کی جگہ کے پچاس ہزار تک مانگ رہے ہیں لیکن حکومت کے کانوں پر جوں تک نہیں ریگ رہی۔

کہنے والے تو کہہ رہے ہیں کہ حکمران تو اپنی مصیبت کے نکلنے کے راستے ڈھونڈ رہے ہیں زرداری صاحب نے سب کو ہی اپنے ساتھ مشکل میں ڈال دیا ہے ہر کوئی اپنی جان بچا کر ملک سے بھاگنے کے چکر میں ہے۔ وہ کیسے عوامی مشکل کی گھڑی میں عوام کا ساتھ دے سکتے ہیں۔ وہ اب بھی ملک سے بھاگنے میں اپنے سربراہ جناب زرداری کا ساتھ دے رہے ہیں اور اپنی لوٹ کا مال سمیٹ کر نکلنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔ انہیں اس مصیبت کی گھڑی میں اپنے بھاگ نکلنے کی راہ ہی سجائی دے رہی ہے۔ وہ کیسے کسی اور کی مصیبت کو محسوس کر سکتے ہیں ان کے ساتھ کھڑے ہو سکتے ہیں ان کے تو خود اپنے پیروں تلے سے زمین کھسک رہی ہے۔ یقیناً یہ اللہ کا عذاب ہے کیونکہ عوام نے اپنے لیے ایسے بددیانت چوروں کو منتخب کر کے اپنے پیروں پر خود کلہاڑی جو ماری ہے۔





# گفتگو

عمران احمد

”حضرت سفیان بن اسید حضری سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا، بہت بڑی خیانت کہ تو اپنے بھائی سے کوئی بات کہے۔ وہ تیری خاطر اس بات کو درست سمجھے حالانکہ حقیقت میں تو اس سے جھوٹ بول رہا ہو۔“ (ابوداؤد)

مزعانِ محترم..... سلامت باشد!

تمام قارئین کو جشنِ آزادی اور عید الفطر مبارک ہو۔

جب ہم یہ طور تحریر کر رہے ہیں رمضان المبارک کا نصف ماہ مکمل ہو چکا ہے مگر اس ماہ گرمی کی شدت سے ہونے والی تقریباً ڈھائی ہزار (ایک متناظر اندازے کے مطابق) اموات نے اس ماہ مبارک کی خوشیوں کو قدرے دھندلا دیا ہے اس پر ہمارے حکمرانوں کی سیاست بازی نے عوام کے دلوں کو مزید دکھی کر دیا ہے ہمارے علمائے اسے عذابِ خداوندی قرار دے کر سارا زور توبہ و استغفار پر صرف کر دیا ہے۔ ہم سیاست دانوں کو تو کچھ نہیں کہہ سکتے انہیں ہم نے خود ملک کی جڑیں کھوکھلی کرنے کے لیے منتخب کیا ہے لیکن ہمیں لفظ عذابِ خداوندی پر اعتراض ہے کیونکہ قدرت کے نظام میں مداخلت سے دنیا بھر کا موسمی نظام تبدیل ہو رہا ہے آلودگی نے خلا میں اوزن کی چادر میں سوراخ کر دیے ہیں جس سے سورج کی کرنیں فلٹر ہونے کے بجائے براہِ راست زمین پر آ رہی ہیں اور طرح طرح کے امراض کا سبب بن رہی ہیں۔ یہ سب مصائب ہمارے اپنے پیدا کردہ ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں اس لیے اللہ تعالیٰ پر الزام دھرنے سے قبل ہمیں اپنے کرتوتوں کا جائزہ لینا چاہیے۔

اب آئیے اپنے خطوط کی طرف۔

(اس ماہ کا انعام یافتہ خط)

**ساحل ابڑو..... بلوچستان۔** قابلِ احترام عمران بھائی۔ السلام علیکم امید ہے کہ مزاج بخیر ہوں گے۔ دیگر احوال زیرِ قلم ہے کہ جولائی کا تازہ شمارہ نئے افق 24 تاریخ کو ملا، بھائی آپ کا بہت بہت شکریہ کہ اس بندہ ناچیز کو اتنی بڑی عزت دی اور ہماری ٹوٹی پھوٹی تحریروں کو نئے افق میں جگہ دی ایک بار پھر بہت بہت شکریہ۔ عمران بھائی ادب کیا ہے ہمیشہ کے لیے اس کو سیکھنے کی کوشش کی نئے افق کو دیکھا پڑھا اسے ہمیشہ کیلئے نزدیک پایا۔ اس سے ادب شناسی کی روشنی پائی نئے افق وہ ادبی جریدہ ہے جس کی خوشبو سے یہ ادبی محبت مہک اٹھتی ہے اور من کے اندر زمزمہ پرواز گیت گنگناتا ہے۔ اقبال بھائی کے ساتھ کیا ہوا وعدہ تو پورا نہیں کر سکتا کیونکہ گرمی اف اللہ اور رمضان المبارک کا مہینہ سبحان اللہ سارا دن روزے سے محنت مزدوری کرنا اور رات کو تراویح سے فارغ ہو کر سو جانا جس کی وجہ سے میں جولائی کے شمارے پر پورا تبصرہ نہیں کر سکتا۔ البتہ چند الفاظ ضرور تحریر کروں گا جو چند دن پہلے مجھے کسی رائٹر کا ایس ایم ایس ہوا کہ ساحل آپ نے آزادی کے موضوع کا کیوں انتخاب کیا اور آپ کی تحریروں میں اکثر ناول کی جھلک محسوس ہوتی ہے تو میرے پیارے بھائی ناول بہت بڑا طویل شبہ پارہ ہوتا ہے جو میرے بس کی بات نہیں کیونکہ جہاں اردو فکشن حقارت، واقعہ یا افسانے کو نثری ادب کہا جاتا ہے انیسویں صدی میں انسانی ادب سے داستان گوئی کا رجحان ختم ہو گیا اور اس کے مقابلے میں ناول منظر عام پر آیا ناول کو ہم داستان کی



ارتقائی شکل کہہ سکتے ہیں جو اطالوی زبان کے لفظ Navella سے مشتق ہے۔ یہ ناول انگریزی ادب کے اثرات سے اردو ادب میں منتقل ہوا۔ ناول نگار کے نقطہ نظر اور نظریہ حیات کا عمل دخل ناول میں براہ راست ہوتا ہے جس سے ناول میں ناول نگار زمانے کی حقیقی زندگی اور فرد کے افعال و اعمال نیز ذہنی و نفسیاتی کیفیات کی عکاس کرتا ہے اسی طرح ناول کا کیونٹوس بھی زندگی کے نشیب و فراز کی طرح وسیع ہو جاتا ہے۔ ناول کے پاس اظہار آزادی کا عنصر تو ہوتا ہے لیکن اختیار نہیں ہوتا کہ وہ کفایت پسندی کے تحت تفصیلات سے دامن نہی ہو اور صنعتی جزئیات کو تحریری اسلوب دے اگر ایسا ہے تو ناول نگار کے لیے بصیرت اور باریک بینی کا ماہر بھی ہونا چاہیے ناول میں استعاراتی تہوار زیادہ کا آئینہ ثابت ہوتا ہے۔ بھائی میں نے تو ابھی تک 26 بہاریں بھی نہیں دیکھی ہیں۔ جس میں 15 سالوں سے ادب کی خدمت کرتا آ رہا ہوں مگر اب تک ادب کو قریب سے نہیں دیکھا نئے افق کے سارے رائٹر حضرات میرے استاد محترم ہیں انکل محمد سلیم اختر کی کہانیاں پڑھ پڑھ کر یہ مقام حاصل کیا تمام ڈائجسٹوں میں لکھنے کا شرف حاصل ہوا تو سلیم اختر کی وجہ سے کیونکہ ہمارا صوبہ بلوچستان پسماندہ علاقہ ہے یہاں کوئی کتاب اور کی سہولت موجود نہیں سلیم اختر ہر مہینے بہت سے ڈائجسٹ ڈاک سے بھیج دیتے ہیں جس کی وجہ سے ہم سارے ادبی دوست اس کا مطالعہ کرتے ہیں۔ خلیل جبار (پراسرار قتل) بہترین تحریر ثابت ہوئی۔ ریاض بٹ (ملاپ) معاشرے کی عکاس بنی۔ طاہرہ جمیس (ستم) نے تو کمال کر دیا۔ ویلڈن طاہرہ مبارک باد ہو۔ اقبال بھائی آپ کی تحریر ہم نوجوان نسل کیلئے تعمیراتی سوچ کو روشناس کراتی ہے جو اس ملک و قوم کے لیے ایک پیغام ہوتا ہے خوب صورت لفظوں کا چناؤ اور بہترین کردار۔ اقبال بھائی آپ بہترین رائٹر میں سے ایک ہیں میں آپ کی سوچ اور خیالات کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں باقی تحریروں پر تو میں تبصرہ نہیں کر سکتا کیونکہ میں نے ابھی تک پڑھی ہی نہیں ہیں امید ہے کہ وہ بھی نئے افق کے معیار پر ہوں گی۔ مقبول جاوید صدیقی اور کاشف بھائی آپ دونوں کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے نئے افق کو رونق بخشی اور مزید لکھنے کی چٹنگی دی۔ آخر میں اتنا ضرور لکھوں گا کہ میری لکھائی بہت کمزور ہے جس کی وجہ سے تعلیم (پراسری) پاس اور کاغذ بھی بہت پرانا استعمال کرتا ہوں جس کی وجہ سے (غربت)۔ پلیز نندار امانت دست کرنا میں نے زیادہ تر آزادی کے حوالے سے لکھا کیا میں نے نئے افق کے معیار پر لکھ سکتا ہوں اگر میری تحریروں میں وزن ہے تو ٹھیک ہے ورنہ ضرور بتانا آئندہ کے لیے نہیں لکھوں گا۔ میری طرف سے تمام دوست اور نئے افق کی پوری ٹیم کو عید مبارک ہو والسلام۔

بڑا بڑا صاحب خوب صورت خط کا شکریہ آپ کے لفظ سے قارئین کے لیے محبت چھلکتی ہے آپ کو جو موضوع اچھا لگتا ہے آپ اس پر لکھتے رہیں۔

**بیمارستان سعیدہ ..... لاہور۔** عمران بھائی آداب۔ ماہ صیام کی آمد ہے اور جب میرا خط آپ پڑھیں گے تو شاید آدھا ماہ مقدس گزر چکا ہو گا اور عید جیسی خوشی قریب ہوگی۔ اس مقدس ماہ کے نزول کا مقصد تزکیہ نفس ہے تاکہ ہم اس مقصد کی معراج حاصل کر سکیں جس کے لئے انسان کو پیدا کیا گیا یعنی حقوق العباد سواپنی خوشیوں میں غریبوں کو بھی شریک کیجیے کہنے میں تو ہم اسلامی ملک میں رہتے ہیں لیکن رمضان شروع ہوتے ہی تمام تاجر حضرات شیطان بند ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہیں اور ان کا کردار ادا کرتے ہوئے اتنی مہنگائی کر دیتے ہیں کہ غریب آدمی صرف نمک سے ہی روزہ کھوتا ہے۔ یہی حال عید پر ہوتا ہے جبکہ یورینیم ممالک میں کرکس اور ایسٹریاتے ہی ہر چیز کے دام کم ہو جاتے ہیں تاکہ ہر غریب خوشیوں میں شامل ہو سکے سو ہمیں کم از کم اپنی ذمہ داری نبھانی چاہیے اور صدقہ و فطرانے کے علاوہ بھی خاص طور پر سڑکوں ہوٹلوں میں کام کرتے بچوں کی اس طرح مدد کرنی ہے کہ ان کی عزت نفس بھی مجروح نہ ہو۔ اب آتے ہیں جناب رسالے کی طرف سرورق کی طرف مختلف رنگوں سے مزین ایک اسٹائش سی لڑکی رسالے کی خوبصورتی بڑھاتی نظر آئی۔ پہلی کہانی ڈاکٹر ایم اے قریشی کی طویل مگر اچھی تھی۔ اگر یہ مختصر ہوتی تو اور اچھا تاثر دیتی۔ پراسرار قتل کا نام کچھ اور ہوتا



چاہیے تھا کیونکہ قتل پر سرانہیں تھا قاتل کا پکڑے جانا پر سرار سائے کی وجہ سے تھا سبق آموز کہانی تھی۔ اسلام اسی لیے اعتدال پسندی اور میانہ روی کی تعلیم دیتا ہے۔ نہ ہاتھ بندھے ہوں اور نہ انسان شیطان کا بھائی ہو اور دوسری بات اس کہانی کی یہ تھی کہ سبے گناہ کا خون رنگ لاتا ہے۔ حنا سید کی تھپڑ متاثر نہیں کر سکی کیونکہ موبائل آنے کے بعد سے اب تک اس طرح کی خبریں اور کہانیاں عام ہو چکی ہیں۔ ریاض بٹ کی ملاپ حسب معمول دلچسپ تھی۔ قلندر ذات انسانی سوچ سے بڑھ کر ماورائی ہوتی جا رہی ہے اسے اب اختتام کی طرف لے آئیں اور نئی کہانی شروع کریں۔ ابن حق کی بھرم بغیر سر پاؤں کے تھی۔ بس لفاظی تھی نہ کوئی مقصد نہ دلچسپ عنصر۔ کے ایم خالد کی ایجنسی دلچسپ تھی اکثر میں بھی حکومتی پالیسیوں کے خلاف لکھتی ہوں ایسی ایجنسیز کا تو میں بڑی بے تابی سے انتظار کروں گی کہ میرے بھی وارے نیارے ہو جائیں۔ اقبال بھٹی کی بیگم شیطان بس ایوریج تھی اور زریں قمر کی گمنام سپاہی طویل تھی پر زیادہ متاثر نہیں کر سکی۔ تکمیل تمنا میں پامست صاحب کا حقیقی وجود ہے تو اس رسالے کے توسط سے مجھے ان صاحب کا ممبر دے دیں کیونکہ مجھے ایسی باتوں میں بہت دلچسپی ہے۔ فلسطین الماس صاحب کی کہانی کم اور ہسٹری جغرافیہ کا باب زیادہ لگ رہی ہے۔ میں نے ہسٹری کے حوالے سے نسیم حجازی کی بہت کتابیں پڑھی ہیں وہ ہسٹری کے ساتھ اس طرح کہانی بیان کرتے ہیں کہ دلچسپی اور توازن برقرار رہتا ہے۔ اب سب لکھنے اور پڑھنے والوں کے لئے ماہ صیام کے حوالے سے نیک تمنا میں اور اجازت۔

جنگریحانہ یاد آوری کا شکریہ آپ نے بالکل درست لکھا انسانوں کی خدمت ہی سب سے بڑی عبادت ہے۔ اللہ تعالیٰ نماز روزے تو معاف کر سکتا ہے لیکن حقوق العباد نہیں۔

**ابن مقبول جاوید احمد حقیقی ..... راولپنڈی** محترم السلام علیکم! نئے گیٹ اپ میں بڑا ہی خوب صورت اور پرکشش ٹائٹل والا نئے افق سامنے آیا تو چند لمحوں کے لیے دم بخود رہ گیا۔ خوب صورت اور بڑی بڑی آنکھوں کے ساتھ بہترین پوز میں محترمہ عجب جلوہ دکھا رہی ہیں نمایاں فرق ہو گیا ہے ٹائٹل کی حد تک تو فہرست دیکھ کر لگا کہ آپ لوگ اپنی پوری محبت و مشقت سے کہانیوں کا انتخاب کر رہے ہیں مثلاً پہلی کہانی ڈاکٹر ایم اے قریشی اور حسام بٹ کی دل موہ لینے والی تحریر آسٹرو لو جسٹ کی کہانی، کوئٹھن اور مختصر کہانی نے بھی پرچے کو چار چاند لگا رہی ہے۔ محترم مشتاق احمد قریشی کی دستک تو چشم کشا ثابت ہوئی غور و فکر کے لیے کئی درود کر گئی۔ گفتگو میں عمران جی نے زبردست حدیث شریف بیان کی ہے اور یہ دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ انعامات کا سلسلہ بھی شروع کر دیا گیا ہے۔ ذوق آگئی اور خوشبوخن میں دونوں انعام یافتہ تحریریں واقعی انعام کی حقدار ہیں اور پھر اپنا تبصرہ انعامی قرار دینے پر یکدم ہی خوشی سے اچھل پڑا۔ مجلس ادارت کا بے حد شکر گزار ہوں ڈاکٹر خادم حسین کا شکریہ، اللہ انہیں نیکی کرنے کا موقع بخشا۔ بے آمین مگر مجید احمد جانی کے خط کا فٹ نوٹ ادارہ کی طرف سے پڑھ کر بے حد افسوس ہوا ریاض حسین قمر جی لیجیے ہم حاضر ہیں مگر آپ خوشبوخن سے غائب کیوں باقی یاد کرنے کا بے حد شکریہ۔ ایم ایم کاشف نے نئے انکشافات کر ڈالے تبصرہ بھی اچھا تھا۔ بھائی عمر فاروق ارشد کی تجویز کے سلسلے وار ناؤز کے کچھ صفحات کم کر کے خوشبوخن اور ذوق آگئی کو دے کر چار چاند لگ سکتے ہیں اور مقابلے کے لیے مواد بھی اچھا خاص لکھا جائے گا میں اس تجویز پر عمل کرنے کے لیے محترم مشتاق صاحب عمران جی اور اقبال بھٹی صاحبان سے پر زور اپیل کرتا ہوں، ریاض بٹ جی خوب آئے اور زبردست کہانی تھی بے حد اچھی۔ میری درخواست ہے احباب مجلس ادارت سے کہ تمام کوئٹھن کو بھی انعام دینے کی فہرست میں شامل کیا جائے بے حد شکریہ۔ اجنبی بے حد اچھی کہانی ہے شروع کے صفحات پر ڈاکٹر ایم اے قریشی ایسی ہی کہانیاں لایا کریں تھپڑ اچھی تھی مگر عام سی کہانی رہی ملاپ تو ریاض بٹ کی خوب صورت کہانی رہی۔ ابن حق کی بھرم عام کہانی سے ہٹ کر تھی۔ اچھی رہی۔ تم ہمارے معاشرے کے محروم افراد کی نفسیات اور پھر انہی لوگوں کے خلاف انھہ کر کچھ بن کر حلال و حرام کی تمیز کے بغیر آگے



چاہیے تھا کیونکہ قتل پر سرانہیں تھا قاتل کا پکڑے جانا پر سرار سائے کی وجہ سے تھا سبق آموز کہانی تھی۔ اسلام اسی لیے اعتدال پسندی اور میانہ روی کی تعلیم دیتا ہے۔ نہ ہاتھ بندھے ہوں اور نہ انسان شیطان کا بھائی ہو اور دوسری بات اس کہانی کی یہ تھی کہ سبے گناہ کا خون رنگ لاتا ہے۔ حنا سید کی تھپڑ متاثر نہیں کر سکی کیونکہ موبائل آنے کے بعد سے اب تک اس طرح کی خبریں اور کہانیاں عام ہو چکی ہیں۔ ریاض بٹ کی ملاپ حسب معمول دلچسپ تھی۔ قلندر ذات انسانی سوچ سے بڑھ کر ماورائی ہوتی جا رہی ہے اسے اب اختتام کی طرف لے آئیں اور نئی کہانی شروع کریں۔ ابن حق کی بھرم بغیر سر پاؤں کے تھی۔ بس لفاظی تھی نہ کوئی مقصد نہ دلچسپ عنصر۔ کے ایم خالد کی ایجنسی دلچسپ تھی اکثر میں بھی حکومتی پالیسیوں کے خلاف لکھتی ہوں ایسی ایجنسیز کا تو میں بڑی بے تابی سے انتظار کروں گی کہ میرے بھی وارے نیارے ہو جائیں۔ اقبال بھٹی کی بیگم شیطان بس ایورج تھی اور زریں قمر کی گناہ سپاہی طویل تھی پر زیادہ متاثر نہیں کر سکی۔ تکمیل تمنا میں پاسبان صاحب کا حقیقی وجود ہے تو اس رسالے کے توسط سے مجھے ان صاحب کا ممبر دے دیں کیونکہ مجھے ایسی باتوں میں بہت دلچسپی ہے۔ فلسطین الماس صاحب کی کہانی کم اور ہسٹری جغرافیہ کا باب زیادہ لگ رہی ہے۔ میں نے ہسٹری کے حوالے سے نسیم حجازی کی بہت کتابیں پڑھی ہیں وہ ہسٹری کے ساتھ اس طرح کہانی بیان کرتے ہیں کہ دلچسپی اور توازن برقرار رہتا ہے۔ اب سب لکھنے اور پڑھنے والوں کے لئے ماہ صیام کے حوالے سے نیک تمنا میں اور اجازت۔

ہمارے بھائی یا قاری کا شکر ہے آپ نے بالکل درست لکھا انسانوں کی خدمت ہی سب سے بڑی عبادت ہے۔ اللہ تعالیٰ نماز روزے تو معاف کر سکتا ہے لیکن حقوق العباد نہیں۔

**ابن مقبول جاوید احمد صدیقی..... (اولینڈی) محترم السلام علیکم! نئے گیٹ اپ میں بڑا ہی خوب صورت اور پرکشش ٹائٹل والا نئے افق سامنے آیا تو چند لمحوں کے لیے دم بخود رہ گیا۔ خوب صورت اور بڑی بڑی آنکھوں کے ساتھ بہترین پوز میں محترمہ عجب جلوہ دکھا رہی ہیں نمایاں فرق ہو گیا ہے ٹائٹل کی حد تک تو فہرست دیکھ کر لگا کہ آپ لوگ اپنی پوری محبت و مشقت سے کہانیوں کا انتخاب کر رہے ہیں مثلاً پہلی کہانی ڈاکٹر ایم اے قریشی اور حسام بٹ کی دل موہ لینے والی تحریر آسٹریلوجسٹ کی کہانی، کوئٹھن اور مختصر کہانی نے بھی پرچے کو چار چاند لگا رہی ہے۔ محترم مشتاق احمد قریشی کی دستک تو چشم کشا ثابت ہوئی غور و فکر کے لیے کئی درود کر گئی۔ گشتگو میں عمران جی نے زبردست حدیث شریف بیان کی ہے اور یہ دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ انعامات کا سلسلہ بھی شروع کر دیا گیا ہے۔ ذوق آگئی اور خوشبوخن میں دونوں انعام یافتہ تحریریں واقعی انعام کی حقدار ہیں اور پھر اپنا تبصرہ انعامی قرار دینے پر یکدم ہی خوشی سے اچھل پڑا۔ مجلس ادارت کا بے حد شکر گزار ہوں ڈاکٹر خادم حسین کا شکریہ، اللہ انہیں نیکی کرنے کا موقع بخشے۔ سچا مین مگر مجید احمد جانی کے خط کا فٹ نوٹ ادارہ کی طرف سے پڑھ کر بے حد افسوس ہوا ریاض حسین قمر جی لیجیے ہم حائسہ ہیں مگر آپ خوشبوخن سے غائب کیوں باقی یاد کرنے کا بے حد شکریہ۔ ایم ایم کاشف نے نئے انکشافات کر ڈالے تبصرہ بھی اچھا تھا۔ بھائی عمر فاروق ارشد کی تجویز کے سلسلے وار ناؤز کے کچھ صفحات کم کر کے خوشبوخن اور ذوق آگئی کو دے کر چار چاند لگ سکتے ہیں اور مقابلے کے لیے مواد بھی اچھا خاص لکھا جائے گا میں اس تجویز پر عمل کرنے کے لیے محترم مشتاق صاحب عمران جی اور اقبال بھٹی صاحبان سے پرزور اپیل کرتا ہوں، ریاض بٹ جی خوب آئے اور زبردست کہانی تھی بے حد اچھی۔ میری درخواست ہے احباب مجلس ادارت سے کہ تمام کوئٹھن کو بھی انعام دینے کی فہرست میں شامل کیا جائے بے حد شکریہ۔ اجنبی بے حد اچھی کہانی ہے شروع کے صفحات پر ڈاکٹر ایم اے قریشی ایسی ہی کہانیاں لایا کریں تھپڑ اچھی تھی مگر عام سی کہانی رہی ملاپ تو ریاض بٹ کی خوب صورت کہانی رہی۔ ابن حق کی بھرم عام کہانی سے ہٹ کر تھی۔ اچھی رہی۔ تم ہمارے معاشرے کے محروم افراد کی نفسیات اور پھر انہی لوگوں کے خلاف اٹھ کر کچھ بن کر حلال و حرام کی تمیز کے بغیر آگے**



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)



بڑھنے کا جنون آخر کار کیسے کیسے انجام تک پہنچے۔ طاہرہ حبیب تارا کی اچھی کوشش رہی۔ طنز و مزاح پر لکھی خوب رہی اور کے ایم خالد اس میں کامیاب بھی رہے ہمارے میگزین میں اس طرح کی کہانیاں بھی خوشگوار ہوا کا جھونکا ثابت ہوں گی اور بھٹی صاحب کی بیگم شیطان تو پڑھ کر بے حد ہنسی بھی آئی اور ساتھ ہی کہانی بڑے ماہرانہ انداز میں بڑی اچھی پلاننگ سے لکھی گئی ہے طبع زاد کہانیوں میں زبردست رہی۔ گمنام سپاہی معلومات اور واقعات کا بہترین اظہار تھا۔ زریں قمر کی بہترین کاوش رہی۔ حسام بٹ کی تکمیل تمنا تو ہمیشہ کی طرح شروع کی اور ارد گرد سے بے خبر کہانی کے ساتھ بڑھتے چلے گئے حتیٰ کہ آخری لائن بھی آگئی زبردست منفرد اور سٹروپامسٹری پر بالکل ہی انوکھے انداز میں یہ سلسلہ چل رہا ہے یہ چلتا رہنا چاہیے دونوں سلسلے وار کہانیاں بھی زبردست جاری ہیں ذوق آگئی میں آسہ اشرف کو مبارک باد اور خوشبو حن میں ایم جے قریشی کو بھی مبارک باد۔ میری کہانی کوٹیشن کے طور پر شامل کرنے کا بے حد شکریہ۔ قارئین نے پچھلے شمارے میں بھی کہانی پر کوئی اظہار خیال نہیں کیا تھا براہ کرم ضرور لکھیں ہمارا میگزین تیزی سے بہتری کی طرف بڑھ رہا ہے لامحالہ قارئین کی تعداد بڑھتی چلی جائے گی ان شاء اللہ تمام احباب مجلس کو سلام۔

جواد ید صدفی صاحب، نئے افق کی پسندیدگی کا شکریہ آپ کی جانب سے ارسال کردہ کوٹیشن اور دیگر تحاریر کے منتظر ہیں۔

**عمر فاروق ارشد۔۔۔۔۔ فورٹ عباس۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔** جولائی کا نئے افق کافی دیر سے موصول ہوا سو قلم بھی کافی دیر سے اٹھا ہے مگر امید ہے کہ تبصرہ پہنچ ہی جائے گا اب شائع ہونا یا نہ ہونا یہ تو جناب کی صوابدید پر ہے۔ خیر اس مرتبہ ٹائٹل نے بالکل بھی متاثر نہیں کیا میں با ترد کہہ سکتا ہوں کہ یہ ٹائٹل مکمل طور پر فداپ ثابت ہوا کیونکہ آپ کو چاہیے تھا کہ رمضان کی مناسبت سے کوئی سادہ اور جاذب نظر سرورق ترتیب دیتے۔ یہ ماورائی اور دانت نکوتی مخلوق بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ محترم قریشی صاحب ہمیشہ کی طرح دلوں پر دستک دے رہے تھے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ، وطن عزیز پر صرف خدائے ذوالجلال کا سایہ ہے جو یہ وطن آج تک قائم ہے ورنہ اپنوں کی بے ضمیری اور غیروں کی سازشوں نے کب کوئی کسر چھوڑی ہے آج کی تازہ صورت حال کو ہی دیکھ لیں۔ کیسے کیسے شرفا کہلانے والوں کے چہروں سے شرافت کے نقاب اتر رہے ہیں اور نیچے سے کرپشن غداری اور حرام کاری کی غلاطت سے ہتھڑے ہوئے چہرے نمایاں ہو رہے ہیں۔ بطور پاکستانی ہم اس تبدیلی پر خوش ہیں کہ احتساب کا عمل ہونا چاہیے مگر ذرا ہے کہ سیاہ کر تو توں کے مالک یہ خونخوار مگر مجھ احتساب کے نرم و نازک جال کو پھاڑ کر بھاگ نہ جائیں کیونکہ 70 سالوں میں تو ان کا احتساب نہ ہو سکا تو پھر آج یہ معجزہ کیسے ممکن ہے؟ بہر حال ہم اپنی گفتگو کی محفل میں آتے ہیں۔ ابن مقبول صاحب طویل ترین تبصرے سے ساتھ شامل ہوئے بھائی نے بہت اچھی باتوں کی طرف توجہ دلائی ریاض بٹ صاحب نیک تمناؤں کا شکریہ آپ کی کہانیاں ضرور شائع ہوتی رہیں گی بس آپ کبھی دل چھوٹا مت کرنا سلسلے وار ناول بھی اچھے جارہے ہیں مگر مجھے افسوس ہے کہ کمپوزنگ کی غلطیوں پر قہر تو نہیں پایا جاسکا۔ اس مرتبہ ایک بہت ہی سنگین غلطی یہ ہوئی کہ الیاس ایم اے صاحب کو الماس ایم اے بنا دیا گیا گویا ہوشیار باش جنس کی تبدیلی کا عمل نئے افق میں شروع ہو چکا ہے اللہ ہی خیر کرے۔ دوسری بات یہ کہ میں مستقل سلسلے خوش بو حن کے بارے میں کچھ بات کرنا چاہوں گا ان میں سے کچھ ایسی باتیں ہیں کہ جن کی طرف پہلے بھی بار بار توجہ دلا چکا ہوں مگر بے سود، پہلی بات یہ کہ اس سلسلے کے صفحات میں اضافہ کیا جائے اس مرتبہ جتنی جگہ اس سلسلہ کو دی گئی اس سے بہتر ہے کہ آپ اسے بالکل ہی ختم کر دیں چند مخصوص لوگوں کو نمائندگی دے کر آپ خانہ پری تو کر سکتے ہیں لیکن رسالے کا معیار قائم نہیں رکھ سکتے۔ دوسری بات یہ کہ ہر دفعہ نوٹیشن صاحب کو مکمل تعارف اور زندگی کا زائچہ شریف پیش کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ یہ ایک غیر مناسب بات لگتی ہے اس جگہ پر غزلیں شائع ہو سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ صفحات کم از کم اتنے ہوں کہ ساتھیوں کا کلام



ہر ماہ شائع ہوا کرے۔ یہاں یہ صورت حال یہ ہے کہ چار ماہ بعد غزل شائع کر دی جاتی ہے جب بندہ اس پر فاتحہ پڑھ چکا ہوتا ہے بعض اوقات بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ پہلے والی غزلیں شائع نہیں ہوتیں جبکہ بعد والی شائع کر دی جاتی ہے۔ اس طرح لکھنے والا الجھن میں رہتا ہے کہ ان غزلوں کے ساتھ کیا حشر ہوا۔ اس کا آسان حل یہ ہے کہ ”کوشش جاری رکھیں“ کے عنوان سے ان ساتھیوں کے نام دے دیے جائیں جن کا کلام قربانی کا بکرا بنا دیا گیا ہو۔ محترم قریشی صاحب اور عمران بھیا جی یقین کریں کہ میں نہایت مجبوری اور راسخ اقدام کے طور پر یہ چند گزارشات کر رہا ہوں کیونکہ جب قاری ذہنی طور پر ادارے کی پالیسیوں یا رسالے کی بناوٹ سے مطمئن نہیں ہوگا تو پھر وہ کس طرح اس کا مطالعہ کر سکے گا۔ باقی سلسلے اللہ کے فضل سے بہت اچھے جارہے ہیں کہانیوں کا انتخاب بھی عمدہ ہے اللہ تعالیٰ ہمارے نئے افق کو دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے آمین۔

محترم ارشد جی، آپ کی تنقید اور تعریف کا شکریہ ہم کوشش کریں گے کہ نئے افق آپ کے معیار کے مطابق بنائیں تاریخی کہانی کے خالق کا نام الماس ایم اے ہے، ایم الیاس نہیں۔

**ریاض بٹ حسن ابدال** السلام علیکم! ماہ جولائی 2015ء کا شمارہ اس بار 20 جون کو مل گیا خوشگوار حیرت کا ایک جھٹکا لگا اس کو آپ بھی لکھنا نہ سمجھ لیجیے گا کیونکہ اتنی لوڈ شیڈنگ ہوتی ہے کہ جھٹکے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا البتہ ماہ رمضان شروع ہوتے ہی مہنگائی کے جو جھٹکے لگانے شروع کیے ہیں اس کی بدولت غریب عوام بلکہ متوسط طبقے والوں کی بھی چیمیں نکل گئی ہیں ان چیخوں پر کان دھرنے والا کوئی نہیں ہے۔ خدا بزرگ و برتر ہمارے حال پر رحم کرے آمین، اس بار دستک میں محترم مشتاق احمد قریشی صاحب کیسنائی آقاؤں کی پاکستان میں دشمنی کے متعلق لکھ رہے ہیں یہ بات اپنی جگہ ایک نل حقیقت ہے کہ امریکہ نے کبھی نہیں چاہا کہ پاکستان مستحکم ہوا اپنے پاؤں پر کھڑا ہو وہ یہی چاہتا رہا ہے کہ پاکستان اس کی بیساکھیوں کے سہارے ڈھونڈتا رہے ایسے حالات پیدا کرتا رہا ہے اور اب بھی وہ اس ڈگر پر چل رہا ہے کہ پاکستان میں اس نہ ہو۔ مختلف فرقوں کو آپس میں لڑانے کی کوشش کرتا رہتا ہے کہتے ہیں جب تک کلہاڑی کے ساتھ لکڑی کا دستہ نہ ہو وہ درخت نہیں کاٹ سکتی۔ یہاں پر (پاکستان) میں ایسے حالات پیدا کیے جاتے ہیں کہ ہم میں سے کچھ کلہاڑی کا دستہ بن جاتے ہیں بہر حال ہماری دعا ہے کہ پاکستان ترقی کرے اس میں استحکام ہو اور دشمنوں کو منہ کی کھانا پڑے اب بڑھتے ہیں اپنی محفل گفتگو کی طرف محترم ابن مقبول جاوید احمد صدیقی صاحب مبارک ہو آپ کا خط ماہ جولائی کے شمارے کا انعام یافتہ خط قرار پایا آپ کے خطوط ہمیشہ سے موثر مدلل اور سیر حاصل تبصرہ کے حامل ہوتے ہیں اس بار بھی بہترین خط ہے اللہ کرے زور قلم اور زیادہ میری تفتیشی کہانی ”چراغ“ پسند کرنے کا بے حد شکریہ آپ لوگوں کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے میں لکھ رہا ہوں ورنہ کب کا غنڈ اور قلم کا رشتہ منقطع کر چکا ہوتا ڈاکٹر خادم حسین صاحب محفل میں خوش آمدید خدا آپ کو سلامت رکھے اور آپ اس طرح مریضوں کو صحت کامل دینے کا وسیلہ بنے رہیں۔ اس دور میں حقیقی سچا ملنا بڑا مشکل ہے لیکن اس دنیا میں اچھے لوگ موجود ہیں اور ایسے کرداروں کو میں اپنی تفتیشی کہانیوں میں اجاگر کرنے کی سعی کرتا رہتا ہوں مجید احمد جانی صاحب یاد کرنے کا بے حد شکریہ۔ اشفاق شاہین صاحب میری کہانی ”چراغ“ آپ کے معیار پر بھی پوری اترتی جس کے لیے یہ بندہ ناچیز مشکور و ممنون ہے۔ آئندہ بھی اپنی رائے سے مطلع کرتے رہے گا ریاض حسین قمر بھائی کیسے ہو اس بار بھی آپ کا خط محفل کی جان ہے میری کہانی چراغ کو پسندیدگی کی سند دینے پر شکر گزار ہوں بھائی محفل سے غیر حاضری کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ دراصل اب صحت ٹھیک نہیں رہتی دعاؤں اور دوائیوں کے سہارے جی رہا ہوں کبھی کبھی لکھ نہیں سکتا آپ کی محبتیں اور عنایتیں دوبارہ ہاتھ میں قلم تھما دیتی ہیں ایم ایچ کاشف صاحب یہ تو کوئی اچھی بات نہیں ہے کہ رائٹر ایک ہی کہانی مختلف رسائل میں ارسال کر دے بہر حال اس کی وضاحت تو خود رائٹر ہی کریں گے عمر فاروق ارشد بھائی



آپ کا خط اور تبصرہ ہمیشہ کی طرح سندر ہے اور آپ کے خیالات ارفع ہیں میری کہانی چراغ آپ کو بھی اچھی جو میرے لیے باعث تقویت ہے خدا آپ کو خوش رکھے اور آپ میری اچھی کہانی پر میری حوصلہ افزائی کرتے رہیں، شکریہ۔ لیجیے گفتگو کی محفل تمام ہوئی قارئین خاطر جمع رکھیں میں ابھی کہیں نہیں جا رہا ابھی کہانیوں اور باقی سلسلوں پر تبصرہ باقی ہے ویسے یہ باقی ہے ایسے ہی ہے جیسے فی وی پر کوئی با مقصد اور اچھا پروگرام چل رہا ہو اور میزبان یہ کہے کہ ملتے ہیں چھوٹی سی بریک کے بعد اور یہ بریک یعنی اشتہارات شیطان کی آنت کی طرح لے ہو جائیں یا کوئی کہانی انتہائی دلچسپ اور سنسنی خیز مرحلے پر ہو اور اچانک لکھا آجائے باقی اگلے ماہ، خیر کہانیوں میں خلیل جبار کی پر اسرار قتل ان کی باقی کہانیوں کی نسبت زیادہ اچھی تھی۔ دراصل کسی انسان کی جان لینا وقتی فائدہ ہے یا اشتعال کے آسان ہے لیکن بعد کے حالات برداشت کرنا مشکل ہے تکمیل تمنا بٹ صاحب کی ایک خوب صورت کہانی ہے ہمیں خوشی ہے کہ بٹ صاحب نے ہمارے پیارے رسالے کے لیے لکھنا شروع کیا ہے اور یہ بات اس سے بھی زیادہ طمانینہ اور خوشی کا باعث ہے کہ اب وہ ان شاء اللہ ہمیشہ لکھتے رہیں گے۔ اقبال بھٹی بیگم شیطان کی صورت میں ایک اچھی اور منفرد کہانی لے کر آئے عورت جب انتقام میں اندھی ہو جائے تو ناگن بن جاتی ہے اور اپنے شکار کو ڈس کر ہی دم لیتی ہے اور سیر کے لیے سوا سیر بن کر اپنا مقصد حاصل کرتی ہے کے ایم خالد کی کہانی ”ایجنسی“ طنز و مزاح کے اعتبار سے ایک اچھی اور جاندار کاوش ہے ”ستم“ طاہرہ حبیب کی بھی تعریف کے قابل ہے ان کے قلم کی کاٹ دلوں کو جھنجوز دیتی ہے چند نلوں کی خاطر انسان کا خون بہانا کبھی بھی اچھا نہیں سمجھا گیا۔ حنا سید کی مختصر سی تحریر تھپڑ پڑھ کر دل کانپ اٹھا۔ یہ آج کل کی جوانی کے لیے ایک سبق آموز کہانی ہے۔ مختصر ہوتے ہوئے بھی یہ کہانی کسی طویل کہانی سے کم نہیں ہے۔ آپ نے ذوق آگے اور خوش بوخن کے لیے بھی انعام کا سلسلہ شروع کر کے اچھا قدم اٹھایا ہے میری گزارش یہ ہے کہ ان کے صفحات بڑھادیں بہر حال انعام کے لیے منتخب ہونے والے انتخاب کے علاوہ بھی سارا انتخاب اچھا ہے آخر میں دعا گو ہوں کہ خدا بزرگ و برتر ہمارے پیارے رسالے کو دن و گنی اور رات چمکنی ترقی عطا فرمائے آمین۔

☆ بٹ صاحب یا آوری کا شکریہ، اللہ تعالیٰ آپ کو صحت دے اور ہمت دے تاکہ آپ کے قاری آپ کی تحریروں سے لطف اندوز ہوتے رہیں۔



### مصنفین سے گزارش

- ☆ مسودہ صاف اور خوشخط لکھیں۔
- ☆ صفحے کے دائیں جانب کم از کم ڈیرہانچ کا حاشیہ چھوڑ کر لکھیں۔
- ☆ صفحے کے ایک جانب اور ایک سطر چھوڑ کر لکھیں صرف نیلی یا سیاہ روشنائی کا ہی استعمال کریں۔
- ☆ خوشبوخن کے لیے جن اشعار کا انتخاب کریں ان میں شاعر کا نام ضرور تحریر کریں۔
- ☆ ذوق آگے کے لیے بھیجی جانے والی تمام تحریروں میں کتابی حوالے ضرور تحریر کریں۔
- ☆ نوٹو اسٹیٹ کہانی قابل قبول نہیں ہوگی۔ اصل مسودہ ارسال کریں اور نوٹو اسٹیٹ کروا کر اپنے پاس محفوظ رکھیں کیونکہ ادارہ نے ناقابل اشاعت کہانیوں کی واپسی کا سلسلہ بند کر دیا ہے۔
- ☆ مسودے کے آخری صفحہ پر اردو میں اپنا مکمل نام پتا اور موبائل فون نمبر ضرور خوشخط تحریر کریں۔
- ☆ ”گفتگو“ کے لیے آپ کے ارسال کردہ خطوط ادارہ کو ہر ماہ کی 3 تاریخ تک مل جانے چاہیے۔
- ☆ اپنی کہانیاں دفتر کے پتہ پر رجسٹرڈ ڈاک کے ذریعے ارسال کیجیے۔ 7 فرید چیمبرز، عبداللہ ہارون روڈ، کراچی۔



# اقرا

ترتیب: طاہر قریشی

اللہ

تفسیر: سوہ البقرۃ کی یہ آیت مبارکہ ”آیتھری“ کے نام سے مشہور ہے۔ اس آیت میں اللہ تبارک و تعالیٰ کی ایسی مکمل قدرت و عظمت ارشاد ہوئی ہے جس کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔ اسی باعث حدیث شریف میں اس آیت کو قرآن شریف کی سب سے افضل آیت قرار دیا گیا ہے۔ اس میں لفظ کرسی استعمال ہوا ہے جو بالعموم حکومت و اقتدار کے اعتبار سے کے طور پر بولا جاتا ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ کی حاکمیت و اقتدار بلا شرکت غیر سے پوری کی پوری کائنات بلکہ تمام عالم (کیونکہ وہ ذاتِ عالی رب العالمین ہے یعنی کسی ایک عالم کا نہیں تمام عالموں کا رب ہے) اس کی ذاتِ عالی فطعی غیر فانی ہے وہ ہمیشہ سے زندہ ہے اور ہمیشہ ہی زندہ رہنے والی ہے۔ اس کی زندگی کسی کی بخشی ہوئی یا تخلیق کی ہوئی نہیں بلکہ وہی سب کو زندگی اور اسباب زندگی بخشنے والی ہستی ہے۔ وہ آپ ہی اپنی حیات سے زندہ ہے۔ اور اس کے ہی بل بوتے پر ساری کائنات کا نظام قائم ہے۔ وہ اپنی اس عظیم ترین سلطنت کے جملہ اختیارات کا پوری طرح خود ہی مالک و مختار ہے۔ کوئی دوسرا نہ اس کی ذات میں نہ ہی اس کی صفات میں کسی طرح شریک ہے نہ ہو سکتا ہے اور نہ اس کے اختیارات میں اور نہ اس کے حقوق الہی میں اور جو ایسا کرتے ہیں اللہ کے ساتھ کسی بھی طرح کسی کو شریک کرتے ہیں اس سے کسی بھی طرح کی مدد مانگتے ہیں یا اپنی حاجات روائی کی مانگ کرتے ہیں وہ سب جھوٹ اور شرک میں مبتلا ہیں اور خود اپنے آپ پر ظلم کے مرتکب ہوتے ہیں۔

آیت مبارکہ میں رب ذوالجلال نے اپنے غیر محدود اور مطلق اختیارات کا تصور پیش کر کے بتا دیا ہے کہ اس کی حکومت میں نہ تو کوئی شریک ہے اور نہ ہی اس کے ہاں کسی کا ایسا زور چلتا کہ اس کی سفارش اللہ تعالیٰ کے فیصلوں پر کسی طرح اثر انداز ہو سکے۔ کسی کے پاس وہ علم ہی نہیں ہے جس سے وہ نظام کائنات اور اس کی مصلحتوں کو سمجھ سکے۔ انسان ہو یا فرشتے یا دوسری مخلوقات سب کا علم ناقص اور محدود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام مخلوقات کو ان کی تخلیق کے وقت ان کی ضرورت کا جو علم عطا کیا وہ ان کی ضرورت کے مطابق ہے ہر ایک کی حد مقرر کر دی گئی ہے۔ کائنات کی حقیقتوں پر کسی کی نظر محیط نہیں اپنی مصلحتوں کو اللہ تبارک و تعالیٰ ہی پوری طرح جانتا ہے وہی تمام علوم کا سرچشمہ اور منبع ہے۔ اس لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اللہ کی ہدایت و رہنمائی پر عمل کیا جائے۔

انسان چاہے تو بہت بلند مرتبہ ہو سکتا ہے وہ عظمت و سر بلندی کے اونچے مدارج طے کر سکتا ہے۔ لیکن وہ اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ حدود و قیود سے باہر نہیں نکل سکتا اور جب قلبِ مومن میں بندگی اطاعتِ الہی توحیدِ الہی کا عقیدہ اچھی طرح جاں گزریں ہو جاتا ہے تو پھر وہ جذبہ عمل اسے مقامِ عبودیت تک پہنچا دیتا ہے۔ اور وہ ہر قسم کی سرکشی اور تکبر سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ اس کی طبیعت میں عجز و انکساری نرمی پیدا ہو جاتی ہے اس کا دل خوفِ الہی سے کانپتا رہتا ہے۔ جو شخص قرآن حکیم کے اندازِ بیان کو سمجھ لیتا ہے پھر وہ کسی قسم کے مباحث و اعتراضات میں نہیں پڑتا۔

سورۃ الحشر کی آیات ۲۲ تا ۲۴ میں اور البقرۃ آیت ۲۵۵ میں رب کائنات کی معبودیت اس کے واحد لہ ہونے اور اس کے سوا کوئی اور کسی طرح کسی بھی عبادت کا مستحق نہیں ہے کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ یعنی اللہ تبارک و تعالیٰ کے سوا کسی کا یہ مقام و مرتبہ نہیں ہے کہ انسان اس کی بندگی و پرستش کرے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے پاس وہ صفاتِ الہی اور اختیارات



الہی نہیں اور نہ ہو سکتے ہیں جو اس معبود حقیقی کے پاس ہیں اس لئے عبادت و پرستش کا حق بھی اس مالک و خالق کا ہے کسی اور کا نہیں۔ باقی تو سب اس کی مخلوق ہیں اور کسی مخلوق کی عبادت و پرستش خالق کے ہوتے ہوئے نہیں کی جاسکتی۔

قرآن حکیم میں رب کائنات کی صفات عالی کو خوب نمایاں طور پر بیان کیا گیا ہے لیکن ان دونوں مقامات یعنی سورہ الحشر کی یہ آخری تین آیات اور البقرہ کی آیت الکرسی میں جو صفات الہی بیان کی گئی ہیں اسماء الحسنی کا ہی حصہ ہیں۔ اسماء الحسنی یعنی اللہ کے تمام اچھے نام کیا ہیں۔ دراصل یہ وہ صفات الہی ہیں جن سے اس کی قدرت کی مختلف صلاحیتوں، حیثیتوں کا اظہار ہوتا ہے۔ تفصیل آئندہ صفحات میں آپ دیکھ سکیں گے۔ ان آیات مبارکہ میں جن صفات کا ذکر فرمایا گیا ہے وہ ہیں۔ ”اللہ اور الہ“ یعنی معبود جس کی پرستش و عبادت کی جائے۔ پھر دوسری صفت ”الشہادہ“ آئی ہے جس کے معنی جاننے والا اور ایسا جاننے والے کے ہیں جو اپنی مخلوقات کی ہر پوشیدہ اور ظاہر سے پوری طرح واقف ہو۔ اس کے ماضی حال اور مستقبل تک سے واقف ہو۔ اس کے بعد جو صفت الہی آئی ہے وہ ”الرحیم“ یعنی نہایت رحم والا اور بہت ہی مہربان اللہ کی ذات عالی ایسی ہے جس کی رحمت بے پایاں ہیں جن کی وسعت تمام کائنات پر محیط ہے۔ پھر صفت الہی ”الملک“ آئی ہے جس کے معنی بادشاہ حاکم، مقدر یعنی ذات الہی جو سارے جہانوں کی بادشاہ و مالک ہے۔ پوری کائنات اسی کی فرماں روائی پر محیط ہے۔ پھر صفت ”القدوس“ آئی ہے جس کے معنی ہیں تمام صیوبوں سے پاک ایسی ذات عالی جس میں کسی قسم کا کوئی عیب یا نقص نہیں ہے وہ ہر برائی جو ذہن انسانی میں آسکتی ہے سے پاک ہے۔ آگے چل کر ”السلیم“ کی صفت بیان ہوئی ہے جس کے معنی سلامتی کے ہیں یعنی اللہ کی ذات ایسی ذات ہے جس کو کسی قسم کی نہ کمزوری لاحق ہو سکتی ہے نہ ہی کبھی اس کے کمال کو زوال آسکتا ہے اس کی صفات ہر نقص اور شر سے محفوظ ہے۔ پھر ”المومن“ کہا گیا ہے جس کے معنی امن دینے والا خوف سے حفاظت کرنے والا امن دینے والا یعنی اسباب امن مہیا کرنے والے کے ہیں اس کے بعد صفت ”السمیع“ آئی ہے جس کے معنی نگہبان یا گواہ کے ہیں حفاظت کرنے والے کے ہیں یعنی خبر گیری کرنا اور ذمے داری اٹھانے والا اس کے بعد رب کائنات کی صفت ”العزيز“ آئی ہے جس کے معنی غالب، قوی، قاہر کے ہیں یعنی ایسی زبردست ہستی جس کا کوئی مقابلہ نہ کر سکے۔ پھر ”الجلال“ کی صفت بیان ہوئی ہے جس کے معنی بڑی طاقت والا یا بڑے دباؤ والا کے ہیں۔ یعنی اللہ کی یہ صفت اس کی اس قوت کا اظہار ہے کہ وہ اپنی قوت سے جس چیز کو جس طرح چاہے نافذ کر سکتا ہے اور درست کر سکتا ہے۔ پھر ”المتکبر“ سے خطاب ہوا ہے جس کے معنی عظمت و بزرگی کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات حقیقت میں سب سے بڑی ہے اور تمام بڑائی اسی کو زیب دیتی ہے۔ وہی ہر قسم کی بڑائی کا مستحق ہے کیونکہ کائنات کی تمام چیزیں اسکا آگے تھیر دیت ہیں۔ وہی ان کا بنانے والا انہیں قائم رکھنے والا اور ان کی نگہداشت و پرورش کرنے والا ہے۔ وہ ہر شرک سے پاک ہے اس کا کوئی کسی بھی طرح نہ ادنیٰ درجے میں نہ کسی اور درجے میں کسی طرح بھی کوئی شریک نہیں ہے جو ایسا کہتے ہیں دراصل وہ خود پر ہی ظلم کرتے ہیں۔ پھر صفت الہی ”الخالق“ آئی ہے جس کے معنی ہر چیز کو پیدا کرنے والا یعنی پوری کائنات اور اس کے ایک ایک ذرے تک کی تخلیق اور اس کی پوری پوری منصوبہ بندی سے لے کر اس کی مخصوص صورت و شکل میں پیدا کرنے تک کی یہ صفت الہی ذات باری تعالیٰ کے لئے ہی مخصوص و خاص ہے۔

(جاری ہے)







READING  
Section

SLANKUUTAMIK

WWW.PAKSOCIETY.COM  
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY  
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1



PAKSOCIETY



## کیچڑ کا کنول

ڈاکٹر ایم ایے قریشی

انسان اور حیوان میں فرق صرف اتنا ہے کہ انسان اچھے اور برے کی تمیز کر سکتا ہے 'اس میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہے' یہی خوبیاں دے کر اللہ تعالیٰ نے اسے اشرف المخلوق ہونے کا درجہ دیا لیکن جب بھی انسان ان خوبیوں کو منفی انداز میں استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے تو پھر وہ آدمیت کے درجے سے بھی گر جاتا ہے 'اس میں اور حیوان میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ انسانوں کے جنگل میں پھنس جانے والی ایک ماں کی روداد' اس کا حسن اس کے لیے کانٹوں کی سیج بن گیا تھا۔ تھے افق کی روایتوں کا امین' مغربی ادب سے منتخب ایک خوب صورت ناولٹ۔



READING  
Section

SCANNED BY AMIR



جین وارڈمین اس وقت کلاس لے رہی تھی جب اسے اسکول کے پرنسپل مسٹر ڈاسن کی طرف سے بلاوا آیا۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا کہ پیریڈ جاری ہو اور مسٹر ڈاسن نے اسے اپنے آفس میں طلب کیا ہو۔ تاہم جین کو اندازہ ہو گیا کہ مسٹر ڈاسن کیوں اپنا یہ معمول توڑنے پر مجبور ہوئے ہوں گے۔

گزشتہ دنوں جین نے اپنے ایک شاگرد پیٹ مورگن کے بارے میں ایک خصوصی رپورٹ اس کے والدین کو بھجوائی تھی اسے یقین تھا کہ پیٹ کے والدین غصے میں بھرے ہوئے پرنسپل کے پاس پہنچے ہوں گے۔

جین کو اس امر کا خوب تجربہ تھا کہ تمام والدین دوسروں کے بچوں کو تو توند و ضوابط کا پابند اور خوش اطوار دیکھنا چاہتے ہیں لیکن ان کے اپنے بچوں کو ایسا بنانے کے لیے اساتذہ سخت طرز عمل اختیار کریں تو انہیں بہت برا محسوس ہوتا ہے۔ ان کے اپنے بچوں کی خامیوں کی نشاندہی کی جائے تو وہ مرنے مارنے پر تل جاتے ہیں۔ جین نے پیٹ کے بارے میں جو رپورٹ لکھی تھی وہ تو خاص طور پر بہت سخت تھی لیکن جین نے تنگ آ کر یہ قیدم اٹھایا تھا۔ پیٹ کو تعزیر اور اصلاح کی سخت ضرورت تھی۔

ہائی اسکول کے سنیر طالب علم کے طور پر پیٹ کی عمر کچھ زیادہ ہی تھی۔ انیس سال سے کچھ اور..... چنانچہ دوسرے طالب علموں کو تو وہ اپنے سامنے محض بچہ ہی سمجھتا تھا۔ ہمیشہ سرکشی پر آمادہ رہتا تھا اور کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ رسماً بھی اپنی ٹیچر کا احترام یا ساتھیوں سے رواداری کا مظاہرہ نہیں کرتا تھا۔ صرف یہی نہیں جین کو یہ بھی شک تھا کہ وہ بد معاش قسم کے کچھ لڑکوں کے ٹولے کا سردار ہے جو کادونٹی میں بحرمانہ سرگرمیوں میں مصروف رہتے تھے۔

جین نے اپنی رپورٹ میں سفارش کی تھی کہ پیٹ مورگن کو عام عدالت میں پیش کیا جائے کیونکہ وہ اتنا کم عمر تو نہیں تھا کہ اسے بچوں کی عدالت میں پیش کیا جاتا۔ یہ سفارش بہت ہی سخت رویے کی نشاندہی کرتی تھی لیکن جین کے خیال میں اس کے سوا چارہ بھی نہیں رہا تھا۔ وہ پیٹ کے والدین کا سامنا کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھی۔ جین نے اپنے شاگردوں کو مصروف رکھنے کے لیے کچھ کام بتایا دو مانیٹروں کو نگرانی پر مامور کیا اور انہیں بتا دیا کہ شاید باقی پیریڈ کے دوران وہ پڑھانے کے لیے نہ آ سکے۔ جب وہ درمیانی راستے سے گزر کر دروازے کی طرف بڑھی تو اس نے محسوس کیا کہ چوبیس کے چوبیس لڑکے لڑکیوں کی آنکھیں عقب سے اسے تک رہی تھیں اور آج ان کی نظروں میں کوئی خاص بات تھی وہ سب جیسے کسی راز میں شریک تھے۔ ایسا راز جس کا تعلق جین کی ذات سے تھا۔ اس احساس سے جین نے اپنے آپ کو کچھ بے چین سا محسوس کیا۔

اسے یاد آیا کہ آج دوپہر کھانے کے وقفے میں بھی اسے کچھ ایسا ہی احساس ہوا تھا۔ کیفے ٹیریا میں وہ اپنے کھانے کی ٹرے اٹھا کر اس مخصوص میز پر چلی گئی تھی جہاں وہ ٹیچرز بیٹھی تھیں جن کے ساتھ وہ رواز نہ ہی دوپہر کا کھانا کھاتی اور گپ شپ کرتی تھی تب بھی محسوس کیا تھا کہ وہ تمام ٹیچرز پر اسرار سے انداز میں خاموش فضا میں ایک عجیب سا نامانوسیت رچی ہوئی تھی لیکن اس وقت جین نے اسے محض اپنا وہم سمجھا تھا مگر اس وقت وہ چونکے بغیر نہیں رہ سکی تھی جب ایک ٹیچر اگنس فلاٹ اپنی میز چھوڑ کر دوسری میز پر جا بیٹھی جین نے یہی سوچ کر استفسار نہیں کیا تھا کہ شاید اگنس کسی معاملے میں پریشان ہے۔

وارڈمین کو لیک دیو کے ہائی اسکول میں پڑھتے



میں مسرت اور گرمجوشی کی لہر دوڑ جاتی تھی جو اسے ایک عزم نو کے ساتھ جہد حیات جاری رکھنے کا حوصلہ دیتی تھی۔

جین جب پرنسپل کے دفتر میں پہنچی تو اس نے بیرونی حصے میں مسٹر ڈاسن کی سیکرٹری مس ولسن کو حسب معمول ٹائپ رائٹر سے کھیلتے ہوئے پایا۔ مس ولسن سے جین کی خاصی گہری دوستی تھی۔ دونوں تنہا رہنے کی عادی تھیں اور کسی مرد سے ان کی دوستی نہیں تھی۔ دونوں کے معاملے میں اس کی وجوہات مختلف تھیں۔

جین تو صرف اس لیے آج تک کسی مرد کی طرف متوجہ نہیں ہوئی تھی کہ وہ ابھی تک بل کو بھلا نہیں پائی تھی۔ وہ اس کی محبت اس کے ساتھ گزرا ہوا حسین دور وہ یادیں وہ باتیں ہی اب تک اس کا سرمایہ تھیں اور وہ انہی سے دل بہلاتی رہتی تھی۔ اسے کسی کی رفاقت کی ضرورت محسوس ہی نہیں ہوئی تھی۔

وہ بے پناہ خوبصورت تھی۔ ایک خوبصورت عورت، جو جوان ہو اور بیوہ بھی تو مردوں کو قسمت آزمائی اور شرف قبولیت کے روشن امکانات نظر آنے لگتے ہیں۔ چند ایک مردوں کے ساتھ جین نے چھوٹی موٹی تقریبات میں شرکت کی لیکن کسی کی رفاقت اور دوستی سے اس کا دل نہ بہلا۔ اسے کوئی خوشی حاصل نہ ہوئی۔ چنانچہ اس نے کسی کے ساتھ آنا جانا بالکل ہی ترک کر دیا۔

مس ولسن نے سراٹھا کر جین کی طرف دیکھا۔ جین کو یہ دیکھ کر حیرت کا شدید جھٹکا لگا کہ اس کی آنکھوں میں شناسائی کی رمت تک نہیں تھی۔ اس کا چہرہ اس حد تک سپاٹ تھا کہ پھر سے تراشا گیا نظر آرہا تھا۔

”مسٹر ڈاسن تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“ اس نے

ہوئے چند سال گزر چکے تھے۔ لیک ویو جو اس کا آبائی قصبہ نہیں تھا لیکن اس کے شوہر بل وارڈمین اور اس کے خاندان کا اس سے تعلق پرانا تھا۔ بل یہیں پیدا ہوا یہیں پلا بڑھا اور یہیں دفن ہوا۔ وہاں کے لوگ اسے محبت اور گرمجوشی سے یاد کرتے تھے۔ وہ فوجی تھا اور میدان جنگ میں کھائے ہوئے زخموں کی تاب نہ لا کر دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ کسن ٹیری کی شکل میں اس کی جیتی جگاتی نشانی جین کے پاس موجود تھی بل کے انتقال کے بعد جین نے بھی زیادہ توجہ اور محبت سے ٹیری کی پرورش شروع کر دی تھی۔ اس کے خیال میں اب اس کی ذمے داریاں دگنی ہو گئی تھیں۔ اسے اپنے بچے کے لیے ماں ہی کا نہیں باپ کا کردار بھی ادا کرنا تھا۔

بل کے انتقال کے بعد بھی جین نے لیک ویو میں ہی رہائش پذیر رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کے خیالی میں ٹیری کے لیے ایسے قصبے میں رہنا بہتر تھا جہاں لوگ محبت احترام اور انسیت سے اس کے باپ کو یاد کرتے تھے۔ یہاں اس کے ذہن میں یہ احساس پختہ ہو گیا تھا کہ اس کا باپ ایک ایسا انسان تھا جس پر فخر کیا جاسکتا تھا۔ اس طرح اس کی خود اعتمادی میں اضافہ ہو سکتا تھا۔

جین کا یہ خیال اب تک درست ہی ثابت ہوا تھا۔ لیک ویو میں ماں بیٹے کا وقت نہایت خوشگوار گزر رہا تھا۔ قصبے کے وسط میں وہ ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے جو انہیں حج ڈیلے نے معمولی سے کرائے پر دیا ہوا تھا۔ حج ڈیلے بل کا قانونی مشیر بھی رہا تھا۔ ٹیری قصبے کے گرینڈ اسکول میں پڑھ رہا تھا۔ وہ ایک مثالی بچہ تھا۔ بل اگر زندہ ہوتا تو اس کی اٹھان دیکھ کر یقیناً خوشی سے پھولا نہ سماتا۔ بل کے بارے میں سوچتے ہوئے جین کی رگ دپے



چہرے پر کہیں کہیں بڑھتی عمر کی پرچھائیاں قدم  
ہمارے ہی تھیں۔ اس نے ایک نظر جین کی طرف دیکھا  
اور فوراً ہی گویا نظر چراتے ہوئے کہا۔ ”بیٹھو جین۔“

جین نے محسوس کیا کہ وہ بے حد پریشان ہے  
اور اس کی آنکھوں میں کچھ ایسا ہی تاثر تھا جیسے حال  
ہی میں اسے کسی ایسے انکشاف سے دوچار ہونا پڑا  
جس نے اس کے حواس پر بجلی سی گرا دی ہو۔ جین نے  
بیٹھتے ہوئے حتی الامکان خوشدلی سے کہا۔ ”میرے  
خیال میں حالات اتنے بھی برے نہیں پال! پیٹ  
مورگن کے ماں باپ نے یہاں آ کر کم از کم فریجیر تو  
نہیں توڑا، ہمیں اسی پر خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ غالباً  
پیٹ ہی کے بارے میں بات کرنے کے لیے تم نے  
مجھے بلایا ہے۔“

”مسئلے کا تعلق پیٹ مورگن ہی سے ہے لیکن اس  
طرح نہیں جس طرح تم سمجھ رہی ہو۔“ پال نے  
بوجھل لہجے میں کہا۔ وہ ریوالونگ چیئر پر بیٹھ گیا اور  
کچھ اس طرح گھوم گیا کہ اسے جین کی طرف نہ دیکھنا  
پڑے۔ ایک طویل سانس لے کر وہ بولا۔ ”جین!  
میں تم سے استعفا طلب کرنا چاہتا ہوں۔“ جین  
خاموشی سے اسے تک رہی تھی۔ پال بات جاری  
رکھتے ہوئے بولا۔ ”استعفا پیش کرنے کی تم کوئی بھی  
وجہ بیان کر سکتی ہو۔ خرابی صحت..... ترک سکونت  
یا کچھ اور.....“

اب جین کو احساس ہوا کہ پال حد سے زیادہ سنجیدہ  
تھا اس کے معدے میں گرہ سی پڑنے لگی۔ پال کہہ  
ریا تھا۔ ”آج صبح بورڈ آف ایجوکیشن کی میٹنگ ہوئی  
تھی..... وہ لوگ نہیں چاہتے کہ تمہارے بارے میں  
کوئی اسکینڈل کھڑا ہو جائے۔ ان کی خواہش ہے کہ  
جس حد تک بھی ممکن ہو تم وقار سے رخصت ہو جاؤ۔“  
”پال!“ جین نے اس کی بات کاٹتے ہوئے

صرف اتنا کہا اور دوبارہ ٹائپ رائٹر کی طرف متوجہ  
ہو گئی۔ لہجے میں دوستی کی جھلک تھی نہ آشنائی کا  
شانہ۔ صرف سرد مہری اور لا تعلقی تھی۔ جین چند لمحے  
بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ اسے احساس تھا کہ  
یہاں کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور تھی۔ کوئی سنگین گڑبڑ۔  
امکان یہی نظر آتا تھا کہ پیٹ مورگن کے والدین  
پرنسپل کے کمرے میں موجود تھے اور انہوں نے آتے  
ہی یقیناً خوب ہنگامہ مچایا تھا۔ مس لسن کو تلخ کلامی  
جھگڑے اور ہنگامے سے بڑی نفرت تھی ایک لمحے  
کے توقف کے بعد جین نے قدم بڑھایا اور ڈاسن کے  
کمرے کا دروازہ کھول کر اندر جا پہنچی۔ اسے یہ دیکھ کر  
ایک بار پھر حیرت کا سامنا کرنا پڑا کہ پیٹ مورگن  
یا اس کے والدین کمرے میں موجود نہیں تھے۔

پال ڈاسن کی عمر پینتیس کے قریب تھی۔ عہدے  
کے اعتبار سے وہ جین کے لیے قابل احترام تھا لیکن  
اس احترام میں دوستی کی آمیزش تھی۔ اسکول کی  
چار دیواری سے باہر بھی جین کی اس سے ملاقاتیں  
رہی تھیں اور ابتدائی دو چار ملاقاتوں کے بعد ہی پال  
ڈاسن نے ایک سنجیدہ سی تجویز اس کے سامنے رکھ دی  
تھی۔ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا اگر جین واقعی  
شادی کی خواہش مند ہوتی تو پال اس کی نظر میں  
معقول ترین شوہر اور ٹیری کے لیے مشفق ترین  
باپ ہوتا لیکن وہ شادی کے لیے ذہنی طور پر تیار ہی  
نہیں تھی اس لیے انکار کے سوا چارہ نہیں تھا۔ پال  
نے اس کے انکار کو وقار اور متانت سے قبول کیا تھا  
اس کے بعد بھی بطور پرنسپل اور ٹیچران کے طرز عمل یا  
دوستانہ مراسم میں کوئی فرق نہیں آیا تھا کوئی ناگواری  
پیدا نہیں ہوئی تھی۔

پال ڈاسن اس وقت کھڑکی کے قریب کھڑا تھا  
’جین کی آہٹ پا کر وہ مڑا۔ وہ دراز قد اور وجیہ تھا۔



کہا۔ ”تم نے خود ہی تو پیٹ مورگن کے بارے میں رپورٹ طلب کی تھی۔ میں نے انتہائی دیانت داری سے تمہیں رپورٹ تیار کر دی۔ وہ رپورٹ بورڈ کے سامنے پیش کرنے کے لیے تو نہیں تھی۔“

”جین۔“ وہ تیزی سے بولا اور صرف ایک لمحے کے لیے اس کی طرف مڑا۔ ”کیا تم مجھے یہ بتانے کی کوشش کر رہی ہو کہ تمہیں کچھ معلوم نہیں کہ میں کیوں تم سے استغاثہ طلب کر رہا ہوں؟“

”ہاں مجھے واقعی نہیں معلوم۔“ جین نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اور میں چاہتی ہوں کہ تم بھی گھما پھرا کر بات کرنے کی بجائے سیدھی طرح مجھے بتا دو کہ معاملہ کیا ہے؟“

”تفصیل میں جانا میرے لیے سخت اذیت کا باعث ہوگا۔ خصوصاً تمہارے سامنے۔“ پال نے مجروح سے لہجے میں کہا۔ ”لیکن اگر تم اصرار کر رہی ہو تو.....“

”میں اصرار کر رہی ہوں۔“ جین بات کاٹ کر بولی۔

پال نے کرسی گھمائی اس کا چہرہ سا ہوا تھا۔ ”ٹھیک ہے اس نے سخت لہجے میں کہا۔“ اس قصے کا پہلا باب تو یہ ہے۔“ اس نے میز سے ایک ٹائپ شدہ کاغذ اٹھا کر جین کی طرف بڑھایا۔

جین نے پہلے تو تیزی سے پڑھنا شروع کیا لیکن پھر جیسے الفاظ اس کی آنکھوں میں چبھنے لگے اور دل وہشت سے ڈوبنے لگا۔ وہ دراصل بیخ ڈیلے جو بورڈ آف ایجوکیشن کے چیئرمین بھی ہیں کے نام ایک خط تھا۔ چند سطریں پڑھنے کے بعد جین نے لکھنے والے کا نام دیکھنے کے لیے نیچے نظر ڈالی۔ خط کے آخر میں کوئی نام یاد ستخط نہیں تھے۔ خط بھی اصل نہیں تھا اصل کی ڈپلیکیٹ کاپی تھی۔ ”گمنام خط“ جین

بڑبڑائی خط کے مندرجات ناقابل یقین تھے۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ جین نے پیٹ مورگن کے خلاف رپورٹ اس لیے تیار کی تھی کہ وہ اس سے مراسم استوار کرنے پر تیار نہیں ہوا تھا۔ اس نے پیٹ کو اپنی خواہشوں کے جال میں پھانسنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ ایک تو اس لیے اس کے دام میں نہیں آیا تھا کہ وہ عمر میں اس سے بہت بڑی تھی دوسرے اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ معلمی جیسے مقدس پیشے سے وابستہ کوئی ہستی اپنے کسی شاگرد کو غیر اخلاقی مقاصد کی بھینٹ بھی چڑھا سکتی ہے۔

خط کے مطابق اپنی ناکام اور ابانت کے احساس کے لیے اور اپنے جذبہ انتقام کی تسکین کے لیے جین نے اس کے خلاف رپورٹ تیار کی تھی۔ صرف یہی نہیں خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ صرف پیٹ مورگن ہی اس کا مطلوب نہیں رہا تھا کئی تھے جن کی طرف اس کے جذبہ طلب نے قدم بڑھائے تھے۔ بورڈ آف ایجوکیشن سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ فوری طور پر اس نیچر کے خلاف کارروائی کرے جس کا کردار اس حد تک پست ہے۔

جین کا اس خط پر ہنسنے کو دل چاہ رہا تھا مگر وہ ہنس نہیں رہی تھی ہنسا تو درکنار وہ کچھ بول نہیں پارہی تھی۔ حلق میں جیسے کچھ پھنس کر رہ گیا تھا۔ اس احساس سے اس کا جسم سن ہوا جا رہا تھا۔ خط کے مندرجات سے اس کے اپنے سوا باقی تقریباً پورا اسٹاف ہی واقف ہو چکا تھا۔ صبح سے اب تک لوگوں کا رویہ اس بات کا گواہ تھا۔ یقیناً اس کی ساتھی ٹیچرز اور بعض شاگردوں کو بھی بورڈ آف ایجوکیشن کے اجلاس میں طلب کیا گیا ہوگا اور ان سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہوگی۔

”اس کے علاوہ بھی کچھ خطوط ہیں۔“ پال ڈاسن



نے کہا۔ ”ان میں کچھ لوگوں کے نام ہیں اور ان کے حوالے سے وقت اور تاریخوں کے ساتھ کچھ واقعات کا ذکر ہے۔“

”تم..... تم نے ان باتوں پر یقین کر لیا پال؟“ جین نے رندھی ہوئی سی آواز میں پوچھا۔

”نہیں۔“ وہ کرسی گھماتے ہوئے تقریباً چلا اٹھا۔ ”میں ایک ہفتے سے ان الزامات کے خلاف لڑ رہا تھا جین..... لیکن.....“

”لیکن بورڈ نے تمہارے دلائل مسترد کر دیے ہوں گے۔“ جین نے بات مکمل کی۔ ”لیکن پال اس سارے معاملے سے مجھے کیوں بے خبر رکھا گیا؟ مجھے بلا کر اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے کیوں نہیں کہا گیا؟ یہ تو گویا گھر کی عدالت ہو گئی کہ گناہ لوگوں کے الزامات مزم کو بتائے اور بلائے بغیر فیصلہ دے دیا گیا۔“

”تمہارے مفاد کے لیے ایسا کیا گیا تھا۔“ پال بولا۔ ”کیا تم چاہتی ہو کہ بات بالکل عام ہو جائے؟“ ”بات اور کس حد تک عام ہوگی پال؟ مجھے تو اب احساس ہوا ہے کہ اسکول میں تقریباً سب ہی کو علم ہے۔“ جین نے دکھ سے کہا۔

”افواہوں اور پینہ پیچھے ہونے والی باتوں کو نہیں روکا جاسکتا۔“ پال نے کہا۔ ”تاہم اگر تم صورت حال کو اس کی تمام تر ناگواری کے باوجود قبول کر لیتی ہو اور اپنی مرضی سے استعفا دے دیتی ہو تو معاملہ یہیں دب جائے گا۔ کاؤنٹی کے اخبارات یا عدالت تک بات نہیں پہنچے گی لیکن اگر تم باقاعدہ تفتیش اور عدالتی سماعت پر اصرار کرتی ہو تو جتنی باتیں بنیں گی وہ نہ تو بھلائی جائیں گی اور نہ ان کے بعد تم قصبے میں رہ سکو گی خواہ تم اپنی بے گناہی ثابت بھی کر دو۔“

”کیا باقاعدہ سماعت کے دوران جناب گناہ

آ کر میرے خلاف گواہی دیں گے؟“ جین نے ح لہجے میں پوچھا۔

”پیٹ مورگن گواہی دے گا۔“ پال بولا۔ ”بورڈ کے سامنے تو وہ گواہی دے ہی چکا ہے۔“

”وہ جھوٹا مکار..... غلیظ چوہا۔“ جین کی آواز شدت جذبات سے کانپ گئی پھر اس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”اور وہ دیگر معززین جن کے نام لیے گئے ہیں؟“

”بورڈ نے ان میں سے کسی کو طلب نہیں کیا۔“ پال بولا۔ ”اگر ہم ہر ایک کو بلانا شروع کر دیں گے تو اس قصبے کی تاریخ کا سب سے زیادہ ہنگامہ خیز اسکینڈل اٹھ کھڑا ہوگا۔ بورڈ کو تو قلعہ ہے کہ؟“

”لعنت ہے اس بورڈ پر۔“ جین نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”مجھے اپنا موقف پیش کرنے کا حق ہے۔ مجھے یہ بھی حق حاصل ہے کہ میں اپنے اوپر الزام لگانے والوں کا سامنا کروں۔ بشرطیکہ ان کا واقعی کوئی وجود ہو۔“ پھر اس کے لہجے میں تلخ تجسس درآ یا۔ ”اور کیا میری ساتھی ٹیچرز نے بھی نو جوان پیٹ مورگن کے الزام کی تائید کی تھی؟“

پال نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ”ان کا کہنا ہے کہ تمہارے کردار پر شبہ کرنے کا وہ دل میں خیال بھی نہیں لاسکتیں لیکن.....“ اس کا لہجہ طنزیہ سا ہو گیا اور اس نے گویا دوسروں کے الفاظ دہرائے۔ ”حالات حقائق اور الزامات کی روشنی میں امکانات پر غور کیا جاسکتا ہے۔“ اس نے بے بسی سے ہاتھ پھیلائے اور بات ادھوری رہنے دی۔

جین ایک لمحے کے لیے خاموش رہی پھر مضبوط لہجے میں بولی۔ ”میں ان الزامات کا مقابلہ کروں گی۔ تم مجھے ملازمت سے برخاست نہیں کر سکتے۔ معاملے کی باقاعدہ سماعت کے بغیر ٹیچرز یونین بھی



مرتبہ تمہارے ساتھ میر کو جانا۔۔۔ یا ایک مرتبہ غلطی سے میرا جارج ہمفرے سے لفٹ لے لیتا اور اس کا راستے میں دست درازی پر اتر آتا۔۔۔ شہادتوں سے یہی مراد ہے نا تمہاری؟“

”ہاں۔“ پال نے ناخوشی سے کہا۔ ”عدالتوں میں چھوٹی سے چھوٹی شہادت بھی زیر بحث آتی ہے۔ جج ڈیلے تمہارے آنجہانی شوہر کا وکیل رہا ہے۔ اس کی زمین اور جائیداد وغیرہ کے معاملات وہی طے کرتا تھا لیکن وہ بورڈ آف ایجوکیشن کا چیئرمین بھی ہے۔ بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ تمہارا ہمدرد اور بھی خواہ ہے۔ جا کر اس سے مشورہ کرو۔“

جین کو اچھی طرح یاد تھا۔ بل نے بھی اسپتال میں بستر مرگ پر یہی کہا تھا۔ ”جین جج ڈیلے ہمارا سچا ہمدرد اور بھی خواہ ہے میرے بعد زندگی میں تم اس کی ذات پر اعتماد کر سکتی ہو۔“

پال بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”اس کے بعد بھی اگر تم مقابلہ کرنے کا فیصلہ کرتی ہو تو۔۔۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”بہر حال میں تمہارا ساتھ دوں گا خواہ اس کے لئے مجھے اپنی ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑیں۔“

”تم نے یہ کہنے کی ہمت تو کی۔“ جین اٹھتے ہوئے بولی۔ ”میرے لیے یہی کافی ہے۔ اب غالباً تم یہ تو نہیں چاہو گے کہ میں کلاس کو مزید پڑھاؤں؟ میں تو اب چھوت کی مریضہ ہو چکی ہوں نا۔۔۔ کہیں بچوں پر میرا سایہ نہ پڑ جائے۔“

”جین پلیز۔“ پال نے بے چارگی سے کہا۔ جین تیزی سے مڑی اور دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ مس دسین پھٹی پھٹی سی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”میں اسٹور کیپر سے کہتی ہوں کہ جراثیم کش دوا

اس کی اجازت نہیں دے گی۔“ پال کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔ ”تمہیں میری کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے۔“

میری کے تصور نے جین کو گویا ہلا کر رکھ دیا۔ اس نے چشم تصور سے میری کو گریڈ اسکول میں اپنے کلاس روم میں بیٹھے دیکھا۔ شاید بات اس کے کلاس فیلوز تک بھی پہنچ چکی ہو جین نے سوچا۔

پال کہہ رہا تھا۔ ”اگر تم استعفا دے دیتی ہو تو تم اور میری کسی بھی ایسی جگہ جا کر سکونت پذیر ہو سکتے ہو جہاں افواہیں تمہارا تعاقب نہیں کریں گی۔ اس کے برعکس اگر تم مقابلہ کرنے کا فیصلہ کرتی ہو تو اخبارات صفحہ اول پر تمہاری بڑی بڑی تصویروں کے ساتھ اس معاملے کو اچھالیں گے۔ اخبارات کو خوبصورت عورتوں کے چھوٹے چھوٹے اسکیٹنڈل سے بھی بڑی دلچسپی ہوتی ہے۔ اگر تم جیت بھی گئیں اور تم نے اپنی بے گناہی ثابت بھی کر دی تب بھی اس وقت تک تم پر اتنی کیچڑ اچھالی جا چکی ہوگی کہ کم از کم اس قصبے کے ماحول میں تمہارا رہنا دشوار ہوگا۔“

”محض ایک بے نام خط کی بدولت۔۔۔“ جین نے جملہ اٹھوڑا چھوڑ کر قہقہہ لگانا چاہا مگر قہقہے کی بجائے اس کے حلق سے ایک سسکی سی برآمد ہوئی۔ یہ بے بسی کی انتہا تھی۔

پال اٹھ کھڑا ہوا۔ ”اگر بچے کا مسئلہ نہ ہوتا تو میں بھی یہی مشورہ دیتا کہ مقابلہ کرو لیکن۔۔۔ کیا عمر ہے اس کی؟ غالباً گیارہ سال۔۔۔ کیا اثرات مرتب ہوں گے اس کے ذہن پر؟ جب وہ چھوٹی موٹی شہادتوں کی تفصیل سنے گا۔“

”تمہارا اشارہ میرے گھناؤنے ماضی میں مدفون لرزہ خیز واقعات کی طرف ہے؟ مثلاً میرا چند ایک



کی دو بوتلیں یہاں بھیج دے۔“ جین نے اس کی میز کے قریب رک کر تلخ لہجے میں کہا۔ میری بدکرداری کے جراثیم یہاں پھیل گئے ہوں گے نا..... کہیں تمہیں متاثر نہ کرنے لگیں۔“

مس ولسن کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ جین تیزی سے دفتر سے نکل آئی۔



جج ڈیلے ان لوگوں میں سے تھا جو لیک ویو میں ہی پیدا ہوئے تھے اور یہیں ان کا بچپن اور جوانی گزری۔ وہ ہر اس شخص کو اچھی طرح جانتا تھا جو اس کے باپ کے زمانے سے لے کر اب تک لیک ویو میں رہ چکا تھا۔ اس کا باپ بھی جج ہی تھا اور ڈیلے جج معنوں میں باپ کا جانشین ثابت ہوا تھا۔ وہ پچاس کے پینے میں تھا اور اس کی گہری نیلی آنکھوں سے بلا کی چالاکی چھلکتی تھی۔ جین سے اس کا رویہ مشفقانہ رہا تھا تاہم جین اس شخص کو کچھ زیادہ پسند نہیں کرتی تھی لیکن آج مجبوراً وہ اس کے پاس چلی آئی تھی۔

”مجھے معلوم ہے مسٹر ڈیلے۔“ جین نے گفتگو کے دوران کہا۔ ”کہ بورڈ کے چیئرمین کی حیثیت سے تمہیں اپنی ذمہ داریاں پوری کرنی ہیں لیکن تم میرے آنجمنائی شوہر کے قانونی مشیر رہے ہو اور اب بھی اس کی زمین وغیرہ کے منتظم ہو چنانچہ میری طرف سے بھی تم پر کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔“

”ہم اس مسئلے پر بالترتیب بات کرتے ہیں جین۔“ ڈیلے نے رومال سے اپنا پھولا پھولا چہرہ صاف کرتے ہوئے کہا اور کرسی کی پشت گاہ سے ٹیک لگالی۔ ”بورڈ آف ایجوکیشن کسی عدالت کا سا طریقہ کار اختیار نہیں کر سکتا۔ ہمیں محض شک و شبہ کی بنیاد پر بھی احتیاطی تدابیر اختیار کرنی پڑتی ہیں کیونکہ ہمیں

سیکڑوں بچوں کی حفاظت کرنی ہوتی ہے۔“ ”کیا انہیں مجھ سے خطرہ لاحق ہے؟“ جین نے رو دینے کے سے انداز میں پوچھا۔

”بورڈ کو جو فیصلہ کرنا ہے کر چکا ہے۔“ جج ڈیلے نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”اب اگر تم اس معاملے کو خاموشی سے دبانے میں تعاون نہیں کرتیں تو بورڈ مجبوراً اپنی شہادتیں اور دلائل پیش کرے گا۔ ضروری نہیں کہ تم قصور وار قرار پاؤ لیکن معاشرے میں کہنا جاتا ہے کہ جہاں دھواں اٹھے گا وہاں آگ ضرور لگی ہوگی۔ پس منظر کے ساتھ بورڈ کسی ٹیچر کو تدریس جاری رکھنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔“

”اب تم میرے وکیل کی حیثیت سے بات کرو مسٹر ڈیلے۔“ جین نے گہری سانس لے کر کہا۔ جج ڈیلے چند لمحے اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”تم پر جو الزام لگایا گیا ہے کیا وہ درست ہے جین؟“

”مجھے سخت افسوس ہے کہ تم نے مجھ سے یہ سوال کیا۔“ جین نے برہمی سے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کل سے کام لو جین۔“ ڈیلے نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ”یہ سوال میں بطور وکیل اپنے ہر کلائنٹ سے کرتا ہوں۔ اب تم مجھے مزید واضح الفاظ میں بات کرنے پر معاف کر دینا۔ کیا تم نے کبھی اس لڑکے پیٹ مورگن پر التفات کا مظاہرہ کیا تھا؟“

”اس خبیث..... بد معاش پر.....؟“ وہ گھٹی گھٹی سی آواز میں بولی پھر اس کے صبر کا پیمانہ چھلک پڑا اور وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

جج خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ جب اس کے دل کا غبار نکل چکا اور وہ کچھ پرسکون ہو چکی تو جج نے سمجھانے کے سے انداز میں کہنا شروع کیا۔



بولی۔ ”کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے میں ساری صورت حال ٹیری کے سامنے رکھوں گی۔“

”گیارہ سال کے بچے کے سامنے؟“ جج کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

”بعض بچوں کو وقت سے پہلے جوان ہونا پڑتا ہے۔“ جین نے بوجھل لہجے میں کہا۔ ”ویسے بھی یہ صرف میری نہیں اس کی زندگی کا بھی مسئلہ ہے۔ لوگوں نے تو ابھی سے میری طرف عجیب عجیب نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا ہے۔ ممکن ہے بات ٹیری تک پہنچ بھی چکی ہو۔ اگر میں اسے اعتماد میں نہیں لوں گی تو جانے کیا سوچے۔ میں اسے بھی فیصلہ کرنے کا حق دینا چاہتی ہوں۔ مجھے اس کے محسوسات کو بھی مد نظر رکھنا ہوگا۔“

وہ اپنی چھوٹی سی کار میں بیٹھ کر جج ڈیلے کے دفتر سے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔ اس کا مکان ایلم اسٹریٹ میں واقع تھا اور اس کی طرف لوٹ کر آنا اسے ہمیشہ ایک خوشگوار عمل محسوس ہوا تھا۔ یہ اس کی اپنی گلی تھی۔ یہاں کی فضا میں ہمیشہ اسے گرمجوشی رہتی ہوئی محسوس ہوتی تھی لیکن شاید یہ اس کے تصور کا شاخسانہ تھا کہ آج وہ خود کو اپنی گلی میں اجنبی محسوس کر رہی تھی۔ ہر گھر کے دروازے گویا اس پر بند ہو چکے تھے اور ہر شخص نے جیسے اس سے منہ موڑ لیا تھا۔

مکان کے سامنے گاڑی روکتے ہی ٹیری اسے پورچ کی سب سے اوپر والی سیڑھی پر بیٹھا نظر آیا۔ وہ چند لمحے گاڑی میں ہی بیٹھی اپنی توانائی مجتمع کرنے کی کوشش کرتی رہی اور ٹیری کو دیکھتی رہی۔ پورچ کی سیڑھی پر سر جھکائے بیٹھا وہ کچھ زیادہ ہی تنہا تنہا اور ناتواں نظر آ رہا تھا۔ اس کا وجود بے حد چھوٹا محسوس ہو رہا تھا۔ آخر وہ بچہ ہی تو تھا۔ تاہم اپنے طرز عمل سے وہ

”فطری تقاضے ہر انسان کی ذات کا ایک حصہ ہیں لیکن بہت سے لوگ ان معاملات میں کج رویہ ہوتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ سوچتے ہیں کہ تم جوان ہو، یہ وہ ہوا لازماً فطرت کے تقاضے تمہیں بھی پریشان کرتے ہوں گے اس لیے..... تمہارے دل کا دروازہ ہر ایک کے لئے کھلا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر تم اپنی تمام تر معصومیت اور سادہ دلی کے ساتھ کسی کی طرف مسکرا کر بھی دیکھ لو تو وہ اسے ایک دعوت سمجھ سکتا ہے کہ تم کچھ زیادہ ہی قریب آ رہی ہو۔ وہ اسے ایک دعوت تصور کر سکتا ہے اور اگر تم مردوں کے ساتھ رکھائی اور سرد مہری کا رویہ اپنائے رکھو تب بھی وہ یہی سمجھیں گے کہ تم بن رہی ہو اور درحقیقت تمہارے دل میں طلب کرو میں لے رہی ہے۔ ایک حسین بیوہ ہونے اور کسی مرد کی دوست نہ ہونے کی صورت میں عورت کو بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مانا کہ آخر کار تم اپنی بے گناہی ثابت کر دو گی لیکن اس وقت تک کسی کو بھی تمہاری نیک چلتی کا سو فیصد یقین نہیں رہے گا۔ شک کی پرچھائیاں ہر ذہن میں رہتی رہیں گی، تم مقدمہ تو جیت سکتی ہو لیکن باعزت طور پر یہاں رہنے کی جنگ نہیں جیت سکتیں۔ میرا مطلب سمجھ رہی ہو؟“

جین اچھی طرح سمجھ رہی تھی جج ڈیلے کا مفہوم بھی کم و بیش یہی تھا جو پال ڈاسن کا تھا۔ جج نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”سب سے بڑا مسئلہ ٹیری کا ہے۔ ہمارے قصبے میں شکی مزاج اور تنگ ذہن عورتوں کی کمی نہیں جو اپنے بچوں کو ٹیری کے ساتھ کھیلنے سے منع کریں گی۔ بچے ٹیری پر فقرے کسا کریں گے۔ اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرنے کی تمہیں بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑے گی۔“

چند لمحے خاموشی کے بعد جین فیصلہ کن لہجے میں



نا سمجھ بچہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ خوش مزاج اور ہنس مکھ ضرور تھا لیکن بیشتر معاملات میں اس پر اپنی عمر سے کہیں زیادہ متانت طاری رہتی تھی۔ وہ جو کچھ بھی تھا بہر حال وہی جین کا سب کچھ تھا۔ جین اندر پہنچی تو وہ اسے دیکھ کر سیڑھیوں سے اتر آیا اور اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار دیکھ کر جین کا دل ڈوبنے لگا۔ کیا وہ سب کچھ سن چکا ہے؟

جین نے اسے پیار کیا تو وہ بولا۔ ”اچھا ہوا آپ آ گئیں مئی! میں سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کرنا چاہیے؟“ ”کس سلسلے میں؟“ جین نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

”عجیب سی بات ہے۔“ میری نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ”میں جب گھر پہنچی تو یہ کاغذ مجھے کیل سے دروازے پر لگا ہوا نظر آیا۔ آپ کو دکھاتے ہوئے مجھے شرم آ رہی ہے۔“ اس نے ہنسنے کی جیکٹ کی جیب سے ایک مزارا کاغذ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

جین نے کاغذ پر ایک نظر ڈالی اس پر ایک عورت کا نقش خاکہ تھا اور نیچے جلی حروف میں لکھا تھا ’طوائف‘

کراہیت سے جین کو اب کافی سی آگئی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ میری لفظ طوائف کا مطلب سمجھتا ہے یا نہیں لیکن میری کا پریشان چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ بہت کچھ سمجھتا ہے۔ جین نے اذیت کے عالم میں آنکھیں بند کر لیں۔ گرد و پیش کا منظر اس کی نظر میں دھندلانے لگا تھا۔



رات کے کھانے کے لیے وہ میری کو لیک ویو سے باہر لے گئی۔ اپنا مکان اسے شیشے کا مرتبان محسوس ہونے لگا تھا جس میں وہ اور میری رنگین پھیلیوں کی

طرح تیر رہے تھے اور پورا قصبہ گویا ارد گرد لہڑا اٹھیں تک رہا تھا۔ وہ ایک قریبی قصبے کے ریسٹوران میں آچکے تھے۔ میری نے محسوس کر لیا تھا کہ کوئی بات ضرور ہے اور اس کی مئی پریشان ہیں لیکن اس نے کریدنے کی کوشش نہیں کی۔ ریسٹوران کے پرانی طرز کے ہال میں بہت کم گاہک تھے۔ کھانے کے دوران بالا خیر بولی اٹھا۔ ”مئی! بہتر ہوگا آپ مجھے بتادیں کہ آخر آپ کیوں پریشان ہیں؟ آپ کی پریشانی کی وجہ صرف وہ خاکہ نہیں کچھ اور بھی ہے۔“ تب جین نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ وہ خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا اور جب جین خاموش ہوئی تو بولا۔ ”ہم مقابلہ کریں گے مئی! ان گندے لوگوں کو اپنے الزامات واپس لینے پڑیں گے اور اس ساری شرارت کے نتیجے میں پیٹ مورگن کو جیل جانا ہوگا۔“

تب جین نے اسے وہ سب کچھ سمجھایا جو پال ڈائن اور جج ڈیلے اسے سمجھانے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ اس کے جواب میں میری نے اپنی عمر سے کہیں بڑھاری اور سمجھداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے جو بات کہی اسے سن کر جین فخر و مسرت سے سرشار ہو گئی۔

میری بولا۔ ”مئی! اگر ہم راہ فرار اختیار کریں گے تو ہم خود بھی اپنے آپ کو پور چور سا محسوس کریں گے۔ اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرنے کے بعد بے شک ہم یہاں سے چلے جائیں تب ہمارے ضمیر پر کوئی بوجھ تو نہیں ہوگا۔۔۔۔۔ میں ہر حال میں الزام تراشی کرنے والوں کا مقابلہ کرنا چاہوں گا۔ انہیں اپنی بد معاشی کی سزا ملنی چاہیے۔ بجائے اس کے کہ ہم اپنی بے گناہی کے باوجود چوروں کی طرح منہ چھپا کر فرار ہو جائیں۔“

”خدا تمہیں خوش رکھے میری ڈارلنگ۔“ جین



”میری نے سیٹ پر پہلو بدل کر پیچھے دیکھتے ہوئے کہا۔“ اس نے بھی رفتار کم کر دی ہے مئی۔“  
جین کے اعصاب منتشر سے ہونے لگے۔ اس قصبے اور لیک ویو کے درمیان خال خال ہی آبادی تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ جیسے ہی اسے کسی گھر میں روشنی نظر آئے گی وہ گاڑی روک لے گی اور پولیس کی مدد طلب کر لے گی۔

”مئی۔“ دفعتاً میری نے قدرے خوفزدہ لہجے میں کہا۔ ”سڑک کے کنارے ایک اور موٹر سائیکل نکل آئی ہے اور..... اور اب اور..... وہ تین ہو گئے ہیں۔“ جین نے ایکسیلیٹر پر دباؤ بڑھا دیا اور کار ایک جھٹکے سے مزید تیز رفتاری سے دوڑنے لگی۔ چند لمحوں بعد اس نے عمیق آئینے پر نظر ڈالی۔ اس کے تعاقب میں اب چار ہیڈ لائٹس متحرک نظر آ رہی تھیں اور پھر اس کے دیکھتے ہی دیکھتے ان میں پانچویں بھی شامل ہو گئی۔

”یہ چاہتے کیا ہیں مئی؟“ میری نے جاننا چاہا۔ جین نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔  
”معلوم نہیں۔“ وہ مرتعش لہجے میں بولی۔

اس وقت کار کی رفتار ساٹھ کے قریب تھی جب میری پیچھے دیکھتے ہوئے تقریباً چلا اٹھا۔ ”ان میں سے ایک ہم سے آگے نکلنے کے لیے آ رہا ہے مئی۔“ جین نے موٹر سائیکل کا شور قریب آتے ہوئے محسوس کر لیا تھا۔ پھر ایک موٹر سائیکل سوار کھڑکی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے گزرنے لگا۔ اس کا چہرہ ہیلمٹ اور چشمے میں چھپا ہوا تھا مگر ہونٹ نظر آ رہے تھے اور ان ہونٹوں پر نہایت نفرت انگیز مسکراہٹ تھی۔

”طوائف۔“ وہ پوری قوت سے چلایا اور کار سے آگے نکلتا چلا گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے دوسرا موٹر

نے گلوگیر آواز میں کہا۔ اس کی آنکھیں بھرا آئی تھیں اور اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہیں میری کو سینے سے لگا لے مگر اسے معلوم تھا کہ میری اس کی اس حرکت سے شرمندہ سا ہو جائے گا۔ ”اب میرا دل ہلکا ہو گیا ہے میری۔“ وہ بولی۔ ”آج ہم سکون سے سوئیں گے اور صبح اس مسئلے پر مزید بات کریں گے۔“  
”ٹھیک ہے۔“ میری بولا۔ ”آپ بہر حال جو بھی فیصلہ کریں وہ مجھے منظور ہوگا۔“

کھانے کے بعد جب باہر آ کر جین نے پارکنگ لاٹ سے اپنی چھوٹی سی کار نکالی اور وہ واپس روانہ ہونے لگے تو جین نے سڑک کے پار ایک شخص کو دیکھا۔ وہ موٹر سائیکل پر تھا اور اس نے ان کی گاڑی کے ساتھ ہی اپنی موٹر سائیکل اشارت کی تھی۔ وہ چمڑے کی سیاہ جیکٹ پہنے ہوئے تھا۔ سر پر سیاہ ہی ہیلمٹ تھا اور آنکھوں پر ٹین شیشوں کی عینک۔ اس حلیے میں اس کی صورت دیکھنا یا اسے پہچانا ممکن نہیں تھا۔ ویسے بھی پارکنگ لاٹ کی سڑک پر روشنی بہت کم تھی۔ تاہم جین کی چھٹی حس اسے احساس دلارہی تھی کہ وہ پیٹ مورگن تھا۔

پیٹ اور اس کے ٹولے کے پاس موٹر سائیکلیں تھیں۔ بہر حال جین نے میری کی توجہ اس طرف مبذول نہیں کرائی اور خاموشی سے ڈرائیو کرنے لگی لیکن عقب نما آئینے میں ایک ہیڈ لائٹ کو حرکت کرتے دیکھ کر اس کے جسم میں سردی لہر دوڑ گئی۔ موٹر سائیکل اس کے تعاقب میں چل پڑی۔ تب اسے یہ بات میری کو بتانا پڑی۔

”میں نے بھی اسے پارکنگ لاٹ سے نکلنے ہی دیکھ لیا تھا۔“ میری نے کہا۔

”میں کار کی رفتار کم کرتی ہوں تاکہ وہ آگے نکل جائے۔“ جین نے کہا۔



لڑھک گئی تھی۔ اس نے جبلی طور پر ٹیری کو تھامنے سے بچانے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اس کے ذہن میں ٹیری کے تصور کے سوا کچھ نہیں رہ گیا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے اس تصور پر بھی تاریکی غالب آ گئی۔ اسے کچھ ہوش نہ رہا۔



پہلی آواز اسے ٹیری ہی کی سنائی دی وہ پکار رہا تھا۔ ”ممی! ہوش میں آئیے۔“

جین کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ اسے احساس ہوا کہ وہ کسی نرم اور آرام دہ چیز پر لیٹی ہوئی تھی اور اس کے منہ میں برانڈی کا ذائقہ باقی تھا۔ اس نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں۔ اس کے چاروں طرف ایسی روشنی پھیلی ہوئی تھی جو آنکھوں کو بھلی لگ رہی تھی پھر اسے ٹیری اسے اوپر جھکا ہوا نظر آیا۔ جین مسکرا دی۔ اور ٹیری نے سکون کی سانس لی۔ ”آپ نے تو مجھے دہشت زدہ ہی کر دیا تھا ممی۔“ وہ شکوہ آمیز لہجے میں بولا پھر اس نے گردن گھما کر گویا کسی کو اطلاع دی۔ ”ممی کو ہوش آ گیا ہے مسٹر بیومونٹ۔“

جین نے گردن پیش کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ وہ ایک طویل و عریض رہائشی کمرہ تھا کھڑکیوں پر بھاری بھاری عثمانی پردے بڑے ہوئے تھے۔ ایک طرف بڑا سا آئینہ وان نظر آ رہا تھا۔ دیواروں پر پکاسو کی پینٹنگز آویزاں تھیں جو اصل تو نہیں تھیں لیکن نقل بہ مطابق اصل ضرور تھیں۔ جین ایک آرام دہ کاؤچ پر لیٹی ہوئی تھی۔ ”آپ کچھ اور برانڈی پینا پسند کریں گی مسز وارڈمین۔“ جین نے یہ آواز سن کر گردن قدرے ترچھی کر کے دیکھا۔ اس کے سر ہانے ایک شخص کھڑا تھا۔ اس کے چہرے کا صرف ایک ہی رخ جین کو نظر آ رہا تھا اور وہ ایسا ہی تھا جیسے کسی یونانی سکے پر ابھری ہوئی حسن و محبت کے دیوتا

سائیکل سوار آیا۔ اس نے بھی اسی انداز میں یہ لفظ دہرایا پھر تیسرا اور پھر چوتھا موٹر سائیکل سوار بھی اسی طرح جین کی سماعت پر انگارے برساتا ہوا گزر گیا۔

جین سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی۔ چاروں موٹر سائیکلوں کی عقبی بتیاں اگلے موٹر پر نظروں سے اوجھل ہو چکی تھیں۔ پانچویں موٹر سائیکل اب بھی اس کے تعاقب میں تھی۔ اگلا موٹر عبور کر کے جین کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ چاروں موٹر سائیکلوں کی عقبی بتیاں غالب ہو چکی تھیں۔

”وہ لوگ جا چکے ہیں ممی۔“ ٹیری نے کہا لیکن چند لمحے بعد ماں بیٹے کو احساس ہوا کہ محض ان کی خوش فہمی تھی۔ وہ چاروں اپنی موٹر سائیکلیں سڑک سے اتار کر انجن بند کر کے کھڑے ہو گئے تھے اور جیسے ہی جین کی کار آگے نکلی وہ ایک بار پھر اس کے تعاقب میں چل پڑے تھے۔ عقب نما آئینے میں جین کو اب پھر پانچ ہیڈ لائٹس نظر آ رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد دوبارہ وہی عمل شروع ہو گیا۔ ایک ایک کر کے موٹر سائیکل سوار اس کی کار کو تقریباً چھوتے ہوئے اور اس کے کان کے عین قریب گلا پھاڑ پھاڑ کر وہی مکروہ لفظ بار بار دہراتے ہوئے گزرنے لگے۔

جین کے ہاتھ سچ کی سی کیفیت میں اسٹیرنگ ویل پر جمے ہوئے تھے لیکن ان آوازوں سے گویا اپنے آپ کو بچانے کے لیے وہ سیٹ پر ترچھی ہوئی جا رہی تھی جیسے اس طرح اس کی سماعت پر انگارے برساتا ہو جائے گا۔

”ممی!“ دفعتاً ٹیری چلایا۔ جین کو احساس ہی نہیں ہو سکا تھا کہ غیر ارادی طور پر وہ گاڑی کو سڑک کے عین کنارے پر لے آئی تھی۔ پھر اس کے دوپیسے کچے میں اتر گئے۔ زمین کچھ زیادہ ہی نرم تھی۔ گاڑی ایک لمبے لمبے معمولی سے جنگلے کو توڑتی ہوئی نشیب میں



یہ بتا رہے تھے کہ شاید کچھ عرصے بعد سرجن ان کا چہرہ ٹھیک کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔  
 ”میں معافی چاہتی ہوں مسٹر بیومونٹ۔“ جین نے کمزور سے لہجے میں کہا۔

”معذرت کی کیا ضرورت ہے۔“ وہ کھردری سی آواز میں بولا۔

”میرا پورا چہرہ دیکھ کر تقریباً ہر شخص کی چیخ نکل جاتی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے ٹیری کی طرف دیکھا اور ایک بار پھر جین کے سامنے اس کے چہرے کا پرکشش رخ آ گیا۔ یہ وہی چہرہ تھا جس نے بیومونٹ کی کامیابی کے مختصر دور میں امریکا کی آدھی عورتوں کو اس کا دیوانہ بنادیا تھا۔ بیومونٹ ٹیری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”حادثے کے بعد آج تک میں نے یہ پہلا لڑکا دیکھا ہے جس نے میرے پورے وجود پر نظر پڑنے کے بعد نہ تو چیخ ماری اور نہ ہی جھرجھری لی۔ بلکہ اس طرح پرسکون رہا جیسے کوئی خاص بات نہیں ہے۔“

ٹیری جین کو بتانے لگا۔ ”مسٹر بیومونٹ کا مکان سڑک سے کافی ہٹ کر ہے لیکن انہوں نے ہماری کارائٹن کی آواز سن لی تھی اور یہی آپ کو اٹھا کر یہاں لائے تھے۔“

”نشیب میں آ کر تمہاری کار حیرت انگیز طور پر سیدھی ہو گئی تھی۔“ بیومونٹ اب دوستانہ لہجے میں بولا۔ ”اور یہ تقریباً ایک معجزہ ہی ہے کہ اس کا ایک شیشہ تک نہیں ٹوٹا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ تمہیں اٹھا کر یہاں لے آیا جائے۔“

جین کو اب سب کچھ یاد آ گیا تھا۔ موٹر سائیکلوں کا شور ان لڑکوں کی شیطانی مسکراہٹ اور وہ غلیظ لفظ..... بیومونٹ کی آواز اب جیسے بازگشت کی طرح سنائی دے رہی تھی۔ ”ٹیری نے مجھے وہ سب کچھ بتا دیا

کی تصویر۔ جین نے زندگی میں بہت کم ایسے وجہہ مرد دیکھے تھے۔ اس کے بال سنہرے تھے گیلے میں اس کا رخ تھا اور اس کی ٹوئڈ کی جیکٹ بے حد قیمتی نظر آ رہی تھی۔

جین کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ بولا۔ ”آپ بڑی خوش قسمت ہیں کہ حادثے میں آپ کو کئی گزند نہیں پہنچی تاہم اطمینان کے لیے میں نے ڈاکٹر کو بلا بھیجا ہے۔“ اس کے لہجے میں برطانوی تلفظ کی جھلک تھی۔ اس کا نام جین کو کچھ مانوس سا محسوس ہوا تھا۔

”میں ہوں تو یا اکل ٹھیک۔“ جین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تاہم تھوڑی سی مزید برانڈی سے شاید طبیعت مزید بہتر محسوس ہو۔“

جب وہ برانڈی کا گلاس جین کو دینے کے لیے آگے آیا تو جین کو اس کے چہرے کا دوسرا رخ نظر آیا اور اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ اس کا آدھا چہرہ گویا اس کا اپنا نہیں کسی عفریت یا بلا کا تھا جسے اس کے چہرے کے ساتھ جوڑ دیا گیا تھا۔ آدھا چہرہ اتنا خوبصورت اور آدھا چہرہ اتنا ڈراؤنا۔ اس طرف کا ہر نقش مسخ شدہ تھا۔

”اپنی چیخ مت روکو۔“ بیومونٹ نے قدرے تلخی سے کہا۔

جین کے کچھ کہنے سے پہلے ٹیری بول اٹھا۔ ”ممی! آپ کو یاد ہے جون بیومونٹ مشہور ترین فلمی ہیرو ہوا کرتے تھے۔ ہم ان کی ہر فلم بڑے شوق سے دیکھنے جایا کرتے تھے۔ ان کی کار کو حادثہ پیش آ گیا تھا جس میں ان کا آدھا چہرہ تباہ ہو کر رہ گیا تھا۔ ہم نے سن تو رکھا تھا کہ انہوں نے بیس کہیں قریب ہی مکان لے رکھا ہے۔ لیکن غائب یہ کہیں آتے جاتے نہیں۔ اس لیے ہم نے انہیں کبھی نہیں دیکھا۔“



ہے جو آج تمہارے ساتھ پیش آیا ہے۔ میں اسے ایک بہت بڑا اعزاز سمجھتا ہوں کہ اس بچے نے پہلی ملاقات میں ہی مجھے اس حد تک اعتماد کے قابل سمجھا کہ مجھ سے کوئی بات نہیں چھپائی، میرا خیال ہے تم ان بد معاشوں میں سے تو کسی کو نہیں پہچان سکتیں، جنہوں نے تمہیں گاڑی سڑک سے اتارنے پر مجبور کر دیا تھا اور حادثے کا سبب بنے تھے؟“

جین نے نفی میں سر ہلایا۔

”تو کہ تم نے میری رائے طلب نہیں کی لیکن میں یہی کہوں گا کہ میں میری سے متفق ہوں۔“

بیومونٹ بولا۔ ”تمہیں مقابلہ کرنا چاہیے۔ خواہ اس کے لیے تمہیں کوئی بھی قربانی دینی پڑے۔“ اس کا لہجہ سرد تھا۔

عین اسی لمحے شیشہ ٹوٹنے کا چھٹکا سنائی دیا۔ کھڑکی کا پردہ مرتعش ہوا پھر اس کے عقب سے ایک بڑا سا پتھر اور شیشے کی ڈھیروں کرچیاں قالین پر آ کر گریں۔ باہر ایک بار پھر کوئی چڑانے کے سے انداز میں چلایا۔ ”طوائف.....!“ اور پھر وہ اسی انداز میں اس لفظ کی تکرار کرنے لگا۔

”لائٹ آف کر دو میری۔“ بیومونٹ نے پرسکون لہجے میں کہا۔

چند لمحے بعد کمرہ تاریکی میں ڈوب گیا۔ بیومونٹ کھڑکی میں جا کھڑا ہوا تھا۔ پردہ اس نے سمیٹ دیا تھا باہر چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ اسی لیے جین کو کھڑکی میں اس کا ہیولا نظر آ رہا تھا، باہر ایک بار پھر وہی آواز کسی بدروح کی پکار کی طرح گونجی۔ بیومونٹ پلٹا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے پر گلدان نما ایک برتن اسٹینڈ پر کھڑا تھا۔ اس میں ایک..... کئی چھڑیاں کھڑی تھیں، بیومونٹ نے مونے سے دستے والی ایک چھڑی نکالی اور

دوسرے ہی لمحے وہ کمرے سے باہر جا چکا تھا۔ وہ جیسے ہی اپنے باغیچے کا گیٹ کھول کر باہر آیا ایک موٹر سائیکل بیدار ہونے کی آواز آئی اور دوسرے ہی لمحے موٹر سائیکل سڑک کی طرف جاتی دکھائی دی۔ اس پاس کوئی اور نظر نہیں آ رہا تھا۔ بیومونٹ غصے سے اندر ہی اندر ہل کھا کر رہ گیا۔ برسوں کی محرومیوں.....؟ آج شاید انڈ پڑتا لیکن موقع ہی ہاتھ سے نکل گیا۔ کجنت بد معاش بھاگ گیا۔

غصہ جانے کتنی باتوں پر بیومونٹ کے وجود میں اندر ہی اندر پیدا ہو رہا تھا۔ حادثے کے بعد اس نے شو بزنس کی دنیا میں جو کھوڑا بہت عرصہ گزرا تھا وہ بڑی اذیت کے عالم میں گزرا تھا۔ فنکار جو اس کی دوستی کا دم بھرتے نہیں ٹھکتے تھے اس کی پیٹھ پیچھے قہقہے لگاتے ہوئے کہتے تھے۔ ”اب دیکھیں گے حسینائیں کس طرح اس کے گرد منڈلاتی ہیں۔“ اور یہ باتیں بیومونٹ کے کانوں میں بھی پہنچ ہی جاتی تھیں۔

وہ اداکارائیں جو اس کی الفت میں مری جاتی تھیں، فون کر کے کہتی تھیں۔ ”معاف کرنا ڈارلنگ میں اسپتال میں تمہاری مزاج پرسی کے لیے ضرور آتی لیکن شوٹنگز سے فرصت ہی نہیں ملی۔ اس کے حادثے کے بارے میں بھی طرح طرح کے افسانے تراشے گئے تھے۔ افسانے تراشے دانوں میں اس کی دوستی کے دعویدار ہی پیش پیش رہے تھے۔ کسی نے کہا وہ اس وقت نشے میں دھت تھا۔ جب اس کی کار پہاڑی راستے پر قابو سے باہر ہوئی، کسی نے انکشاف کیا کہ وہ تو خطرناک منشیات کا عادی ہے۔ اخباروں نے خوب خوب سرخیاں جمائیں۔

بیومونٹ کو اس دنیا سے نفرت ہو گئی تھی جہاں تمام جذبے ساری خیر خواہی انسان کی کامیابی کے گرد گھومتی تھی ادھر آپ کو زوال آیا اور ادھر سب جذبے



نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”آپ مسز وارڈمین کا معائنہ کیجیے۔“

وہ اس کی کھڑکی کے قریب جا کھڑا ہوا جس کا جہازی سائز کا شیشہ ٹوٹ چکا تھا۔ ٹیری نے جھپکتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ شیشہ تو خاصا مہنگا رہا ہوگا مسز بیومونٹ؟“

”بے شک۔“ بیومونٹ نے جواب دیا۔ ”اور اگر وہ بد معاش مجھے دیکھ کر بھاگ نہ جاتا تو میں نہ صرف اس سے قیمت وصول کر کے چھوڑتا بلکہ اسے ایسا سبق بھی دیتا کہ آئندہ وہ کسی کی کھڑکی کا شیشہ توڑنے کی جرات نہ کرتا۔“

ڈاکٹر اسٹیفن نے معائنے سے فارغ ہوتے ہوئے کہا۔ ”تم خوش قسمت ہو جین کوئی خاص چوٹ نہیں آئی۔ البتہ اچھی طرح سونے کے لیے تمہیں مسکن دوا کی ضرورت ہوگی۔ صبح اگر تم جسم کے کسی حصے میں درد یا کھنچاؤ محسوس کرو تو میرے پاس چلی آنا۔“ ایک لمحے کے توقف سے اس نے پوچھا۔ ”تم ان لوگوں کو پہچانتی ہو جو حادثے کا سبب بنے تھے؟“ جین ناموش رہی۔ شاید اس تاسف کے تحت کہ ڈاکٹر جیسے جہاندیدہ شخص کو بھی یہ سوال کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔

بیومونٹ تلخ لہجے میں بولا۔ ”مسز وارڈمین کو اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ پیٹ مورٹن اور اس کا ٹولا تھا جو موٹر سائیکلوں پر ان اطراف میں ہنگامہ برپا کرتا پھرتا رہتا ہے لیکن وہ یہ بات اس لیے آپ کو نہیں بتا رہی ہیں کہ شاید آپ پھر یہی سوچنے لگیں کہ وہ پیٹ پر اس لیے الزام تراشی کر رہی ہیں کہ اس نے ان کی شیطانی خواہشات کے سامنے سر جھکانے سے انکار کر دیا تھا۔“

”مجھے نہیں معلوم کہ آپ مجھ پر کیوں برہم ہیں

ہوا ہوئے۔ صرف نفرت و حقارت رہ گئی۔ بیومونٹ کے تحت الشعور میں وہ سب آوازیں اسی طرح گونجتی تھیں جس طرح آج میدان میں یہ بد معاش چلا رہا تھا۔ ”طوائف..... طوائف.....“ بیومونٹ کو اچھی طرح جین کے کرب کا اندازہ تھا اسے معلوم تھا کہ یہ آوازیں سن کر جین پر کیا گزری ہوگی۔ وہ واپس اندر جانے کے لیے مڑنے ہی لگا تھا کہ ایک کار کی ہیڈ لائٹس اسے مکان کی طرف گھومتی نظر آئیں۔ غالباً ڈاکٹر آرہا تھا۔ اس ڈاکٹر کا فون نمبر ٹیری ہی نے بیومونٹ کو دیا تھا اور بتایا تھا کہ یہ ان کا فیملی ڈاکٹر ہے اس کا نام اسٹیفن گرانٹ تھا۔

اسٹیفن گرانٹ کی عمر ساٹھ سال کے قریب تھی۔ لیک دیو کی آدمی آبادی نے اسی کے سامنے دنیا میں آنکھ کھولی تھی۔ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے اس نے یقیناً انسانی زندگی کو بڑی بڑی ڈراؤنی شکلوں میں دیکھا ہوگا لیکن بیومونٹ کو دیکھ کر وہ بھی ہڑبڑائے بغیر نہ رہ سکا تاہم دوسرے ہی لمحے وہ پرسکون اور قدرے معذرت خواہ نظر آنے لگا۔ بیومونٹ اسے اندر لایا۔ جین اب تکیے کے سہارے بیٹھی تھی اور ٹیری کو پیار کر رہی تھی۔ ڈاکٹر کو دیکھ کر وہ بولی۔ ”مجھے تو امید نہیں تھی کہ تم آؤ گے ڈاکٹر اسٹیفن۔“

”اب ایسی بھی کیا بات تھی جین۔“ ڈاکٹر قدرے کھسانے سے لہجے میں بولا۔ جین نے بیومونٹ کو بتایا۔ ”ڈاکٹر اسٹیفن گرانٹ بھی بورڈ آف ایجوکیشن کے رکن ہیں۔“ بیومونٹ سگریٹ سلگاتے سلگاتے رک گیا اور سرد لہجے میں بولا۔ ”اگر مجھے یہ معلوم ہوتا تو میں اس ڈاکٹر کو اپنے گھر میں داخل ہونے کی اجازت نہ دیتا۔“ ”مسز بیومونٹ.....“ ڈاکٹر نے کچھ کہنا چاہا۔ ”صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔“ بیومونٹ



مسٹر بیومونٹ۔ "ڈاکٹر نے نجات آمیز لہجے میں کہا۔

میں آپ کو بتا دوں کہ....."

"مورگن کا لڑکا....." بیومونٹ نے حقارت اور

غصے سے دہرایا۔ "اسے لڑکا کہنے کی ضرورت نہیں  
ڈاکٹر وہ انیس سال کا ہے، یعنی فوج میں بھرتی ہونے  
کے قابل ہو چکا ہے کوئی بھی شخص جسے تم عمر کے لحاظ  
سے پورا جوان مرد ہونے کا سرٹیفکیٹ دے سکو اگر  
پیٹ مورگن کے مقابلے پر آئے تو زیادہ امکان یہی  
ہے کہ پیٹ مورگن اس پر غالب آ جائے گا۔ قانونی  
نکتہ نظر سے بھی وہ لڑکا نہیں ہے مردوں کی صنف  
کے لیے باعث شرم ہی سہی لیکن بہر حال وہ ایک مکمل  
جوان مرد ہے۔"

"آپ مجھے کچھ مت بتائیے ڈاکٹر۔" بیومونٹ  
نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹ دی۔ "البتہ میں  
آپ کو بتا دیتا ہوں کہ مسز وارڈ مین نے اگر درد وغیرہ  
محسوس کیا تو وہ اس کے علاج کے لیے آپ کے پاس  
نہیں آئیں گی۔ یہ تو بڑی ستم ظریفی ہے کہ انسان  
انہی کے پاس دوا کے لیے جائے جنہوں نے درد دیا  
ہو۔ اگر آپ اور آپ کے معزز ساتھی مل کر مسز  
وارڈ مین کے متعلق ایک طرفہ فیصلے نہ کرتے تو یہ نوبت  
ہی کیوں آتی؟"

ڈاکٹر کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا ایک  
جار ہا تھا۔ وہ گویا محل سے کام لینے کی کوشش کر رہا تھا  
تاہم اس کے چہرے پر سرخی برقرار رہی اس نے  
بیومونٹ کو جواب دینے کے بجائے جین کو مخاطب  
کیا۔ "میرا خیال ہے جلد یا بدیر تمہیں مجھ سے ملنے  
آنا ہی پڑے گا جین تب ہی ہم اس سلسلے میں بات  
کریں گے۔ میں نہیں سمجھتا کہ مسٹر بیومونٹ کو اس  
معاملے میں بولنے کا حق حاصل ہے۔"

"آپ کا خیال قطعی غلط ہے ڈاکٹر۔" بیومونٹ  
نے تیزی سے کہا۔ "میں اسی کاؤنٹی کا باشندہ ہوں۔  
ایک ویو کی آبادی میں میرا بھی شمار ہوتا ہے گو کہ کسی  
نے کبھی اس حقیقت پر توجہ دینے کی زحمت نہیں کی۔  
میں باقاعدگی سے ٹیکس ادا کرتا ہوں۔ جس میں تعلیمی  
ٹیکس بھی شامل ہے۔ جب سے مجھے یہ معلوم ہوا ہے  
کہ بورڈ آف ایجوکیشن بغیر کسی شہادت اور بغیر کسی  
ثبوت کے محض چند گناہ خطوط کی بنیاد پر دو انسانی  
زندگیوں کو تباہ کرنے پر تلا ہوا ہے....."

"مورگن کے لڑکے نے شہادت دی تو ہے۔"  
ڈاکٹر بات کاٹتے ہوئے بولا۔ "بورڈ کی نظر میں یہی

ڈاکٹر نے وہی تمام باتیں وہی تمام مشورے بیان  
کرنے شروع کر دیئے جو جین اس سے پہلے پال  
ڈاسن اور جج ڈیلے سے بھی سن چکی تھی۔ بورڈ آف  
ایجوکیشن کے عہدیداروں وغیرہ میں شاید اتنی ہم  
آہنگی آج سے پہلے کبھی کسی مسئلے پر نہیں پائی گئی تھی۔  
"تم تو ہمارے فیملی ڈاکٹر ہو مسٹر اسٹیفن۔" جین  
رومانی ہو کر بولی۔ "ہم سب کی رگ رگ سے محاورنا  
نہیں عملاً واقف ہو۔ کیا تم نے بھی ان الزامات پر  
یقین کر لیا تھا؟"

"میں نے صرف ایک طبی ماہر کے طور پر اپنی  
رائے دی تھی۔" ڈاکٹر کے لہجے میں خفیف سی  
معذرت خود ہی جھلک آئی۔ "تم جوان ہو چھ سال  
سے بیوگی کی زندگی بسر کر رہی ہو۔ تنہائی پسند ہو بعض  
حالات میں فطرت انسان کے ذہن پر ایسا بوجھ ڈالتی  
ہے اور اس کی نفسیات پر ایسے اثرات مرتب کرتی ہے  
کہ اس سے بعض حرکات کا سرزد ہو جانا ممکن ہوتا  
ہے۔ میں نے صرف امکان ظاہر کیا تھا۔"

"اور اب تم لوگ صرف امکانات، شبہات  
اور ایک بد معاش کے لگائے ہوئے الزامات کی بنا



سمجھتی آئی تھی کہ اس کے بہت سے دوست ہمدرد اور  
بھی خواہ ہیں۔ جج ڈیلے پال ڈاسن اور ڈاکٹر اسٹیفن پر  
تو وہ آنکھیں بند کر کے بھروسہ کرتی تھی مگر اب  
اسے معلوم ہوا تھا کہ اس کا تو کوئی دوست نہیں تھا  
جو اس کے سامنے کھڑا ہو کر کسی کا وارہتا۔۔۔۔۔ ہاں  
صرف ایک اجنبی اس کا دوست تھا۔ آدھے چہرے  
والا ایک اجنبی جو اس کی خاطر ہر وار سہنے کو سینہ سپر  
ہو گیا تھا۔ جو غصے میں جین کے جذبات کی ترجمانی  
کر چکا تھا۔ وہی کچھ کہہ چکا تھا جو جین کہنا چاہتی تھی  
مگر کہہ نہ پائی تھی۔ بیومونٹ ہی گزشتہ رات انہیں گھر  
چھوڑ کر گیا تھا۔ اس کی باتوں سے جین کو بڑا حوصلہ ملا  
تھا لیکن اب اس میں مقابلہ کرنے کی خواہش دھیمی  
پڑ چکی تھی۔ فائدہ کیا تھا؟ بیومونٹ اس کی کیا مدد  
کر سکتا تھا؟ بادل نخواستہ وہ انھی تنہائی اور کپڑے بدل  
کر نیچے پہنچی اسے ٹیری کے سامنے جاتے ہوئے  
شرم سی محسوس ہو رہی تھی۔ اس میں ٹیری کو یہ بتانے  
کا حوصلہ نہیں تھا کہ اس کی اہمیت ایک ہی روز میں  
جواب دے چکی ہے۔

اسے کچن کا دروازہ بند نظر آیا ایسا صرف چھٹی  
کے روز ہوتا تھا۔ کیونکہ ٹیری اس روز بھی صبح جلد ہی  
اٹھتا تھا اور اپنا ناشتہ خود ہی تیار کرنے کے لیے کچن  
میں گھس جاتا تھا تا کہ ناشتے سے فارغ ہو کر بچوں کا  
ریڈیو پروگرام سن سکے۔ جین نے کچن کا دروازہ کھولا  
تو سامنے ہی اسے بیومونٹ کافی کا مک تھا جسے کچن  
ٹیمبل پر بیٹھا نظر آیا۔ وہ اس طرح بیٹھا تھا کہ دروازہ  
کھولنے والے کو اس کے چہرے کا صرف اچھا رخ  
نظر آئے۔ ٹیری چولہے کے قریب کھڑا انڈے  
پھینٹ رہا تھا۔ جین کو یہ احساس تو ہو چکا تھا کہ  
بیومونٹ اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا لیکن پھر بھی  
اسے سامنے پا کر اسے تقویت سی محسوس ہوئی۔ شاید

پرسنل وارڈین کو مجبور کر رہے ہو کہ وہ استعفا دے  
کر ٹیری کو لے کر یہاں سے چلی جائیں تاکہ بورڈ  
آف ایجوکیشن کو کسی انجمن کا سامنا نہ کرنا پڑے؟  
بیومونٹ نے تلخ لہجے میں کہا۔

”پانچ اور مردوں کے نام بھی سامنے آئے ہیں  
جنہیں جج ڈیلے نے خفیہ رکھا ہے۔“ ڈاکٹر بولا۔  
لیکن اگر اشد ضرورت آن پڑی تو وہ انہیں شہادت  
کے لیے بلائے پر مجبور ہوگا۔“ ایک لمحے کے توقف  
کے بعد وہ بولا۔ ”کیا میں تمہیں اور ٹیری کو اپنی کار میں  
تمہارے گھر تک لے چلوں جین؟ میرا خیال ہے کہ  
تمہاری کار تو استعمال کے قابل نہیں ہوگی۔“

”اس زحمت کی ضرورت نہیں۔“ بیومونٹ بدستور  
تلخ لہجے میں بولا۔ ”کہیں جناب گناہ تمہیں بھی مسز  
وارڈین کے عاشقوں کی فہرست میں شامل کر دیں  
اور لوگ کہیں کہ دیکھو بڑھاپے میں ڈاکٹر کو کیا  
سوچھی۔ میں خود مسز وارڈین کو چھوڑ آؤں گا لفظوں  
کی جتنی بھی کچڑا چھالی جائے گی میں اسے نہ صرف  
اپنے وجود پر برداشت کر لوں گا بلکہ اس کا جواب بھی  
دوں گا۔ اور بورڈ کے رکن کی حیثیت سے بھی اگر تم  
میری جوابی کارروائی کی زد میں آ گئے تو شکوہ نہ کرنا۔“



ہفتے میں پانچ دن وہ آنکھ کھلتے ہی تیزی سے  
اٹھنے تیار ہونے اپنا اور ٹیری کا ناشتہ تیار کرنے اور پھر  
تیزی سے اسکول کی طرف روانہ ہونے کی عادی تھی  
لیکن آج یہ معمول ٹوٹ گیا تھا۔ بیدار ہونے کے بعد  
بھی وہ مصحح انداز میں بستر پر ہی لیٹی رہی۔ کھڑکی  
سے موسم بہار کی دھوپ اندر آ رہی تھی جین اپنے آپ  
کو شکست خوردہ اور غلیظ غلیظ سا محسوس کر رہی تھی  
جیسے کسی نے اس کے وجود پر کچھڑ مل دی ہو۔

تنہائی کا احساس اس کے سوا تھا۔ آج تک وہ یہی



اس لیے کہ وہی ایک شخص تھا جسے اس کی ذات پر کوئی شک نہیں تھا اور جسے اجنبی ہوتے ہوئے بھی جین کی باتوں پر اعتبار تھا۔

جین نے مضحکہ خیز آواز میں اسے صبح بخیر کہا۔ بیومونٹ نے خوشدلی سے جواب دیا۔ ٹیری بولا۔ ”آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی مئی کہ مسٹر بیومونٹ نے رات ہمارے گھر کے سامنے اپنی کار میں گزاری ہے۔ صبح میں نے دروازہ کھولا تو انہیں دیکھا۔ ظاہر ہے اس صورت میں انہیں ناشتے کے لیے مدعو کرنا میرا اخلاقی فرض بنتا تھا۔“

”بے شک۔“ جین نے ایک کرسی سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”لیکن میرا خیال ہے مسٹر بیومونٹ کو اس تکلیف کی ضرورت نہیں۔“

”میں تمہاری آنکھوں میں شکست کی پرچھائیاں دیکھ رہا ہوں۔“ بیومونٹ بولا۔ ”غالباً تم نے اس مسئلے پر بہت سوچا ہے۔ میں بھی سوچتا رہا ہوں۔ یہ درست ہے کہ اگر تم اس معاملے کی باقاعدہ تحقیقات اور سماعت میں حصہ لیتی ہو تو کارروائی بہت دیر میں جا کر مکمل ہوگی اور اس وقت تک تمہاری شہرت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ چکا ہوگا۔“

”اچھا ہوا تم بھی اس خیال سے متفق ہو گئے۔“ جین نے قدرے غمی سے کہا۔

”میں اس خیال سے متفق ہوں لیکن میں نے حوصلہ نہیں ہار دیا ہے۔“ بیومونٹ کے لہجے میں ہلکی سی تندہی آگئی۔ ”مجھے معلوم ہے کہ باضابطہ کارروائیوں سے مظلوم کو خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوتا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ تمہاری بے گناہی کم سے کم وقت میں ثابت ہو۔ اس سے پہلے کہ افواہیں اور شکوک و شبہات کا زہر فضا میں پھیلے جناب گمنام کی شخصیت بے نقاب ہو جانی چاہیے اور پیٹ مورگن سے اس

کا تعلق بھی سامنے آ جانا چاہیے۔“

”پیٹ مورگن سے تعلق؟“ جین نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔

”مجھے وضاحت کرنے دو۔“ بیومونٹ بولا۔ ”تمہارے خلاف یہ ہنگامہ اس رپورٹ کے بعد شروع ہوا ہے جو تم نے پیٹ مورگن کے بارے میں تیار کی۔ وہ رپورٹ اب بے وقعتی کے ساتھ پال ڈائن کے دفتر میں محفوظ ہوگی جہاں تک پیٹ مورگن کا تعلق ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ انسان نما حیوان ہے اور اسے ہی جیسے بد معاشوں کے گروہ کی سربراہی کرتا ہے لیکن ہمیں انسانی نفسیات کا یہ پہلو مد نظر رکھنا چاہیے کہ اس قسم کے لوگ لڑائی جھگڑا، گالی گلوچ وغیرہ تو کر سکتے ہیں لیکن اس طرح چالاکی کے ساتھ کسی کے خلاف سازش تیار نہیں کر سکتے۔ میں بڑی سے بڑی شرط لگانے کو تیار ہوں کہ کسی نے اس کی مدد کی ہے۔ اسے راستہ دکھایا ہے جناب گمنام نے اس گمنام کو سامنے لانے کا طریقہ یہی ہے کہ اسے کسی طرح کھل کر پیٹ مورگن کی مدد کرنے پر مجبور کر دیا جائے اور پیٹ مورگن ہی وہ ہستی ہے جو اسے بے نقاب کر سکتی ہے۔“

”لیکن یہ کام کس طرح ہوگا؟“ جین نے مایوسی سے پوچھا۔

”یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔“ بیومونٹ بولا۔ ”اس کے لیے ہمیں غیر روایتی طریقہ اختیار کرنا ہوگا۔ اگر میں بھی تھوڑا سا ہنگامہ کھڑا کر دوں۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟“

جین نے تذبذب سے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ اسی لمحے ٹیری نے اس کے گلے میں ہاتھیں ڈال دیں۔ ”آپ مسٹر بیومونٹ کو ہر ضروری کارروائی کرنے کی اجازت دے دیجیے مئی! اگر پاپا زندہ



ہوتے تو وہ بھی ہر ضروری قدم اٹھاتے۔ وہ خاموشی سے کبھی شکست تسلیم نہ کرتے۔“

جین نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”ٹھیک ہے، مسٹر بیومنٹ، آپ جو بہتر سمجھتے ہیں کیجیے۔“

بیومنٹ ناشتہ ختم کر چکا تھا۔ وہ خوشدلی سے مسکرایا اور اٹھ کر مطمئن انداز میں دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے پر رک کر وہ مڑتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں اور میری کوئی الحال اس گھر کی چار دیواری تک محدود رہنا ہوگا۔ اگر تم کوئی ہنگامہ شور شرابا یا موٹر سائیکلوں وغیرہ کی آواز سنو تو گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ اپنے اوسان بحال رکھنے ہیں۔ میری بھی کوئی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں گوریلا جنگ میں شریک رہا ہوں اور ایسا نرم اور نازک مزاج نہیں ہوں جیسے کہ عموماً فلمی دنیا کے لوگ ہوتے ہیں۔ میں بہت سخت جان ہوں اور پھر میرے پاس کھونے کے لیے ہے ہی کیا؟ سوائے دو نئے دوستوں کے۔“ وہ مسکرایا اور رخصت ہو گیا۔



پیٹ مورگن کا کنبہ تین افراد پر مشتمل تھا جو سب کے سب ایک دوسرے سے ناخوش تھے۔ اس کا باپ فریڈ مورگن بڑھئی تھا اور ایک مقامی ٹھیکیدار کے پاس ملازم تھا۔ عرصہ ہوا کہ گھربار سے اس کی حقیقی دلچسپی ختم ہو چکی تھی۔ بس وہ گویا گھر کی سرپرستی کر کے ایک فرض نبھاتا تھا۔ اس کی بیوی بد زبان تھی اور بیٹا سرکش و نافرمان۔

اس روز بھی وہ خاموشی سے میز پر بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔ فریڈ مورگن کو نازنگی کا جوس کھنا محسوس ہو رہا تھا۔ مخنی شاید جوس میں نہیں تھی بلکہ اس کے محسوسات میں تھی۔ اس کی بیوی نے کچھ رقم کا مطالبہ کیا تھا جو اس کے پاس نہیں تھی۔ اس کا بیٹا حسب

معمول گزشتہ رات بھی دیر سے آیا تھا۔ غالباً ہمیشہ کی طرح کہیں کسی بد معاشی میں مصروف رہا تھا۔ دفعتاً دروازے پر دستک ہوئی اور فریڈ مورگن بیٹے کی طرف دیکھ کر غرایا۔ ”دیکھو کون ہے؟“

پیٹ مورگن دروازہ کھولنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ قد میں اپنے باپ جتنا ہی تھا۔ چھ فٹ سے نکلتا ہوا، اس کا جسم کسری اور وزن ایک سو اسی پونڈ تھا۔ اس نے دروازہ کھولا تو ایک وجیہہ شخص سامنے کھڑا دکھائی دیا۔ وہ قد میں پیٹ کے برابر، لیکن وزن میں غالباً اس سے کچھ کم تھا۔ وہ ترچھا کھڑا تھا اور مسکرا رہا تھا۔ اس کا لباس بیش قیمت تھا۔ پیٹ نے انداز لگایا کہ وہ غالباً چھٹیاں گزارنے کے لیے قصبے میں آنے والا کوئی آسودہ حال شہری ہے جسے اس کے باپ کی خدمات کی ضرورت آن پڑی تھی۔

”پیٹ مورگن تمہارا ہی نام ہے؟“ اجنبی نے پوچھا۔

”ہاں۔“ پیٹ نے جواب دیا۔ ان کے درمیان مکالمہ بس یہیں تک محدود رہا۔ کیونکہ اس کے فوراً بعد اجنبی کا بازو بجلی کی سی تیزی سے حرکت میں آیا تھا اور ایک زوردار گھونسا پیٹ کی ناف پر پڑا تھا۔ جیسے ہی وہ دہرا ہونے لگا، دوسرا گھونسا ہتھوڑے کی طرح اس کی تھوڑی پر اور ساتھ ہی کپٹی پر گرا۔ اس کا ایک ہاتھ۔ پیٹ مورگن آلوؤں کی بوری کی طرح فرش پر لڑھک گیا۔ اس کی ماں مسز مورگن چیختی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھی۔ اجنبی اب بھی پیٹ کے سر پر کھڑا تھا اور مسکرا رہا تھا، وہ پرسکون لہجے میں بولا۔ ”میں تمہیں خبردار کر رہا ہوں پیٹ مورگن کہ آج سے تم مجھے جہاں بھی نظر آؤ گے میں اسی طرح تمہاری درگت بناؤں گا۔ میں تمہیں پورے قصبے میں فٹ پال کی طرح ادھر سے ادھر لڑھکاتا پھروں گا۔ اگر تم اپنی جان بچانا



”میرے خیال میں تو جین کو پیش آنے والا کوئی واقعہ حادثاتی نہیں۔“ ہیومنٹ نے کہا۔ ”خیر ان باتوں کو چھوڑو۔۔۔۔۔ یہ بتاؤ کہ جین کے خلاف گناہ کا جو خط موصول ہوا ہے کیا میں اسے دیکھ سکتا ہوں؟“

”میں سمجھتا ہوں کہ مجھے اس کا اختیار حاصل نہیں کہ میں بورڈ کے اور اجازت کے بغیر تمہیں وہ خط دکھاؤں۔“ پال نے جواب دیا۔

”اچھا یہ بتاؤ کہ پیٹ مورگن نے بورڈ کے سامنے اپنی کہانی کس طرح سنائی تھی؟“

”اسے جو کچھ کہنا تھا اس نے پہلے تنہائی میں جج ڈیلے سے کہا تھا۔ جج نے بورڈ کے سامنے اس سے سوال و جواب کیے تھے۔“ پال نے بتایا۔

”بہت خوب۔“ ہیومنٹ نے کہا اور کھڑکی میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ کھڑکی سے نیچے جھانکتے ہوئے وہ چند لمحوں بعد بولا۔ ”ذرا ایک منٹ کے لیے تم یہاں آنا پسند کرو گے؟“

پال اس کے برابر جا کھڑا ہوا۔ نیچے گراؤنڈ میں سیکڑوں نیچے جمع ہو رہے تھے اور اسمبلی کے لیے گھنٹی بجنے کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک طرف پیٹ مورگن پانچ چھ لڑکوں کے حلقے میں کھڑا تھا۔ وہ لڑکے عمر میں اس سے چھوٹے تھے۔ انداز سے ظاہر تھا کہ وہ ان کے سامنے کچھ ڈیٹیلیں مار رہا تھا۔

”فرض کرو۔۔۔۔۔“ ہیومنٹ بولا۔ ”میں نیچے جا کر اس لڑکے کی پٹائی شروع کر دوں تو تمہارا رد عمل کیا ہوگا؟“

”میں تمہیں اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔ پیٹ مورگن ایسا ترنوالہ نہیں ہے۔“

”مخلصانہ مشورے کا شکریہ۔“ ہیومنٹ نے کہا۔

”لیکن مجھے اپنے سوال کا جواب چاہیے۔“

”میں پولیس کو اطلاع دے کر تمہیں گرفتار کراؤں

چاہتے ہو تو پولیس اسٹیشن جا کر میرے خلاف باقاعدہ ریپٹ درج کراؤ۔ پھر میں وضاحت کروں گا کہ میں نے تمہارا یہ حشر کیوں کیا۔“ پھر وہ مسٹر اور مسز مورگن کی طرف مڑا جو کچن ٹیبل کے قریب دم بخود کھڑے تھے۔ ”گڈ مارننگ مسٹر اینڈ مسز مورگن۔“ اس نے تعظیماً جھکتے ہوئے کہا پھر وہ ایڑیوں کے بل گھوما اور انہیں سشدر چھوڑ کر رخصت ہو گیا۔



پرنسپل کی سیکرٹری مس ڈورس ولسن وقت سے کچھ پہلے ہی اپنی ڈیوٹی پر پہنچ جاتی تھی تاکہ اپنے کاغذات وغیرہ درست کر سکے۔ اس روز وہ کام کے لیے تیار ہو کر بیٹھی ہی تھی کہ ایک اجنبی آفس میں داخل ہوا۔ وہ بے حد وجہ تھا۔ کسی یونانی ریوٹ کی طرح۔۔۔۔۔ لیکن جب اس کا چہرہ پوری طرح سامنے آیا تو خون مس ولسن کی رگوں میں گویا ٹنجد ہو گیا۔

”مسٹر پال ڈاسن اندر ہیں؟“ اجنبی نے پوچھا۔ مس ولسن نے تھوک نگل کر اثبات میں سر ہلایا۔ اجنبی نے اندر جانے کی اجازت طلب نہیں کی گویا اسے پال ڈاسن سے ملنے کے لیے رسمیات کی پابندی کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ سیدھا اندر چلا گیا۔

پال ڈاسن اپنی میز پر موجود تھا۔ اس نے بغیر اطلاع کے کسی ملاقاتی کی آمد پر حیرت سے سر اٹھا کر دیکھا لیکن نووارد کو پہچان کر گویا اس کی حیرت دور ہو گئی۔ ”تم یقیناً ہیومنٹ ہو۔“ پال نے کہا۔ ”ڈاکٹر اسٹیفن گرانٹ نے مجھے رات تم سے ملاقات کے بارے میں بتایا تھا۔ جین اب کیسی ہے؟“

”تمہیں تو اچھی طرح اندازہ ہونا چاہیے کہ وہ کیسی ہوگی۔“ ہیومنٹ نے تیکھے لہجے میں کہا۔

”میں حادثے کے بارے میں جاننا چاہ رہا تھا۔“

پال بولا۔



کئی ہاتھ کھانے پڑے۔ وہ لڑکھڑایا اور پھر بیومونٹ نے اس کی کنپٹی پر پیشہ دربا کسر کی طرح گھونسا رسید کیا۔ وہ اوندھے منہ گرا اور پھر نہیں اٹھا۔ اس کے کم عمر دوست اب محض خوفزدہ بچے نظر آ رہے تھے۔

بیومونٹ نے منتظر نظروں سے ان کی طرف دیکھا لیکن ان میں سے کسی نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ تب بیومونٹ مڑا اور اسکول کی عمارت سے باہر چلا گیا۔ اوپر کھڑکی میں کھڑے ہوئے پال ڈاسن کے ہونٹ بھنجے ہوئے تھے۔ وہ کھڑکی سے ہٹ کر اپنی میز پر آیا اور فون اپنی طرف کھسکا کرج ڈیلے کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔



جج ڈیلے نے مسکراتے ہوئے اپنے آفس میں بیومونٹ کا استقبال کیا۔ بیومونٹ رومال سے اپنے ہاتھ صاف کر رہا تھا۔ ”خوش آمدید بیومونٹ۔“ جج نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ ”تم نے مجھے زحمت سے بچالیا ورنہ مجھے خود تم سے ملاقات کے لیے آنا پڑتا۔ سنا ہے اسکول میں تم نے چھوٹا سا ہنگامہ برپا کر ڈالا۔ پال نے مجھے فون لیا تھا۔ بیٹھ جاؤ نا۔“

”تم نے پولیس کو اطلاع دے دی ہے یا نہیں؟“ بیومونٹ نے قدرے اشتیاق سے پوچھا۔

”نہیں..... نہیں۔“ جج نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

”میں ذرا پرانے خیالات کا آدمی ہوں۔ میں پہلے معاملات کو اپنے طور پر سلجھانے کی کوشش کرتا ہوں مجھے گزشتہ رات کے واقعے کا بھی علم ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر اسٹیفن سے ملاقات ہوئی تھی۔“

”یہ ڈاکٹر اسٹیفن کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ لوگوں سے ملاقات کرنے کا کافی شوقین معلوم ہوتا ہے۔“ بیومونٹ نے تسکین لہجے میں کہا۔

”اس میں کوئی شک نہیں۔“ جج نے دوبارہ ہلکا

گا۔ ”پال نے کہا۔“

”کیا یہ تمہاری ذمہ داری ہے؟“ بیومونٹ نے پوچھا۔

”ذمہ داری تو بورڈ کی ہے لیکن میں اسی کی خاطر یہ فریضہ انجام دوں گا۔ لیکن میرے خیال میں جین واسے معاملے کی وجہ سے پیٹ مورگن کی پوزیشن کچھ ایسی ہو چکی ہے کہ تمہیں اس کے بارے میں کوئی قدم اٹھانے سے پہلے بورڈ کے چیئرمین سے مشورہ کر لینا چاہیے۔“ پال ڈاسن نے کہا۔

”تمہاری یہ تجویز میری نظر میں خاصی معقول ہے۔“ بیومونٹ نے تسلیم کیا۔

”اب چند منٹ کے لیے تم یہیں کھڑے رہنا۔ یوں سمجھو کہ تمہیں کسی تھیٹر میں اپیشل باکس ملا ہوا ہے۔ ابھی تمہارے سامنے خاصا دلچسپ تماشا پیش کیا جائے گا۔“ بیومونٹ نے کہا اور آفس سے باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد پال نے اسے نیچے گراؤنڈ میں پیٹ مورگن کی طرف بڑھتے دیکھا بچے اس کی صورت دیکھ کر راستہ چھوڑتے جا رہے تھے۔ پیٹ کے سامنے پہنچ کر بیومونٹ بولا۔ ”میں نے تمہیں خبردار کر دیا تھا کہ آئندہ تم مجھے نظر آئے تو تمہارا کیا حشر ہوگا؟“

”ہاں..... مجھے گرانے کے بعد بکواس کی تھی تم نے۔ غیر متوقع طور پر حملہ کیا تھا۔ اب میری باری ہے۔“ پیٹ غرایا۔

”اکیلے آؤ گے یا تمہارے یہ ساتھی بھی.....؟“ بیومونٹ نے ذرا پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

”مجھے کسی کی ضرورت نہیں۔“ پیٹ نے دانت پیس کر کہا۔ اور بیومونٹ پر جھپٹا۔ بیومونٹ پہلے ڈانسر کی طرح حرکت کرتا نظر آیا۔ پیٹ اسے پکڑنے میں کامیاب نہیں ہو سکا اور چند سیکنڈ میں ہی اسے تابڑ توڑ



سابقہ بہ لگایا۔ ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا۔  
 ”پیٹ مورگن کے متعلق تو مجھے اندازہ تھا کہ وہ اپنی  
 حرکتوں سے شامت کو دعوت دے رہا ہے لیکن کسی  
 شخص میں اس کو سبق دینے کی ہمت ہی نہیں تھی۔ اپنی  
 نجی حیثیت میں میں تمہیں مبارک باد دیتا ہوں۔  
 جب تک اس کے والدین اس سلسلے میں شور نہیں  
 مچائیں گے تب تک میں کچھ نہیں کروں گا اور امکان  
 یہی ہے کہ وہ شور نہیں مچائیں گے۔“

”اتم تو قانونی کارروائیوں کے بغیر کام چلانے  
 کے ہی عادی معلوم ہوتے ہو جج ڈیلے۔“ بیومونٹ  
 نے خشک لہجے میں کہا۔

”تو کیا تم لازماً گرفتار ہونا چاہتے ہو؟“ جج نے  
 ہنستے ہوئے کہا۔

”ارادہ تو یہی تھا۔“ بیومونٹ نے جواب  
 دیا۔ ”دراصل میں چاہتا ہوں کہ کوئی چیز ریکارڈ پر  
 آئے۔ اب تک تمہارے بورڈ کی میٹنگ جس میں  
 مسز وارڈمین کو قصور دار ٹھہرایا گیا کی کوئی کارروائی  
 ریکارڈ پر نہیں ہے۔ شہادتیں اگر کوئی ہیں تو وہ تمہاری  
 میز کی دراز میں ہیں۔ جین نے پیٹ مورگن کے  
 متعلق جو رپورٹ تیار کی وہ بھی کہیں کوئے کھدرے  
 میں پڑی ہے۔ سارا کام بس افواہوں اور اندازوں پر  
 چل رہا ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ کوئی چیز  
 ریکارڈ پر آ جائے۔“

ایک گہری سانس لے کر اس نے سلسلہ کلام  
 جوڑا۔ ”اگر مجھے پیٹ مورگن کو پینے کے الزام میں  
 حراست میں لے لیا جاتا ہے تو میں اس کی وجوہات  
 بیان کروں گا اور سب سے پہلے میں مطالبہ کروں گا  
 کہ تمہیں نا اہل قرار دے کر جج کے منصب سے ہٹایا  
 جائے کیونکہ تم نے اس لڑکے پیٹ مورگن کی بہت  
 ہی بردہ پوشی کی ہے۔“

جج ڈیلے کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب  
 ہو چکی تھی۔ وہ بے انتہا سنجیدگی سے بولا۔ ”اس معاملے  
 کو منظر عام پر لا کر تم جین کی مدد نہیں کر رہے بیومونٹ!  
 تم اس کے لیے مشکلات کھڑی کر رہے ہو۔“  
 ”میں یہ فلسفہ سن چکا ہوں۔“ بیومونٹ نجی سے  
 بولا۔ ”یہ بتاؤ کہ تم نے گناہ خط لکھنے والے کا سراغ  
 لگانے کی کوئی کوشش کی؟“

”نہیں، کیونکہ کامیابی کی کوئی امید نہیں تھی۔ کوئی  
 سراغ موجود نہیں تھا۔“ جج نے پرسکون لہجے میں  
 جواب دیا۔

”بورڈ کے سامنے پیش کرنے سے پہلے تم نے  
 پیٹ مورگن سے تنہائی میں ملاقات کی تھی۔ اس نے  
 جو کچھ کہا کیا تم نے وہ بھی بورڈ کے سامنے بیان  
 کیا تھا؟“ بیومونٹ نے دوسرا سوال کیا۔

”نہیں۔“ جج اب بھی پرسکون تھا۔ ”اس نے  
 بہت سے لوگوں کے نام لیے تھے اور اول فول بکتا  
 رہا تھا۔ میں نے اسے دوسروں کے سامنے بیان کرنا  
 ضروری نہیں سمجھا تھا اور کارروائی صرف اسی کی ذات  
 تک محدود رکھی تھی۔ باقاعدہ عدالتی کارروائی کے  
 دوران بھی میں یہی کرداں گا بشرطیکہ مجھ پر دعویداروں  
 کی طرف سے دباؤ نہ ڈالا جائے۔“

جج سے سوال جواب کرنا دیوار سے ٹکریں مارنے  
 کے مترادف تھا۔ اس کے پاس ہر عمل کا جواز ہر سوال کا  
 جواب موجود تھا جو کچھ بیومونٹ معلوم کرنا چاہتا تھا  
 اس کے لیے اسے کچھ اور کرنے کی ضرورت تھی۔  
 بیومونٹ جج کے دفتر سے نکل آیا اور اپنی گاڑی کی  
 طرف بڑھا۔ وہ اپنی کنورٹبل کا دروازہ کھول رہا تھا  
 جب کسی نے عقب سے اسے پکارا۔ وہ مڑا اور یہ دیکھ  
 کر اسے قدرے حیرت ہوئی کہ پیٹ مورگن کا باپ  
 فریڈ اس کی طرف چلا آ رہا تھا تاہم اس کے چہرے پر



کھولا تو وہ اسے دیوار سے چپکا ہوا نظر آیا۔ اس کے ہونٹ کھینچے ہوئے تھے اور وہ کسی بھیڑیے کی طرح دانت نکوس رہا تھا۔ چھوٹے لیکن خطرناک نظر آنے والے پھل کا چاقو اس کے ہاتھ میں تھا۔

”تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا بیومونٹ۔“ وہ غرایا۔ ”یہاں تمہاری اچھل کود کے لیے جگہ نہیں ہے۔“ وہ ہاتھ پیچھے لے جاتے ہوئے وار کرنے کے لیے بیومونٹ پر جھپٹا۔ بیومونٹ کی نظر اس کے چاقو والے ہاتھ پر تھی۔ اس بازو پر کرائے کا وار کرتے ہوئے اس نے پیٹ کے پیٹ میں ٹھوکر رسید کی اور جیسے ہی وہ دہرا ہوا بیومونٹ نے ایک سو اسی پونڈ کے اس نوجوان کو ایک خاص انداز سے فٹ بال کی طرح اٹھایا اور سامنے کی دیوار پر دے مارا۔ وہ فرش پر گر اور بے حس و حرکت ہو گیا۔

بیومونٹ نے ٹوٹی سے پانی لے کر اس کے چہرے پر چھڑکا اور کہا۔ ”ہوش میں آؤ بد معاش مجھے تم سے دو باتیں کرنی ہیں۔“

پیٹ کسمایا اور بیومونٹ اس پر جھک کر اسے جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں کس نے قصبے سے چلے جانے کا مشورہ دیا تھا؟ کس نے دیا تھا؟ بتاتے ہو یا تمہیں اٹھا کر ایک بار پھر دیوار پر دے ماروں۔۔۔۔۔؟“



نیری دوڑتا ہوا کچن میں آیا جہاں جین برتن دھو رہی تھی۔

”ممی!“ وہ خوفزدہ آواز میں بولا ”بہت سے لوگ ہمارے گھر کی طرف آرہے ہیں۔ آٹھ دس کاریں ہیں جو باری باری سڑک کے کنارے رک رہی ہیں۔“

جین نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ نیری سچ

ایسی کوئی علامت نہیں تھی کہ وہ بیومونٹ سے انتقام لینے کی کوشش کرے گا۔

”مسٹر بیومونٹ میں آپ سے بات کرنا چاہتا تھا۔“ فریڈ قریب آ کر ہانپتے ہوئے بولا۔ ”مجھے نہیں معلوم کہ آپ کس لیے پیٹ پر برہم ہیں۔ بہر حال کوئی نہ کوئی معقول وجہ ہی ہوگی میں اور میری بیوی خود اس اثر کے سے عاجز ہیں۔“

”مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“ بیومونٹ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے سرد لہجے میں پوچھا۔

”ہمیں نصیحت حاصل ہوگئی ہے مسٹر بیومونٹ۔“ فریڈ بولا۔ ”میرے بھائی کا ریاست کے شمالی حصے میں ایک فارم ہے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ پیٹ کو فارم پر بھیج دیا جائے۔ میں نے سوچا کہ آپ کو بھی مطلع کر دیا جائے کیونکہ مجھے اندیشہ تھا کہ آپ ایک بار پھر اس کی تلاش میں گھر پہنچیں گے اور اس کی ماں میں اب کچھ دیکھنے اور سننے کا حوصلہ نہیں ہے۔“

”کب بھیج رہے ہو اسے؟“ بیومونٹ نے پوچھا۔ ”میں تو اسے ریلوے اسٹیشن پر چھوڑ بھی آیا ہوں۔“ فریڈ نے جواب دیا۔ ”میں منٹ بعد ٹرین آنے والی ہے۔“

اس کے بعد بیومونٹ نے کچھ نہیں سنا اور کار میں بیٹھ کر آندھی طوفان کی طرح اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔ پلیٹ فارم پر پیٹ مورگن اسے سامان ڈھونے والی ایک ٹرالی پر ساکت بیٹھا نظر آیا۔ ایک پرانا سا سوٹ کیس اس کے پیروں کے پاس رکھا تھا۔ بیومونٹ کو دیکھتے ہی وہ اٹھا اور دوڑ پڑا۔ بیومونٹ اس کے پیچھے تھا۔ پیٹ ویننگ روم میں گھس گیا۔ بیومونٹ نے اس کے پیچھے پیچھے اندر آ کر ادھر ادھر دیکھا۔ ویننگ روم میں کوئی نہیں تھا۔ پیٹ یقیناً ہاتھ روم میں گھسا تھا۔ بیومونٹ نے ہاتھ روم کا دروازہ



آواز پر قابو رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”تب بھی مجھے اور میری کو اپنا پروگرام بنانے میں کچھ وقت تو لگے گا۔“

”ہم ذرا بھی انتظار کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔“ مسز سیلٹر نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”قصبے میں تمہارے آنجنابی شوہر بل کے چچا چچی موجود ہیں وہ بعد میں تمہارا سامان پیک کروا کے تمہیں بھجوادیں گے۔ تم جہاں بھی جاؤ انہیں اطلاع دے دینا۔“

جین کا گلا رندھ گیا اور وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی۔ لوگوں کے چہرے اس کی آنکھوں کے سامنے دھندلا رہے تھے۔ اس نے میری کو زیادہ سختی سے بازو کے حلقے میں لے لیا۔ دفعتاً اسے اپنے کندھے پر کسی مضبوط ہاتھ کی گرفت کا احساس ہوا۔ اس نے ہڑبڑا کر دیکھا۔ وہ پال ڈاسن تھا۔ اس کا چہرہ سپید نظر آ رہا تھا تاہم اس کی آنکھوں میں غصے کی سرخی تھی۔

”میں جس قدر جلد ممکن ہو سکا یہاں پہنچا ہوں۔“ وہ بھٹی بھٹی سی آواز میں بولا۔ ”مجھے پتہ چلا تھا کہ لوگ جمع ہو کر تمہارے گھر کی طرف جارہے ہیں۔“ پھر وہ پتھرائے ہوئے سے چہروں کے ہجوم کی طرف مڑا اور براہمی سے بولا۔ ”تم سب کس قسم کے انسان ہو؟ ابھی تو مسز دارڈمین کے خلاف کچھ بھی ثابت نہیں ہوا ہے حتیٰ کہ ابھی تو اس کے خلاف الزامات کی کوئی باقاعدہ سماعت بھی نہیں ہوئی ہے کیا تم لوگ اسے اس معمولی حد تک بھی انصاف فراہم کرنے کے لیے تیار نہیں ہو؟“

سب خاموش رہے ان کی آنکھیں بتاتی تھیں کہ وہ انصاف کا کوئی تقاضا پورا کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں عورتوں کی آنکھوں میں جین شکوک و شبہات کی پرچھائیاں دیکھ سکتی تھی۔ شاید میرا شوہر بھی اس عورت

کہہ رہا تھا۔ کاریں ایک قطار میں رک چکی تھیں اور لوگ ان سے اتر کر دروازے کے قریب جمع ہو رہے تھے۔ وہ تقریباً بیس عورتیں اور چھ سات مرد تھے۔ وہ سب کندھے سے کندھے جوڑے گیٹ کی طرف بڑھے۔ جین نے باہر آ کر ان کا استقبال کیا۔ سب سے آگے مسز سیلٹر تھیں انجمن خواتین کی صدر۔

”ہم تم سے بات کرنے آئے ہیں مسز دارڈمین۔“ مسز سیلٹر نے کہا۔ ان کے چہرے پر بلا کی کڑختی اور سرد مہری تھی۔ جین نے میری کو اپنے سے چمٹا لیا۔ اس کے معدے میں اینٹھن سی ہونے لگی تھی۔ مسز سیلٹر اسے ایک طرف ہٹاتی ہوئی بلا اجازت کمرے میں گھس آئی۔ باقی لوگ بھی کسی نہ کسی طرح اندر آ ہی گئے۔ شاہدہ کمرہ بھر گیا۔

”میں حتی الامکان اختصار سے کام لینے کی کوشش کروں گی۔“ مسز سیلٹر نے نخوت سے کہا۔ ”ہمیں نہیں معلوم کہ بورڈ آف ایجوکیشن تمہارے بارے میں کیا فیصلہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اور ہم اب اس کے فیصلے کا انتظار بھی نہیں کر سکتے۔ ہم اسکول میں پڑھنے والے بچوں کے والدین ہیں ہم چاہتے ہیں کہ تم آج اور ابھی یہ قصبہ چھوڑ دو۔ اگر تم انکار کرو گی تو ہم طاقت بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ مسز مورگن کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی ورنہ وہ بھی تمہاری بدکرداری کی شہادت دینے پر تیار ہیں اور اگر ان کا الزام درست ثابت ہو گیا تو تمہیں خود اپنے بچے کو بھی ساتھ رکھنے کا حق حاصل نہیں رہے گا۔“

جین کا دم گھٹ رہا تھا اس کا دل چاہا کہ میری کو سینے سے چمٹا کر بھاگ کھڑی ہو لیکن یہ تو کھلا اعتراف شکست تھا اور پھر دروازے پر بھی لوگ کھڑے تھے۔ ”اگر میں آپ لوگوں کے اس فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کر بھی دوں۔“ جین نے اپنی



کی زلفوں کا اسیر رہ چکا ہے۔ ان میں سے ہر ایک یقیناً یہی سوچ رہی تھی۔

”میرے خیال میں تو بہتر یہی ہوگا کہ پہلے تم خود اپنی پوزیشن پر غور کر لو مسٹر ڈاسن۔“ مسز سیلٹرن نے کہا۔ ”کر لیا ہے غور میں نے۔“ پال ڈاسن تقریباً چلا اٹھا۔ ”میں نے بورڈ کو اس کی مرضی کے مطابق سب کچھ کرنے دیا۔۔۔۔۔ کوئی احتجاج نہیں کیا۔۔۔۔۔ اب مجھے اس پر افسوس ہو رہا ہے۔۔۔۔۔ لیکن کم از کم اب میں کسی کو وحشیانہ طرز عمل اختیار کرنے کی اجازت نہیں دوں گا خواہ اس کے لیے مجھے ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑیں۔ اس لیے مجھے برطرفی کی دھمکی سے ڈرانے کی ضرورت نہیں۔ کسی نہ کسی کو تو بہر حال انصاف شائستگی اور انسانیت کی حمایت میں آواز بلند کرنی ہی چاہیے۔ مجھے خوشی ہے کہ یہ اعزاز میرے حصے میں آ رہا ہے۔“

مسز سیلٹرن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ دہشت زدہ کی نظروں سے پال ڈاسن کے پیچھے کسی چیز کو دیکھ رہی تھی۔ پال نے مڑ کر دیکھا۔ دراصل بیومونٹ کمرے میں آچکا تھا۔

بیومونٹ نے یوں سب کی طرف دیکھا جیسے وہ سرکس کے مسخرے ہوں پھر وہ گویا انہیں ذرا بھی اہمیت دیے بغیر جین سے مخاطب ہوا۔ ”سب ٹھیک ہو گیا ہے جین! سازش کی دھند صاف ہو گئی ہے۔ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی ہے۔“ پھر اس نے ٹیری کا کندھا تھپتھپایا۔ ”اب مزید پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ننھے دوست۔“ پھر وہ مجمع سے مخاطب ہوا۔ ”میں اس امید پر تم سے بات کر رہا ہوں کہ شاید تمہارے اندر انسانیت اور انصاف پسندی کی رت باقی ہو۔ تم سب مسز وارڈمین کو برسوں سے جانتے ہو اور میری اس سے واقفیت کو چوبیس گھنٹے بھی

نہیں گزرے لیکن میں اسے تم سب سے بہتر طور پر جان گیا ہوں۔ برسوں کی شناسائی کے بعد بھی تم اس کی فطرت و کردار کو نہیں سمجھ سکے اور چند گھنٹوں کے اندر اندر بغیر کسی ٹھوس وجہ کے تم سب نے آنکھیں ماتھے پر رکھ لیں۔ جو کچھ اس کے ساتھ ہوا اسے سن کر میرا خون کھول اٹھا تھا اور چونکہ کوئی اس کی مدد کرنے پر آمادہ نظر نہیں آتا تھا اس لیے میں نے تھوڑی سی زحمت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ تم لوگوں کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں بھی یہیں کاربند ہوا ہوں۔“ وہ تلخ انداز میں مسکرایا۔ ”مجھے تفصیلات سننے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ مسز وارڈمین بے قصور ہے۔ اس قسم کی سازش کوئی ایسا شخص ہی کر سکتا تھا جو ذہنی طور پر غیر متوازن ہو اور انتقام کا مارا ہوا ہو۔ پیٹ مورگن اس معیار پر پورا اترتا تھا۔ مسز وارڈمین نے اس کے بارے میں جو رپورٹ تیار کی تھی وہ اسے جیل بھی بھجوا سکتی تھی لیکن میں نے غور کیا تو احساس ہوا کہ اپنے طور پر باقاعدہ اس قسم کی سازش تیار کرنا اس کی ذہنیت سے ذرا بالاتر تھا اس کی طرف سے رد عمل کے اظہار کے طریقے کچھ اور ہی ہو سکتے تھے۔ کھڑکیوں کے شیشے توڑنا، گالیاں دینا، چیخنا چلانا اور راستے میں مسز وارڈمین کو تنگ کرنا تو اس کا رد عمل ہو سکتا تھا لیکن اتنے بڑے انداز میں سازش تیار کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔“ وہ سانس لینے کے لیے ایک لمحے کو خاموش ہوا۔ سب دم بخود کھڑے تھے۔ ”چنانچہ مجھے یقین ہو گیا کہ کوئی پیٹ مورگن کو استعمال کر رہا ہے۔“ بیومونٹ نے سلسلہ کلام جوڑا۔ ”ظاہر ہے اس شخص کے ذہن میں یہ خیال پیٹ مورگن کے بارے میں رپورٹ پڑھنے کے بعد ہی آیا ہوگا۔ اگر میرا نظریہ درست تھا تو مجھے زیادہ اشخاص کے درمیان اپنے مطلوبہ شخص کو تلاش نہیں کرنا تھا۔ ظاہر ہے وہ







جج کے جانے کے بعد بیومونٹ بولا۔ ”اب میں بھی چلتا ہوں۔“

”ابھی مت جاؤ مسٹر بیومونٹ۔“ جین کے لہجے نے جیسے بیومونٹ کے پیروں میں زنجیر ڈال دی۔

”ابھی مت جائیں بیومونٹ۔“ ٹیری بھی بول اٹھا۔

بیومونٹ بولا۔ ”تم دونوں کو میرا شکر گزار ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے تو یونہی گھر سے نکل کر ہاتھ پاؤں ہلانے کا بہانہ ڈھونڈا تھا۔ دو سال تک گھر کی چار دیواری میں مقید رہنے کے بعد آج زندگی کا کچھ لطف آیا ہے۔ میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔“

”مجھے معلوم ہے.....“ جین سر جھکا کر بولی۔

”لیکن میں تمہیں اس لیے رکنے کو نہیں کہہ رہی کہ تم نے مجھ پر احسان کیا ہے۔“

”اچھا..... ٹھیک..... ہے.....“ بیومونٹ نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے ٹیری کی کمر پر تھکی دی۔ ”اگر مجھے رکنے کی دعوت دے ہی رہے ہو تو ایک کپ کافی تو پلاؤ ننھے باورچی۔“

”ابھی لایا۔“ ٹیری نے مستعدی سے کہا اور کچن کی طرف دوڑ گیا۔

چونکہ اس کا اصل مقصد نہیں سمجھ سکا تھا اس لیے اپنے بیٹے کو اسٹیشن چھوڑ کر واپس آتے وقت اس نے راستے میں مجھے دیکھا تو بڑی سادگی سے یہ بات بھی بتادی۔

میری خوش قسمتی تھی کہ پیٹ کونرین پر سوار ہونے سے پہلے پکڑنے میں کامیاب ہو گیا ورنہ وہ پیش منظر سے غائب ہو جاتا اور حقیقت کا سراغ لگنا تقریباً ناممکن ہو جاتا۔

بیومونٹ نے قبر الو د نظروں سے پال ڈالنے کی طرف دیکھا۔ ”باہر دو پولیس والے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ اگر تم اپنی ٹانگوں پر چل سکو تو تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔ ورنہ میں تمہیں اٹھا کر لے چلوں گا لیکن اس صورت میں تم ہوش و حواس میں نہیں رہو گے۔ ہوش میں آنے کے بعد بھی ایک عرصے تک تمہاری ہڈیاں فریاد کرتی رہیں گی۔“

اس کے بعد بیومونٹ باقی لوگوں کی طرف متوجہ ہوا اور غصے سے تقریباً لرزاتے ہوئے بولا۔ ”اب براہ کرم آپ سب لوگ مجھے تشریف لے جائیں اور یہ بتانے کی کوشش نہ کریں کہ آپ اپنے طرز عمل پر بہت شرمندہ ہیں۔ اب جین کو آپ کی کھوکھلی معذرتوں سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔“

سب لوگ گردنیں جھکائے باہر چلے گئے۔ جج ڈیلے کمرے میں ہی رہا۔ وہ مسکراتے ہوئے بیومونٹ سے مخاطب ہوا۔ ”آخر تم پیٹ مورگن کی زبان کھلوانے میں کامیاب ہو ہی گئے۔“

”پیٹ جیسے لوگ صرف ایک ہی زبان سمجھتے ہیں اور اتفاق سے وہ مجھ آتی ہے۔“ بیومونٹ بولا۔

جج بولا۔ ”میں چند منٹ بعد اسکول جا کر اسپیشلی اسمبلی بلاتا ہوں اور مختصر سی تقریر کر کے صورت حال سے سب کو آگاہ کرتا ہوں۔“ وہ خاص طور پر جین سے مخاطب ہوا۔ ”تم جلدی سے تیار ہو کر اسکول پہنچ جاؤ۔“



# کاغذی رشتے

عامر زمان عامر

رشتے آسمانوں پر بنتے ہیں۔ یہ جملہ ہر دوسرے گھر میں بھٹی یا بھٹے کی شادی کے وقت عام بولا جاتا ہے مگر ہم میں سے کوئی اس کے معنی پر غور نہیں کرتا کہ ہم یہ کہتے ہوئے اللہ تعالیٰ کو اپنے غلط فیصلوں کا نامہ دار قرار دے رہے ہوتے ہیں۔ اللہ انسان کو پورے عقل و شعور کے ساتھ دنیا میں بھیجتا ہے تاکہ وہ جو بھی قدم اٹھائے سوچ سمجھ کر حالات کے تقاضوں کے مطابق اٹھائے اور پھر تقویٰ کرے اور اللہ کے فضل و کرم کا انتظار کرے۔

ان لمحوں کی روداد جب انسان اپنے فیصلوں پر خود سے نگاہیں چرانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

”آبیاری اگر یکسوئی اور صدق دل سے کی جائے تو خزاں رسیدہ جہازی بھی ہری ہو سکتی ہے انسان تو پھر انسان ہے لگاتار گرنے سے پانی کا ننھا قطرہ مضبوط چٹان میں چھید کر سکتا ہے تو تمہاری امید کی کرن مایوسی کے گھپ اندھیرے کو اجالے میں کیوں نہیں بدل سکتی۔“ اس نے بھرپور دل جوئی سے اپنی سہیلی کے منتشر خیالات کو یکجا کر کے اسے مطمئن کرنے کی پوری کوشش کی۔

”دل کے بہلانے کو یہ خیال اچھا ہے۔“  
زیرہ نے لہجے میں تنی بے یقینی کو شعر میں ڈھال کے پیش کیے۔

”بہت خوب محترمہ! شاعری میں بھی دلچسپی رکھنے لگی ہیں واہ..... واہ کیا کہنے۔“ اس نے خوب صورت داد سے موضوع بدلنا چاہا۔

”آہ.....“ شاعری جیسے انمول جذبے تو زندہ دل لوگوں کے اوڑھنے بچھونے ہوتے ہیں اور ہم تو کب کے زندوں کی فہرست سے خارج ہو گئے۔

”جو بھی ہے آج تم نے اپنے دل کی وضاحت شاعرانہ انداز میں کی ہے تو مجھے ایسے لگا کہ اگر تم خود میں تھوڑی ہمت پیدا کرو تو تمہارے اجڑے ہوئے

چمن میں پھر سے بہار آ سکتی ہے۔ دیکھو زیرہ! مجھے تمہاری پریشانی کا اندازہ ہے مگر دل و دماغ پر یہی غمگین کیفیت طاری رکھو گی تو مستقل ذہنی مریض بن جاؤ گی۔ ناامیدی خود پر حاوی کرو گی خوشیوں سے بھرے زندگی کے تمام رنگ اور احساس جیسے جذبے تم بہت پیچھے چھوڑ جاؤ گی۔ اپنے جذباتوں کی عمارت کو اپنے ہاتھوں سے مسمار مت کرو ورنہ گرے ہوئے مکان کی ایک ایک کر کے لوگ اینٹیں بھی اٹھا کے لے جاتے ہیں۔“

عناوہ نے انٹر کے بعد پڑھائی کو خیر آباد کہہ ڈالا اس کے والدین کی بہت خواہش تھی کہ وہ آگے پڑھے مگر اس کا دل پڑھائی سے اچاٹ ہو چکا تھا اس لیے اس کے والد نے ازدواجی بندھن میں باندھنے کا فیصلہ کیا مگر وہ ابھی شادی کرنے کے حق میں نہیں تھی اس نے اس فیصلے کے خلاف شدید احتجاج کیا۔

”امی! مانا کہ میں بڑی آپ کی طرح ذہین اور کتابی کیزا نہیں ہوں نہ ہی میں پڑھائی میں لائق ہوں مگر دنیا میں بہت ساری لڑکیاں اپنے والدین کی خواہش کے مطابق تعلیم حاصل نہیں کر پاتی تو کیا تعلیم ادھوری چھوڑنے کی سزا میں ان سب کی شادی





گزرتی اور جواب میں اس نے زنجیرہ کو بھی کھری  
کھری سنا دیں کہ تم ہی رہو کتابی کیرا مجھے فضول  
مشورے مت دوشادی کا اتنا شوق ہے تو خود کرا لو۔  
عمارہ نے چڑھاتے ہوئے منہ بنا کے جواب دیا تو اس  
کی بڑی بہن کے ساتھ ماں بھی کھلکھلا کے ہنس دی۔  
”عمارہ بیٹا! تمہاری آپنی سچ کہہ رہی ہیں یہ  
تمہارے ابو کا حتمی فیصلہ ہے اور بینیاں والدین کے  
گھر ہمیشہ تھوڑی بیٹھی رہتی ہیں۔ ایک نہ ایک دن تو  
بابل کا گھر چھوڑنا ہوتا ہے بس ہر والدین کی دعا ہوتی  
ہے کہ اس کی بیٹی کے خدا نصیب اچھے کرے۔  
تمہارے ابو نے رشتے کی بات بہت سوچ سمجھ کے  
کی ہے تمہاری آپنی ابھی پڑھ رہی ہے جب تعلیم مکمل  
ہونے کے بعد اس کی باری آئے گی تو دیکھا جائے  
گا۔ فی الحال تو تمہارے بڑے بھیا اور تمہارے ابو

کردی جاتی ہے۔ ماں مجھے نہیں کرنی شادی اور ویسے  
بھی آپنی مجھ سے بڑی ہیں ناں پہلے اس کی پھر بعد  
میں میری باری۔“ عمارہ نے بڑے لاڈ سے ماں کی  
ممتا بھری آغوش میں لیٹتے ہوئے کہا۔

”ارے واہ بھی کرے کوئی اور بھرے کوئی یہ کیا  
بات ہوئی انصاف کے تقاضے تو یہ کہتے ہیں کہ سزا  
صرف اسے ملنی چاہیے جس نے جرم کیا ہو۔ آج تک  
کبھی سنا ہے کہ مجرم کے بھائی یا بڑی بہن کو سزا ملی ہو  
بھئی ابو امی سمیت سب کی کتنی خواہش ہے کہ ہماری  
گڑیا بڑھے لکھے اسی گھر میں راج کرے مگر اب  
پڑھائی بھی نہیں کرنی تو اس کی سزا بھی تو تجھے ملے گی  
ناں آپنی کو کوئی قربانی کا بکرا سمجھ رکھا ہے۔“

ماں کے جواب سے پہلے ہی زنجیرہ نے اسے  
چھیڑنے کے لیے ناٹک اڑائی جو اسے سخت ناگوار





خالد چوہان میانوالی کا مشہور ڈاکٹر تھا خالد کے علاوہ اس کا سب سے بڑا بیٹا بھی اسی پیشے سے وابستہ تھا وہ اپنے چھوٹے بیٹے کو بھی اس مقدس پیشے سے جوڑنا چاہتا تھا۔ علی کی کامیابی کی صورت میں اس کا دیرینہ خواب پورا ہو گیا۔

سمندری سے واپس آنے کے دوسرے ہفتے ہی اس نے عمارہ کے ہونے والے سسرال کو میانوالی بھلا کے شادی کی تاریخ پکی کر دی۔ ایک ماہ کے اندر اپنے گھر کی ہوگئی لمحے اپنی رفتار سے سرکتے رہے عمارہ نے پھول سی بنی کو جنم دے کے اپنے سسرال کے سونے آنگن کو خوشیوں سے بھر دیا۔ انتہائی مختصر عرصے میں نا صرف اس نے سب کے دل جیت لیے بلکہ وہ سب کی آنکھ کا تارا بن گئی اسے والدین کی توقع اور اپنی سوچ سے بڑھ کے سکھ اور خوشیاں ملیں۔



”ماں مجھے چھوڑو تم بتاؤ بارش نہ آندھی آج تم کیسے ہو؟“ ارا گھر کا راستہ بھول گئی؟“ زبیرہ نے بجائے جواب کے پر شکوہ اندازہ میں الٹا سوال داغا۔ نگہت نہ صرف زبیرہ کی ماموں زاد بہن تھی بلکہ اس کی بچپن کی سب سے پکی دوست بھی تھی۔

”زبیرہ یار! ہم آپ کی طرح لائق پڑھا کو تو ہیں نہیں، ہمیں گھر کے کاموں سے فرصت ہی کب ملتی ہے۔ طعنہ تو ایسے مار رہی ہو جیسے تم نے ہمارے گھر آتے جاتے اپنے جوتے گھسا دیے ہوں۔ ہمارے درمیان کون سا دریا پڑتا ہے جسے تم عبور نہیں کر سکتی تھیں آپ کو تو گھر سے کالج، کالج سے گھر کے علاوہ کون سا کوئی کام ہوتا ہے اچھا چھوڑو کہیں جا رہی ہو؟“

”کیوں آپ کو نہیں پتا کیا آپ لوگ شادی میں نہیں جا رہے ہو؟“ اس نے نگہت کے بچس میں اور

تمہارے سسرال کے گھر رشتے کی بات پکی کرنے اسی ہفتے سمندری جا رہے ہیں۔ ہماری آرزو ہے کہ ہماری گڑیا کو اپنی سسرال میں اپنے والدین سے بڑھ کے سکھ نصیب ہوں اچھا شریف خاندان ہے لڑکا پڑھا لکھا سلجھا ہوا ہے سب سے اہم بات اپنا ذاتی کاروبار ہے۔ ہماری گڑیا راج کرے گی وہاں۔۔۔۔۔“

ماں نے تفصیل سے آگاہ کیا۔

”اور ماں جی سنا ہے دلہا بھائی بڑے خوب صورت بھی ہیں۔“ زبیرہ نے تنگ کرنے کے لیے پھر مداخلت کی۔

”ہونہ۔۔۔ جیسا بھی ہو مجھے کیا لینا دینا۔“ عمارہ نے اٹھ کے معصومیت بھری ادا سے کندھے اچکائے بڑی بہن کو چڑھاتے ہوئے ٹھینکا دکھایا اور پاؤں پیٹتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔



”مما، پاپا، آپ! بھی کہاں ہو سب لوگ ذرا باہر تو آ کے دیکھو کون آیا ہے؟“ علی کے چلانے پر سب سے پہلے اس کی ماں باورچی خانے سے باہر نکلی وہ اسے بازو میں تھام کے دائرے میں گھماتے ہوئے خوشی سے ناخن لگا۔

”ارے علی کیا بات ہے۔۔۔۔۔ ارے کیا کر رہے ہو میرے ہاتھوں پر لگا آنا تمہیں نظر نہیں آ رہا ہے۔“ سب شور سے باہر صحن میں جمع ہو کے اس کی خوشی کو حیرت سے ٹکنے لگے۔

”پاپا جی، مماجی بات ہی ایسی ہے کہ آپ سنو گے تو خوشی سے جھوم اٹھو گے“ میرا رزلٹ آ گیا ہے آج سے ہمارے گھر میں ایک نہیں دو نہیں بلکہ تین تین ڈاکٹر ہیں۔ آج چوہان ہاؤس میں ایک اور ڈاکٹر کا اضافہ ہو گیا۔“ اس خوش خبری کے بعد خالد نے اپنے ہونہار بیٹے کو فخر سے گلے لگالیا۔



اضافہ کیا۔

”کیا مطلب..... کون سی شادی کس کی شادی؟“ نگہت نے ہتھیلی کی ساری انگلیاں حیرانی سے گھما کے اشارے سے پوچھا۔

”لاہور پھوپو فاطمہ کی بیٹی نائلہ کی شادی پر جارہے ہیں کیا آپ لوگوں نے نہیں جانتا ہے؟“  
”اوہ ہاں مگر اس کی شادی میں تو پورے پانچ دن بڑے جین ابوبکر رہے تھے ہم تو ہفتے کی رات کو نکلیں گے مگر آپ شاید ان کے خاص مہمان ہیں اس لیے ہفتہ پہلے آپ کو بلایا ہے۔“

”نہیں خاص عام وان کوئی بات نہیں دراصل ابو اور بڑے بھیا کولاہور کوئی اپنا کام ہے وہ ہمیں سمندر عمارہ کے گھر چھوڑتے جائیں گے۔ کافی دنوں سے عمارہ اور اس کے شوہر فیصل ضد کر رہے تھے ہم بھی عمارہ فیصل کے ساتھ جمعے کی شام یا ہفتے کی صبح ہی پہنچیں گے تب تک ابو اور بھیا بھی آجائیں گے۔“  
”اچھا زوئی پھر تو لاہور ہی میں ملاقات ہوگی۔“  
اس نے چائے کا خالی کپ واپس ٹرے میں رکھتے ہوئے کہا۔



”پروین فاطمہ آپ سے نائلہ کی شادی پر آپ کی کوئی بات ہوئی تھی یا ان سے آپ نے کوئی وعدہ کیا تھا؟“  
”وعدہ کیا وعدہ..... اس نے جملہ دہرایا۔“

”آج آپ کا فون آیا تھا وہ کہہ رہی تھی کہ اس نے تم سے زنیہ کے رشتے کی بات کی تھی اور تم نے بھی آمادگی ظاہر کی تھی۔“

”ہاں خالد آپ کو بتانا بھول گئی آپا سے میری بات ہوئی تھی۔“

”پھر تم نے جواب میں کیا کہا آپا کو؟“ خالد اٹھ کے ٹیگ سے ٹیک لگا کے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

لڑائی

میاں بیوی کی لڑائی ہو گئی  
کئی دن بات چیت بند رہی ایک  
دن میاں کو صبح سویرے کہیں جانا  
تھا اس نے رات کو سوتے ہوئے ایک  
پرچہ پر لکھا۔ ”مجھے صبح سویرے  
پانچ بجے جگا دینا۔“ اور پرچہ  
بیوی کے سرہانے رکھ دیا۔

وہ صبح اٹھا تو دس بج رہے تھے  
اور اس کے سرہانے ایک پرچہ رکھا  
ہوا تھا اس پر لکھا تھا۔ ”اٹھ جائیں  
پانچ بج چکے ہیں۔“

توقیر احمد..... کالمو کی

”ہاں میں نے کہا کہ اس سے بڑھ کر ہمیں اور کیا  
چاہیے وہ تو بات آگے بڑھانے اور ہمارے گھر آنے  
کی بھی خواہاں تھی مگر میں نے کہا کہ میں آپ کے  
بھائی اور زنیہ سے بات کروں گی اس سلسلے میں زنیہ  
اور اعظم سے بھی بات کی ہے سب بچوں کی یہی  
رائے ہے کہ زنیہ اپنی بڑی چھوپو کی بہو بنے مگر زنیہ  
کا اعتراض ہے۔“

”اعتراض..... اسے کیا اعتراض ہے اور کیوں؟“  
خالد کی بھویں سکڑ گئیں مانتے تھے کہ بل گہرے ہو گئے۔

”اسے آپ اعتراض کہو یا..... وہ فی الحال شادی  
کے حق میں نہیں ہے دراصل وہ مزید پڑھنا چاہتی  
ہے۔ بہر حال حتمی فیصلہ تو آپ نے کرنا ہے ہمارے  
لیے تو خوشی کی بات ہے آپ کی بڑی بہن ہے اپنا  
خون ہے کسی چیز کی کمی نہیں اس گھر میں بلکہ میں تو  
کہتی ہوں ہماری بیٹی اس گھر میں عمارہ سے بھی زیادہ  
سکھی اور خوش رہے گی۔ سب سے بڑھ کے طارق



نائلہ کی شادی میں دیکھا ہے وہ تب سے تمہیں اپنی بہو بنانے کے لیے بضد ہیں میں کافی عرصے سے اسے ٹالتا آ رہا ہوں مگر اب مزید اسے میں نہیں ٹال سکتا۔ بیٹا! ہر کام کا ایک مقررہ وقت ہوتا ہے میں تمہاری پھوپھو کو زبان دے چکا ہوں اس لیے وہ اسی ہفتے منگنی کرنے آ رہے ہیں کیونکہ وقار بھی انگلینڈ سے تین ماہ کی چھٹی پر آیا ہوا ہے اس لیے وہ جلدی کر رہے ہیں۔ مجھے امید ہے تمہیں اپنے پاپا کے انتخاب اور فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ وہ اپنے فیصلے سے آگاہ کر کے چلا گیا مگر زنیہ کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس کا باپ اس کی رائے جاننے کے لیے آیا تھا یا اپنا حکم صادر کرنے آیا تھا۔

اسی رات وہ ایک پل بھی سکون سے نہ سو سکی وہ جاتی آنکھوں سے اپنے ٹوٹتے ہوئے خوابوں کی گرچیاں روح تک محسوس کر رہی تھی۔ بظاہر تو انسان فطرتاً زاد پیدا ہوا ہے اس اعتبار سے اسے جینا اپنی مرضی سے اپنی زندگی کے اچھے برے فیصلے کرنے کا پورا حق حاصل ہے مگر روزمرہ کے معاملات میں اسے محرومی اور غلامی کا احساس تب ہوتا ہے جب بعض معاملات میں اس سے اس کی رائے کو مسترد کر دیا جاتا ہے اور زبردستی اس پر اپنا فیصلہ مسلط کیا جاتا ہے اس کے ساتھ بھی وہی ہوا ہے۔ اس کے باپ کے ایک فیصلے سے اس کے مستقبل کے نہری سپنے گھوٹ میں چکنا چور ہو گئے اس قدر محرومی اور مایوسی کا احساس اسے اندر سے مسلسل توڑ رہا تھا۔ آج تک اس کے باپ نے اس کی ہر بات مانی تھی اس کی ہر خواہش کا احترام کیا تھا۔ وہ تین بھائیوں اور ایک چھوٹی بہن کے باوجود گھر بھر میں سب کی لاڈلی تھی۔ سب کو اس کی قابلیت، مستقبل کی منصوبہ بندی اور ذہین ہونے پر ناز تھا مگر کسی کے خواب اور ارمان رشتوں کے تقدس

شریف اور برسر روزگار ہے باقی جو آپ بہتر سمجھیں۔“ تمام صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے اس نے گیند خالد کے کورٹ میں ڈال دی۔

”ہونہہ..... تو یہ بات ہے اچھا کچھ سوچتے ہیں۔“ خالد نے گہری سانس خارج کرتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

اس کے بعد تو خالد کی بڑی بہن کے فون کے ذمہ داری سلسلے شروع ہو گئے ایک روز فاطمہ نے میاؤں آنے کی خواہش ظاہر کی تو خالد نے کہا۔

”آپا ایسی بھی کیا جلدی ہے گھر والی بات ہے۔ گھر کے بچے ہیں پرین نے سب سے بات بھی کی ہے تقریباً کبھی راضی بھی ہیں بس ذرا زنیہ کی پڑھائی کا مسئلہ ہے اس لیے کچھ دن آپ صبر سے کام لیں اس کے امتحان بالکل قریب ہیں۔ اس کے بعد اسے راضی کرنا مشکل نہیں ہے اس کا یہ غدر بھی جائز اس سے پہلے میں آپ کو ہاں یا ناں میں کوئی حتمی جواب نہیں دے سکتا ہوں۔“ خالد کے دو ٹوک الفاظ کے بعد فاطمہ نے اپنی خواہش پر فل اسٹاپ لگاتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے خالد! زنیہ کے امتحان کے فوراً بعد بات ہوگی مجھے انتظار رہے گا۔“

امتحان کے بعد خالد نے زنیہ سے بات کی تو زنیہ نے ایک بار پھر انکار کرتے ہوئے کہا۔

”ابو جی! مجھے ابھی شادی نہیں کرنی ہے میرا مستقبل میرے خواب جس کے لیے میں اتنی محنت کر کے آج یہاں تک پہنچی ہوں۔“ مگر خالد نے پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”زوبی بیٹا! مجھے علم ہے کہ میری بیٹی بہت قابل ہے لائق ہے مجھے تم پر فخر ہے۔ تمہارا گریجویٹیشن اچھے نمبروں سے ہو گیا ہے۔ میں آپ کے جذبات سمجھ سکتا ہوں مگر جب سے تمہاری بڑی پھوپھو نے تمہیں



پر قربان کر دینا سب سے بڑی خرابی ہے ہمارے معاشرے میں نازک رشتوں کی بات ہو یا گھریلو معاملات کا مسئلہ قربانی ہمیشہ عورت کے حصے آتی ہے۔ زنیہ اپنے باپ کے فیصلے کو مقدر سمجھ کے اپنی تمام آرزو میں مشرقی اطوار کی نذر کرتی ہوئی اپنے ہونٹوں پر صبر کی مہر لگائے بدن پر والدین کا عطا کردہ لباس فائزہ زیب تن کر کے طارق کی دلہن بن کے بابل کے گھر سے رخصت ہو گئی۔



خالد چوہان کے تین بیٹے دو بیٹیاں کل متاع حیات تھی۔ ایک بیٹے اور نثارہ کا فرض وہ پہلے ہی ادا کر چکا تھا۔ زنیہ کی رخصتی سے وہ ان اہم فریضے سے سرخرو ہو گیا بیٹیاں جواب جوان ہو جائیں تو والدین کے لیے بوجھ بن جاتی ہیں۔ ان کی راتوں کی نیند اڑ جاتی ہے ہر والدین کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کی بیٹی ان کے جیتے جی اپنے گھر کی ہو جائے۔ اسے اچھا سسرال ملے اسے سکھ نصیب ہو اس لیے زنیہ کے والدین نے جو فیصلہ کیا اس کے بہتر مستقبل اور بھلائی کے لیے کیا تھا۔ فاطمہ خالد چوہان کی سب سے بڑی بہن تھی جو پنڈی بھٹیاں میں مقیم تھی۔ فاطمہ کے خاوند کا انتقال ہو چکا تھا اس کے دو بیٹے طارق وقار اور ایک بیٹی کشمالہ تھی۔ طارق کا اپنے ہی شہر میں اپنا کاروبار تھا وقار گزشتہ تین سال سے انگلستان میں تھا۔ کشمالہ ابھی پڑھ رہی تھی وقار ہر سال کے آخر میں دو ماہ کے لیے پاکستان آتا تھا مگر اس بار اپنے بھائی کی شادی کے لیے اس نے ایک ماہ کی چھٹی زیادہ لے لی تھی۔ طارق عام شکل و صورت سانولے رنگ کا بچی عمر کا مرد تھا جبکہ زنیہ گورے چٹے رنگ کی تیکھے نقوش کی خوب صورت لڑکی تھی۔ طویل قامت لائے گئے سیاہ بال اس کے خوب

صورت حسن میں اور بھی اضافہ کر رہے تھے۔ طارق اور اس کا کوئی جوڑ نہ تھا مگر پھر بھی اس نے اپنے گھر والوں کی خوشی کی خاطر زہر کا گھونٹ آنکھیں بند کر کے پی لیا۔ آج زنیہ کی اس گھر میں پہلی رات تھی گو کہ پہلے بھی اس کا اس گھر سے گہرا رشتہ تھا مگر نجانے کیوں آج ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ تنہائی کے صحرا میں اتر گئی ہو۔ فاطمہ اسے مسہری پر بٹھا کے مہمان خواتین کے جھرمٹ میں گھل مل گئی ابھی وہ ٹھیک سے سنبھل کے بیٹھ بھی نہیں پائی تھی کہ اس کی اکلوتی نند کشمالہ اپنی سہیلیوں کی فوج کے ساتھ آ پہنچی۔

نوبیا ہتا دلہن کو دیکھنے کا اشتیاق خواتین کم عمر لڑکیوں میں بہت زیادہ ہوتا ہے۔ کشمالہ کی سہیلیاں بھی منہ دکھائی کی ادائیگی کے لیے سب سے پہلے د اور ہو چکی تھیں۔ خواتین میں دلہن کو دیکھنے میں پہل کا عنصر بھی نمایاں ہوتا ہے وہ پورے محلے میں بعد میں یہ خبر بڑے تازے سے بیان کرتی ہیں کہ فلاں کی بہو اور فلاں کی دلہن کو سب سے پہلے میں نے دیکھا تھا سب سے پہلے تحفہ میں نے دیا تھا۔ لڑکیوں کی محفل زعفران جاری تھی مگر ان کے حصار میں زنیہ کا دم گھٹنے کے قریب تھا۔

وہ دلہن کے بھاری بھر کم سرخ جوڑے میں بیٹھی تھک چکی تھی وہ کشمالہ اور اس کی سہیلیوں کو منع بھی نہیں کر سکتی۔ ابھی ان کی شرارتیں اور تبصرے جاری تھے رشتہ دار اور محلے کی دیگر خواتین کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کشمالہ تو اپنی نئی نوبلی بھابی کے ساتھ چمٹ کے بیٹھ گئی اس کا زنیہ کو اتنا فائدہ ضرور ہوا تھا کہ اس سے پوچھے گئے سوالات میں سے بیشتر کے جوابات کشمالہ ہی دیتی رہی۔ یہ سلسلہ رات گئے جاری رہا ہر گزرتے لمحے خواتین کی تعداد میں اضافہ



قد رتھ کاوٹ کے باوجود اسے نیند بھی نہیں آرہی تھی۔  
 دھیمی سی آہٹ سے وہ چونک اٹھی اور سہم کے اٹھ  
 بیٹھی۔ اپنے ماضی کے سنہریے خواب وہ اپنے  
 والدین کی خوشی پر نچھاور کر چکی تھی۔ دل و دماغ سے  
 اس گھر اور طارق کو اپنا مان کے نئی زندگی کے سفر پر  
 پہلا قدم رکھ چکی تھی۔ آج اس کی سہاگ رات تھی یہی  
 وہ خوش نصیب رات تھی جس کا خواب ہر لڑکی دور  
 بلوغت کی سیڑھیاں چڑھ کے اپنے من میں سجاتی  
 ہے۔ یہ لمحے اور ہر کیف تصورات کی مٹی سے  
 خواہشات کے دیرانے میں چاہت کے آشیاں تعمیر  
 کرتی ہیں جس کے کشادہ آنگن میں نت نئے  
 حسرتوں کے پھول کھلتے ہیں، کلیاں مہبتی ہیں جس کی  
 معطر خوشبو سے آرزوئیں مچلتی ہیں۔ وہ جوانی کے تپتے  
 تنور میں جل بھن کے ٹھنڈے ہو کے آہیں بھر رہی تھی  
 انتظار کی گھڑیاں تلواریں بن کے آنکھوں میں لٹک رہی  
 تھیں۔ انتظار کرتے اس کی آنکھیں بند ہونے لگی  
 رات کے نجانے کون سے لمحے آرزوؤں سے لپٹے بند  
 کمرے کا دروازہ ہلکی سی آہٹ کے ساتھ کھلا جیسے  
 مدتوں اور بد نصیب گھر کا دروازہ کھلتا ہے۔ طارق  
 کپڑے تبدیل کر کے جونہی پلٹا زینیرہ نے حیرت  
 سے اپنی آنکھیں کھلیں دیر اسے دیکھتے ہی خود میں  
 سمٹ کے اٹھ کے بیٹھ گئی۔

”میں دوستوں کے پاس بیٹھا تھا وقت گزرنے کا  
 احساس ہی نہیں ہوا۔“ پاس بیٹھتے ہی اس نے سلام  
 کے بعد جیب میں ہاتھ ٹٹولنے لگا۔ ”یا آپ کے لیے  
 میری طرف سے پہلا تحفہ ہے۔“ اس نے ہاتھ آگے  
 بڑھایا۔ کوئی رد عمل نہ پا کر خود ہی شرمندہ ہو کے اس کی  
 کلائی پکڑ کے اسے انگوٹھی پہنادی۔ اس کے چھوتے  
 ہی بجلی کی طرح کرنٹ کی ایک لہر زینیرہ کے رگ رگ  
 میں سرایت کر گئی۔ اس نے شرما کے فوراً آنکھیں موند

اور کی ہوتی رہی مگر کشمالہ اس کے ساتھ چپکی رہی۔  
 وقار کے آنے سے خواتین سے اس کی خدا خدا  
 کر کے جان چھوٹی، اس کے اندر آتے ہی خواہش  
 اٹھ گئیں۔ اس نے کشمالہ پر بھی رعب جھاڑتے  
 ہوئے اسے اٹھا دیا۔

”بھئی بھابی تھکی ہوئی ہیں اسے تھوڑی دیر آرام  
 بھی کرنے دو اب اس نے ہمیشہ اسی گھر میں تمہارے  
 ساتھ بٹنا ہے۔“

”یہ نمونہ کہاں سے ٹپک پڑا بس اس کی کمی رہتی  
 تھی۔“ وقار کے بڑھتے قدم دیکھ کے وہ ناگوریت  
 سے بڑبڑائی۔

”بھابی کہیے کوئی پریشانی تو نہیں ہے ناں آپ  
 نے کھانا بھی ٹھیک طرح سے نہیں تھایا۔ گھر والوں کی  
 یاد آرہی ہے یا طبیعت۔“ وہ سانس کھڑا کن  
 اکیوں سے مسلسل گھور رہا تھا جواباً وہ خاموش رہی۔  
 وقار بھرپور کوشش سے اسے متوجہ کر رہا تھا اس سے  
 پہلے کے اس کی خاموشی کا سکوت ٹوٹنا ماں کی آواز پر  
 وہ چونک گیا۔

”وقار تم یہاں کھڑے ہو اور میں تجھے پورے گھر  
 میں ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔ جاؤ مہمانوں کے پاس  
 بیٹھو اور اپنے بھائی کو اندر بھیجو۔“ وقار سعادت مندی  
 سے نظریں جھکائے ”جی امی“ کہہ کر کمرے سے باہر  
 نکل گیا۔



رات سبک رفتاری سے نقطہ انجام کی جانب رواں  
 تھی۔ ٹھہرے ہوئے لمحے پانی کی طرح مدہم روشنی  
 میں ارتعاش پیدا کر رہے تھے۔ بیٹھے بیٹھے تھک گئی تو  
 وہ پلنگ پر نیم دراز ہو گئی مگر اس کی نگاہیں بدستور  
 دروازے پر مرکوز تھیں۔ پھولوں سے جی خوب صورت  
 مسبری پر اس کا مخملی بدن کسی آہٹ کا منتظر تھا۔ اس



ارمانوں کی بیج پر خوب صورت مسہری کی آغوش میں لیٹے تھے مگر دونوں کے درمیان غیر محرم کی دیوار اب بھی حائل تھی۔ زبانیں گنگ ہو چکی تھیں بہت ساری ان کہی باتیں اور دل کے سندر جذبے اندر ہی دم توڑ رہے تھے۔ الفاظ کے کتنے موتی لبوں کے کنارے اظہار کے لیے پرتول رہے تھے۔ زنیہ کو کیا خبر تھی جس شخص کے ساتھ اس کا رشتہ ازدواج جوڑا گیا تھا وہ رسم و رواج کا پاسدار تھا مگر حقیقت میں ان تلوں میں تیل نہ تھا۔ وہ اس حقیقت سے نا آشنا تھی کہ جسے سایہ دار درخت سمجھ کے اس کی چھاؤں تلے پناہ ڈھونڈ رہی تھی وہ اجڑی ہوئی وہ جھارڑی تھی جس پر نہ کبھی بہار آ سکتی تھی نہ اس سے سبز پتوں یا پھل پھول کی امید کی جاسکتی تھی۔ رات کے گزرتے ہوئے لمحے اس کے جیون نبر کی خوشیاں سمیٹ کے اپنے ساتھ لیے چارے تھے سو گواریت سے بھرے پل اس کی نا واریت میں اضافہ کر رہے تھے۔



کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے زنیہ نے جوانی کے خمار کو انگڑائی میں ڈھانچ لیا نیم مردہ آرزوؤں کا پہلا سورج طلوع ہوا جس کی جھلپانی سنہری کرنیں اس کے چہرے کی معدوم تمازت کو بحال نہ کر پائیں۔

”ارے زنیہ باجی! آپ کا میک اپ تو بالکل اسی طرح ہے تمہاری تو لالی بھی نہیں اتری ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب مزید نیپ ٹاپ (میک اپ) کی ضرورت نہیں ہے۔“ بیوی پارلروالی مائزہ نے اسے دیکھ کے بھونڈے انداز میں فقرہ کسا۔ زنیہ نے مرجھائے ہوئے چہرے سے خود پر جبر کرتے ہوئے پھسکی سی مسکراہٹ سجائی اور کہا۔

”ہاں بہن! میک اپ کی کوئی ضرورت نہیں ہے آپ چائے پانی پی کے جاسکتی ہو۔“

لیں، کچھ دیر کی ایک طرفہ رسمی گفتگو کے بعد اس نے اٹھ کے دروازہ اور لائٹ بند کر دی اور اس کے ساتھ پلنگ پر لیٹ گیا وہ دہن کے بھاری لباس سے آزاد ہو کے نارمل کپڑے پہن کے ہلکی پھلکی ہو کے سونا چاہتی تھی مگر وہ اپنی خواہش کا اظہار کیسے کرتی باہم بچوں میں اجنبیت کی فضا تھی۔ وہ چپ سادھے لیٹی رہے کہ شاید طارق کو خود ہی احساس ہو جائے۔ عورت فطرتاً شرم و حیا کے لبادے میں لپی رہتی ہے مگر یہ طور خاص کچھ ایسے مواقع ہوتے ہیں جن پر وہ شرماہٹ کی دیوار کے پیچھے چھپی ہوتی ہے۔

عمل اور رد عمل دونوں صورتوں میں اس کا لہجہ منتظر ہوتا ہے اس کے بعد ان دونوں کے درمیان رسمی غیر رسمی کوئی بات نہ ہوتی۔ زنیہ کو مرد کا یہ پہلا روپ اور شادی کی پہلی رات کا منظر بڑا انوکھا لگا تھا۔ کچھ دیر گہرے سکون نے زنیہ کو عجیب کیفیت سے دوچار کر دیا اسے محسوس ہوا کہ طارق کا پورا جسم بڑی طرح کانپ رہا ہے اس نے تشویش سے کمرٹ بدلی اس کا دل چاہا۔ وہ اس سے بات کرے مگر اندر کی بات صحن میں ہی اٹک کے رو گئی۔ زنیہ نے جو بھی منہ اس کی طرف کیا اس نے بھی کمرٹ بدلی اور اس کی طرف پیٹھ کر کے لیٹ گیا۔ ایک لمحے کے لیے زنیہ کو ایسے لگا جیسے کسی نے اسے پکڑ کے گھپ اندھیری قبر میں اتار دیا ہو جہاں زندگی نہ ہی زندگی کا تصور جہاں خواہشات کا کوئی مول تھا نہ جذبات کی کوئی قدرو قیمت بس کال کوٹھڑی کے اندھیرے پنجرے میں اس کا وجود قید ہے۔ دل میں ہزار طرح کے دوسے ناگ کی طرح اسے ڈس رہے تھے۔ آنکھوں میں اشکوں کے طوفان اٹم اٹم کے پلکوں کے ساحل سے ٹکرا کے سوچوں کے سمندر میں گر رہے تھے۔ ایک چھت



سامنے متا کا دامن پھیلائے اپنے بیٹے کی غلطیوں پر معافی کی بھیک مانگ رہی تھی۔

”دیکھو زنیہ! ایک عورت ہونے کے ناتے میں تمہارا درد اور پریشانی سمجھ سکتی ہوں سچ پوچھو تو تمہاری اصل مجرم تمہاری پھوپھو ہے۔ میں نے اتنی ضد اور منت سماجت کر کے اپنے بھائی سے اس بے شرم کے لیے تمہارا ہاتھ مانگا تھا مجھے کیا خبر تھی۔ میں خود اربانوں کا گلہ گھونٹ کے تمہیں ایسے شخص کے لیے باندھ رہی ہوں جو تمہیں از دواچی خوشیاں دے سکتا ہے نا وہ تمہارے جذبات سمجھ سکتا ہے بہر حال میرے لیے تم کوئی غیر نہیں ہو میرے چھوٹے بھائی کی بیٹی ہو ایسے میں تم اگر گھر چھوڑ کے جاتی ہو تو بھائی پر کیا گزرے گی۔ میں اسے کیا جواب دو گی جہاں اتنے دن والدین کی خوشی اور اس گھر کی عزت کے لیے تم نے اتنی بڑی قربانی دی ہے وہاں کچھ دن اور صبر سے ہمارا ساتھ دینا ہوگا اس بے غیرت نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا۔ اپنے ساتھ ہم سب کی زندگی عذاب میں ڈال دی ہے دیکھو رشتے کہہ دینے سے ختم نہیں ہو جاتے۔ اس راز کے کھل جانے سے جہاں معاشرے میں ہماری ناک کٹے گی وہاں تم پر بھی انگلیاں اٹھیں گی۔ کوئی ہمیں برا کہے گا تو کوئی تم پر پکچڑا چھالے گا۔ اس لیے ہم سب کی عزت اب تمہارے ہاتھ میں ہے۔ میں جانتی ہوں جب سے ہمیں پتا چلا ہے ہم اس کے علاج کے لیے پیسہ پانی کی طرح بہا رہے ہیں! یقین کرو مجھے اس کے کرتوتوں کا علم ہوتا تو میں تجھے کبھی اس آگ میں نہ جھونکتی۔ دیکھو وہ پیدا کنی بیمار نہیں تھا بچپن کے غلط کاموں اور بری صحبت نے اسے ناکارہ بنا دیا ہے اب جس حکیم سے دوا لے رہیں اس نے یقین دلایا ہے کہ چند ماہ کی بات ہے اس کے علاج سے بہت جلد اس کی کھوئی

کچھ دن اپنے والدین کے گھر گزارنے کے بعد طارق کا چھوٹا بھائی وقار اور اس کی ماں اسے واپس اپنے گھر لے آئے۔ آج اسے اس گھر میں آئے ہوئے دوسرا دن تھا طارق گھر میں نہیں تھا۔ وہ بوجھل قدموں سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ دہری اذیت میں گرفتار تھی شام کے سائے گہرے ہونے لگے مگر طارق ابھی تک نہ آیا اس کی کوئی خبر وہ رات بھی اس نے کانتوں کے بستر پر کروٹیں بدلتے گزر گئی۔ آخر ایک رات اونٹ پہاڑ کے نیچے آ ہی گیا زنیہ اپنے کمرے میں سوئی ہوئی تھی وہ چوروں کی طرح چپکے سے دروازہ کھول کے جونہی اندر داخل ہوا اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ حیران کن نظروں سے اسے دیکھنے لگی اس سے پہلے کہ اس کی برداشت دم توڑ جاتی وہ اس کے سامنے زمین پر بیٹھ گیا۔ اس نے بے بسی سے اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے اور عورتوں کی طرح زار و قطار رونے لگا۔

”زنیہ مجھے معاف کر دو میں تمہارا مجرم ہوں۔ میں تمہارے قابل نہیں ہوں میں شادی کے قابل نہیں ہوں۔ مجھے میری غلط کاریوں اور غلط کاموں کی سزا مل رہی ہے میں تو مرد کہلانے کا بھی حق دار نہیں ہوں۔ میں تمہارا مجرم ہوں مجھے.....“ زنیہ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے وہ بت بنی بیٹھی آنکھیں پھاڑے اسے دیکھے جارہی تھی۔ اس کی آنکھیں پتھرا گئیں آنسو آنکھوں میں جم کے رہ گئے مگر اندر سے وہ مسلسل ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہی تھی۔ اس کی حالت ایسی تھی جیسے کانٹو تو بدن میں خون نہ ہو۔ تقدیر نے اس کے ساتھ کتنا بھیانک مذاق کیا تھا۔ وہ مسلسل ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی وہ اپنی عزت اور والدین کی خوشی کے لیے ہر دکھ سہی گئی طارق کی نامردی کا عقد پورے گھر پر کھل چکا تھا۔ اس کی ماں اپنی بہو کے



ہوئی قوت اور شباب لوٹ آئے گا۔ تم دل چھوٹا مت کرو بہت جلد تمہاری اجڑی ہوئی زندگی میں پھر سے بہا آئے گی۔“

زنیرہ کو سمجھاتے ہوئے اس کی ساس کچھ اضافے کے ساتھ حکیموں کے رنے رنائے جملے دہرا کے روز اس کے سامنے حوصلے کی دیوار کھڑی کرتی رہتیں۔ زنیرہ کو محرومیت کے احساس نے اندر سے کھوکھلا کر ڈالا تھا اس کے نزدیک خوشیاں بالکل خواب بن کے رہ گئی تھیں۔ بالکل ایسے جیسے زندگی ایک جھٹکے سے اک نئے موڑ پر آ کے رک گئی ہو جیسے کسی بندگی میں زندگی کی شام ہو گئی ہو جہاں آگے بڑھنے کا راستہ نہ واپس لوٹنے کا حوصلہ ہو۔ اس کے اندر اٹھنے والے سوالوں کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ وہ ہر رات آہوں کی سیج پر سسکیوں میں ڈوب کے آنکھوں میں رات گزار کے اس امید کے ساتھ اٹھتی شاید آج سورج کی پہلی کرن اس کے لیے مسرتوں کی نوید بن کے پھوٹے گی۔ سوالوں کا کیا ہے بعض آنکھوں میں بسے ہوئے خوابوں کی طرح ہوتے ہیں جو کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوتے۔ کچھ سوال ذہن میں قطرہ قطرہ ٹپک کے ذہن کے لیے بوجھ بن جاتے ہیں۔ اس کا ذہن بھی ایسے ہی بوجھ تلے دبا تھا اسے اس گھر اور ماحول کا حصہ بنے سال سے زائد عرصہ بیت چکا تھا اس کی پریشانی کی گتھیاں سلجھانا ناممکن تھیں آنسوؤں اوتا ہوں کا حجم روز بروز بڑھتا جا رہا تھا اس کے پاس بظاہر تو سب کچھ تھا دولت عیش و عشرت گھر میں سب تھا اگر کمی تھی تو وہ بھی سکون کی دولت جو کسی بھی قیمت پر دنیا کے کسی بازار سے بھی خریدی نہیں جاسکتی ہے۔

وہ از دو اجی خوشی سے محروم تھی جس کے بغیر عورت خود کو غیر محفوظ اور ادھوری سمجھتی ہے۔ عورت اپنے سہاگ اور گھر کی خوشی کے لیے سب کچھ سہہ جانی

ہے ہر بات پر سمجھوتہ کر سکتی ہے مگر از دو اجی راحت چھن جانے پر نہیں کیونکہ یہ اس کا بنیادی شرعی حق ہے۔ عورت اس درخت کی مانند ہوتی ہے جس کی جڑ زمین کے اندر چھپی ہوتی ہے مگر سارے درخت کے وجود کو مٹی میں اپنے اندر سموئے ہوتی ہے۔ مرد اس درخت کا تنا اور بچے اس کا پھل پھول ہوتے ہیں مگر زنیرہ کی مثال خزاں رسیدہ سوکھی اجڑی ہوئی جھاڑی کی تھی جو تنے پھل پھول سے محروم تھی۔ عورت کی ذات میں یہ خلا نہ برداشت ہوتا ہے اسی محرومی کا دیمک اسے اندر سے کھوکھلا کر رہا تھا۔



”ارے شبنم وہ عمارت تو کب کی زمین بوس ہو چکی اب لوگ اس کی اینٹیں اٹھا کے لے جائیں یا اس کا تمام خام ملبہ اٹھا کے لے جائیں مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ مجھے تو اس ہجرے نے کہیں کا نہیں چھوڑا جی سکتی ہوں نہ مر سکتی ہوں۔ اگر والدین کو اصلیت سے آگاہ کرتی ہوں تو خون کے رشتے پر اعتبار اٹھ جانے کا ڈر ہے۔ یہ بھی نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے بھائی بہن کے رشتے میں کوئی دراڑ پڑے مگر اسے ناتواں کندھوں پر اتنا بھاری بوجھ لاد کے زندگی کے گتھن راستوں پر چلتے رہنا بھی محال ہے۔ مجھے تو سمجھ نہیں آ رہا ہے کہ میں کس کی بتیلی پر اپنی حسرتوں کا خون تلاش کروں۔ میرے ابو کی بتیلی پر جس نے ایک بہن سے اپنا وعدہ اور رشتہ نبھایا اپنی پھوپھو کو کوسوں جس نے ایک نامرد کو میرے پلو سے باندھ دیا یا طارق کو قصور وار ٹھہراؤں جس نے سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے میری زندگی کو دکھوں کی دلدل میں ڈھکیل دیا۔“

”ہاں زنیرہ! تیری بات ٹھیک ہے تو سچ کہتی ہے پتا تو تمہارے مرد کو بھی تھا اپنی کارستانیوں کا اس نے



واقعی جان بوجھ کے تمہاری ہستی مسکراتی زندگی کو عذاب بنا دیا ہے۔“ زنیہ کے جواب پر اس نے بھی ہاں میں ہاں ملا دی۔

”مرد... تم اسے مرد کہہ رہی ہو؟ مرد ایسے ہوتے ہیں، مرد تو ایسا لفظ ہے جس کے لبوں پر آ جانے سے ایک سہاگن کے تن بدن سے سرشاری پھوٹی ہے۔ لفظ مرد سے ایک تحفظ کا احساس ہوتا ہے اس سے آنکھوں کی جھیل کے گرد ان گنت امیدوں کے جگنو چمکنے لگتے ہیں۔ مرد تو عورت کی چار دیواری کے لیے ستون ہوتا ہے جس سے اس کی زندگی کی عمارت مکمل ہوتی ہے۔ مرد تو عورت کی حفاظت کرتا ہے عورت کو خوش رکھتا ہے اس کے خواب اس کے ارمان پورے کرتا ہے۔ اس کے جذبے اس کی قوت اور حوصلہ بڑھاتا ہے۔ وہ اسے دنیا کے مقابلے کے لیے اپنے برابر لا کھڑا کرتا ہے۔ مرد تو وہ لفظ ہے جس کے ادا ہونے سے ہر چیز اس کی طرف کھینچی چلی آتی ہے ہر شے خود مرد کی طرف سفر کرتی ہے۔ اصل مرد وہ نہیں ہوتا جو چاند مارے توڑنے کی بات کرے بلکہ مرد وہ ہے جو زمین آسمان عورت کے قدموں میں لا کے رکھ دیتا ہے پھر خود اس کا آسمان بن جاتا ہے ایسے بزدل کو انسان کہنا مردانگی کی توہین ہے۔“ زنیہ نے جی بھر کے اپنے دل کا اہال نکال لیا تھا۔



دھیرے دھیرے جب اس کے سرال کو پختہ یقین ہو گیا کہ اس نے اپنے ہونٹ ہمیشہ کے لیے سی لیے ہیں تو الٹا چور کو تو ال کو ڈانٹنے والا معاملہ بن گیا۔ وہ اچانک گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ہوئے اس کے گرد زندگی کا دائرہ جنگ کرنے لگے کیونکہ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ طارق کسی طور بھی ٹھیک ہونے والا نہیں ہے اس کے بعد وہی پھوپھو جو سگے رشتوں کے

حوالے دے کر صدقے داری جاتی تھیں وہ ہی روایتی ساس بہو کے انداز اپنانے لگی بات بات پر گالی گلوچ لڑائی جھگڑے معمول بن گیا۔ نوبت یہاں تک آ گئی کہ سونے اوڑھنے بچھونے سے لے کر کھانے پینے پہننے تک ہر بات میں کیڑے نکالنے شروع ہو گئے۔ ہر روز کی تکرار نے اس کی الجھنوں میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ اس کی اچھائیاں صبر سب کچھ بالائے طاق رکھتے ہوئے انہوں نے زندگی اجیرن بنا دی۔ اگلے سال کے آخر میں وقار ایک ماہ کی چھٹی منانے واپس آ گیا جو اس کی جملہ پریشانی میں ایک اور اضافہ تھا۔ اس نے زنیہ سے ایک کپ چائے لانے کی فرمائش کی اس وقت گھر میں ان کے سوا کوئی اور موجود نہ تھا اس کی امی طارق کے ساتھ دوا لینے گئی تھیں کشمالہ ٹیوشن پڑھنے گئی تھی وہ چائے رکھ کے واپس پلٹنے لگی تو وقار نے اس کا راستہ روک لیا عجیب نظروں سے اس کا سر تاپا جائزہ لینے لگا۔

”وقار بھائی یہ کیا تمیزی ہے... بیٹے میرا راستہ چھوڑیے۔ مجھے ایسا وابیات مذاق بالکل پسند نہیں۔“ یہ مذاق نہیں ہے میں کتنے دنوں سے موقع کی تلاش میں تھا آج مشکل سے موقع ملا ہے۔“ اس نے ڈھٹائی سے کہا۔

”شرم کرو کیا بک رہے ہو۔ تمہاری بڑی بھابی ہوں تمہاری ہمت کیسے ہوئی ایسے بات کرنے کی۔“ ”بھابی... کون بھابی... کیسی بھابی... مجھے تمہارے اور طارق کے درمیان از دو ابی خلیج کا اچھی طرح علم ہے۔ ارے بھول جاؤ اسے ان تلوں میں تیل نہیں ہے۔ اپنی خوب صورت جوانی پر ترس کھاؤ دیکھو تمہارے سامنے وقار کھڑا ہے تمہیں دل و جان سے چاہتا ہے۔ میں تمہیں وہ تمام خوشیاں وہ سب راحتیں دوں گا جس کے لیے تم ترس گئی ہو۔ تمہارے



کھلتے شباب میں جاہت کے سارے رنگ بھردوں گا گھبراؤ نہیں میں تجھے وہ سب کچھ دوں گا جس سے آج تک طارق نے تمہیں محروم رکھا ہے۔ فرق بس اتنا ہوگا بچے میرے ہوں گے نام طارق کا ہوگا۔ تم جب جاہو اس سے چھٹکارا حاصل کر کے مجھ سے شادی کر سکتی ہو۔“

”اپنی گندی زبان کو لگام دو ورنہ..... تم طارق سے بھی لڑ جاؤ گے میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ میں میں جانور نہیں ہوں جسے تم بھیڑ بکری کی طرح جہاں مرضی باندھ کے اپنا مقصد حاصل کر سکتے ہو۔“ وہ سنی ان سنی کر کے آگے بڑھا اس کی طرف دونوں بازو پھیلا دیئے اگلے لمحے زنا نے رار پھڑاس کے گال لال کر گیا۔ اس سے پہلے وہ سفاک بھیڑیے کی طرح اسے بربریت کا نشانہ بناتا کشمالہ اس کے گالوں پر رسید ہونے والا تھپڑ دیکھ چکی تھی۔ اسے دیکھتے ہی وہ اس کا راستہ چھوڑ کے جلدی سے پاہر نکل گیا۔ کشمالہ کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا زنیروہ رونی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی مگر کشمالہ کو برآمدے سے اپنے کمرے تک کا فاصلہ طے کرنے میں جیسے صدیاں بیت گئیں۔

”اتنا سب کچھ ہو گیا اور تم نے کسی کو کچھ بتایا تک نہیں چپ چاپ گنوار لڑکیوں کی طرح سہتی رہی حیرت کی بات ہے۔“ زنیروہ کے جہیز کا سامان واپس آیا تو نگہت کی ماں (زنیروہ کی ممانی) اسے اتنی بڑی بے وقوفی پر خاموش رہنے پر ڈانٹنے لگی۔ وقار کی گھٹیا حرکت پر اس نے نگہت کو بتایا اس لیے اسی دن نگہت کا باپ اسے ہمیشہ کے لیے لے آیا اس کے آنے کے کچھ روز بعد اس کا سامان بھی آ گیا۔ آدھے سے زیادہ زیور اور سامان اس کے سسرال والوں نے اپنے پاس

رکھ لیا جو واپس کیا وہ بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔ زنیروہ کا والد مجرموں کی طرح اپنی بیٹی سے نظریں چرائے گھر میں اس کی بربادی کے بکھرے ہوئے سامان کو حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ یہ وہی قیمتی دولت تھی جو اس نے اپنی بیٹی کا گھر بسانے کے لیے تنکا تنکا اکٹھا کر کے اسے جہیز کی صورت میں دی تھی۔ اس کے گھر پر قیامت صغریٰ کا منظر تھا اس کی ماں کا رورو کے برا حال ہو گیا سب گھر والے پچھتا رہے تھے سب سے زیادہ افسوس اس کے باپ کو ہو رہا تھا اسی نے اپنی بیٹی کی خوشیاں اس کے خواب اور مستقبل کو رشتے نبھانے کی بھینٹ چڑھایا تھا۔



زنیروہ کے گھر آنے کے ایک ماہ بعد طارق نی خلع کے کاغذات بھجوا دیئے۔ یہ وہ تین کاغذ تھے جن سے آسمان بھی لرز اٹھتا ہے زمین کا کلیجہ پھٹنے لگتا ہے جو عورت کی آرزوؤں کے گلستان کو پل بھر میں ویرانی میں بدل دیتے ہیں۔ معاشرے میں ایک عورت کے لیے سب سے بڑی گالی طلاق ہوتی ہے اسی گالی کے خوف سے اس نے اپنی زندگی کے انمول لمحے دکھوں کے صحرا میں گزار دیئے تھے۔ وہ والدین کی عزت اور خوشی کے لیے سب کچھ صبر سے برداشت کرتی رہی اور ہر غم کو چہرے سے مٹا لگتی۔ وہ کتنے دنوں سے رو بھی نہ پائی تھی اس کی آنکھیں پتھر کی ہو گئی تھیں مگر آج طارق نے اسے رومی رشتے کی زنجیر سے بھی آزاد کیا تو اس کے ضبط کی دیوار بھی اس دراڑ سے ٹوٹ کے ریزہ ریزہ ہو گئی۔







READING  
Section

SCANNED BY AMIR



## قلندر ذات

امجد جاوید

قلندر دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جو شکر گزاری کے اعلیٰ ترین مقام تک پہنچ کر قرب الہی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ رب تعالیٰ بھی ان کی خواہش کو رد نہیں کرتا۔ دوسرے وہ جو ذات کے قلندر ہوتے ہیں۔ ان کا پیشہ بندر، ریحہ اور کتے بچانا ہوتا ہے۔ یہ کہانی ایک ایسے مرد آپن کی ہے جو ذات کا قلندر تھا۔ اس نے ان لوگوں کو اپنی انگلیوں پر بچایا جو اپنے تئیں دنیا تسخیر کرنے کی دھن میں انسانیت کے دشمن بن گئے تھے۔ انسانی صلاحیتوں کی ان رسائیوں کی داستان جہاں عقل دنگ رہ جاتی ہے اور فکر حیران۔ اس داستان کی انفرادیت کی گواہی آپ خود دیں گے۔ کیونکہ یہ محض خامہ فرسائی نہیں مقاصد کا تعین بھی کرتی ہے۔



READING  
Section

SCANNED BY AMIR



بہت پسند کرتا ہوں۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔  
 ”جانتا ہوں، لیکن ہندی نالوں میں شکار پکڑنا بہت  
 آسان ہوتا ہے۔ چھوٹی موٹی کامیابی کا مطلب یہ  
 نہیں کہ تم سمندر میں شکار کرو اور تم کچھ حاصل کر لو،  
 ایسا نہیں ہے، سمندر میں ڈنڈل، شارک اور نہ جانے  
 کیا کچھ ہوتا ہے، نجانے تم کب شکار ہو جاؤ، تمہیں خود  
 بھی پتہ نہ چلے۔“ اس بار وہ غراتے ہوئے بولا تھا۔  
 ”سوچنے پر یا خواب دیکھنے پر کوئی پابندی  
 نہیں ہے مسٹر۔۔۔“ اتنا کہہ کر میں جان بوجھ کر  
 رک گیا۔

”تم مجھے کسی بھی نام سے پکار سکتے ہو۔“ اس نے  
 کہا۔

”اور میں تم سے پوچھنا چاہوں گا کہ تم مجھے آفر  
 کیوں دے رہے ہو؟“

”ہاں، یہ کام کی بات کی ہے تم نے، انڈر ورلڈ میں  
 تمہارا نام بہت سنا ہے خاص طور پر بھارت میں، یہ  
 میں جانتا ہوں کہ تم کام کے بندے ہو، کام کرو۔“  
 اس نے بڑے سکون سے کیا۔

”کیسا کام؟“ میں نے تیزی سے پوچھا۔

”وہی جو تم نے اپنے ملک میں کیا اور بھارت میں  
 جہاں نے، ویسا ہی؟“ اس نے کہا تو میں سمجھ گیا یہ بندہ  
 کون ہو سکتا ہے۔ اس نے پہلے کہ میں کچھ کہتا وہ بولا۔  
 ”میں تمہارے بارے میں جانتا ہوں، اس لیے  
 میں تم تک پہنچا ہوں، میں یہاں تمہارے سامنے  
 ہوں، اس سے اندازہ لگا لو کہ میں تمہیں کتنی اہمیت دیتا  
 ہوں۔ ورنہ تم جتنا وقت بھی لگے رہتے مجھ تک  
 نہیں پہنچ سکتے تھے، یہاں تک کہ تمہاری موت  
 کہیں ہو جاتی۔“

”جاؤ، اب تم ہو جاؤ، میں تمہیں تلاش کر لوں گا۔  
 میں تمہیں آفر کرتا ہوں کہ تم جب چاہے مجھے موت

وہ میرے چہرے پر بڑے غور سے دیکھ رہا  
 تھا۔ اس کی سیاہ چمکتی ہوئی آنکھوں میں عجیب طرح  
 کی سرستی کے علاوہ گہرائی تھی۔ ایک بات میں نے  
 خاص طور پر نوٹ کی، اس کی بھونکی ہلکی ہلکی کانپ  
 رہی تھیں۔

”یہ سب کچھ تم مجھے کیوں بتا رہے ہو؟“ میں نے  
 اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”اس لیے کہ وہ کمپنی ابھی میں ختم نہیں کرنا چاہتا،  
 ابھی بہت سارا کام بڑا ہے۔“ اس نے یوں کہا جیسے وہ  
 مجھ سے زیادہ خود کلامی کر رہا ہو۔

”کیا وہ کمپنی ختم ہونے جا رہی ہے؟“ میں نے  
 پھر پوچھا تو وہ سختی سے بولا۔

”ابھی تک کوئی ایسا پیرا نہیں ہو سکا جو اسے ختم کر  
 سکے اور نہ ہی میں پیدا ہونے دوں گا۔“

”تو پھر تم مجھے یہ کیوں بتا رہے ہو؟“ میں نے  
 الجھتے ہوئے پوچھا تو وہ نرم لہجے میں بولا۔

”بات یہ ہے جمال کہ۔۔۔۔۔“

”تم میرے نام سے واقف ہو؟“ میں نے تیزی  
 سے پوچھا تو وہ ہنس کر بولا۔

”ہاں، جب تم برطانیہ پہنچے تھے، میں تب سے  
 جانتا ہوں کہ تم یہاں کس مقصد کے لیے آئے ہو۔“  
 یہ کہہ کر وہ ایک لمحے کے لیے رکا، پھر کہتا چلا گیا، ”ہاں  
 تو جمال، میں تمہیں آفر دے رہا ہوں، تم میرے  
 ساتھ شامل ہو جاؤ، اس کمپنی کا کوئی دفتر نہیں، کہیں آنا  
 جانا نہیں، کوئی عہدہ نہیں، سیلری تم جتنی چاہو، اتنی ملتی  
 رہے گی۔“

”یہ سبیلی ہے، بھارت ہے یا۔۔۔۔۔“ میں نے کہنا  
 چاہا تو وہ میری بات ٹوک کر بولا۔

”وارننگ بھی سمجھ سکتے ہو۔“

”اور تمہیں پتہ ہوگا کہ میں وارننگ دینے والوں کو



آپ دنیا کے کسی بھی خطے میں مقیم ہوں

# آنچل نئے افق

ہم بروقت ہر ماہ آپ کی دلیرانہ فراہم کریں گے

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا رسالہ  
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے ہر کونے میں 700 روپے

افریقہ امریکا کینیڈا آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے

5000 روپے (ایک ساتھ منگوانے)

6000 روپے (الگ الگ منگوانے پر)

میدل ایسٹ ایشیائی یورپ کے لیے

4500 روپے (ایک ساتھ منگوانے)

5500 روپے (الگ الگ منگوانے پر)

رقم ڈیمانڈ آرٹ منی آرڈر منی گرام  
ویسٹرن یونین کے ذریعے بھیجی جاسکتی ہیں۔  
مقامی افراد دفتر میں نقد ادائیگی کر سکتے ہیں۔

رابطہ: طاہر احمد قریشی..... 0300-8264242

نئے افق گروپ آف پبلی کیشنز

کسٹمر سروس: 7 فسر یہ جمیز عبداللہ ہاؤس روڈ کراچی۔

فون نمبرز: 922-35620771/2

[aanchalpk.com](http://aanchalpk.com)

[aanchalnovel.com](http://aanchalnovel.com)

[Circulationn14@gmail.com](mailto:Circulationn14@gmail.com)

کے گھاٹ اتار دو۔“ میں نے اسے چیلنج دے دیا  
”تم بہت پچھتاؤ گے۔“ اس نے غراتے  
ہوئے کہا۔

”ابھی تم بچو، تم نشانے پر ہو، جہاں کہو، وہیں گولی  
لگ جائے گی، بولو۔“ میں نے کہا تو اس نے گھوم کر  
دیکھا، ڈیورا، بیسج پر یوں بیٹھی ہوئی تھی جیسے سو رہی ہو۔  
تانی کے ہاتھ میں ہاسٹل تھا جو اس نے گود میں رکھ کر  
نال اس شخص کی طرف کی ہوئی تھی، جو میرے پاس  
کھڑا تھا۔

”بہت اچھا، مجھے تمہارا انداز پسند آیا، لیکن تم  
نہیں جانتے کہ اس کے گرد ایک مزید گھیرا بھی ہے،  
جو میرے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔“ اس نے طنزیہ  
انداز میں کہا۔

”تب تک تم ختم ہو چکے ہو گے، جب تک وہ گھیرا  
تنگ ہوگا، اس گھرے کا بندوبست بھی ہے میرے  
پاس، اب کیا خیال ہے؟“

”میری آفر اب بھی وہی ہے؟“ اس نے کسی  
خوف کے بغیر کہا، پھر چند لمحوں بعد بولا۔

”مجھے پورا یقین ہے کہ تم میری آفر قبول کرو گے۔“  
”تم جانتے ہو کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں، تم  
میرے سامنے ہو اور میں تمہیں ابھی ختم کر سکتا ہوں  
لیکن جاؤ، میں نے تمہیں چھوڑا تاکہ پھر تلاش کر  
سکوں، اگر میں نے تمہیں چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر  
تلاش کر لیا تو پھر تم میری مانو گے، نہ کر سکا تو میں  
تمہاری مانوں گا۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے اس کی  
طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

اس کی آنکھوں میں الجھن تھی۔ اسے فیصلہ کرنے  
میں چند لمحے لگ گئے۔ پھر اس نے ہاتھ میری جانب  
بڑھا دیا۔ میں نے اس سے ہاتھ ملایا اور پھر اس کے  
ساتھ گلے ملا۔ یہی وقت تھا، جب میں نے اپنا کام



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)



لیکن..... اس نے کہنا چاہا تو بانیتا تیزی سے بولی۔  
 ”دیکھا ہر پریت، میں نے کہا تھا نا کہ یہ اس سوال  
 کا جواب نہیں دے گا، اب خود ہی دیکھ لو۔ میری بات  
 بالکل ٹھیک ہے کہ یہ کسی اور سے محبت کرتا ہے۔“  
 ”بانیتا، یہ مذاق نہیں بد گمانی ہوگی، ایسا  
 مذاق.....“ اس نے انتہائی جذباتی انداز میں کہنا  
 چاہا تو ہر پریت بولی۔

”جیسی! اسے کہنے دو، میں تو جانتی ہوں نا تم مجھ  
 سے کتنی محبت کرتے ہو۔“

”اُوئے جا اُوئے، سارے سسٹنس کا بیڑا غرق  
 کر دیا ہے تو نے۔ میں تو.....“ بانیتا نے کہنا چاہا تو ہر  
 پریت کو تیزی سے بولی۔

”دیکھتی نہیں ہو جیسی کا چہرہ کیسا ہو گیا ہے۔“  
 ”چل کوئی اور بات کرتے ہیں۔ یا زاب تو  
 موضوع ہی ختم ہو گئے ہیں، ایک ہفتہ ہو گیا، گھر میں  
 پڑے باتیں ہی کر رہے ہیں۔“ بانیتا نے اُکتائے  
 ہوئے انداز میں کہا۔

”پھر چونک کر بولی۔

”وہ انوجیت آ گیا ہے کہ نہیں؟“  
 ”بتایا تو ہے کہ وہ آ گیا ہے اور اپنے کمرے  
 میں پڑا سو رہا ہے۔“ ہر پریت کو نے بتایا۔

”وہ کب جاگے گا یا؟“ وہ پھر اُکتائے ہوئے  
 انداز میں بولی۔

”آجائے گا ابھی کچھ دیر میں۔“ جیپال نے کہا۔

”چھا، اسے بتا دینا کہ وہ کسی سے نہ ملے، جب  
 تک میں اس سے جی بھر کے باتیں نہ کر لوں۔“ بانیتا  
 کو نے کہا۔

”وہ میں نے اسے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اپنی آمد  
 کے بارے میں ابھی نہ بتائے، اس کا فون بند ہے اور  
 ایک بات اور ہے۔“ ہر پریت کو نے کہا پھر لمحہ بھر

کر دیا۔ میں اس سے الگ ہوا اور اسے جانے کا اشارہ  
 کیا۔ وہ چند لمحے الجھے ہوئے انداز میں مجھے دیکھتا  
 رہا، پھر چل دیا۔ ڈیورا دیے ہی بیٹھی رہی تھی۔ وہ اس  
 کی جانب بڑھا تو تانی نے اسے ایک طرف جانے کا  
 اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھ گیا۔ جب وہ کافی دور چلا گیا  
 تو ہم وہاں سے اٹھ گئے۔ ڈیورا وہیں بیٹھ کر بیٹھی رہی۔  
 ”مجھے پتہ چل گیا تھا کہ وہ جو ڈیورا کو ساتھ لایا ہے  
 اس میں ضرور کوئی بات ہے۔“ تانی نے تیز تیز چلتے  
 ہوئے کہا تو میں نے پوچھا۔

”یہ پتہ کہاں سے آیا۔“

”ڈیورا کا تھا۔ سالی پوری تیاری سے آئی تھی، میں  
 نے بھی صرف ایک سوئی سے کام لیا۔ اب سوئے گی  
 شام تک گہری نیند۔“ اس نے کہا اور تہقہہ لگا کر ہنس  
 دی۔ میں سوچنے لگا، اگر اس وقت میرے ساتھ ایک  
 عام سی لڑکی ہوتی، جس نے تربیت نہ لی ہوئی ہو تو  
 کیا ہوتا؟ ہم دونوں وہاں سے نکلتے چلے گئے۔

☆.....☆.....☆

صبح ناشتے کے بعد سے ہر پریت کو کے کمرے  
 میں محفل لگی ہوئی تھی۔ بانیتا کو رینڈ پر لیٹی ہوئی تھی،  
 نو تن کو اس کے پاس بیٹھی ہوئی تھی، سندھپ کو ایک  
 صوفے پر نیم دراز تھی اور جیپال ایک کرسی پر بیٹھا ان  
 سب کی باتوں کا جواب دے رہا تھا۔ اس وقت  
 موضوع یہی تھا کہ وہ ہر پریت کے ساتھ کتنی محبت  
 کرتا ہے۔

”میں اس کا کیا جواب دوں، یہ سوال ہی غلط  
 ہے۔“ اس نے بے چارگی سے کہا۔

”لیکن سوال تو ہے نا؟ جو بھی جواب بنے وہ دو۔“  
 بانیتا کو نے ہنستے ہوئے کہا۔

”دیکھو، تم لوگوں نے جو کچھ کھانا پینا ہے، میں وہ  
 لا دیتا ہوں، اس کے علاوہ جو چاہتی ہو، وہ کر دیتا ہوں



رک کر بولی۔  
 ”تیری شادی نہ کرادوں انوجیت کے ساتھ؟“  
 اس پر بھی ایک دم سے ہنس دیئے۔ تبھی بانیتا  
 کور بولی۔  
 ”بس پھر جہیز میں کیا آئے گا، یہ تم جانتی ہو۔“  
 وہ اسی بات پر ہنسنے لگے۔ ایسے میں انوجیت وہاں  
 آ گیا۔ جسے دیکھ کر سبھی خوش ہو گئے۔ وہ سب کو یوں  
 بے تکلفانہ انداز میں بیٹھے دیکھ کر حیرت سے بولا۔  
 ”یہاں تو اتنی اچھی محفل لگی ہوئی ہے، میں ایویں  
 خواہ مخواہ سوتا رہا۔“  
 یہ کہتے ہوئے وہ ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ تبھی بانیتا  
 کور نے گہری سنجیدگی سے کہا۔  
 ”انوجیت! یہ تو بس دل بہلانے کے بہانے  
 ہیں، اس کے علاوہ اور کریں بھی کیا؟ تم سناؤ، کیا ہو رہا  
 ہے چندی گڑھ میں۔“  
 ”بس حکومت بن گئی ہے اور ہم حکومت میں آ  
 گئے ہیں۔ اب وزیر مشیر بننے کے لیے جوڑ توڑ عروج  
 پر ہے۔ بڑی مشکل سے یہ دو دن نکال کرا یا ہوں۔“  
 ”وہ تو ٹھیک ہے، لیکن جو ہم پوچھنا چاہ رہے  
 ہیں، اس کے بارے میں بتاؤ، کیا سوچا جا رہا ہے؟“  
 بانیتا کور نے پوچھا۔  
 ”اگر تم لوگ یہ سوچو کہ کوئی پکڑ دھکڑ ہوگی، اسے  
 بھول جاؤ، ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ انہیں یہ پتہ چل چکا  
 ہے کہ اگر وہ تم لوگوں کو ماریں گے تو انہیں بھی مرنا  
 ہوگا۔“ انوجیت نے کہا تو بانیتا کور نے پوچھا۔  
 ”کیا تمہاری بات ہوئی ہے؟“  
 ”ہاں، میرے سمیت چند لوگوں کی۔ رتن دیپ  
 سنگھ بھی تھے اس میٹنگ میں اور ”را“ والے  
 بھی۔ کون کس خفیہ ایجنسی سے تعلق رکھتا تھا،  
 میں نہیں جانتا لیکن بات ہو گئی اور انہیں باور کرا دیا

کہ اب نہیں۔“ انوجیت کے اپنے لہجے میں کافی حد  
 تک گرمی آ گئی تھی۔  
 ”کیا تم اس ملاقات کی روداد بتا سکتے ہو؟“  
 اچانک حسپال نے پوچھا تو وہ بولا۔  
 ”کیوں نہیں۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کور کا اور پھر کہتا  
 ہی چلا گیا، ”انہوں نے تم لوگوں پر الزم لگایا، میں  
 الزام کی بات کر رہا ہوں، تصدیق نہیں کہ اشوک مہرہ،  
 ہرنیت سنگھ وغیرہ کو تم لوگوں نے مارا ہے۔ اس کے  
 علاوہ وہ پرانی باتیں کرتے رہے۔ وہ شک اس لیے کر  
 رہے تھے کہ امرتسر میں تم لوگوں کی ہوٹل کے باہر  
 تصویریں بن گئی تھیں۔ یہی جو ہماری کمزوری تھی،  
 اسے ہی رتن دیپ سنگھ نے پکڑ لیا۔ آخر اتنا اہتمام  
 کیوں، مجھ پر قاتلانہ حملہ ہوا، اس کا ذمے دار کون؟  
 پھر جالندھر فارم پر قاتلانہ حملہ کیوں؟ کیا ہم غدار  
 ہیں؟ بہر حال چار پانچ گھنٹوں کی طویل بحث کے  
 بعد اس کا نتیجہ نکل آیا۔“  
 ”کیسا نتیجہ؟“ بانیتا کور نے پوچھا۔  
 ”یہی کہ تم لوگوں نے بھی زیادتی کی۔ دوسری  
 جانب سے بھی ہوئی۔ طے یہ پایا کہ اب اگر کوئی  
 معاملہ ہو، ثابت ہو تو پھر کوئی کارروائی کی جائے۔ ورنہ  
 اب ہم خاموش نہیں رہیں گے۔ کمیشن بن جائیں گے  
 ، پھر جو سزاوار ہوگا، اسے سزا دی جائے گی۔“  
 ”مطلب معاملہ رفع دفع ہو گیا۔“ حسپال نے  
 سکون سے کہا تو انوجیت بولا۔  
 ”ہاں ہو تو گیا ہے فی الحال، لیکن تمہیں پتہ ہے یہ  
 خفیہ ایجنسیوں والے موقعہ کے انتظار میں ہوتے  
 ہیں۔ اب انہیں ثبوت اکٹھا کرنا ہوں گے۔ اگر آئندہ  
 آنے والے دنوں میں کوئی ثبوت نہ ملے تو کوئی انگلی  
 نہیں اٹھا سکتا۔ اور نہ ہی کوئی گرفتاری ہوگی۔“  
 ”اب ہمیں کیا کرنا ہوگا؟“ بانیتا کور نے پوچھا۔



”کچھ عرصہ انتظار، تم لوگ جہاں رہو۔ بلد یو سنگھ اور اس کے ساتھی اپنے اپنے گھروں میں جائیں۔ کچھ عرصہ تک ان سے رابطہ بالکل نہ رہے اور وہ بھی محتاط رہیں کہ ان کی نگرانی بہر حال ہوگی۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“ وہ سر ہلاتی ہوئی بولی تو چند لمحوں کے لیے ان میں خاموشی چھا گئی۔ تبھی انوجیت سنگھ نے کہا۔

”ممبر بننے کے بعد پہلی دفعہ اوگی پنڈ آیا ہوں۔ میرے یہ دودن تو لوگوں سے ملنے ملانے میں گزر جائیں گے۔ اب شاید میں آپ کو وقت نہ دے سکوں۔“

”ہاں ایسا ہوتا ہے۔ میں بہر حال آج ہی واپس امرتسر چلی جاؤں گی۔ میرے ساتھ تین کور بھی جائے گی۔“ بانیتا کور نے سوچتے ہوئے کہا، یوں وہ مختلف باتوں میں کھو گئے کہ آئندہ انہیں کیا کرنا ہوگا۔

☆.....☆.....☆

لندن کی وہ صبح کہہ میں لپٹی ہوئی تھی۔ کب بارش آجائے، اس کے بارے میں کچھ کہا نہیں جاسکتا تھا۔ موسمی حالات بتانے والوں نے بارش کی پیش گوئی کی تھی۔ اس وقت میں اور جنید لندن کے علاقے میں پہنچ گئے تھے۔ یہ لندن کا پرانا علاقہ تھا۔ مجھے پتہ تھا کہ وہ ”گاڈ فادر“ اسی علاقے میں موجود ہے، کس گھر میں ہے اس کے بارے میں بھی جانتا تھا۔ اصل میں جب ہم لاہور سے نکلنے لگے تھے تو یہ طے تھا کہ لندن اور اس کے علاقے میرے لیے اجنبی ہیں۔ زمینی حقائق کے بارے میں جانتا، آدھی جنگ جیت جانے کے مترادف ہوتا ہے۔ ارونڈ سنگھ نے چلتے وقت مجھے ایک ایسی ڈیوٹس دی تھی، جو دیکھنے میں ذرا سی تھی لیکن اسے کسی بھی انسانی جسم سے چپکا دیا جائے تو یوں دکھائی دیتا تھا، جیسے تل

ہو۔ ایک بار چپک جانے کے بعد وہ اترتی نہیں تھی۔ اس نے میرے، جنید اور مہوش کے وہ لگاؤ۔ تاکہ ہم کہیں آگے پیچھے بھی ہو جائیں تو گم نہیں ہو سکتے تھے۔ حالات کے بارے میں تو پتہ نہیں تھا اور ہم ایسے دشمن کی تلاش میں نکلے تھے، جس کے بارے میں پتہ ہی نہیں تھا۔ ہمارے پاس صرف ایک فون نمبر تھا۔ میں نے وہ ڈیوٹس ڈیوٹس کے ساتھ بھی لگا دی۔ اس کے بارے میں پتہ چلتا رہا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ وہ میرے لیے بہت بڑا ذریعہ بن گئی تھی۔ مجھے تو یہ گمان بھی نہیں تھا کہ وہ اچانک خود میرے سامنے آجائے گا، یہ اس کی خود اعتمادی کی انتہا تھی۔ میں چاہتا تو اسی وقت بہت کچھ کر سکتا تھا۔ لیکن ابھی میں پوری طرح کنفرم نہیں تھا، دوسرا میں اس کے کام کے طریقے کار کے بارے میں جانتا چاہتا تھا اور تیسرا وہ جو خود میرے پاس آفرے کر آ گیا تھا، اس نے ایسا کیوں کیا، حالانکہ وہ جانتا تھا کہ میں اس کا دشمن ہوں، اسے نقصان پہنچا چکا ہوں۔ اس کے پیچھے ضرور کچھ تھا، یہ میری چھٹی حس مجھے بتا رہی تھی۔ شاید لاشعوری طور پر یہ سب میرے ذہن میں تھا، اس وقت میرا رویہ ایسا کیوں ہو گیا تھا، مجھے خود نہیں احساس تھا۔ دوسرا مجھے یہ زعم تھا کہ لندن میں جو میرے رابطے تھے، جنہوں نے مجھے اپنی نگاہوں میں رکھا ہوا تھا اور وہ میری سیکورٹی پر مامور ہو چکے تھے، انہی میں سے کچھ لوگ اس کے پیچھے لگ گئے تھے۔ اسی بنا پر میں نے اسے چیلنج دے دیا کہ اسے چوبیس گھنٹوں میں تلاش کر لوں گا۔ میری سیکورٹی پر مامور لوگ ناکام ہو گئے تھے۔ ڈیوٹس وہیں پہنچ پر بیٹھی رہی تھی۔ اسے اسپتال والے اٹھا کر لے گئے تھے۔ جبکہ وہ انہیں جل دینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ جہاں جہاں پھرتا رہا، اس کے بارے میں ارونڈ سنگھ مجھے بتاتا رہا۔ صبح ہوتے ہی



ان کی دھمکی نظر انداز کر دی۔ اگلے دن میں نے زینت کو ساتھ لیا اور گھر چلا گیا۔

ایک ہفتے بعد ہم واپس لوٹنے لگے تو زینت نے مجھ سے مشورہ مانگا۔

”بھائی! میں نے تمہیں بتایا نہیں لیکن میری کلاس کا ایک لڑکا ہے، وہ مجھ سے محبت کے دعوے کر کے مجھے بدنام کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔“

”مجھے بتایا نہیں تم نے، خاموش کیوں رہی ہو؟“ میں نے اس سے سخت لہجے میں پوچھا

”میں خاموش اس لیے ہوں کہ جب میں اسے کوئی ریسپانس نہیں دے رہی تو چند دن بھونک کر خاموش ہو جائے گا۔ دوسرا وہ طلبہ تنظیم کا ایک بڑا عہدیدار بھی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے۔“ اس نے رو ہانسا ہو کر کہا۔

”اب کیوں بتا رہی ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”اس لیے کہ میں جاؤں ہی نہ یونیورسٹی، ابا کو بتاؤں ہی نہ، یا سب کچھ بتا دوں، مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔“ اس نے الجھتے ہوئے پوچھا تو میں نے کہا۔ ”تم چلو یونیورسٹی، وہاں چلتے ہیں، دیکھا جائے گا۔ میں بھیک کر لوں گا سب۔“ میں نے اسے تسلی دلا سہ دیا اور اپنے ساتھ یونیورسٹی لے گیا۔ میں نے زینت کو ہاسٹل چھوڑا اور خود اس طلبہ تنظیم کے بڑے کے پاس چلا گیا۔ اسے ساری صورت حال بتائی۔ اس نے بڑے سکون سے سنی۔ پھر مجھے اطمینان رکھنے کا کہہ کر واپس بھیج دیا۔

تین دن گزرے تھے اس صبح زینت نے مجھے فون کر کے بتایا کہ اسے کچھ چیزوں کی ضرورت ہے وہ لا دوں۔ میں مارکیٹ گیا اور چیزیں لے آیا۔ اس کی کلاس ساڑھے دس بجے کے قریب تھی۔ اس نے دس بجے ہاسٹل سے نکلتا تھا۔ میں کچھ منٹ پہلے اس کے ہاسٹل جا

پہنچا۔ وہ ہاسٹل سے نکلی تو میں اس کے لیے لائی ہوئی چیزیں اسے دے دیں۔ اس وقت جب میں وہ چیزیں اسے دے رہا تھا، اسی وقت اسی طلبہ تنظیم کے کافی سارے غنڈے وہاں آدھمکے۔ ان کے ساتھ لڑکیاں بھی تھیں۔ انہوں نے پوچھا نہیں اور نہ کوئی بات کی، یک لخت مجھے مارنا شروع کر دیا۔ ساتھ میں ان کے منہ سے یہی نکل رہا تھا کہ فحاشی پھیلا رہے ہو، ڈیٹ لگا رہے ہو، بتاتے ہیں تم دونوں کو ہیرا نہ تھا، انہوں نے زینت کو کچھ نہیں کہا۔ ان کے ساتھ آئی لڑکیاں اُسے ہاسٹل میں دھکیل کر لے گئیں۔ انہوں نے مجھے یہاں تک مارا کہ میں ادھ موا ہو گیا۔ بات یہاں تک رہتی تو ٹھیک تھا لیکن اس کے بعد جو انہوں نے مجھ پر جو ظلم کیا، اس نے میری زندگی بدل دی۔

انہوں نے ایک گدھے کا بندوبست پہلے ہی کیا ہوا تھا۔ انہوں نے مجھے اس پر بٹھا دیا۔ ایک تار میں پرانے جوتے پروئے ہوئے تھے، وہ میرے گلے میں ڈال دیئے۔ موٹر سائیکل کے سالینئر سے کالک لی اور میرے منہ پر لگا دی۔ ہاسٹل کی طرف والی جو سڑک تھی اس پر مجھے ڈال دیا گیا۔ وہ لمحہ ایسا تھا کہ میں موت کی دعا مانگ رہا تھا، لیکن مجھے موت نہیں آرہی تھی۔ کچھ دیر بعد میں نے اپنی زندگی ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں اس وقت مر گیا تھا۔ مجھے نہیں ہوش تھا کہ میرے ارد گرد کیا ہو رہا ہے۔ بس یہ آواز میرے دماغ کو پھاڑ دیتی تھی کہ جب لوگ پوچھتے کہ اسے گدھے پر کیوں بٹھایا ہے، تو جواب دیتے کہ یہ لڑکیوں کو چھیڑتا ہے۔ وہ میرے مرنے کا مقام تھا۔ میرا وجود تو زندہ تھا، لیکن میں مر گیا۔

نہر کے پل پر انہوں نے مجھے چھوڑ دیا۔ میں گدھے پر ہی تھا کہ گدھا مجھے نشیب کی جانب لے گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں وہاں کیسے گرا ہوں،



”آپ کی ہمدردی نے.....“ میں نے کہنا چاہا تو وہ مجھے ٹوکتے ہوئے بولا۔

”بالکل نہیں، مجھے تم سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ ایک ذرہ برابر بھی نہیں۔ میرا وجدان تھا کہ تمہارے ساتھ ظلم ہو رہا ہے، وہی ہوا، میں نے جب تصدیق کی تو مجھے ساری بات پتہ چل گئی۔ وہ چند لوگ کون تھے، جو ہاسٹل گئے، کہاں اور کیسے پلان بنا، ہاسٹل میں کس لڑکی نے انہیں بتایا کہ تم وہاں آنے والے ہو۔ سب مجھے پتہ چل گیا۔“ اس نے پھر اسی عام سے لہجے میں جواب دیا

”مگر مجھے زندگی نہیں چاہئے، میں مرنا چاہتا ہوں۔ اب میں اس ظالم معاشرے میں نہیں جی سکتا۔“ میں نے احتجاجی لہجے میں کہا تو مسکراتے ہوئے بولا۔

”یہاں سے جانے کے بعد مر جانا۔ لیکن اگر تم ان لوگوں سے انتقام لے کر مرنا چاہو تو میں تمہاری ہر طرح سے مدد کروں گا۔“ اس نے سکون سے کہا۔

”کیا تمہاری بھی ان سے دشمنی ہے؟“ میں نے پوچھا تو ایک دم سے ہنس دیا، پھر بولا۔

”میری نہ کسی سے دشمنی ہے اور نہ دوستی، میرے اپنے کام ہیں، میرے ساتھ کام کرو، اس کے عوض میں تمہیں ہر طرح کی مدد دوں گا۔ یہ ظاہر ہے کہ میرے سارے دھندے کا لہ ہیں، ایک بھی ایسا نہیں جو میں معاشرے کے سامنے فخر سے بتا سکوں۔ صاف کہوں تو بات یہ ہے کہ تم میرے اچھے ساتھی بن سکتے ہو، میرے ساتھ جڑ جاؤ گے تو طاقت، دولت اور حکومت تیرے قدموں کے نیچے ہوگی اور اگر بنا انتقام لیے مرنا چاہتے ہو تو کل ہی چلے جانا، میں نہیں روکوں گا، یہاں سے جاتے ہی مر جانا، یا کہیں ڈوب مرنا۔“ سکندر خان نے حتمی انداز میں کہا

میں بے ہوش تھا، یہ کچھ دیر کی بے ہوشی تھی۔ میری آنکھ کھلی تو میں وہیں نہر کنارے پڑا تھا اور لوگ میرے ارد گرد تھے۔ اس وقت میرے ذہن میں صرف ایک ہی فیصلہ تھا کہ مجھے مر جانا چاہئے۔ اس زندگی سے اب موت بہتر ہے۔ میں اٹھا اور سڑک کی جانب بڑھا۔ وہاں ٹریفک رواں تھی۔ میں نے چھلانگ لگائی اور ایک کار کے سامنے آ گیا۔ مجھے بریک لگنے کی تیز آوازیں سنائی دی تھیں۔ اس کے بعد درد کی ایک تیز لہر میرے اندر سرایت کر گئی اور مجھے ہوش نہیں رہا۔ میں نے خود کو کنفرم کر دیا کہ میں مر گیا ہوں۔

میری آنکھ کھلی تو میں بند پر تھا۔ کافی ساری پٹیاں مجھے باندھی گئی تھیں۔ میں حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے بولنا چاہا تو نہیں بول سکا۔ بلاشبہ میں نے کوئی ایسی حرکت کی ہوگی کہ ایک دم سے کئی لوگ آگئے، ان میں ڈاکٹر بھی تھے۔ وہ مجھے دیکھنے لگے۔ یہ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ میں وہاں صرف ایک دن اور ایک رات رہا ہوں۔ اگلے ہی دن میں ایک بنگلے پر تھا، جہاں میرا قاعدہ علاج ہونے لگا۔

وہ سکندر خان کا بنگلہ تھا۔ میں جس کار سے ٹکرایا تھا، وہ نجانے کون تھا۔ لیکن اس وقت یہی سکندر خان مجھے وہاں سے اٹھا کر اسپتال لایا تھا۔

”کیوں لائے مجھے؟ مرنے دیا ہوتا؟“ میرا اس سے پہلا سوال ہی یہی تھا۔

”جس وقت تم گدھے پر تھے تو میں تمہارے قریب سے اپنی کار پر گزرا تھا۔ میں اس وقت کار بیک نہیں کر سکا، میں اوپر سے گھوم کر آیا تو تم سڑک پر خون میں لت پت تھے۔ مجھے اسی وقت تمہاری بے گناہی کا یقین ہو گیا تھا۔ لہذا میں نے تمہیں اٹھایا اور تمہاری دیکھ بھال کی۔“ اس نے بڑے عام سے



## نکاح

اسلام نکاح سے پہلے عشق کی اجازت اس لیے نہیں دیتا کہ انسان اپنی ساری محبتیں اس کے لیے بچا کر رکھے جو ان کا اصل حق دار ہے۔

شادی سے پہلے کی محبت گویا اس طرح کی ہے جیسے "افطاری سے پہلے کوئی روزہ افطار کر لے۔ افطار کا مزہ بھی نہ رہا گناہ کا مستحق بھی ہوا کفارے کا خرچ بھی اور سزا کا دھڑکا بھی رہا۔"

سلیم رضا..... فیصل آباد

گئے تو وہ چند لڑکے بندھے ہوئے وہاں پڑے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی سمجھ گئے کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ میں نے پہلی بار ہاسٹل چلایا۔ نجانے کیسے اور کہاں گولیاں پڑتی رہیں، لیکن میں نے ہی ان سب کو مارا۔ اسی رات جب میں واپس سکندر خان کے پاس آیا تو میرے طرف دیکھ کر ہنستے ہوئے بولا۔

"میں تمہیں ایک ایسی جگہ بھجوا رہا ہوں، جو دنیا سے الگ ہے، لیکن دنیا سے جڑی ہوئی ہے۔ وہاں دو برس رہو۔ ہر طرح کا اسلحہ چلانا سیکھو، پھر واپس آؤ۔ اس دوران اگر میں مر بھی گیا تو کچھ لوگ ہیں جو تمہیں سنبھال لیں گے۔ جاؤ، عیش کرو۔"

میں چلا گیا۔ وہ پاکستان ہی کا ایک علاقہ تھا۔ وہاں میں دیکھ کر حیران رہ گیا کہ جدید ترین اسلحہ وہاں موجود ہے۔ ایک طرح سے وہاں پوری فوجی تربیت دے رہے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ کتابوں اور جدید ریسرچ مہیا کی جاتی تھی۔ روزانہ اخبار وہاں

اور میرے پاس سے اٹھ کر چلا گیا۔

میرے ذہن میں صرف انتقام تھا۔ میری اب تک کی تحقیق ہے کہ غنڈہ ہو یا جرائم پیشہ، وہ جوصلے والا تو ہوتا ہے لیکن دل والا نہیں، اندر سے وہ بزدل ہوتا ہے۔ وہ کمزور پر ہاتھ اٹھاتا ہے لیکن طاقت ور کے آگے فوراً جھک جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جیسے ایک شرابی اپنے دوستوں میں یا کمزور لوگوں میں بڑی بڑکیں مارے گا، غل غپاڑہ کرے گا لیکن پولیس کے ادنیٰ سے المکار کو دیکھ کر خفا موش ہو جائے گا۔

مجھے بالکل تندرست ہونے میں ایک ماہ لگ گیا۔ میں نے سکندر خان کو بتا دیا کہ میں اپنے گھر والوں کے لیے مر چکا ہوں۔ اب جو کہو میں وہی کرنے کو تیار ہوں۔

"ہاں، تمہیں تھوڑا سا کچھ کرنا ہوگا، اس کے بعد تمہیں کچھ بھی نہیں کرنا، سوائے اس کے کہ تم طاقت ور بنو۔"

"وہ جو تھوڑا سا ہے، وہ کیا کرنا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"جن لوگوں نے تمہیں ہاسٹل کے باہر مارا ہے، انہیں قتل کرنا ہے بس، ذرا سا کام ہے۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یہ ذرا سا کام....." میں نے کہنا چاہا تو وہ ہنستے ہوئے بولا۔

"تمہیں بس گولی چلانی ہے۔ باقی سب کام ہو جائے گا۔ اب جاؤ۔" اس نے کہا اور میں اپنے کمرے میں آ گیا۔

اسی رات، دس بجے کے بعد کا وقت ہوگا، مجھے بلایا گیا۔ میں ایک جیب میں بیٹھا اور ان کے ساتھ چل دیا۔ وہ ایک باغ تھا، تپچی اور امروہ کے پودے تھے وہاں باغ کے باہر جیب روک کر جب ہم اندر



پہنچتا تھا۔ ”میں سمجھ گیا کہ آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔“ میں

نے کہا تو وہ بولا۔

”انتقام کی آگ کو اپنی جدوجہد کا ایندھن بناؤ۔“

اس نے کہا تو میں سمجھ گیا کہ وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے۔

”مجھے کیا کرنا ہے وہ میں سمجھ گیا، آپ کیا کہتے ہو؟“

”دریا بہہ رہا ہے، اس میں ہاتھ ہی نہیں دھونے،

بلکہ پوری طرح نہالو۔“

ان دنوں ہیروئن کا ایسا نشہ سامنے آیا تھا، جس نے

انسانی زندگی تو تباہ کرنی ہی تھی، عالمی طاقت کا یہ

ہتھیار بھی بن گیا۔ جعلی ڈالر، ہیروئن کی پیداوار میں

سرمایہ اور اس کی حفاظت، اسلحہ کی خرید و فروخت،

ہیروئن کے ساتھ ہونے لگی۔ اس کے ساتھ ساتھ

سیاسی ہتھکنڈوں میں بھی یہی زہر استعمال ہونے

لگا۔ اسی کے بل بوتے پر اندھی قوتوں کو فروغ دیا

جانے لگا۔ جس سے منی لانڈرنگ کا بزنس کا پھیلنے

لگا۔ پرائز بانڈ سے لے کر کرکٹ تک کا جوا عروج

پکڑنے لگا اور اس نے ایک زمانے کو اپنی لپیٹ میں

لے لیا۔ رئیس کے گھوڑے کی جگہ کرکٹر نے لے لی۔

اس کے ساتھ ساتھ اندھی قوتیں اس طرح پروان

چڑھیں کہ دہشت گردی بڑھنے لگی۔ جرم کی دنیا میں

ان حالات کو اچھا خیال کیا جانے لگا تو پھر جرم بڑھتا

ہی چلا گیا۔ انسانیت تڑپنے لگی اور موت کے سوداگر

زندگیوں کا سودا کرنے لگے۔

جرم کے اس پھیلاؤ میں جدید آلات نے بڑی

معاونت کی۔ انڈر ورلڈ نے اسے خوب استعمال

کیا۔ ایک عام فون سے لے کر کمپیوٹر اور سٹلائٹ

سسٹم سے استفادہ کیا گیا۔ سامراجی نظام نے ایک

نیا نقاب اوڑھ لیا۔

میں نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا

تھا۔ اگلے تیرہ برس میں نے پوری دنیا گھومی۔ انڈر

دو برس گزر جانے کے بعد میں لاہور واپس آ

گیا۔ ان دنوں انٹرنیٹ نیا نیا آیا تھا۔ مجھے رہنے کو

ایک جگہ دے دی گئی۔ جہاں میں سوائے کھانے

پینے، ورزش کرنے سونے اور نیٹ پر نت نئی تحقیق

کرنے کے اور کچھ نہیں کرتا تھا۔ ایک برس میں یہاں

رہا۔ میرے رابطے بڑھنے لگے۔ انہی دنوں مجھے پتہ

چلا کہ سکندر خان کیا چیز ہے۔ وہ منی لانڈرنگ کا بادشاہ

تھا۔ سوئی سے لے کر جہاز تک جو بھی شے بکنے والی

ہوتی تھی اس کا تاجر تھا، اس کی سب سے بڑی آمدنی

کا ذریعہ جوا تھا۔ اسے ذہنی طور پر شارپ لوگ چاہئے

تھے۔ اس کا نیٹ ورک بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ

وہاں تک رسائی لے جا چکا تھا، جہاں میری سوچ بھی

نہیں جاسکتی تھی لیکن میں اس دنیا سے متعارف ہو

گیا۔ میں نے یہ سمجھ لیا کہ دنیا کو جس طرح چاہئے

استعمال کیا جاسکتا ہے۔

ایک دن سکندر خان نے مجھے اپنے پاس بلا کر کہا۔

”تمہیں اپنے دشمن یاد ہیں؟“

”کیوں نہیں، میں انہیں بھولا ہوں اور نہ ہی

انہیں بھول سکتا ہوں۔ وہ مجھے ہر پل یاد رہتے ہیں۔“

”دیکھو، دشمن کو کئی طرح سے مارتے ہیں۔

سازش کر کے یا سامنے آکر للکار کر۔ وقتی طور پر سبق

دے کر تھوڑا بہت، یا پھر ایسے کہ دشمن تو زندہ رہے،

لیکن وہ مرا ہوا ہو، اسے ہر پل اپنی بے بسی کا احساس

ہو۔ یہ سب سے بڑا اور بھیاں تک انتقام ہوتا ہے۔

دشمن کو وقت دینے کے لیے تین برس بہت ہوتے

ہیں۔ لیکن میں کہتا ہوں ابھی نہیں، صرف ان کے

بارے میں جانو، معلومات رکھو اور ایسی ضرب لگاؤ کہ

وہ ہمیشہ کے لیے تڑپتا رہے کہ اس نے ایسا ظلم کیا ہی

کیوں تھا۔“



ورلڈ کا جو عالمی نیٹ ورک ہے نہ صرف اس کا حصہ بن گیا بلکہ اس میں ایک اہم طاقت مانا جانے لگا۔ مجھے اندازہ ہی نہیں تھا کہ میں اتنا طاقتور ہو جاؤں گا۔ پندرہ برس سے زیادہ اس دنیا میں گزر گئے۔ میں کڑھتا تھا۔ ظلم کے اس نظام نے بے گناہوں کے لیے یہ زمین تنگ کر دی ہوئی ہے۔ بڑے بڑے مقدس لوگ اندر سے کس قدر گھٹاؤ نے ہوں گے اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ میں نے ایک بات سمجھ لی کہ ہر بندہ بکاؤ ہے۔ نہ بکنے والے چند ہیں۔ یہ سوچ غلط ہے کہ دولت سے ہر شے خریدی جاسکتی ہے۔ دولت کے بغیر لوگ محبت میں بھی یک جاتے ہیں، اپنا آپ وار دیتے ہیں۔ مگر میں نے بھی کسی ایسے بندہ کو نہیں آزمایا۔ میں نے ہمیشہ انہی لوگوں پر سرمایہ کاری کی جو اندر سے غلیظ ہوں۔ پیسے کے لیے اپنی غیرت تک بیچ دیں۔ اس دوران میں نے اپنی الگ سے دنیا بنانا شروع کر دی تھی۔ لوگوں کا پیسہ لوگوں پر ہی خرچ ہوتا تھا۔ سکندر خان اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ میں اس دنیا ہی سے غائب ہو گیا، اپنی دنیا تخلیق کرنے کے لیے۔

بیس برس بعد جب میں لاہور میں واپس گیا تو میں ایک نئی دنیا تخلیق کر چکا تھا۔ میں اپنے خاندان کا ذکر اس لیے نہیں کر رہا کہ میں نے ان سے ناتہ ہی نہیں رکھا۔ میں ان کے لیے مر چکا تھا۔ میرے والدین اس دنیا میں نہیں رہے تھے۔ تایا بھی اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ کزن تھے۔ لیکن زینت نہیں تھی، وہ میرے دکھ میں اپنی سائیس کھونٹھی تھی۔ اسے یہی غم لے بیٹھا کہ یہ سب اسی وجہ سے ہوا۔ حالانکہ بہت بعد میں مجھے سمجھ آئی کہ دشمن تو یہ سمجھ رہا ہوتا ہے کہ وہ کامیاب ہو گیا۔ لیکن رب تعالیٰ ایسے حالات بنا دیتا ہے کہ وہ وقتی طور پر بڑی ذلت آمیز شکست لگتی ہے، مگر وہ بہت بڑی فتح کی بنیاد بن جاتی ہے۔ جو بعد

میں زندگی سنوار دیتی ہے۔ میرے تین دشمن تھے اور تینوں لاہور میں موجود تھے۔ بہتے مانگنے والا عہدیدار جو اب ایک بڑا بزنس مین تھا، یونیورسٹی میں تنظیم کا بڑا سرغنہ جو ایک سیاست دان بن چکا تھا، زینت کو تنگ کرنے والا عہدیدار اسی سیاسی جماعت کی ایک ذیلی تنظیم کا سربراہ تھا اور اسکالر بن گیا تھا۔ میں چاہتا تو تینوں کو ایک وقت میں گولیوں سے چھلنی کروا دیتا لیکن یہ کوئی انتقام نہیں تھا۔ وہ لوگ جو یونیورسٹی میں میرے لیے کام کر رہے تھے۔ انہوں نے ان کے اندر داخل ہو کر ان کی تنظیم کو دیمک لگا دی۔ یہاں تک کہ وہ اپنا وتیرہ چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ خیر یہ باتیں کسی دوسرے رُخ کی ہیں۔ میں انہیں نہیں بھولا، شروع ہی سے انہیں اپنی نگاہ میں رکھا۔

انسان کا ظاہر اور باطن ایک ہو تو اسے کسی قسم کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ وہ میرے دشمن تھے اور میں انہیں کبھی نہیں بھولا۔ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ میں ان پر نگاہ نہ رکھتا۔ ان تینوں کے بے شمار بیرون ملک ثور لگے۔ وہاں ان کی بے غیرتیاں بھی عروج پر تھیں۔ دلالوں سے ساز باز کر کے بہت کچھ اکٹھا کر لیا گیا۔ وہ سب کچھ آہستہ آہستہ جمع ہوتا گیا۔ سکندر خان مر گیا تھا۔ اس کی جگہ اس کے بیٹے نے لے لی تھی۔ میرا شمار ان کے با اعتماد لوگوں میں ہوتا تھا۔ میں جو اپنے کالے دھندوں کا پھیلاؤ کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ان لوگوں کو بھی مرتا ہوا دیکھ رہا تھا، جو غداری کرتے تھے، یا وہ مقابلے میں مارے جاتے، وہ مقابلہ پولیس سے ہوتا، فورسز سے یا پھر دوسری کسی پارٹی سے۔ دھندے کے پھیلاؤ میں مجھے اپنے آپ کو محفوظ کرنے اور زیادہ سے زیادہ خفیہ نیٹ ورک بنانے کا جنون سوار ہو گیا، جو میرے بڑے کام آیا۔



بند کر دیا۔

میں نے سیاست دان کو فون کیا۔ اس نے اپنے کیرئیر کا، اپنے بچے کے کیرئیر کا رونا رویا۔ میری مرضی کا پیسہ دینے کو تیار تھے۔ میں نے اسے بھی خود کشی کا کہہ کر فون بند کر دیا۔ تیسرے کے ساتھ بھی ہی کیا۔ تینوں دھماکے مار مار کر رو رہے تھے۔ میں نے انہیں ایک جگہ بلوایا۔ تینوں کو معلوم نہیں تھا میں کون ہوں، ہر ایک کو یہی پتہ تھا کہ وہ مجھے اکیلا ہی ملنے جا رہا ہے۔ وہ سب پہنچ گئے۔ ان تینوں کو الگ الگ بٹھایا گیا۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد تینوں کو بلوایا۔ وہ میرے سامنے تھے۔ انہوں نے مجھے نہیں پہچانا۔ میں نے ان سے سوال کیا۔

”تم تینوں میں مشترک کیا ہے؟“

”طلبہ تنظیم۔“ ان کا یہی جواب تھا۔

”مجھے کیوں نہیں پہچان پارہے ہو؟“

”کچھ دیر بعد وہ سمجھ گئے کہ میں کون ہوں۔“

”ہمیں معاف کر دو۔“ ان کا یہی کہنا تھا۔

”تم لوگوں سے انتقام لینے کی وجہ سے میری

زندگی خرچ ہو گئی۔ تم لوگوں نے ظلم کیا، مجھے تو مارا ہی،

ذلیل کیا، میں ذلت کیسے بھول جاؤں اور وہ بھی میری

ہی بہن پر الزام، صرف اسی لیے کہ تم لوگوں کی غنڈہ

گردی قائم رہے۔ معافی تو ہے نہیں، بولو تم تینوں خود

کشی کر دو گے یا تمہارے بچے؟ کل تک فیصلہ

بتا دینا۔ چلے جاؤ۔“

یہی وہ وقت تھا جب میں کسی دوسرے بی دشت

کی سیاحی میں نکل کھڑا ہوا۔

ان لوگوں نے اپنی بقا کی جنگ لڑنا تھی۔ ان سے

جو ہوسکا، انہوں نے اپنے وسائل اور تعلقات استعمال

کیے کہ مجھے مار ڈالا جائے۔ اگلے دن کی شام تک

انہوں نے مجھے مارنے لیے کئی لوگ تیار کر لیے۔ میں

میرے تینوں دشمنوں کے بچے مختلف اداروں

میں پڑھ رہے تھے۔ پرنس مین کی بیٹی، سیاست دان

کا بیٹا اور اسکالر کی بیٹی۔ یہ تینوں نئے دور کی پیداوار

تھے۔ ان تینوں کے عشق چل رہے تھے۔ ان تینوں

کے ساتھ ایک ایک بندہ لگا دیا گیا۔ ان کے لیے سب

سے بڑا مسئلہ ”تخلیہ“ کا حصول تھا۔ جو انہیں مہیا کر دیا

گیا۔ لوگوں کے میسوں پر نگاہ رکھنے والے اپنے بچوں

کی تربیت سے غافل ہو جاتے ہیں، یہی ان کا حال

تھا۔ وہ دنیا کے سامنے بڑے مقدس تھے۔ لیکن ان کی

اپنی اولاد کیا کر رہی ہے انہیں یہ خبر ہی نہیں تھی۔ اس

تخلیے میں انہوں نے کیا کیا گل کھلائے، یہ وہی جانتا

تھا، جس نے ان کی ریکارڈنگ کی۔ تخلیے کی ملاقاتیں

رنگ لے آئیں۔ انہی دنوں میں وہاں پہنچ گیا۔

میرے سامنے تین سی ڈیز رکھ دی گئیں۔

میں نے سب سے پہلے پرنس مین کو اس کی بیٹی

والی سی ڈی بھیجی۔ دو گھنٹے میں جب اس کے پاس وہ

سی ڈی پہنچ گئی تو میں نے اسے فون کیا۔

”سی ڈی دیکھ لی تم نے؟“

”ہاں آئی تو ہے، کون ہو تم اور کیا ہے اس میں تم

بی بتا دو۔“ اس نے بے پروائی سے کہا۔

”میں ایک گھنٹے بعد فون کرتا ہوں۔ اب میں

نہیں بتاؤں گا، تم خود بتاؤ گے یا پھر شہر بھر کے لوگ۔“

میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ اس دوران میں نے

دوسروں تک بھی سی ڈیز پہنچا دی۔ آدھا گھنٹہ بھی

نہیں گزرا کہ پرنس مین کا فون آ گیا۔ اس سے بات

نہیں ہو پارہی تھی۔

”میری بیٹی کو بچالو، میری عزت داؤ پر لگ گئی

ہے، جتنی رقم چاہو میں دینے کے لیے تیار ہوں۔“

”مجھے رقم نہیں چاہیے۔ صرف خود کشی چاہیے، تم

کر لو یا تمہاری اولاد گر لے۔“ میں نے کہا اور فون



بہت زیادہ بکاؤ مال ہیں۔ خاص طور پر دھرم کے نام پر بلیک میل کرنے والے بہت ہیں۔ جس طرح حکومت کوئی پل یا عمارت خود تعمیر نہیں کرتی، بلکہ کسی ٹھیکے دار کو اس کا ٹھیکہ دیتی ہے۔ اسے کام چاہئے ہوتا ہے، اسی طرح کالے دھندے کے لوگ ٹھیکہ دیتے بھی ہیں اور لیتے بھی ہیں۔

ایک بالکل سانسے کی بات ہے۔ غریب خواب بہت دیکھتا ہے، کیونکہ اس کے پاس خوابوں کے علاوہ ہوتا کچھ نہیں۔ یہی خواب اپنے اندر بہت بڑے بڑے آئیڈیا چھپائے ہوئے ہوتے ہیں۔ اب ہوتا کیا ہے، ان خوابوں کی تعبیر کے لیے سرمایہ دار دولت خرچ کرتا ہے اور انہی خوابوں کو اپنی دولت میں اضافے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ میں نے بھی غریبوں کے خواب خریدے ہیں اور اس سے دولت نہیں بڑھائی بلکہ صرف طاقت حاصل کی۔ کیونکہ یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ طاقتور کا ساتھ دیتے ہیں، کمزور کو رگید دیتے ہیں۔

ایک انسانی نفسیات اور ہے۔ وہ یہ کہ میں اپنے دل میں ایک خواب پیش رکھتا ہوں، مثلاً ایک ہندو، مسلمان کو مارنا چاہتا ہے، یا مسلمان ایک ہندو کو ختم کرنا چاہتا ہے، ایک فرقہ یا مسلک کے لوگ دوسرے کو ختم کرنا چاہتے ہیں، میں صرف ان کی خواہش پوری کرنے کے لیے سہولیات دیتا ہوں، وہ خواہش بھی پوری کر لیتے ہیں اور انہیں دولت بھی مل جاتی ہے۔

میں اکیلا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس دنیا میں نجانے کتنی قوتیں ہیں جو اپنا اپنا مفاد حاصل کر رہے ہیں۔ کہیں کوئی دشمن ہوتا ہے اور کہیں کوئی دوست بنتا ہے، نہ دشمنی پاسدار نہ دوستی۔ مفاد لیا اور الگ ہو گئے۔ لڑائی وہاں جیتی ہے جب ایک ہڈی پر دوسرے جھپٹ پڑیں۔ میں ہڈی پر نہیں جھپٹا، بلکہ ہڈی رکھتا

ہی نہیں رہوں گا تو باقی کیا بچے گا۔ مجھے ان کی جو مصروفیات تھیں پتہ چلتی رہیں۔ میں سوچتا رہا کہ اگر میرے پاس وسائل اور طاقت نہ ہوتی تو یہ مجھے اب تک مار چکے ہوتے؟ نجانے کیوں مجھے احساس ہوا کہ ہمارے درمیان بساط کچھی ہوئی ہے۔ وہ تینوں ایک طرف ہو گئے ہیں اور اپنے مہرے کی چال دے دے رہے ہیں۔ اور میں اپنے مہرے چلا رہا ہوں۔ اسی دن مجھے خیال آیا کہ اگر میں مہرے ہی خرید لوں تو بساط پر اپنی مرضی سے کھیل کھیل سکتا ہوں۔ میری طاقت صرف اور صرف انفارمیشن تھی۔ بر وقت معلومات، جیسے اگر ان کی سازش کے بارے میں مجھے پتہ نہ چلتا کہ انہوں نے وارنٹس کرنا ہے تو میں ان کے چنگل میں پھنس جاتا۔ اس دوران مجھے یہ پتہ چل گیا کہ ان کا سب سے بڑا دشمن کون ہے؟ میں نے خود سامنے آئے بغیر ان تک رسائی کی، انہیں کہا کہ اگر ہم انہیں راستے سے ہٹا دیں تو..... جواب مثبت آیا۔ اسی رات انہیں پار کر دیا گیا۔ وہی لوگ جن سے وہ مجھے مروانا چاہتے تھے، انہوں نے ہی انہیں مار دیا۔ ان کے بچے ہمیشہ کے لیے میرے قابو میں آ گئے۔

میں ہمیشہ کے لیے لندن آ گیا۔ میرے قریب ترین دو لوگ تھے، جو میرے بارے میں سب جانتے تھے۔ میں نے انہیں ہوا بھی نہیں لگنے دی اور ان کی نگاہوں سے غائب ہو گیا۔ میں نے جدید ترین آلات کا استعمال کیا۔ اپنے گرد ایک حلقہ بنایا۔ میں صرف انہیں ہی کہتا ہوں۔ وہ آگے کوڑ اور ڈی کوڑ میں بات کرتے ہیں۔ ہم نے پہلے پاکستان میں لوگوں کو تلاش کیا۔ انہیں طاقت اور رقم فراہم کی انہوں نے ہمارے لیے کام کیا اور خوب کیا۔ اپنے مخصوص مطالبات منوانے کے لیے کیا حربے استعمال کیے، یہ ایک الگ کہانی ہے۔ پھر بھارت میں یہی کیا۔ وہاں



تھا۔ یہی میری کامیابی تھی۔“

”اسی تلاش میں تم میری نگاہوں میں آ گئے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے، جب بانیہ کور تمہارے پاس پاکستان آئی تھی، کیوں آئی تھی، مجھے پتہ ہے، پھر جو کچھ بھی ہوا، وہ سارے میرے مہرے تھے۔“ اس نے طویل بات کے بعد لمبی سانس لی

”کیا چاہتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”میں تھک گیا ہوں۔ میں سکون سے مرنا چاہتا ہوں۔ مجھے نیند نہیں آتی۔ میں آزادانہ گھوم پھر نہیں سکتا۔ میں نارمل زندگی نہیں گزار سکتا، میرے بچے نہیں ہیں۔ کیا پایا میں نے اتنا سب کچھ کر کے؟“

”ہاں بعض ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو ساری زندگی ایک نظریہ کے لیے لڑتے رہتے ہیں، منافقت کرتے ہیں، جھوٹ بولتے ہیں، حتیٰ کہ رشتے ناتے اور تعلق کی بھی پروا نہیں کرتے، لیکن ایک وقت آتا ہے کہ جب تمہارے جیسی سوچ پیدا ہو جاتی ہے۔ باطل نظریہ کی پہچان ہی یہی ہے۔“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا تو اس نے میری بات نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

”یہ نہیں پوچھو گے کہ میں تمہیں یہاں تک کیوں لایا ہوں؟“

”تم خود ہی بتا دو۔“ میں نے بے پروائی سے کہا۔

”میں یہ سب تمہارے حوالے کر کے ایک پرسکون زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔“ اس نے دھیمے سے کہا۔

”کیوں؟“ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”تم میں اور مجھ میں زمین اور آسمان کا فرق ہے جمال، تم کسی مقصد کے لڑے ہو یا نہیں، لیکن تیرے ارد گرد جو لوگ ہیں بغیر کسی لالچ کے تم پر اپنی جان وار دینے کو ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ تم کیا ہو؟ مجھے اس کی سمجھ نہیں آ سکی، تم پاکستان میں تھے لیکن جب بانیہ

کور پر حملہ ہوا، تم وہاں بھی تھے۔ میں بڑے بڑے شعبہ بازوں کا جانتا ہوں، کئی ایسوں کو میں نے ہائیر کیا ہوا ہے، یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ عام آدمی ایسی صورت حال سے نہیں نکل سکتا، جیسے تم نکل آئے تھے، تمہارے ساتھ کوئی دوسری قوت ضرور ہے، جو تمہاری مدد کر رہی ہے۔“ اس نے تیز لہجے میں کہا اور ساری بات کہہ کر یوں ہو گیا جیسے اس پر سے کوئی بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہو۔ میں چند لمحے اس کی طرف دیکھ کر سوچتا رہا پھر میں نے پہلو بدل کر کہا۔

”اس میں تمہارا قصور نہیں ہے۔ تم جتنی بھی طاقت حاصل کر لو، اس کا انجام کیا ہے؟ موت نا، کیا ساری دنیا کی طاقت تمہیں موت سے بچالے گی؟ نہیں نا؟ تم اور مجھ میں فرق صرف یہی ہے کہ تم زندگی کے تعاقب میں ہو، زندگی چاہتے ہو، لیکن میں موت کو تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔ تمہیں یہ پتہ ہے کہ موت آگنی تو سب ختم، میں جانتا ہوں کہ موت ہے ہی نہیں، مٹی کا وجود ختم ہے تو اگلا دور شروع ہو جائے گا۔“

”یہ صرف طفل تسلیاں ہیں۔ جنگجوؤں نے یہ سب گھڑا ہوا ہے، آخر لوگ جنگ کیوں لڑتے، انہیں ایسی سوچ دے دی گئی، جس کے بل بوتے پر وہ لڑتے تھے، آج بھی دیکھ لو، دنیا بھر میں جتنے نام نہاد مذہبی لوگ ہیں، وہ سب یہی کر رہے ہیں۔ جنت کے، سورگ کے، نروان کے ٹکٹ بانٹ رہے ہیں۔ یہ سوچ ہی ہے نا جو جنگ پر آمادہ کرتی ہے اور لوگ لڑ رہے ہیں۔“ اس نے کافی حد تک اکٹھا ہٹ سے کہا تو میں نے بڑے نرم لہجے میں اس سمجھایا۔

”دیکھو اگر تم تحمل سے میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو تو میں تمہیں یہ فرق واضح کر دیتا ہوں کہ جنگ کیا ہے اور جہاد کیا ہے۔“

”بولو، میں سن رہا ہوں۔“ اس نے کہا۔



تیزی سے یوں بولا، جیسے اگلی بات وہ سمجھنا چاہتا ہو۔  
 ”اعمال بتاتے ہیں کہ میں حاضر ہوں یا نہیں۔ سنو  
 یہودی، عیسائی، یا جو بھی غیر مسلم ہیں، اپنا حاضر ہونا  
 ثابت کر رہے ہیں۔ جس طرح وہ حاضر ہونا ثابت کر  
 رہے ہیں، اس طرح حاضر ہونا ممکن نہیں، چاہے  
 انہوں نے اپنا آئین و قانون بنالیا ہے۔ ہم مسلمانوں  
 کا جو نظام ہے وہ کہاں ہے، ہم کہاں حاضر  
 ہیں؟ میں پاکستان کی بات کرتا ہوں، ہم اگر مسلمان  
 ہیں تو ہمارا نظام عشق اور محبت ہے، انسان اور انسانیت  
 سے محبت والا نظام۔ رحمت اللعالمین ﷺ نے فرمایا  
 ہے نا کہ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے  
 دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ اگر ہم مسلمان ہیں، اگر  
 ہمارے دل میں اللہ مقصود ہے، ہماری آرزو کا محور  
 رحمت اللعالمین ﷺ ہے تو پھر یہاں وہ نظام ظاہر  
 کیوں نہیں ہو رہا ہے؟ اگر یہی معیار بنالیا جائے تو  
 کیا پاکستان میں مسلمانی ہے؟ ہم خود فیصلہ کر لیں کہ  
 ہم حاضر ہیں یا غیر حاضر؟ ہمارے کردار سے ہمارا ہونا  
 ظاہر ہو رہا ہے؟ کیا دوسروں کے لیے سلامتی ہے؟ اگر  
 ہم مقام مسلمانی پر حاضر نہیں تو پھر ہم میں کون حاضر  
 ہے؟ بلاشبہ وہ شیطان ہی ہو سکتا ہے۔ جو کسی بھی  
 دوسرے مسلمان کے قتل کی آرزو رکھتا ہو۔ عشق و محبت  
 والا آئین جو نبی رحمت اللعالمین ﷺ نے دیا وہ  
 سلامتی ہے۔ وہ کیوں ظاہر نہیں ہو رہا؟ ہم اپنا جائزہ  
 لیں، ہم میں کون حاضر ہے؟“  
 ”تم ٹھیک کہتے ہو۔ اگر میں مسلمان ہوں تو  
 دوسروں کو مجھ سے سلامتی ملنی چاہئے۔ میں اپنے  
 انتقام کے چکر میں کہاں سے کہاں تک بھٹک گیا؟“  
 اس نے افسوس سے کہا۔  
 ”جب تک تیری مسلمانی یا میری مسلمانی مجھ میں  
 حاضر نہیں تو میں اور تم غائب ہیں۔ مسجد میں میری

”جستجو، تلاش، کوشش، جدوجہد میں زندگی پڑی  
 ہے۔ یہ زندگی ظاہر ہو رہی ہے اعمال سے، جو عمل کیا  
 جاتا ہے۔ اب یہ زندگی ہے نا، یہ ہے تو اس میں آرزو  
 پڑی ہے۔ آرزو اس وقت تک پیدا نہیں ہوتی، جب  
 تک مقصد نہ ہو۔ مقصد ہوتا ہے مقصود کا اور مقصود ہوتا  
 ہے دل میں۔ دل ہوتا ہے انسان کے اندر۔ سیدھے  
 سادے لفظوں میں یہ کہ دل میں آرزو کیسی ہے؟ اسی  
 طرح کے اعمال ظاہر ہوں گے اور وہ آرزو کس کے  
 لیے ہے؟“  
 ”تم کہنا یہ چاہتے ہو کہ انسانی خواہشات ہی  
 اسے جدوجہد میں لگا دیتی ہیں۔“ وہ بولا۔  
 ”ابھی تم سنو، فیصلہ بعد میں دیتا۔“ میں نے کہا،  
 ایک لمحہ رکا اور پھر بولا۔  
 ”انسان کو سب ہی اشرف المخلوقات مانتے  
 ہیں، تو اس کی عقل بھی اشرف ہونی چاہئے۔ اور بلا  
 شبہ اس کی عقل اشرف ہے۔ عقل کے ساتھ ہر شے کو  
 زیر کر لیا اور کرتا چلا جا رہا ہے۔ کہنا میں یہ چاہتا ہوں  
 کہ عقل تو ہر شے تسخیر کر رہی ہے، کیا یہ اس کے اشرف  
 ہونے کا ثبوت ہے؟ کیا اس کے اعمال ثابت کر  
 رہے ہیں کہ وہ اشرف عقل والا ہے؟ اب اشرف عقل  
 ہے کیا؟ دوسرے انسانوں کا قتل یا انسانیت کی  
 حفاظت؟ اس کے اعمال بتا رہے ہیں کہ اس کی آرزو  
 کیا ہے اور اس کے دل میں کون ہے؟ اب سنو میں  
 ایک مثال دیتا ہوں۔ ایک کلاس روم میں جتنے بھی  
 طالب علم ہیں، بظاہر وہ سب وہیں حاضر ہیں، سامنے  
 بیٹھے ہوئے ہیں، لیکن حاضرا سے ہی تسلیم کیا جائے گا  
 ، جو استاد کے ساتھ ذہنی تعلق جوڑے بیٹھا ہے۔ وہ  
 حاضر نہیں مانا جائے گا، جو کلاس میں تو موجود ہے لیکن  
 اس کا ذہن کہیں دوسری جگہ بھٹک رہا ہے۔“  
 ”تم اس سے کیا ثابت کرنا چاہ رہے ہو؟“ وہ



مسلمانی حاضر ہے، لیکن جب دوکان پر ملاوٹ والی شے بیچ رہا ہوں تو اس وقت مسلمانی کہاں ہے؟“ میں نے سمجھایا

”بلاشبہ غائب ہے؟“ وہ بولا۔

”اب تم خود سوچ لو، تجھ میں کیا حاضر ہے۔ کہیں تم اپنی مسلمانی سے غائب تو نہیں ہو؟ مسلمانی غائب ہے تو شیطانیت ہے؟“ میں نے کہا۔

”یہ کیسے ممکن ہے کہ میں ہمہ وقت حاضر رہوں۔“ اس نے پوچھا۔

”اپنے دل کے ساتھ جڑو۔ اہل دل کے ساتھ جڑو، تاکہ تمہیں دل کی معرفت ملے، یہ دیکھو کہ تمہارے دل میں کیا ہے؟“ میں نے کہا۔

”یار، یہ کیا بات کر رہے ہو، خود کش بم لے کر خود کو پھاڑ دینے والا بھی دل کے ساتھ جڑا ہوا ہوتا ہے۔“ وہ تیزی سے یوں بولا جیسے اکتایا۔

”میں نے پہلے ہی تمہیں سمجھا دیا ہے کہ دل میں مقصود کون ہے اور تمہارے اعمال کیا بتا رہے ہیں، انسان اور انسانیت کا قتل کرنے والے کے دل میں شیطان بیٹھا ہوا ہے اور اگر اس کے اعمال انسان اور انسانیت کی بھلائی کے لیے ہیں تو اس کے دل میں رحمان ہے۔ فیصلہ تم خود کر لو۔“

”تمہاری بات ٹھیک ہے، کیا میں نے جو اتنا بڑا نیٹ ورک بنالیا اور جو چاہتا ہوں وہ کر رہا ہوں کیا دل سے نہیں ہوا؟ اب تک تم نے جو کہا، کیا میں شیطانیت کی راہ پر ہوں؟ یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟“ اس نے تیز لہجے میں الجھتے ہوئے کہا۔

”یہ تم خود دیکھ لو کہ تم کیا کہہ رہے ہو، اور کیا کر رہے ہو۔ ہامان، قارون، شداد اور نمرود میں سے کس کی راہ پر ہو۔“ میں نے سکون سے کہا۔

”میں اب بھی کہتا ہوں کہ یہ جنگجو لوگوں کا وہ میٹھا

نشہ ہے جو وہ لوگوں کو دیتے آئے ہیں، اور اب تک دے رہے ہیں، اسی کے زیر اثر لوگ لڑتے چلے جا رہے ہیں۔ وہ خود محلوں میں رہتے ہیں اور لوگوں کو قناعت کا درس دیتے ہیں۔ دنیا میں چند لوگ عام لوگوں کو لڑاتے چلے جا رہے ہیں، کون مانتا ہے خدا کو سب طاقت کی ہوس میں لگے ہوئے ہیں، جس کا بس چلتا ہے وہ دوسرے کو مار دیتا ہے، یہ کوئی انصاف تو نہیں ہے نا۔“ اس نے جذباتی لہجے میں کہا۔

”میں پھر کہوں گا کہ دل کے ساتھ جڑو۔ کیونکہ یقین دل میں پیدا ہوتا ہے۔ اگر یقین نہیں تو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا۔“ میں نے سکون سے کہا۔

”بہت بحث ہو چکی یار، اب کام کی بات کر لیں۔“ اس نے اکتاتے ہوئے کہا۔

”تمہارا مطلب تھا کہ اب تک جو باتیں ہوئیں ہیں وہ کام کی نہیں ہیں۔“ میں نے پوچھا۔

”وہ تمہارا فلسفہ ہے، تم جانو، یا جو سمجھنا چاہے وہ سمجھے، میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ یہ جو میں نے نیٹ ورک بنا دیا ہے، اس میں ایمپائر کھڑی کر دی ہے، اسے سنبھالو اور مجھے۔“

”نہیں، مجھے نہیں چاہئے۔“ میں نے سکون سے کہا۔

”کیوں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”میرے بزرگوں نے کہا ہے کہ اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے اور تم جانے ہو کہ میں اپنی دنیا آپ پیدا کر چکا ہوں۔ میں تم سے یہ نہیں پوچھوں گا کہ تم مجھے یہ آفر کیوں دے رہے ہو، کیونکہ میں جانتا ہوں۔“

”کیا جانتے ہو تم؟“ اس نے تیزی سے پوچھا۔

”یہی کہ میں آج نہیں تو کل تمہاری یہ ایمپائر ختم کر دینے والا ہوں۔ یہی جنگ اور جہاد میں فرق



ہے۔ جہاد فتنے کو ختم کرتا ہے اور جنگ طاقت کے لیے لڑی جاتی ہے۔ میں تمہیں اتنا کہتا ہوں کہ اپنی یہ شیطانیست چھوڑ کر غائب ہو جاؤ یا توبہ کر لو، ورنہ میں تمہیں ختم کر دوں گا۔ اب بھی تمہیں موقعہ دے رہا ہوں۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”اس کا مطلب ہے کہ تم نہیں مانو گے۔“ اس نے خرخراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”میں تمہیں کہتا ہوں کہ اٹھ کر چلے جاؤ اور سدھر جاؤ۔ میں تمہیں ایک موقعہ دے چکا ہوں۔ جاؤ۔“ میں نے کہا تو وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

”میری مرضی کے بغیر تم لندن سے باہر نہیں جا سکتے ہو، میری بات مانو گے یا زندگی کے آخری سانس یہیں گزار دو گے، یہ میرا چیلنج ہے۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھا اور باہر کی جانب چل دیا۔ میں ہلکے سے مسکرا دیا۔ میں نے اسے وہ سمجھایا تھا، جس سے اس کی زندگی سنور جاتی، لیکن وہ ایسا پتھر تھا، جو خود کو دوزخ کا ایندھن بنانے پر تلا ہوا تھا۔ میں نے بھی فیصلہ کر لیا کہ اگر اس نے مجھے لندن سے باہر جانے پر روکا تو میں اس کی ساری طاقت سلب کر لوں گا۔

☆.....☆.....☆

صبح کی ابھرتی ہوئی کرنیں دربار صاحب پر پڑ رہی تھیں۔ دربار صاحب کا سنہری کلس، سرود صاحب میں دکھائی دے رہا تھا، جس کے ساتھ صبح کی سنہری کرنیں کھیل رہی تھیں۔ سرود صاحب کے ارد گرد بے پر کرما پر کھڑے جہاں سنگھ اور بانیتا کور نے آنکھیں بند کی ہوئی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ اپنے گیان میں مگن تھے۔ وہ دونوں رات ہی سندھپ کور اور نو تن کور کے ساتھ امرتسر آ گئے تھے۔ وہ رات سکون سے سوئے اور صبح ہوتے ہی وہ دونوں دربار

صاحب آ گئے۔ انہیں رات وہاں جانے کے لیے خود سردار رتن دیپ سنگھ نے کہا تھا۔ انہیں وہاں کسی کا انتظار تھا۔ وہ کچھ دیر اپنے دھیان میں رہے۔ پھر لنکر خانے کی طرف چل پڑے۔ ابھی وہ لنکر خانے کے گیٹ سے چند قدم کے فاصلے پر تھے کہ ایک نو عمر سا لڑکا ان کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ ہلکی ہلکی داڑھی اور مونچھ، بڑی بڑی آنکھیں، اس نے سفید گرتا پہنا ہوا تھا۔ سر پر بنستی پگڑی باندھی ہوئی تھی۔ وہ وہاں کا کوئی طالب علم لگ رہا تھا۔

”ست سری اکال سردار جی! سنگھ ڈھلوں جی۔“ اس نے دونوں ہاتھ باندھ کر بڑے نرم لہجے میں فتح بلائی اور پورا نام دہرایا تو ایک بار جہاں چونک گیا۔ ”ست سری اکال، واہگرو جی کی فتح۔“ اس نے بھی ہاتھ جوڑ کر فتح بلائی تو اس لڑکے نے کہا۔ ”سردار جی، میرے ساتھ آئیں، آپ جی سے کوئی ملنا چاہتا ہے۔“

”چلو، جی۔“ اس نے کہا اور اس کے ساتھ چل دیا۔ کسی نے اس نو عمر لڑکے کو بھیجا تھا تو صرف اس لیے کہ کسی کو شک نہ ہو۔ وہ انہیں لے کر کمپلیکس کی جانب چل پڑا۔ وہ چند قدم آگے تھا۔ چند راہداریاں پار کرنے کے بعد وہ اسے کھلے میں موجود ایک کمرے کی جانب بڑھا۔ وہ دونوں اس کے پیچھے چلتے ہوئے دروازے تک آ گئے۔ ابھی دروازہ کھل گیا۔ ایک کمرے کے بعد اگلے کمرے میں ایک بوڑھا سنگھ زمین پر پچھی ہوئی چٹائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ انہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”آؤ جہاں اور بانیتا پتر، میں کھڑا نہیں ہو سکتا، ورنہ میں.....“ اس نے ہانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”نہیں نہیں سردار جی آپ تشریف رکھیں۔“ جہاں نے تیزی سے کہا۔



”آؤ بیٹھو۔“ اس نے اپنے سامنے چٹائی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ دونوں بیٹھ گئے۔ وہ بوڑھا سنگھ چند لمحے تک یوں آنکھیں بند کر کے سوچتا رہا جیسے مراقبے میں ہو۔ پھر ان کی جانب دیکھ کر بولا۔

”میرا نام سر جیت سنگھ بندیاں ہے۔ میں سنت جرنیل سنگھ بھنڈراوالے کا وہ سیوک ہوں، جوان کے ساتھ شہید نہ ہو سکا، سا کا چوراہے کے وقت میں یہاں تھا ہی نہیں، میری ڈیوٹی کسی اور جگہ تھی۔ میں وہیں رہا، اس مہان پرش پر قربان نہیں ہو سکا۔ پر اب لگتا ہے، بہت سارا وقت گزر جانے کے بعد بھنڈراوالے کا ویرن کیا تھا۔ اگلی نسل کو کس نے بتانا تھا کہ سکھی کیا ہے؟“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ جیسے سوچ رہا ہو۔ پھر بولا۔

”رتن دیپ سنگھ جی نے بہت کام کر لیا۔ دشمن نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ وہ چاہے بھی تو کچھ نہیں کر سکتا۔ اس کے ایک ایک لفظ کو وہ سن رہے ہیں۔ وہ بے بس ہو گیا ہے۔ وہ ایسا شیر ہے، جسے پنجرے میں بند ہونا پڑا ہے۔ اور میں اب موت کے دہانے پر ہوں، میرے جیسے کئی سیوک میری طرح کی حالت میں ہیں، اس لیے میں نے سب سے صلاح لی ہے کہ اب یہ کام اگلی پیڑھی کو دے دیا جائے، تم سمجھ رہے ہونا؟“ اس نے جہاں کی طرف دیکھ کر کہا۔

”جی میں سن رہا ہوں۔“ اس نے تیزی سے لیکن جیسے لہجے میں جواب دیا۔

”ہم پچھلے دو ماہ سے تمہیں دیکھ رہے ہیں۔ تیرے بارے میں بہت باتیں بھی سنی ہیں۔ ہماری صلاح یہ ہے کہ تم اب سکھی کا وہ کام سنبھالو، جواب تک ہم کرتے آئے ہیں۔“ اس نے بڑے گہرے لہجے میں کہا۔

”سردار جی، مجھے سکھی کی کوئی بھی سیوا کرنے میں کسی بھی قسم کا کوئی حرج نہیں۔ لیکن میں اتنی بڑی ذمہ داری نہیں نبھاسکتا۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

”کیوں؟“ سردار نے تحمل سے پوچھا۔

”نہ تو میں کوئی گیانی ہوں اور نہ ہی میرا سکھی کے بارے میں اتنا علم ہے، جو جس نے بتایا، مجھے اتنا ہی پتہ ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہم اس رستے کے راہی ہیں، جس کا گزر اندھیروں میں سے ہے۔ کب کہاں اور کیسے موت آ جائے، اس کا کوئی پتہ نہیں۔ اس وقت سکھی کو اس نو جوان لیڈر کی ضرورت ہے جو کہہ دے تو وہ ہو جائے۔ ایسے کردار والا جس پر کوئی انگلی نہ اٹھا سکے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ یہاں اسی سکھوں کے مقدس مقام پر شہیدوں کا نشان بنانا چاہتے ہیں تو وہ نہیں بن پا رہا۔ وہ لیڈر چاہئے جو منافقوں کو اپنے قبیلے سے نکالے۔“ جہاں نے انتہائی جذباتی لہجے میں کہا۔

”تو پھر بتاؤ کون ہے وہ؟“ سردار نے اسی تحمل سے کہا۔

”یہ تو آپ بڑے ہیں، آپ کی نگاہ اور مشاہدہ ہی بتا سکتا ہے کہ وہ کون ہو سکتا ہے۔“ جہاں سنگھ نے سکون سے کہا۔

”سیاسی طور پر جو بندہ بھی ہم چن لیں، تو کیا تم اس کی پیروی کرو گے۔“ اس نے پوچھا۔

”بالکل، جب تک وہ سکھی کے لیے کام کرے گا، ادھر ادھر ہوا تو نہیں۔“ جہاں نے صاف لفظوں میں کہہ دیا تو سردار چند لمحے سوچتا رہا، پھر بولا۔

”دیکھو، جہاں سنگھ، سکھی کو اس وقت غیروں سے اتنا خطرہ نہیں، جتنا انہوں سے ہے۔ بڑی بڑی سازشیں تیار ہو چکی ہیں اور ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ میں پچھلے دو مہینے سے پنجاب میں پھر رہا



ہوں۔ میں نے بہت کچھ دیکھا اور سمجھا ہے۔ میں وہ تمہیں بتاتا ہوں۔“

”جی میں سن رہا ہوں۔“ جہاں نے مودب لہجے میں کہا تو بوڑھا سردار گونج دار آواز میں بولا۔

”پہلی بات تو یہ ہے کہ بقائے انسانیت اعتدال پر قائم ہے۔ جب بھی انسانی معاشرے سے اعتدال نکلتا ہے، اسی وقت تنزلی شروع ہو جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں، اس نے موت خود پر وارد کر لی جو دوسرے کو شکار بنانے کے لیے جو موت بناتا ہے، پہلے وہ موت اسی پر وارد ہوتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے۔“

اس نے کہا تو جہاں خاموش رہا، تب وہ کہتا چلا گیا، ”سا کا چوراہے کے بعد کئی برس تک سکھ نو جوان ہندو کی بھیمنٹ چڑھتے رہے۔ اس سے سکھی کمزور نہیں ہوئی بلکہ زیادہ مضبوط ہوئی ہے۔ بہت سارے نو جوان بھارت سے نکل گئے، انہوں نے دوسرے ملکوں میں اپنے

آپ کو آزمایا، دولت کے انبار جمع کئے۔ لیکن اندر کا انتقام ختم نہیں ہوا۔ ایک نسل سے دوسری نسل میں یہ انتقام منتقل ہو گیا۔ بھارت سے باہر بیٹھے سنگھ آج بھی تڑپ رہے ہیں۔ وہ رقم سے ان نو جوانوں کو مضبوط کر رہے ہیں۔ مگر ان کی رقم ضائع جا رہی ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ یہاں کی سکھ تنظیمیں دو طرح کی ہیں۔

ایک وہ جو باہر کا مال لے کر صرف کاغذی کارروائی کر رہے ہیں۔ دوسری طرف ایسے نو جوان ہیں جو نہ صرف سکھی کو سمجھتے ہیں بلکہ اپنی اپنی جگہ کام کر رہے ہیں۔ وہ ”انکھ“ والے ہیں۔ وہ اپنی آنا رکھتے ہیں۔ رقم کے حوالے سے کمزور ہیں لیکن سکھی کے لیے یہی کارآمد ہیں۔ ایک تیسری قسم ہے جو یہاں کے سنگھ تو ہیں لیکن سازشوں کا شکار ہو گئے ہیں۔ نشوں نے ان کو مار دیا، عیاشی اور سکھی سے دوری نے انہیں کسی ”جوگا“ نہیں چھوڑا۔ میں چاہتا ہوں کہ ان نو جوان میں جو

کمزوری ہے، وہ ختم ہو جائے اور وہ سکھ پنٹھ کے لیے کام کرنے لگیں۔“

”آپ کے دو چار بہت اچھے ہیں لیکن اس کے لیے وہ لیڈر.....“ جہاں نے کہا چاہا تو بوڑھا سردار بولا۔

”میں نے تمہیں لیڈر چن لیا ہے۔ جب تک میری سانس ہے، مجھ سے جو چاہو ملے گا، لیکن انہیں ایک رستہ دے دو۔ مجھے یقین ہے تو اپنی نئی دنیا بنائے گا۔“

”ٹھیک ہے سردار جی، میں کوشش کروں گا کہ آپ سے کچھ نہ مانگوں، ایک نئی دنیا بنانے کا خواب میں پورا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔“ جہاں نے کہا تو بوڑھے سردار سر جیت سنگھ بندیاں کے چہرے پر سرخی پھیل گئی۔ اس نے پاس پڑے بیگ میں سے ایک ڈی وی ڈی نکالی اور اسے دیتے ہوئے کہا۔

”پورے پنجاب سے وہ سنگھ اور کوریں جنہیں میں نے اس کام کے لیے تیار کیا ہے، ان کے بارے میں ساری پوری معلومات اس میں ہے۔ یہ جتنے لوگ بھی ہیں، میں انہیں تمہارے بارے میں بتا دوں گا اور.....“

”نہیں سردار جی، اب مجھے اپنے طریقے سے کام کرنے دیں۔ میں ایک لیڈر دوں گا آپ کو، وہ سامنے ہوگا۔ وہی حکم جاری کرے گا۔“ جہاں نے کہا تو بوڑھے سردار کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

ان کے درمیان بات ختم ہو چکی تھی۔ تبھی ان کے سامنے لنگر چن دیا گیا۔ انہوں نے سیر ہو کر کھایا۔ پوری گفتگو میں بانیتا کو ایک لفظ بھی نہیں بولی تھی۔ دوپہر سے کافی پہلے وہ واپس حویلی آ گئے تھے۔ ان کے پاس سردار رتن دیپ سنگھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ساری بات سنی اور پھر ان دونوں کی جانب دیکھ کر بڑے ہی جذباتی لہجے میں کہا۔



”جو کہا ہے اب اس پر پورا اتر کر دکھانا۔ بانیتا پتر میں نے تمہیں سکھی کے لیے دان کیا۔“

”دھن بھاگ میرے باپو کے۔ میں مایوس نہیں کروں گی۔ جان واردوں گی۔“ اس نے بھی کہا۔

”بس جو کرو سو بھلا، اس پر مزید بات کی گنجائش ہی نہیں ہے۔“ اس نے کہا اور اٹھ گیا۔ بھی بانیتا کور نے ہسپال کا ہاتھ پکڑا اور اپنے سر پر رکھتے ہوئے کہا۔

”ہسپال! اب تک جو بھی ہوا، وہ ایک بارانہ تھا، اب صرف سکھی کے لیے لڑنا ہے۔ ہمارے گرو ہمیں موقع دے رہے ہیں۔“

ہسپال نے بانیتا کور کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے سر سے نیچے کیا۔ پھر دونوں ہاتھوں سے اس کے ہاتھ پکڑ کر دباتے ہوئے کہا۔

”جو بولے سو نہال او۔“

”ست سری اکال او۔“ بانیتا کور نے اس کے نعرے کا جواب دیا اور اس کے گلے لگ گئی۔

☆.....☆.....☆

میں اور جنید ایئر پورٹ کی طرف جا رہے تھے۔ جنید ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور میرے ساتھ پچھلی نشست پر تانی تھی۔ دو دن میں نے اس کے ساتھ گزارے تھے۔ اتنی باتیں کرنے کے باوجود دل نہیں بھرا تھا۔ اس دوران جنید نے بہت سارا ہوم ورک کر لیا تھا۔ بیہوش ایئر پورٹ کی بلڈنگ میں ہم جب داخل ہوئے تو شام ہو رہی تھی۔ جس جہاز سے ہم نے جانا تھا، اس نے صبح کے وقت لاہور پہنچنا تھا۔

”وعدہ کرو کہ بہت جلد اماں اور سوہنی کے ساتھ یہاں آؤ گے۔“ تانی بالکل روائی کے وقت کافی جذباتی ہو گئی تھی۔ میں نے اس کی ہجلی آنکھیں صاف کیں اور بڑے سکون سے کہا۔

”میں نہ آ سکا تو انہیں ضرور بھیج دوں گا۔ ورنہ تم

میں اور جنید ایئر پورٹ کی طرف جا رہے تھے۔ جنید ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور میرے ساتھ پچھلی نشست پر تانی تھی۔ دو دن میں نے اس کے ساتھ گزارے تھے۔ اتنی باتیں کرنے کے باوجود دل نہیں بھرا تھا۔ اس دوران جنید نے بہت سارا ہوم ورک کر لیا تھا۔ بیہوش ایئر پورٹ کی بلڈنگ میں ہم جب داخل ہوئے تو شام ہو رہی تھی۔ جس جہاز سے ہم نے جانا تھا، اس نے صبح کے وقت لاہور پہنچنا تھا۔

”وعدہ کرو کہ بہت جلد اماں اور سوہنی کے ساتھ یہاں آؤ گے۔“ تانی بالکل روائی کے وقت کافی جذباتی ہو گئی تھی۔ میں نے اس کی ہجلی آنکھیں صاف کیں اور بڑے سکون سے کہا۔

”میں نہ آ سکا تو انہیں ضرور بھیج دوں گا۔ ورنہ تم

میں اور جنید ایئر پورٹ کی طرف جا رہے تھے۔ جنید ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور میرے ساتھ پچھلی نشست پر تانی تھی۔ دو دن میں نے اس کے ساتھ گزارے تھے۔ اتنی باتیں کرنے کے باوجود دل نہیں بھرا تھا۔ اس دوران جنید نے بہت سارا ہوم ورک کر لیا تھا۔ بیہوش ایئر پورٹ کی بلڈنگ میں ہم جب داخل ہوئے تو شام ہو رہی تھی۔ جس جہاز سے ہم نے جانا تھا، اس نے صبح کے وقت لاہور پہنچنا تھا۔

چلی آنا، تم پر پابندی تھوڑا ہے۔“

”ہاں، میں یہاں اکیلی رہ کر اکتا چکی ہوں۔“ اس نے کہا تو جنید نے اعلان کی طرف توجہ دلائی۔

ہم ایئر پورٹ کے مراحل کے لیے چل پڑے۔ ہم جہاز میں بیٹھ چکے تھے اور جہاز روائی کے لیے تیار تھا۔ بالکل ایسے وقت میں جہاز کی فنی خرابی کے بارے میں بتایا گیا اور معذرت کرتے ہوئے کہا گیا کہ کچھ دیر بعد روائی ہوگی۔ میں انتظار کر رہا تھا کہ وہ مسافروں کو اترنے کا کب کہتے ہیں۔ زیادہ وقت نہیں گزرا، جہاز کے اندر چند لوگ آ گئے جو دیکھنے میں یوں لگ رہے تھے جیسے بزنس مین ہوں، لیکن نگاہ رکھنے والے تازہ گئے کہ وہ خفیہ کے لوگ ہیں۔ وہ شروع سے لے کر آخر تک گئے وہ واپس پلٹ پڑے۔ اگلے چند منٹوں میں جہاز خالی کرنے کا کہہ دیا گیا۔ مجھے راشد محمود عرف گاڈ فادر کی بات یاد آ گئی کہ وہ مجھے لندن سے نہیں نکلنے دے گا۔ میں پر سکون تھا۔ میں نے ان سب متوقع صورت حال کا بندوبست کر رکھا تھا، جو وہ ان حالات میں کر سکتا تھا۔ جیسے ہی ہم لاؤنج میں واپس آئے تو وہاں پتہ چلا کہ جہاز میں ہم کی افواہ ہے۔ لیکن یہ صرف مسافروں کے ”بہانے“ کی ایک کوشش تھی۔ اس گیم کے پیچھے بہت کچھ چل رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جنید نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اس کا مطلب گاڈ فادر اپنا کام دکھا رہا ہے۔“

”میں تو اسے بہت ذہین آدمی سمجھتا تھا، لیکن وہ نرا بے وقوف قسم کا مہرہ نکلا، اسے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ ایسا کر کے اس نے اپنی موت کو خود آواز دی ہے۔ وہ پھر بچ جائے گا، جو اس کے پیچھے ہے۔“ میں نے اسے بتایا۔

”اب ہمیں کیا کرنا ہوگا؟“ اس نے کافی حد تک

میں اور جنید ایئر پورٹ کی طرف جا رہے تھے۔ جنید ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور میرے ساتھ پچھلی نشست پر تانی تھی۔ دو دن میں نے اس کے ساتھ گزارے تھے۔ اتنی باتیں کرنے کے باوجود دل نہیں بھرا تھا۔ اس دوران جنید نے بہت سارا ہوم ورک کر لیا تھا۔ بیہوش ایئر پورٹ کی بلڈنگ میں ہم جب داخل ہوئے تو شام ہو رہی تھی۔ جس جہاز سے ہم نے جانا تھا، اس نے صبح کے وقت لاہور پہنچنا تھا۔

”وعدہ کرو کہ بہت جلد اماں اور سوہنی کے ساتھ یہاں آؤ گے۔“ تانی بالکل روائی کے وقت کافی جذباتی ہو گئی تھی۔ میں نے اس کی ہجلی آنکھیں صاف کیں اور بڑے سکون سے کہا۔

”میں نہ آ سکا تو انہیں ضرور بھیج دوں گا۔ ورنہ تم

میں اور جنید ایئر پورٹ کی طرف جا رہے تھے۔ جنید ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور میرے ساتھ پچھلی نشست پر تانی تھی۔ دو دن میں نے اس کے ساتھ گزارے تھے۔ اتنی باتیں کرنے کے باوجود دل نہیں بھرا تھا۔ اس دوران جنید نے بہت سارا ہوم ورک کر لیا تھا۔ بیہوش ایئر پورٹ کی بلڈنگ میں ہم جب داخل ہوئے تو شام ہو رہی تھی۔ جس جہاز سے ہم نے جانا تھا، اس نے صبح کے وقت لاہور پہنچنا تھا۔

”وعدہ کرو کہ بہت جلد اماں اور سوہنی کے ساتھ یہاں آؤ گے۔“ تانی بالکل روائی کے وقت کافی جذباتی ہو گئی تھی۔ میں نے اس کی ہجلی آنکھیں صاف کیں اور بڑے سکون سے کہا۔

”میں نہ آ سکا تو انہیں ضرور بھیج دوں گا۔ ورنہ تم

میں اور جنید ایئر پورٹ کی طرف جا رہے تھے۔ جنید ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور میرے ساتھ پچھلی نشست پر تانی تھی۔ دو دن میں نے اس کے ساتھ گزارے تھے۔ اتنی باتیں کرنے کے باوجود دل نہیں بھرا تھا۔ اس دوران جنید نے بہت سارا ہوم ورک کر لیا تھا۔ بیہوش ایئر پورٹ کی بلڈنگ میں ہم جب داخل ہوئے تو شام ہو رہی تھی۔ جس جہاز سے ہم نے جانا تھا، اس نے صبح کے وقت لاہور پہنچنا تھا۔

”وعدہ کرو کہ بہت جلد اماں اور سوہنی کے ساتھ یہاں آؤ گے۔“ تانی بالکل روائی کے وقت کافی جذباتی ہو گئی تھی۔ میں نے اس کی ہجلی آنکھیں صاف کیں اور بڑے سکون سے کہا۔

”میں نہ آ سکا تو انہیں ضرور بھیج دوں گا۔ ورنہ تم

میں اور جنید ایئر پورٹ کی طرف جا رہے تھے۔ جنید ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور میرے ساتھ پچھلی نشست پر تانی تھی۔ دو دن میں نے اس کے ساتھ گزارے تھے۔ اتنی باتیں کرنے کے باوجود دل نہیں بھرا تھا۔ اس دوران جنید نے بہت سارا ہوم ورک کر لیا تھا۔ بیہوش ایئر پورٹ کی بلڈنگ میں ہم جب داخل ہوئے تو شام ہو رہی تھی۔ جس جہاز سے ہم نے جانا تھا، اس نے صبح کے وقت لاہور پہنچنا تھا۔



کے ساتھ چل پڑا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ وہ جنید کو بھی لے کر جائیں گے۔ میں ان کے ساتھ چلتا ہوا ایک سادہ سے آفس میں آ گیا۔ سٹیورٹ نے ایک کرسی کی جانب بیٹھنے کا اشارہ کیا اور سامنے کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

”مسٹر جمال! تم لندن کیوں آئے تھے؟“

”بزنس ٹور کے لئے؟“ میں نے جواب دیا

”کیا میں جان سکتا ہوں کہ تم جتنے دن یہاں رہے اس کی تفصیلات کیا ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”بالکل، میں بتا سکتا ہوں لیکن آفیسر! مجھے یہ کنگرم کر دیں کہ کیا میں حراست میں ہوں۔ مجھے گرفتار کر لیا گیا ہے؟ مجھ سے تم تفتیش کر رہے ہو؟“ میں نے بڑے تحمل سے پوچھا۔

”نہیں، ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ معمول کی کارروائی ہے۔ کیونکہ ہمیں اطلاع ملی ہے کہ کوئی دہشت گرد اسی جہاز سے واپس جا رہا ہے، جس نے کوئی یہاں پلان کیا ہے اور جو لندن کے لیے بہت خطرناک ہے۔“ سٹیورٹ نے صاف لفظوں میں کہا۔

”اوکے تم جو چاہو بوال کر سکتے ہو۔ ایک دن، چند دن، مہینہ یا جتنے بھی دن تم چاہو، تمہارے مطمئن ہو جانے تک یہیں ہوں۔ تم اپنا اطمینان کرو۔“

میں نے سکون سے کہا اور کرسی سے ٹیک لگالی۔

”تم اتنے بااعتماد کیوں ہو؟“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو میں بھی مسکرا دیا

”اس لیے کہ میں نے کوئی غیر قانونی کارروائی نہیں کی، نہ تمہارے ملک کا قانون توڑا اور نہ ہی کسی پلان میں شامل ہوں۔ بلکہ تم کہو تو میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔“

”میری مدد؟ وہ کیسے؟“ سٹیورٹ نے پوچھا۔

”سنو کیا تم لوگوں نے اطلاع دینے والے کے

تشویش سے پوچھا۔

”چائے، گرم گرم چائے پی جانی چاہئے۔“

میرے یوں کہنے پر جنید نے میری طرف دیکھا، پھر بات کو سمجھتے ہوئے ہنس کر پوچھا۔

”اس سے پہلے کہ ہم سے پوچھنا شروع ہو، چائے پی لی جائے۔“

”ہاں، یہ کی ہے ناسیانوں والی بات۔“ میرے یوں کہنے پر وہ اٹھ کر چلا گیا۔ میں وہاں اکیلا ہی بیٹھا رہا۔ میں نے دن نکالا اور تانی کو کال ملا دی۔ وہ ابھی تک ائر پورٹ پر ہی تھی۔ اس نے میری بات سنی اور فون بند کر دیا۔ اب جو کچھ چھٹی کرنا تھا، اسی نے کرنا تھا۔ یہاں تک کہ جنید چائے لیکر واپس آ گیا۔

ہم چائے پی رہے تھے۔ جنید کو پتہ تھا کہ اس نے کیا کہنا ہے۔ وہ پرسکون تھا۔ ہمارے چائے پینے کے دوران بہترین سیاہ سوٹ پہنے چند گورے ہماری جانب بڑھے۔ ان میں سے ایک ہماری جانب آیا، باقی ذرا پیچھے ہی کھڑے رہے۔ وہ کافی فربہ مائل تھا، اس کی ٹھوڑی کے نیچے گوشت لٹک رہا تھا موٹے موٹے نین نقش والی کی آنکھیں یوں تھیں جیسے سو جی ہوئی ہوں۔ اس نے میرے قریب آ کر بڑے اچھے انداز میں ”گڈ ایوننگ“ کہتے ہوئے اپنا تعارف کرایا

”میرا نام سٹیورٹ جان ہے، میں یہاں کی سیکورٹی میں ایک آفیسر ہوں۔ مجھے آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں، کیا آپ میرے ساتھ میرے آفس میں چلیں گے، جہاں ہم اطمینان سے باتیں کر سکیں۔“

”بالکل، کیوں نہیں چلیں۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا پھر ڈسپیوژل اسبل کپ ایک طرف رکھا اور اشارے سے پوچھا کس طرف جانا ہے۔ اس نے مسکراتے ہوئے ایک جانب اشارہ کیا تو میں اس



کوئی بندہ خدا کا انکار کر دے، یا خدا کو تسلیم کر لے اس سے خدا کی ذات کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر وہ خود خدائی کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ ویسے ہی انسانیت سے گر جاتا ہے۔ اس سے بھی خدا کو فرق نہیں پڑتا۔ خدا کا انکار یا خدائی دعویٰ، فرعونیت سے بندہ اپنے مقام بندگی کا انکار کر دیتا ہے۔

یہ انسان ہی کے لیے ہے کہ وہ بندگی کے مقام پر فائز ہوتا ہے اور اس کی بندگی اس کے اعمال سے ظاہر ہوتی ہے۔ انکار خدا کرنے والا، تسلیم کرنے والا، خدائی کا دعویٰ کرنے والا، انسان ہی ہے، دوسری کسی مخلوق سے یہ عمل سرزد نہیں ہو رہا ہے۔ انسان ہی یہ کر رہا ہے۔ اسی سے ہی مکمل ظاہر ہو رہا ہے۔ اب بنیادی نکتہ یہ ہے کہ انسان کا ”ہونا“۔ اگر یہ ہے تو اعمال ظاہر ہو رہے ہیں اگر انسان ہی نہیں تو پھر کوئی بحث ہی نہیں۔ انکار یا تسلیم کرنے کے جو بھی اثرات ہیں وہ انسان پر ہی ہیں۔ اپنے آپ کو غلام مانے کا تو آقا ظاہر ہو گا۔ اگر بندگی والے مقام پر فائز ہوتا ہے۔ بندے کے اعمال اسے بندگی پر فائز کر پس گئے، یہی بندے کی بلندی ہے۔ جب وہ مقام بندگی کا محرم ہو جاتا ہے تو وہ ذات کبریا کے مقام کو مان لیتا ہے۔ یہی بندگی اسے رب تعالیٰ سے جوڑ دیتی ہے۔ یہی وہ رستہ ہے جو رب تک جاتا ہے۔ یہی انسان کا ارتقاء ہے۔ اور انسان کے ارتقاء کا جو راستہ نبی رحمت ﷺ نے عطا کر دیا، وہ اصل راستہ، وہی صراط مستقیم ہے۔

یہ بندگی خدائی، وہ بندگی گدائی

یا بندہ خدا بن یا بندہ عزمانہ

جب انسان بندگی کے مقام پر فائز ہوتا ہے تو پھر باقی سب غیر پر تلوار پھر جاتی ہے۔

اصل بات ہے اپنے آپ کو ماننے کی، خود کو بندہ

بارے میں جان لیا ہے کہ وہ کون ہے؟ یہ اطلاع کس نے دی؟ اسے کیسے پتہ کہ کوئی دہشت گرد اس جہاز سے جا رہا ہے؟ اسے اس تفتیش میں لائے؟“ میں نے کہا۔

”ہاں! اس کے بارے میں چھان بین کی جا رہی ہے، بہت جلد اس کا پتہ چل جائے گا۔“ اس نے بتایا ”مطلب آپ کے یعنی سیکورٹی کے کسی بندے نے اطلاع نہیں دی؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں، کسی شہری نے یہ اطلاع دی ہے۔“ اس نے کہا تو میں مسکراتے ہوئے بولا۔

”اب آپ جتنے چاہیں سوال کریں۔ اگر میں پاکستان پہنچ بھی گیا تو تمہارے ساتھ تعاون کروں گا۔“ میں نے کہا اور سکون سے بیٹھ گیا۔ وہ مجھ سے مختلف سوال کرتا رہا۔ تقریباً آدھا گھنٹہ گزر جانے کے بعد اس نے مجھے جانے کا کہہ دیا۔ میں لاؤنج میں آ گیا۔

میں دوبارہ تانی کو کال ملائی اور اسے اپنے بارے میں بتایا۔ اس گفتگو میں ایسا کوئی لفظ بھی نہیں تھا، جو شک کے زمرے میں آ جاتا۔ ممکن ہے میری کال بھی کہیں سنی جا رہی ہو۔ کیونکہ اس وقت میرے پاس ایک عام سیل فون تھا۔ اس نے اشارے میں بتا دیا کہ اس نے اپنا کام کر دیا ہے۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا، ہمیں واپس جہاز میں جانے کو کہہ دیا گیا۔ ہم جہاز میں سوار ہو کر اطمینان سے بیٹھ گئے اور کچھ دیر بعد جہاز ٹیک آف کر گیا۔

مجھے راشد محمود عرف گاڈ فادر آ گیا۔ اس کے ملنے کے

بعد مجھے اس کے بارے میں سب پتہ چل گیا۔ میرے سمجھانے کے باوجود بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ ہوتا بھی ایسے ہی ہے۔ انسان کی اپنی عقل پر پردہ پڑا ہوتا ہے۔ اسے خود سمجھ نہیں آ رہا ہوتا۔



اگر پورٹ کی حدود سے باہر نکلے تو میرا سیل فون بج اٹھا۔ وہ گاڈ فادر کا فون تھا۔ وہ استہزائیہ لہجے میں بولا۔  
 ”مجھے یقین تھا کہ تم نکل جاؤ گے، لیکن پاکستان کی زمین تم پر تنگ کر دی جائے گی۔ تم سمجھتے ہو نا کہ پاکستان ایک جنگل ہے، جس کے پاس جتنا پیسہ ہے وہ اتنا ہی قانون کو اپنی لونڈی سمجھتا ہے، وہ قانون بھی خرید سکتا ہے، اپنی مرضی سے جو چاہے وہ ہوتا ہے۔“  
 ”جس طرح تمہارے دعویٰ کے باوجود میں یہاں آ گیا ہوں، اسی طرح میرا رب میری حفاظت کرنے والا ہے۔ تم فکر نہ کرو، ابھی کچھ دیر میں تمہارے ساتھ کیا ہوگا، تم نہیں جانتے ہو۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”اچھا، دیکھتے ہیں۔“ اس نے کہا اور قبہ لگا دیا  
 ”اور یہ بھی جان لو کہ تم سوائے ایک مہرے کے کچھ بھی نہیں ہو، مہرہ وہ بھی پیادہ، گھوڑا بھی نہیں۔“ یہ کہتے ہوئے میں ہنس دیا تو اس نے کہا۔  
 ”تم بھی تو مہرے ہو؟“

”یہ وقت بتائے گا۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں سوہنی والے گھر میں جا پہنچا۔ طارق نذیر نے اسے دوبارہ بہترین انداز میں سجا دیا تھا۔ میں بیڈ پر سیدھا ہو کر لیٹا ہی تھا کہ اروند کا فون آ گیا۔

”پاکستان واپسی پر خوش آمدید۔ پاکستان میں گاڈ فادر کے جو چند لوگ تھے، وہ سب حراست میں لیے گئے ہیں۔ ان کے ساتھ عالمی دہشت گرد تنظیم کا نام جوڑ دیا گیا ہے۔ ان میں سب سے اہم ایک نوجوان ہے، جو سارے پیغام ڈی کوڈ کر کے آگے دیتا تھا۔ مطلب، احکام دینے اور لینے والے، جو یہاں کے بائیر کے ہوئے لوگوں کے درمیان تھے، وہ ختم ہو گئے ہیں۔ ابھی وقت لگے گا، نئے لوگ بنانے میں،

ماننے کی۔ اپنی فطرت کو ماننے کی۔ وہ تخلیق ہے اور اس کا کوئی خالق ہے۔ اپنے آپ کو مان لینے کا مطلب ہے کہ میں بندہ ہوں تو اس نے اپنے رب کو تسلیم کر لیا۔ تب وہ بندگی کے مقام پر فائز ہو گیا۔ اس نے اس ذات کی غلامی تسلیم کر لی، جس میں شہنشاہی ہے۔ مقام بندگی پر حاضر ہونے کا مطلب ہے کہ وہ رب کے حضور حاضر ہو گیا۔ یہ یقین کے رب اسے دیکھ رہا ہے۔ یہ انسان پر پردے پڑے ہوئے ہیں کہ وہ رب کی جلوہ افروزیاں نہیں دیکھ پارہا ہے۔ یہ حجاب صرف خودی سے اٹھتے ہیں۔

خودی دل کی غیرت ہے۔ جو کسی غیر کو دل میں نہیں آنے دیتی۔ غرور و تکبر، ہوائی وہوس، فتنہ، تفرقہ، دوئی، شرک، غیر، ضد، ظلم، گمراہی۔ یہی خش و خاشاک ہیں اور آتش عشق کا شعلہ تند و سرکش و بے باک، اس خش و خاشاک کو جلا کر خاکستر دینے والا قوت ہی خودی ہے۔ یہ سارے مراحل بے شک عشق ہی طے کراتا ہے۔ جب بندے کا رخ خدا کی طرف ہوتا ہے تو اس کا سفر بلندی کی طرف ہو جاتا ہے پستی سے ناتھ ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ غلامی آزاد کر دیتی ہے، حرص، ہوس اور لالچ سے۔ کیونکہ بندگی کا عرفان ہونے ہی سے بندے کو اپنی ذات کا عرفان ملتا ہے۔ یہ دل کے زندہ کر لینے سے ہوتی ہے۔ اپنی معرفت حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ سے آگاہ ہونا ضروری ہے۔ خودی سے اس طلسم رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں۔ یہی توحید تھی جسے نہ تو سمجھانہ میں سمجھا۔

لاہور کا موسم بہت خوشگوار تھا، جب ہم اگر پورٹ سے نکلے۔ راستے میں مجھے جنید نے بتایا تھا کہ وہ اس سے کیا پوچھتے رہے تھے۔ اس سے یہی ظاہر تھا کہ کہیں ہم دونوں کی باتوں میں تضاد ہو اور ہم دھڑلے جائیں۔ مگر ایسا ممکن نہیں تھا۔ ہم کار میں بیٹھ کر جب



لیکن ابھی ان میں ان دیکھی دیوار بن چکی ہے، ان میں کوئی رابطہ نہیں رہا۔“

”باقی بھی چند دن میں صاف ہو جائیں گے، تم نے وہ کام کیا جو میں نے بتایا تھا۔“ میں نے پوچھا۔

”وہ تو آج صبح ہی ہو گیا تھا۔“

”کوئی مشکل؟“ میں نے پوچھا۔

”کوئی نہیں۔“ اس نے بتایا۔

دراصل یہی انہی کا کارنامہ تھا کہ انہوں نے گاؤں فارروالے جتنے بھی اکاؤنٹ تھے، ان میں جس طرح پونڈ آگے پیچھے جاتے تھے، ان سب کو سمجھا۔ لندن کے لوگوں نے ان کے منی لانڈرنگ والے دھندے کو سمجھ کر مدد کی اور ان کا جو سرمایہ تھا، وہ سب نکال لیا اور ایسی کمپنیوں کو ادا کیلی کر دی جو صرف نام کی تھیں۔ کروڑوں پاؤنڈ ان کے ہاتھ لگے تھے۔ جو نہ صرف انہوں نے سنبھال لیا، بلکہ ٹھکانے بھی رکھ دیا تھا۔

”اب یہ جو درمیان میں خلا ہے، اس کے کوڈ اور ڈی کوڈ سمجھے ہیں کہ نہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”سمجھ لیے ہیں؟“ اس نے بتایا۔

”تو پھر ان سب کو یہ حکم جاری کر دو کہ شام تک کوئی بندہ کسی سے بات نہ کرے۔ شام کے بعد بات کی جائے گی۔ سمون کریں۔“ میں نے کہا۔

”ہو گیا۔“ اس نے کہا تو میں نے اس کے کمرے کو بند کر دیا۔ میں نے بید پر لیٹ کر بھی خیالوں کو ذہن سے نکالا اور سو گیا۔ دو گھنٹے بعد میری آنکھ کھلی تو میں فریش تھا۔ میں نے جنید کو وہیں ابور میں چھوڑا اور نورنگر کے لیے چل دیا۔ مجھے شام سے پہلے وہاں پہنچ جانا چاہئے تھا۔

☆.....☆.....☆

جسپال اور بانیتا کورجولی کی سرنگ کے راستے سے باہر کی جانب جا رہے تھے۔ دونوں کا حالیہ بدلا ہوا

تھا۔ وہ اس وقت یوں دکھائی دے رہے تھے، جیسے کوئی دیہاتی جوڑا ہو۔ وہ گلیوں میں سے ہوتے ہوئے سڑک پر آ گئے۔ انہوں نے نہ تو سندیپ کور کو بتایا اور نہ نو تن کور کو۔ وہ ایک آنور کشتے پر بیٹھے اور بس اسٹینڈ کی جانب چل دیئے۔ وہ دونوں ایک عام سی بس میں بیٹھ گئے جو بنالہ کی طرف جانے والی تھی۔ تھوڑی دیر میں بس لوگوں سے بھر گئی تو چل پڑی۔ بس مختلف جگہوں پر اسٹاپ کرتی چلتی چلی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ ’چوگوان‘ کا اسٹاپ آ گیا۔ وہ دونوں وہیں اتر گئے۔ وہ صرف یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ ان کا تعاقب تو نہیں ہو رہا۔ کوئی ان کی نگرانی تو نہیں کر رہا ہے۔ اسٹاپ پر وہی دونوں اترے تھے۔ سڑک پر دور دور تک دونوں طرف کوئی گاڑی نہیں تھی۔ وہ ’چوگوان‘ کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر چل پڑے۔ کوئی سو قدم چلنے کے بعد انہیں سامنے سے ایک فورڈ ہیل آتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ ان کے پاس آ کر رک گئی۔ ایک نوجوان اسے ڈرائیو کر رہا تھا۔ وہ دونوں اس میں بیٹھ گئے اور پھر سے اسٹاپ کی جانب چل پڑے۔ واپس سڑک پر آ کر وہ اسی طرف چل دیئے جس طرف سے بس آئی تھی۔ اس دوران انہوں نے پٹرے بدل لیے۔ دونوں جیمین اور شرٹ میں تھے۔ آنکھوں پر سیاہ کاغذ، انہوں نے اپنا روپ تہی بدل لیا تھا۔ تھوڑا سفر کرنے کے بعد وہ سڑک سے دائیں جانب مڑ گئے۔ جس کے اختتام پر اکال گڑھ گاؤں تھا۔

انہیں اکال گڑھ گاؤں میں نہیں جانا تھا بلکہ گاؤں کے باہر مغربی طرف سے سڑک جنوب کی طرف جاتی تھی۔ وہ کچھ آگے جا کر دائیں جانب مڑتی تھی۔ اسی پر وہ فارم باؤس تھا۔ جو کسی زمانے میں رتن دیپ سنگھ نے خریدا تھا۔ تب سے



وہیں گورتج سنگھ اور اس کی بیوی ملکیت کو رہتے آئے تھے۔ ان کی ایک ہی بیوی روپ کو بھی جو بیاہ کر کینڈا شفٹ ہو گئی تھی۔ ان دنوں وہ وہیں آئی ہوئی تھی۔

فارم ہاؤس پر ان کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ گورتج سنگھ، ملکیت کو اور روپ کو، ان کے وہاں پہنچتے ہی پورچ میں آگئے۔ وہی تینوں جانتے تھے کہ یہ کون ہیں لیکن اپنے نوکروں کو دکھاوے کے لیے یہ بتایا گیا کہ یہ کینڈا آئے آئے ہیں۔ روپ کو کے دوست کینڈا سے آ رہے ہیں۔ وہ کچھ دن یہاں رہیں گے۔ یہ کچھ دن کتنے ہونے تھے، یہ انہیں بھی معلوم نہیں تھا۔ کیونکہ یہ پنجاب پر ریسرچ کرنے کے لیے آئے ہیں۔ فارم ہاؤس کے اندر کافی بڑی ساری رہائش گاہ تھی۔ جس کا ایک مخصوص حصہ ان کے حوالے کر دیا گیا۔ وہ بند روم میں جا پہنچے۔ وہاں چائے ہی اپنی عادت کے مطابق بانٹتا کوہ بستر پر جا گری۔ جہاں سنگھ ملازمین کا ایلا ہوا سامان ٹھکانے لگوا رہا تھا۔ یہاں تک کہ بیچ کے بعد وہ دونوں ہی سو گئے۔

شام کے وقت جب وہ بیدار ہوئے تو فریش ہو کر وہ چھت پر آ گئے۔ ارد گرد وہی گاؤں کا ماحول تھا۔ چاروں طرف کھیت تھیں۔ ان میں ہنرہ ہی ہنرہ تھا۔ شمال کی جانب کافی فاصلے پر نیوب ویل تھا۔ جس کے ارد گرد کافی جگہ بنائی ہوئی تھی۔ وہ کچھ دیر وہاں کے ماحول سے لطف اندوز ہوتے رہے، پھر کرسیوں پر آن بیٹھے۔ شام اتر چکی تھی۔ ابھی جہاں نے اپنا فون نکالا اور ارون سنگھ کے نمبر ملا دیئے۔ کچھ دیر بعد ہی کال رسیو کر لی گئی۔

”میری میل پڑھ لی تھی۔ اس نے پوچھا۔  
”ہاں، پڑھ لی تھی۔ اس ڈی ڈی کی کاپی بھی مل گئی ہے، جس میں لوگوں کے ایڈریس ہیں۔ اس کے علاوہ میں نے سردار سر جیت سنگھ بندیاں کی وہ

تحریر بھی پڑھ لی ہے۔ ہم اسے دیکھ لیں گے۔ میں اور فہیم نے ان سے رابطے کا ایک طریقہ کار بنالیا ہے، جو میں تمہیں تفصیل سے بھیج رہا ہوں۔ یہ سب نیٹ ورک میں جیسے ہی آتے ہیں، کوئی پلان کر لیں گے۔“ اس نے پوری تفصیل سے بتا دیا

”جمال کدھر ہے، اس نے دیکھا؟“ جہاں نے پوچھا۔

”وہ ابھی یہاں نہیں پہنچا، لیکن کچھ دیر میں پہنچ جائے گا۔ وہ کہیں قریب ہی ہے۔ وہ جیسے ہی آتا ہے، میں اس سے شیئر کر لیتا ہوں۔“ ارون نے جواب دیا۔  
”اوکے، میں انتظار کر رہا ہوں۔“ اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ بات کرنے کے بعد وہ دونوں نیچے اپنے کمرے میں آ گئے۔ انہوں نے وہ سامان کھولا۔ اس میں بڑے سمارٹ قسم کے آلات تھے۔ وہ ان سے یہاں بیٹھ کر کسی سے بھی رابطہ کر سکتے تھے۔ اس کی یہی خصوصیت تھی کہ اس کوئی نیٹ ورک پکڑ نہیں سکتا تھا۔

رات گئے جمال کا فون آ گیا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اس نے کہا۔  
”تمہیں فی الحال کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم سکون کرو۔ ایک دو دن میں وہ سب نیٹ ورک میں آ جائیں گے۔ پھر ہم پلان کر لیں گے کہ کرنا کیا ہے۔“

”ہم ادھر آرام سے پڑے رہیں، امرتسر ہے یہاں آنے کا فائدہ؟“ جہاں نے پوچھا۔

”یہ میرا فیصلہ نہیں تھا سو بنے، تم جب اپنی من مانی کرو گے تو یہی ہوگا۔ یہ سیٹ اپ تم اوگی میں بھی بنا سکتے تھے۔ یہاں تم جلدی نگاہوں میں آ جاؤ گے۔“  
”میں نے کون سا یہاں ہمیشہ رہنا ہے، زیادہ سے زیادہ سے دو ہفتے اور بس؟“ جہاں نے پوچھا۔



استعمال کر سکتے ہو یا وہ ہمارے کسی کام آسکتے ہیں۔“  
 ”میرے خیال میں انہیں مارنے سے کچھ نہیں ہو گا، وہ انتقاماً مزید لوگ لے آئیں گے۔ مطلب پلان وہی رہے گا، بس اس میں لوگ آگے پیچھے ہوتے رہیں گے۔ اصل بات ہے کہ دشمن جو پلان لے کر آتا ہے، وہ اس میں پوری طرح شکست کھائے۔ اس سے ان کا حوصلہ ٹوٹ جائے۔ انہیں لگے کہ وہ کچھ نہیں کر سکتے ہیں۔ شیطان کا جوا بجنڈا ہے، اس کا قلع قمع کیا جائے۔“ فہیم نے اپنی سوچ سے آگاہ کیا تو کراچی میں بیٹھا ہوا سلمان فوری طور پر بولا۔

”یہ ٹھیک ہے کہ جب تک یہاں کے سہولت کار شیطان کو راستہ نہیں دیں گے، اس وقت تک آپ کا پلان بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ دونوں طرف سے کو تشش کرنا ہوگی، یہ ضروری ہے۔“

”تم دونوں ایک ہی بات کر رہے ہو۔ جب سہولت کار ہی نہیں ہوگا تو وہ اپنا پلان ہوا میں رکھیں گے۔ لیکن ہم ایسے بھی نہیں کریں گے کہ جس پر شک ہوا سے ختم کرتے چلے جائیں۔ اصل میں دیکھنا یہ ہو گا کہ وہ کون سا پلان لا رہے ہیں، اسے ختم کرنے میں جو بھی کرنا پڑے، بہر حال ختم کریں گے۔ بس کوئی بھی پلان کامیاب نہ ہونے دیں۔“ میں نے اپنی رائے دی تو مہوش ہوئی۔

”کوئی بھی پلان جب بنتا ہے نا، وہ نہ صرف حالات کو دیکھ کر بنتا ہے، بلکہ وہاں دستیاب سہولت کو دیکھ کر بنایا جاتا ہے۔ جیسے ہم نے نہیں جانا ہے تو ہم وہاں کے موسم کے مطابق کپڑے رکھتے ہیں، وہاں کی کنوئیں کو ذہن میں رکھتے ہیں، رہنے یا دیگر سہولیات ہمارے دماغ میں ہوتی ہیں۔ یہاں کا ماحول ایسا ہو کہ کوئی پلان بناتے وقت لاکھ مرتبہ سوچے۔ آج اگر ملک کے حالات درست نہیں ہیں،

”تم اپنا سیٹ اپ سیدھا کرو اور اس کے بعد چپ چاپ چندی گڑھ نکل جاؤ، نوٹن اور سندپ کو بھی ساتھ لو۔ بلکہ انہیں اب پہلے بھیج دو، بعد میں تم چلے جانا۔ وہیں سے آریٹ کرو۔ رویت اور گرلین بھی تمہیں جوائن کر لیں گی، میں انہیں یہاں سے بھیج دیتا ہوں۔ انہیں آنے میں وقت لگے گا، وہ ذرا گھوم کے آئیں گیں۔“

”کیا یہ تم نے پہلے ہی سوچا ہوا ہے؟“ جہاں نے پوچھا۔ تو جمال بولا۔

”ہاں، رات میں جب سفر کر رہا تھا، اس وقت سوچا۔ میں ماننا ہوں کہ تم پر بھاری وقت ہے، لیکن جو میں دیکھ رہا ہوں، وہ اس سے کہیں زیادہ بھاری وقت آنے والا ہے اور یہ سب حالات ہم نے مل کر دیکھنے ہیں۔ گھبرانا نہیں، میں تمہارے ساتھ ہوں۔“

”اوکے۔“ جہاں نے کہا اور پھر کچھ دوسری باتوں کے بعد فون بند کر دیا۔ وہ بڑی حد تک مطمئن ہو گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

رات کا پہلا پہر گزر چکا تھا۔ میں، اردند اور فہیم کے پاس ان کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہیں مہوش اور باقی سب تھے۔ میں لندن ٹور کے بارے میں انہیں پہلے ہی سے معلوم تھا، اس لیے زیادہ بات نہیں ہوئی۔

”اردند! یہ جوسٹ تمہیں یہاں کے لوگوں کی ٹی ہے اور اس سے پہلے بھی ہمیں ان دلالوں کی ٹی تھی، کیا یہ دونوں ایک ہی ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”زیادہ تر ان میں وہی لوگ ہیں، ٹھوڑا سا کچھ فرق ہے، چند لوگ نئے ہیں۔“ اس نے جواب دیا تو میں نے فہیم کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”فہیم، تم کیا یہ سمجھتے ہو کہ تم انہیں کس طرح

نئے افق



قانون شکن زیادہ طاقتور ہیں تو اس کا یہاں ایسا ماحول بنایا گیا ہے۔“

”تو پھر ہم ایسا کرتے ہیں کہ ابھی تھوڑا سوچ بچار کریں کہ ہم کیا کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ طے ہے یہ جو ہمارا ملک ہے، یہ ہمارا ”حرم“ ہے، ہمارا گھر، اسے ہم نے بچانا ہے، اس کی حفاظت ہمارے ذمے ہے۔“ میں نے کہا تو ہم سب اٹھ گئے۔ میں نے تو سوچا ہوا تھا کہ کیا کرنا ہے۔ اس لیے میں سیدھا اماں کی طرف چلا گیا۔ جہاں سوہنی میرا انتظار کر رہی تھی۔ میں اماں کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ سوہنی آگئی۔ وہ اماں کو دوائی دینے لگی تو میں اٹھ کر باہر آ گیا۔ میں کاریڈور میں آکھڑا ہوا۔ کچھ دیر بعد وہ آگئی۔

”یہاں کیوں کھڑے ہیں؟“ اس نے ہولے سے پوچھا تو میں نے کہا۔

”میرا انتظار مت کرنا، سو جانا۔ مجھے دیر ہو جائے گی۔“

”کہیں جارہے ہیں آپ؟“ اس نے پوچھا۔

”میں چھت پر ہوں۔ مجھے کچھ لوگوں سے رابطے کرنے ہیں، تم ڈسٹرب ہوگی۔“ میں اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں ہوں گی میں ڈسٹرب، بیڈروم میں چلیں، یا میں بھی آپ کے ساتھ چھت پر آتی ہوں۔“ اس نے شوخی سے کہا تو میں ہنس دیا۔

”ٹھیک ہے آ جانا۔“ میں نے کہا اور چھت پر چلا گیا۔

موسم کافی خوشگوار تھا۔ میں نے جاتے ہی اروند سے رابطہ کیا، وہ ابھی تک اپنے کمپیوٹر کے سامنے تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”کیا جنید نے مقامی نیٹ ورک کو الٹ کر دیا ہے؟“

”جی وہ انتظار میں ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

”کیا تم، میں اور جنید ایک ساتھ رابطے میں ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”جی وہ آپ کی بات سن رہا ہے۔“ اروند نے کہا تو جنید تصدیق کرتا ہوا بولا۔

”میں سن رہا ہوں۔“

”تو سنو خورشید خان ہے ایک بزنس مین ہے، اس کا بائیوڈیٹا ابھی تمہیں اروند دے دیتا ہے۔ اسے بڑے سکون سے پکڑنا ہے اور ماڈل ٹاؤن والے سیف ہاؤس میں لے جانا ہے۔ باقی باتیں وہیں ہوں گی۔“

”میں نے تمہیں میل کر دیا ہے جنید۔“ فہیم کی آواز آئی تو جنید بولا۔

”میں دیکھتا ہوں۔“

”وہ بعد میں دیکھنا، پہلے سن لو۔ اس وقت وہ مال روڈ پر موجود جیم خانہ میں اپنے دوستوں کے ساتھ گپ

شب لڑا رہا ہے۔ وہاں چند غیر ملکی آئے ہوئے ہیں۔ اگرچہ وہ غیر ملکی ایک خاص پلان کے تحت وہاں پر موجود ہیں لیکن ابھی انہیں چھیڑے بغیر صرف خورشید

خان کو اٹھانا ہے، میں لحد بہ لحد تمہارے ساتھ ہوں۔“ فہیم نے اسے بریف کرتے ہوئے کہا۔

”اوکے، میں نکلتا ہوں۔“ جنید نیزی سے بولا۔

”اوکے تم نکلو، ہم تمہارے ساتھ ہیں۔“ فہیم نے کہا تو جنید کی طرف سے خاموشی چھا گئی۔

آدھے گھنٹے میں وہ جیم خانہ کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے آس پاس مقامی نیٹ ورک کے لوگ تھے، جن سے اس کا رابطہ ہو چکا تھا۔ خورشید خان اس وقت ایک کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے باہر نکلنے تک اسے انتظار کرنا تھا۔ وہ باہر رہا اور اس کے ساتھ مقامی

نیٹ ورک بھی۔ تقریباً آدھا گھنٹہ یونہی گزر گیا۔ بھی

89



وہ کمرے سے باہر نکلا تو اس کے ساتھ ایک غیر ملکی لڑکی تھی۔ وہ شراب کے نشے میں تھی اور خورشید خان نے اسے تھاما ہوا تھا۔ خورشید خان کا ڈرائیور کار لے آیا۔ خورشید خان نے بڑی احتیاط کے ساتھ اس غیر ملکی لڑکی کو پچھلی نشست پر پہلے بٹھایا اور پھر خود بیٹھ گیا۔ ڈرائیور کے ساتھ اس کا ایک گارڈ بیٹھ گیا تو کار چل دی۔ اس کے پیچھے ہی اس کی سیکورٹی والی کار بھی نکل پڑی۔ دونوں میں فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔

جنید الیٹ ہو گیا تھا۔ جیسے ہی جیم خانے سے وہ دونوں کاریں نکلیں، جنید بھی ان کے پیچھے لگ گیا۔ اس کے ساتھ تین کاریں تھیں۔ چھ کاروں کا یہ قافلہ تیزی سے بھاگا جا رہا تھا۔ جنید اور مقامی لوگوں میں سب طے تھا کہ کرنا کیا ہے۔ جیسے ہی وہ نہر پر چڑھے، جنید اور اس کے ساتھیوں نے کوشش کی کہ کسی طرح سیکورٹی کار اور خورشید خان والی کار کے درمیان آجائے۔ ٹران لیتے ہوئے ایک کار ان کے درمیان آگئی۔ تب جنید نے بھرپور رسک لیا اور کار خورشید خان کے ساتھ لگا دی۔ پچھلی کار اس سے بھی آگے نکل گئی۔ انہوں نے گھبرے میں لے لیا۔

پان یہ تھا کہ کسی طرح چند لمحوں کے لیے اس کی کار کو روکا جائے۔ ان تینوں کاروں نے آخر کار اس کی کار کو روک تو نہیں پائے لیکن رک جانے کی حد تک آہستہ کر ہی لیا۔ جیسے ہی خورشید خان کی کار آہستہ ہوئی، جنید نے انتہائی پھرتی سے اپنی کار کا دروازہ ذرا سا کھولا اور نیچے کی طرف کر کے سائیلنسر لگے پستل سے ٹائر پر فائر کر دیا۔ جیسے ہی ٹائر پھٹنے کی آواز آئی، اس وقت تک جنید نے پستل اندر کر کے دروازہ بند کر لیا تھا۔ جیسے ہی خورشید خان کے ڈرائیور نے کار آگے بڑھائی تو اسے پتہ چل گیا کہ ٹائر مسئلہ کر گیا ہے۔ اس کی کار ذرا سی لہرائی پھر کار سڑک میں رُک گئی۔ اس

سے ٹریفک بلاک ہو گئی۔ ان کی تینوں کاریں خورشید خان کی کار کے ارد گرد ہو گئیں۔ خورشید خان کا ڈرائیور کار سے اتر آیا تھا۔ یہی وہ لمحہ تھا، جب جنید حرکت میں آ گیا۔ سبھی اپنی اپنی کاروں سے اتر آئے تھے۔ جنید نے جیسے ہی پچھلا دروازہ کھولا، وہ سبھی اس طرف دیکھنے لگے۔ جنید نے پستل خورشید خان کی کنپٹی پر رکھتے ہوئے سکون سے کہا۔

”میرے ساتھ آتے ہو یا نہیں ماردوں؟“

”ک..... کک..... کہاں؟“ اس نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔ اتنے میں اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے سیکورٹی گارڈ نے مڑ کر گن سیدھی تھی دوسری طرف سے اس کے سر پر پستل رکھ دیا گیا تو جنید نے کہا۔

”یار کسی اچھی جگہ چلیں گے، چلو، ایک، دو.....“

”چلو۔“ یہ کہتے ہوئے وہ نیچے اترنے لگا۔ جنید نے اسے اپنے ساتھ لیا اور اپنی کار میں آ بیٹھا۔ تین تک اس کا ڈرائیور لڑکا گنیر لگا چکا تھا۔ سائیڈ سے کاریں نکل رہی تھیں، اس نے زگ زیک کاریوں کی بجائے کہ کمال کر دیا۔ انہیں پورا یقین تھا کہ اس کی سیکورٹی کار ان کے پیچھے ضرور آئے گی۔ انہوں نے نہر سے اندر کی جانب ٹران لیا اور تیز رفتاری سے چلنے لگے۔ انہیں پتہ چل گیا کہ وہ ان کے پیچھے ہیں۔ تنہی فہیم کی آواز اسے سنائی دی۔

”جنید! ان سے مارا ماری مت کرنا، فائر تو بالکل نہیں، یہ اس لیے کہ یہ علاقہ ایسا ہے تم پھنس جاؤ گے۔ انہیں جُل دے کر نکلنے کی کوشش کرو۔“

”اوکے۔“ جنید نے کہا تو اس کے ساتھ ہی ڈرائیور نے کار بھگا دی۔ اسے پتہ تھا کہ سب نے اس کی بات سن لی ہے۔ ایک دم ساری کاریں اکٹھی ہوئیں اور پھر الگ الگ ہو گئیں۔ سیکورٹی والی کار ایک دوسری کار کے پیچھے لگ گئی۔ جنید کے لیے راست



صاف ہو گیا۔ وہ بڑے اطمینان سے ماڈل ناؤن کے سیف ہاؤس میں پہنچ گیا۔

خورشید خان کو جب ایک کمرے میں لے جا کر بٹھا دیا گیا تو میں کیمرے کے ذریعے اسے دیکھنے لگا۔ میں نے جنید کے ذریعے اس سے سوال کیا۔ میں کہتا جا رہا تھا اور جنید اسے دہرا رہا تھا۔ وہ بات سننے کو بیٹا تھا۔

”سکندر خان کے دست راست راشد محمود سے تمہارا کیا تعلق ہے؟“

میرے سوال پر وہ بری طرح چونک گیا۔ مگر لمحہ بھر میں خود پر قابو پا گیا۔ اس نے جنید کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”کون سکندر خان اور کون راشد محمود؟“

”جنید اس کی پٹائی کرو اور اس وقت تک کرتے رہو، جب تک یہ اس تعلق کے بارے میں نہ مان جائے، باقی باتیں صحیح ہوں گی۔“ میں نے کہا اور جنید سے رابطہ منقطع کر کے گھومتے ہوئے دیکھا تو سوہنی میرے پہلو میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ملجلی روشنی میں اس کا سفید رنگ دمک رہا تھا۔ میں نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

”ہاں بھئی فہیم، اب باقی لوگوں کے بارے میں بتاؤ، کیا وہاں لوگ پہنچ گئے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ سب اس آپریشن میں لگ گئے ہیں، چونکہ ہمارا ان سے رابطہ نہیں، اس لیے رپورٹ دیر بعد ملے گی۔“

”اوکے۔“ میں نے کہا تو فہیم نے میری توجہ چاہنے کے لیے پوچھا۔

”آپ کے پاس کوئی ہے؟“

”تمہیں کیسے پتہ؟“ میں نے جلدی سے پوچھا۔

”پہلے آپ کنفرم کریں، تو۔۔۔۔۔“ وہ کہتے ہوئے رُک گیا تو میں نے اسے سوہنی کی موجودگی کے بارے میں بتا دیا، تب وہ بولا۔

”یہ میں آپ کو ایسے نہیں بتا پاؤں گا۔ آپ کو میرے پاس آنا ہوگا۔“

”یہ کیا بات ہوئی بھئی، میں اتنے دنوں بعد اپنی بیوی کے پاس بیٹھا ہوں اور تم رقیبوں کی طرح درمیان میں خلل ڈال رہے ہو۔“ میں ہنستے ہوئے کہا۔

”یہ میری ایک بڑی کامیابی ہے، جو میں سب سے پہلے آپ کو بتانا چاہ رہا تھا۔ چلیں صبح تک انتظار کر لیتا ہوں۔“ اس نے یوں کہا جیسے مایوس ہو گیا ہو۔ سو میرے کہنے سے پہلے ہی سوہنی نے کہا۔

”فہیم! اس وقت تمہارے پاس کون کون ہے؟“

”میں، اروند اور مہوش۔“ اس نے کہا۔

”اوکے، ہم دس یا پندرہ منٹ تک تمہارے پاس آ رہے ہیں۔“ اس نے کہا تو میں نے سوہنی کی جانب دیکھا وہ مسکرا رہی تھی۔ اس نے اپنا سیل فون نکالا اور ایک ملازمہ سے بہترین چائے بنانے کو کہا۔

جب تک ہم کچن کے پاس پہنچے، چائے تیار تھی۔ سوہنی نے فریج میں سے مٹھائی نکالی اور وہ نرے میں رکھتے ہوئے ملازمہ سے چائے رکھنے کو کہا۔ اگلے چند منٹ میں ہم ان کے پاس تھے۔

”ہاں بولو کیا کامیابی ہے۔“ سوہنی اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی، اروند اور مہوش بھی متوجہ ہو گئے۔ وہ بڑی سنجیدگی سے بتانے لگا۔

”آپ کو یاد ہوگا کہ بھارت میں کسی نے بدن کی گرمی اور ان دیکھی شعاعوں کو ایک نریکر کے طور پر استعمال کرنے کا سوفٹ ویئر بنایا تھا، پھر ہم نے اسی سے ان لوگوں کو پکڑا تھا۔“

”ہاں مجھے یاد ہے۔“ میں نے کہا تو وہ تیزی



سے بولا۔ تمہارے اعزاز میں پارٹی ہوگی، یہیں پر۔" میں نے

کہا تو وہ سب خوش ہو گئے۔ ابھی وہ سارے اس سوٹ ویئر کو سمجھ رہے تھے کہ میں نے ارونڈ کی توجہ اپنی طرف کرتے ہوئے کہا۔

"یار، جن لوگوں کی میں نے تمہیں لسٹ دی تھی، وہ سب....."

"ان کا آپریشن مختلف جگہ پر ہو رہا ہے، میں ان کے ساتھ ہوں۔ مجھے اطلاع مل رہی ہے۔ چاہے چھ سات بندے ہی ہیں، لیکن سب مہان قسم کے ہیں۔ آپ فکر نہ کریں، میں سب سنبھال لوں گا۔" اس نے مجھے یقین دلایا تو میں ان کے پاس سے اٹھ کر بیڈ روم کی طرف چل دیا۔ میں نے ان سب سے صبح بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

صبح جب میں بیدار ہوا تو ملجکا اندھیرا تھا۔ میں فریش ہو کر جب واپس بیڈ پر آیا تو سوہنی میرے لیے چائے بنا کر لائچکی تھی۔

"سوہنی۔! اب مجھے ڈسٹرب نہیں کرنا، میں ذرا بڑی ہوں۔" میں چائے کی چسکی لے کر کہا تو وہ میری بات سمجھتے ہوئے مسکرا کر چلی گئی۔ جب تک چائے کی پیالی ختم ہوئی اس وقت تک میں میں سب سے رابطہ کر چکا تھا۔ جنید نے رات خورشید خان کی کافی دھنائی کی تھی۔ صبح سے پہلے وہ سب مان گیا تھا۔

"تم لوگ کیا چاہتے ہو؟" اس نے الجھتے ہوئے کہا۔

"کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔ تمہیں راشد نے نہیں بتایا؟" میں نے سوال کیا۔

"تین دن سے اس کے ساتھ رابطہ نہیں ہے۔" اس نے بتایا تو میں نے پوچھا۔

"وہ نورنگر بندے تم نے بھیجے تھے، راشد کے کہنے پر یا تمہاری اپنی کوئی دلچسپی تھی؟"

"یہ دیکھیں، میں نے ایک سوٹ ویئر بنایا ہے، اس کی بنیادی تھیوری یہ کہ جس طرح بظاہر انسان ایک جیسا ہی ہے، لیکن قدرت نے اسے انفرادیت بھی دی ہے۔ جیسے انگوٹھے کا نشان، جسم کی شعاعیں وغیرہ۔ ہر انسانی جسم کی کیمسٹری الگ ہے۔ اس طرح اگر اس سوٹ ویئر میں کسی بھی شخص کی آواز داخل کر دی جائے تو پھر وہ آواز جب تک دنیا سے ختم نہیں ہو جاتی، اس وقت تک وہ آواز والا بندہ ہماری نگاہ سے اوجھل نہیں ہو سکتا۔"

"اونے فیہ تیری..... مجھے بتایا ہی نہیں۔" ارونڈ سنگھ نے چونکتے ہوئے حیرت سے کہا۔

"اس لیے کہ تو اسے چیک کر، اب اسے اپ ڈیٹ کر، اگر ہو سکے تو۔" فہیم نے فخریہ انداز میں کہا۔

"پر تجھے میرے چھت پر ہونے کا اندازہ کیسے ہو گیا، میں تو بولی ہی نہیں وہاں پر؟" سوہنی نے الجھتے ہوئے کہا۔

"میں نے یہاں جتنے فرد ہیں ان سب کی آوازوں پر ہی تو تجربہ کیا ہے، آپ کی آواز بھی اسی میں ہے، سو، مجھے معلوم ہو گیا کہ آپ کہاں ہو۔"

"بے شک یہ تمہاری بڑی کامیابی ہے۔" مہوش نے اس کے پاس آ کر بال بگاڑ دیے۔ یہ اس کا خلوص بھر انداز تھا۔ بھی اس نے کہا۔

"کاش یہاں گرلین اور رونیت ہوتیں، انہیں کتنی خوشی ہوتی۔ انہیں بھی بتائیں۔"

"انہیں بھی معلوم ہو جائے گا، کل تک وہ بھارت پہنچ جائیں گی، اس وقت وہ جہاز میں ہوں گی۔" میں نے کہا تو وہ سمجھ گئی کہ انہیں تو چلے جانا تھا۔

"اوہ! کل بتا دیں گے۔" مہوش نے کہا۔

"مبارک ہو فہیم، رب تجھے بہت ترقی دے۔ کل



”راشد کے کہنے پر، وہ وہاں کچھ لوگ مردانا چاہتا تھا۔“ اس نے جواب دیا۔

”کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ وہی جانتا ہے، مجھے اس نے صرف اتنا کہا تھا کہ یہ بندہ ہمارے نیٹ ورک کے لیے خطرناک ہے۔“ اس نے صاف بتا دیا۔

”اب سمجھ گئے ہو کہ ہم تم سے کیا چاہتے ہیں؟“ میں نے کہا تو روبانسا ہوتا ہوا بولا۔

”میرا اس میں کوئی قصور نہیں ہے، میں تو اس نیٹ ورک کا حصہ ہوں، مجھے وہ سب کرنا پڑتا ہے، مجھے معاف کر دیں آپ جو کہیں گے میں وہ کرنے کو تیار ہوں۔“

”وہ نیٹ ورک اب ختم ہو چکا ہے۔ تمہارے اکاؤنٹ سے جتنا پیسہ تھا، وہ نکال لیا گیا ہے۔ تمہیں صرف اتنا کہا جا رہا ہے کہ ملک دشمنی میں اگر تم نے کوئی بھی کام کیا تو پھر بخشے نہیں جاؤ گے۔ بلکہ کوئی بھی ایسا کام ہو تو اطلاع دینی ہے۔“

”جی میں ایسا ہی کروں گا، بس مجھے معاف کر دیں۔“ اس نے کہا تو میں نے جنید کو اسے آزاد کرنے کو کہا۔ میں جانتا تھا کہ جنید اسے ایسے نہیں چھوڑنے والا، وہ اسے اس طرح وہاں سے بھیجتا کہ اسے پتہ ہی نہ چلے کہ وہ کہاں تھا۔ میں نے فردا فردا سب سے یہی بات کی انہیں آزاد کر دیا۔

میں نے ایک دفعہ سب کو معاف کر دیا۔ ان میں جو بھی سانپ فطرت والا ہوگا، اس نے ڈنگ ضرور مارنا تھا، اس کے لیے پھر معافی نہیں تھی۔ اسی لمحے میں نے راشد عرف گارڈ فادر کو فون کیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، وہ تیزی سے بولا۔

”مجھے یہ سمجھ نہیں آرہی ہے کہ جب میں تمہیں اپنا سارا نیٹ ورک دے رہا تھا، تم نے نہیں لیا۔ اب

انہیں لوٹ رہے ہو، اور نیٹ ورک تباہ کر رہے ہو، اس سے تمہیں کیا فائدہ ہے میری جان؟“

”تم لوگ انسانیت کے لیے کام نہیں کر رہے ہو، تم لوگوں کا مقصد شیطانیت ہے، جو مجھے قبول نہیں۔ جو بھی میرے ملک کے لیے غلط کرے گا، میں اسے حرف غلط کی طرح منادوں گا۔“

”جو کچھ تم ختم کر چکے ہو، یہ آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہے، تمہارے حکمرانوں نے، سیاست دانوں، مذہبی لیڈروں، سوشل ورکروں نے تمہارے ملک کو تماشہ گاہ بنا دیا ہے۔ کیا کرو گے، بہت وقت چاہئے اور بہت بڑی قوت، اور تم ایسے بھی نہیں ہو کہ بقول تمہارے، میرے جیسے مہرے کو بھی ختم نہیں کر پائے۔ میں زیادہ سے زیادہ دو ہفتے بعد پھر نمودار ہو جاؤں گا۔ پوری دنیا تک رسائی ہے میری۔“ اس کا لہجہ مضحکہ خیز تھا۔

”تو پھر تم نے میری رسائی دیکھنی ہے؟“ میں نے پوچھا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ اچانک اس کا قہقہہ بند ہو گیا۔ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا، ”یہ کیا ہے ڈیورا؟“

”تمہاری موت۔“ اس نے کہا اور فار کر دیا۔ گارڈ فادر کے منہ سے بھیاٹک آواز نکلی۔ اس کے ساتھ ہی وہ گر گیا تھا کیونکہ فون گرنے کی آواز آئی تھی۔ اس کے کچھ ہی لمحوں بعد ڈیورا نے کہا۔

”یہ ختم ہو چکا ہے۔“

”تم آزاد ہو۔ جہاں چاہو جا سکتی ہو۔ یہاں سے نکلو گی تو سرخ مریدین میں میری وہی ساتھی بیٹھی ہوئی ہوگی، جس سے تم ملی تھی۔ وہ تمہاری ہر خواہش پوری کر دے گی۔“ میں نے اسے سمجھایا۔

”اوکے، میری اس کے ساتھ ڈیل ہو چکی ہے۔ مجھے پاسپورٹ مل گیا ہے۔“ اس نے کہا اور فون بند کر



”کھل کر کہو بابا، اصل بات کیا ہے؟“ میں نے جان بوجھ اس سے فرید کی حالت کے بارے میں پوچھا۔

”اصل بات تو شوق ہی نا سرکار اس کا شوق اسے پہلوانی کی طرف لے تو آیا لیکن یہ انتہائی کچا تھا۔ یہ کچھ نہیں جانتا تھا، اسے تو یہ تک معلوم نہیں تھا کہ اس کے اندر کتنی طاقت چھپی ہوئی ہے۔ اس نے خدمت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ خیر اسی سے پوچھو، یہ کن مرحلوں سے گزرا ہے۔“ اس نے فرید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا میں نے فرید کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا دیا، پھر دھیمے سے لہجے میں بولا۔

”مجھے نہیں معلوم تھا کہ پہلوانی اتنی مشکل ہوتی ہے۔ میں اکیلا ہی یہاں اکھاڑا کھود لیتا زور کر لیتا اور بس۔ پھر جب یہ درویش یہاں آئے تو مجھے پتہ چلا کہ یہ خود بھی اپنے دور کے بڑے پہلوان رہے ہیں۔ ان کے یہاں آتے ہی یہ پہلوان یہاں آگئے۔ دو دن ہی میں مجھے پتہ چل گیا کہ میں تو کچھ بھی نہیں ہوں، انہوں نے میرا بدن توڑ کر رکھ دیا۔ میرے اندر یہ سوچ پیدا ہو گئی کہ میں کس کام میں آ پڑا ہوں۔ میں ٹوٹ گیا تھا، میری ہمت ہی جواب دے گئی تھی۔ ایک شام میں دل برداشتہ ہو کر اکھاڑے سے آیا۔ لیکن میرا شوق مجھے اس راہ سے ہٹنے نہیں دے رہا تھا، ساری رات میں اسی کشمکش میں رہا، صبح میں پھر اکھاڑے جا پہنچا۔ تب انہوں نے مجھے داؤ سکھانا شروع کر دیئے اور اب میں ان سب پہلوانوں پر بھاری ہوں۔ بڑے آرام سے انہیں زیر کر لیتا ہوں۔“

”شوق سب سے اہم شوق ہے۔ اس کے شکستہ بدن نے اس کے اندر یہ سوچ پیدا کی کہ میں کس کام میں پڑ گیا ہوں، یہ پستی کی دلیل ہے۔ یہ گرا تو اس

دیا۔ میں تانی کی سوچ کو داد دینے بنا نہیں رہ سکا اس نے کس خوبصورتی سے راشد کوڈیورا کے ہاتھوں ہی ختم کرادیا۔ ایک بڑی ذیل اور کسی بھی دوسرے ملک میں رہنے کا وعدہ ڈیورا کے لیے اتنا اہم نہیں تھا، جتنا اس نے اپنی آزادی کے لیے کیا تھا۔ میں نے ایک طویل سانس لیا اور فون بند کر دیا۔ میں چند منٹ بیڈ پر بیٹھا رہا، پھر اٹھ کر کھڑکی میں آگیا۔ دوپہر ہو چکی تھی۔ شام ہونے میں ابھی کافی وقت پڑا تھا۔ میرا دل کیا کہ میں کہیں باہر نکلوں۔ میں نے کار نکالی اور مسافر شاہ کے گھر سے کی جانب چل پڑا۔

گھر سے پر درختوں کے نیچے پانی کا چھڑکاؤ کیا ہوا تھا۔ رنگین پانیوں والی چار پائیاں کچھی ہوئی تھیں۔ لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے کار روکی اور اتر کر کمروں کے پیچھے دیکھا تو اکھاڑے میں فرید اور درویش دونوں زور کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ دو اور پہلوان بھی زور آزمائی کر رہے تھے۔ انہیں دیکھنے کو کچھ لوگ وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہاں خاصی رونق لگی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ چند لمحوں کے لیے رک گئے۔ میں نے انہیں اپنا کام جاری رکھنے کو کہا اور وہاں سے پلٹ کر مسافر شاہ کے گھر سے پر چلا گیا۔ میں اس وقت واپس لوٹا، جب شام ہو رہی تھی اور وہ زور آزمائی ختم کر کے سردائی رگڑنے لگے تھے۔ اس وقت میں ان کے پاس چار پائی پر جا بیٹھا۔ پہلوان مٹی کے بڑے بڑے پیالوں میں سردائی پیا رہے تھے۔ ایک پیالہ مجھے بھی دیا۔ میں نے سردائی پینے کے بعد اس درویش سے فرید کے بارے میں پوچھا۔

”سناؤ کیا حال ہے اس کا؟“

”اب یہ فتح کی راہ پر آیا ہے، سمجھ لو کہ برتن کو آگ میں رکھ دیا ہے، اب اس نے پختہ ہونا ہے۔“ اس نے رمزیہ انداز میں کہا تو میں نے ہنستے ہوئے کہا۔



کے شوق نے اس کے اندر بلندی پیدا کر دی۔ اصل میں پستی اور بلندی سے گزر جانے کے بعد ہی مقام فتح نصیب ہوتا ہے۔ جب تک کوئی گرتا نہیں ہے، اسے بلندی کی سمجھ نہیں آتی۔ شوق ہی کمزوری کی دلیل کو اڑاتا ہے اور تسخیر کے مقام پر فائز کرتا ہے۔ جس نے خود اٹھنے کا راز پالیا وہی ساری قوتوں کو جذب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ شکستہ ہونا، گرنا، اٹھنا، عمل میں آنا، داؤد سیکھنا، شہ زور بننا، تسخیر کرنا یہ سب شوق ہی کے مراحل ہیں۔ "درویش نے بڑے سکون سے مجھے فرید کے بارے میں سب بتا دیا۔ میں مسکرا دیا۔ جہی میں نے ان سب کی طرف دیکھ کر انہیں وہ بات سمجھائی جو بہت ضروری تھی۔

جب بیج زمین کی تاریکی میں چلا جاتا ہے تو تنہائی میں اس کی آنکھ بند ہو جاتی ہے۔ پھر وہ اپنے سوا کسی کو نہیں دیکھ سکتا۔ کائنات سے اس نے آنکھ بند کر لی اور وہ آنکھ اس نے اپنے آپ پر کھول لی۔ وہ اپنے آپ میں گم ہو گیا۔ اسے اپنے آپ کا احساس ہوتا ہے۔ یعنی خلوت میں جا کر اس نے خود پر نگاہ کی۔ اس وقت بیج کو اپنے بارے میں پتہ چلا کہ اس کے اندر کیا کچھ پڑا ہے، وہ کیا ہے، اس کی حقیقت کیا ہے؟ جب وہ خود کو سمجھتا ہے تو اس کے اندر قوت پیدا ہوتی ہے۔ باب بیج کے پاس دو ہی قوتیں ہیں۔ ایک منی، دوسرا نمی۔ دوسرے لفظوں میں اسے صحبت اور نگاہ بھی کہہ سکتے ہیں جب خود پر نگاہ مرکوز ہوئی، اسے اپنی صلاحیتوں کا اندازہ ہوا تب یہی صلاحیتیں اس کے اندر قوت بیدار کر دیتی ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ خود کو چیر دیتا ہے، زمین کی تاریکی کو بھی پھاڑ دیتا ہے اور خلوت سے جلوت میں آ جاتا ہے۔

اصل میں جب اس نے خود پر آنکھ کھولی تھی، اسی وقت ایک تناور شجر بننے کا عمل اس میں شروع ہو گیا

تھا۔ جب تک اس کی خود پر نگاہ نہیں گئی تھی، وہ اس عمل میں نہیں آیا تھا۔ یہ اس کے اندر کی قوت ہی تھی جو بیدار ہوئی تھی۔ محبت کے شرر سے دل سراپا نور ہوتا ہے۔ ذرا سے بیج سے پیدار یا ض طور ہوتا ہے۔

یہ ذرا سا ذرہ ایٹم، جب ایٹم بم کی صورت میں پھٹتا ہے تو اس کے اندر کس قدر قوت بیدار ہو چکی ہوتی ہے۔ یہ انرجی ثابت کرتی ہے کہ اس کے پھٹنے سے کتنی قوت پیدا ہوتی ہے۔ اور جس نے اس ایٹم کو بھاڑا، اس کی صلاحیتوں اور طاقتوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے؟ وہ انسان، جس نے اتنا کچھ کر لیا، اور نجانے اس سے کیا کچھ ظہور ہوتا ہے، وہ اپنی جانب دیکھ ہی نہیں رہا۔ جس نے اپنے اندر دیکھ لیا، اس نے قوتوں کا منبع سر کر لیا۔ طریقہ یہی ہے کہ اسے خلوت میں جانا پڑے گا۔

انسان ایک جسم ہے، جو منی سے بنا ہے اور اس کا تعلق کائنات سے ہے۔ اس کا وجود منی اور کل کائنات اس کا وجود ہے۔ اس کائنات میں جو سوچ اور فکر ظاہر ہو رہی ہے وہ انسان ہی کی تو ہے کہ کس طرح وہ اپنے پروردگار کی دی ہوئی نعمتوں کو تصرف میں لا رہا ہے، کیسے کیسے تسخیر کر رہا ہے۔ انسان کے اس وجود میں دل پڑا ہوا ہے جو تمام قوتوں کا منبع ہے۔ انسان کے ظاہری جسم کا تعلق اس کائنات سے ہے۔ جہاں سے وہ اپنی تمام ضرورتیں پوری کر رہا ہے۔ وہ اپنی ضرورت کے تحت ہر شے نکال رہا ہے۔ وجود کی ضرورت پوری ہو رہی ہے۔ ایک علم اس کے دل میں پڑا ہے اس کا دل جو ہے وہی دین ہے۔ علم دو ہی ہیں، ایک علم دین ہے اور ایک علم ابدان۔

یہ انسان ہی کا ظہور ہے جو اس کائنات میں ترقی ہو رہی ہے۔ مالک کائنات نے تو اسے پورا بنادیا، ترقی کا مطالب، انسان کی اپنی ترقی۔ جو دل ہے وہ ہماری



غیرت ہے، وہی ہمارا دین ہے۔ اگر یہ نہ رہا تو پھر کچھ بھی نہ رہا۔ کیونکہ دل میں سے جا کر ظاہر ہونے والا ہی مومن ہے۔ دین اور دنیا، ظاہر اور باطن ایک نظام میں لائیں گے تو وہ دل کے تابع ہوگی عقل اگر دل کے تابع ہے تو وہ یزدانی اگر نہیں تو نری شیطانی۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ دل کے ساتھ جڑا کیسے جائے، تو سیدھی سی بات ہے کوئی نہ کوئی معیار لینا پڑے گا، کوئی صورت لینا ہوگی جو دل کے بھید سے واقف ہے جب سامنے مومن ہوگا تو حقیقت کھل جائے گی۔ باطن کا مطلب فقر ہے۔ اصل میں دل کا راز ہے غیرت و ازا فقر، سامنے فقر لینا ہوگا، کوئی ہدف کوئی نشانہ تو لینا ہوگا۔ پھر تسخیر کا مقام خود بخود ہاتھ میں آ جاتا ہے۔ کیونکہ دل کی سوچ ہی مومن سے پیدا ہوتی ہے۔ مومن ہی محرم راز دل ہے۔ سوچ فقر ہی سے پیدا ہوتی ہے۔

رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ پہلوانوں نے کھانا بنایا ہوا تھا، میں نے ان کے ساتھ کھانا کھایا اور پھر واپس حویلی کی جانب چل پڑا۔ میں بہت مسرور تھا۔ مسافر شاہ کے ٹھڑے پر رونق لگ گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

جسپال سنگھ کو چند گز پہنچتے ہوئے تین دن لگ گئے۔ سردار سرجیت سنگھ بندیال کی دی ہوئی معلومات اور نیٹ ورک کے ساتھ رابطہ مکمل کر لیا۔ بھارتی پنجاب کے ہر بڑے شہر میں ایک ایسا بندہ موجود تھا، جس کا پورے علاقے میں نیٹ ورک تھا۔ اس میں ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے۔ فہیم اور اردن سنگھ کے ساتھ مل کر ایسا مربوط رابطہ بنایا تھا کہ انہیں جو کام بھی کرنا تھا، اس سے ہر بندہ باخبر رہتا۔ اس دوران اس نے گاڈ فادر کے اس پورے نیٹ ورک کے بارے میں بھی جانکاری حاصل کر لی

تھی جو بھارت میں پھیلا ہوا تھا۔ مگر اسے دلچسپی بھارتی پنجاب سے تھی، اس لیے اس کا کام جلدی سمٹ گیا۔ اس کے ساتھ بانیتا کور تھی۔ دونوں سیکرٹریس میں ایک بنگلہ نما گھر میں جا پہنچے جہاں سندھپ کور اور نوٹن کور پہلے ہی سے موجود تھیں۔ روایت اور گرلین ابھی تک نہیں پہنچی تھیں۔ اس دن وہ تھائی لینڈ میں تھیں، جہاں سے انہیں بھارت آنا تھا۔ چند گز میں انسانی حقوق کی ایک تنظیم موجود تھی، یہ سارا نیٹ ورک اسی کے گرد گھومتا تھا۔ چند گز ہی میں موجود ایک نوجوان رکن اسمبلی جگتار سنگھ اس تنظیم کو چلا رہا تھا۔ یہ تنظیم اس وقت سے قائم تھی، جب اس نے سیاست میں قدم بھی نہیں رکھا تھا، طلبہ سیاست اور تنظیموں میں اس نے اپنا آپ منوایا۔ بڑھائی کے بعد اس نے کسی سیاسی جماعت کو جوائن نہیں کیا بلکہ انسانی حقوق کی تنظیم بنائی۔ بنیادی طور پر وہ انسانی حقوق کی ہی تنظیم تھی لیکن اس کی تمام تر قوت خالصہ تحریک تھی۔ وہ خالصہ حقوق کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ اس کے لیے جگتار سنگھ نے کئی بار بھارتی پنجاب کا دورہ کیا تھا۔ تقریباً آٹھ برس کی محنت کے بعد اسے سیاسی طور پر استحکام ملا اور وہ اسمبلی میں پہنچ گیا۔ اسے اس مقام تک لانے میں انتہائی خفیہ طور پر سردار سرجیت سنگھ بندیال نے ہی مدد دی تھی۔ جس وقت سردار سرجیت سنگھ بندیال نے جسپال سنگھ پر تمام تر ذمہ داری ڈال دی، بھی اس نے ایک ایسے شخص کی ضرورت محسوس کی کہ جو سامنے آ سکے۔ جب وہ رابطہ کاری پر کام کر رہا تھا، اس وقت اس کے سامنے سردار جگتار سنگھ ہی کا نام ہی آیا۔ جسپال کا اس سے رابطہ ہو چکا تھا اور اس دوپہر اسی جگتار سنگھ سے ملاقات طے تھی۔

وہ چند گز سیکرٹریس میں پانچ منزلہ بلڈنگ



ہم سکون سے تعلیم حاصل کرتے ہوئے بڑھتے گئے۔  
ہوایوں کہ میں نے پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ  
لے لیا۔ میں اپنی مستی میں رہنے والا بندہ تھا۔ میں  
اپنی موج میں رہتا تھا۔ نہ مجھے طلبہ سیاست سے کوئی  
غرض تھی اور نہ مذہبی طلبہ تنظیموں سے کوئی مطلب۔

ہاسٹل میں میرے چند ہی کلاس فیلو دوست تھے۔  
انہی کے ساتھ خوش تھا۔ میری پڑھائی کا ایک برس  
گزر گیا۔ اس دوران صرف ایک واقعہ ہوا۔ وہ یہ تھا  
کہ طلبہ تنظیم جو خود کو مذہبی تنظیم بھی گردانتی تھی، ان کے  
چند لوگ میرے پاس آئے اور انہوں نے مجھ سے  
چندہ مانگا۔ مجھے یہ تو پوری طرح پتہ تھا کہ یہ چندے  
کے نام پر بھتہ ہے جو ہر طالب علم سے وصول کیا جاتا  
ہے۔ میں نے چند روپے انہیں دے دیئے۔ انہوں  
نے اپنے پاس لسٹ دیکھی، میں جو چندہ دے رہا تھا،  
وہ اس لسٹ میں درج رقم سے کہیں کم تھا۔ مجھے اتنے  
ہی دینے کے لیے کہا گیا تو میں نے دینے سے یکسر  
انکار کر دیا۔ انہوں نے فوری طور پر کچھ نہیں کہا۔ واپس  
پلے گئے۔ بات آئی گئی ہو گئی۔

اگلے برس میری کزن زینت نے یونیورسٹی میں  
داخلہ لے لیا تو اس کی تمام تر ذمہ داری مجھ پر ڈال  
دی گئی۔ جسے میں نے بخوشی قبول کر لیا۔

یونیورسٹی میں وہ میرے دوسرے برس کے آخری  
ایام تھے۔ میں اپنے کمرے میں اکیلا تھا۔ شام کا  
وقت تھا۔ ہاسٹل میں اسی طلبہ تنظیم کا جو پہلے والا  
عہدیدار تھا، وہ بدل گیا، اس کی جگہ نیا آ گیا تھا۔ وہی  
نیا عہدیدار اپنے ساتھ چند لڑکوں کو لے کر آ گیا۔ اس  
نے بغیر کسی تمہید کے مجھے کہا کہ تمہاری طرف اتنا چندہ  
بنتا ہے جو تم نے دو برس میں ادا نہیں کیا۔ اس لیے دو  
دنوں میں وہ چندہ دے دو، ورنہ تمہارے ساتھ کیا ہو  
سکتا ہے، تمہارے تصور میں بھی نہیں ہوگا۔ میں نے

کچھ کر سکتا ہوں، یا میں اب بھی چاہوں تو میں  
یہاں سے بڑے آرام کے ساتھ جا سکتا ہوں۔  
مجھے یہ باتیں نہیں کرنی۔ میں کچھ اور ہی باتیں کرنا  
چاہ رہا ہوں۔“

”کہو، میں سن رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔  
”جمال، میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا ہے کہ میں  
تمہیں خود یہاں تک لے کر آیا ہوں۔ ایکس کا بیٹا  
نام ابھی اتنی حیثیت نہیں رکھتا کہ وہ کوئی عالمی گیم کر  
سکے۔ اس کے پیچھے کچھ دوسرے لوگ ہیں۔ میں نہیں  
چاہتا تھا کہ ان کا تجربہ کامیاب ہو۔ وہ اب بھی کام کر  
رہے ہیں لیکن بہت جلد ختم ہو جائیں گے، میں تمہیں  
اس سے پہلے کا جانتا ہوں۔ اب سوال یہ ہے کہ میں  
یہ تعلق داری کیوں رکھنا چاہتا ہوں؟“ اس نے میری  
جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”ظاہر ہے، یہ سوال تو بنتا ہے۔“ میں بولا۔  
”اس سوال کا جواب دینے سے پہلے، میں تمہیں  
اپنے بارے میں بتانا چاہتا ہوں۔ میری سرگزشت  
میں تمہیں جواب مل گیا تو ٹھیک، ورنہ میں صاف  
انداز میں بتا دوں گا۔“ اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔  
”میں سن رہا ہوں۔“ میں نے صوفے پر پھیلتے  
ہوئے کہا تو وہ بھی ایزی ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

میرا نام راشد محمود ہے۔ میں اپنے والدین کا اکلوتا  
ہوں۔ میرے ایک تایا تھے، جن کی اولاد میں تین  
بیٹیاں اور بیٹا صرف ایک ہی تھا۔ دو بڑی تھیں اور  
زینت مجھے سے چھوٹی تھی۔ میرا تایا صفدر علی، مجھے  
سے بڑا پیار کرتا تھا۔ چونکہ ایک ہی گھر میں رہتے تھے،  
اس لیے بچپن ہی سے میں اپنی کزن کو بہنیں ہی تصور  
کرتا تھا۔ بڑے ہی خوشگوار ماحول میں زندگی گزر رہی  
تھی۔ لاڈ پیار اور محبت میں ہماری پرورش ہوئی رہی اور



جس کی ڈرائیونگ وہاں کا ایک مقامی پاکستانی نژاد کر رہا تھا۔ میں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گیا اور ہم چل پڑے۔ جنید ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔

کسی بھی ہنگامی صورت حال کے لیے، وہاں کے لوگوں نے ایک جگہ بنائی ہوئی تھی۔ جہاں کسی کو بھی لے جا کر پوچھنا چاہی جاسکتی تھی۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے سفر کے بعد ہم ایک ایسے علاقے میں آ گئے جہاں بہت کم آبادی تھی۔ اس دوران ہم یوں خاموش رہے، جیسے ہمارے درمیان اعصابی جنگ چل رہی ہو۔

وہ کسی لارڈ کا قلعہ نما گھر تھا۔ جہاں سوائے چند لوگوں کے کوئی نہیں رہتا تھا۔ وہ لارڈ نجانے کب اسے بیچ گیا تھا۔ وہ زندہ تھا یا نہیں، کسی کو معلوم نہیں تھا۔ پورچ میں کار سے اترے تو داخلی دروازے کے پاس چند لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ وہ گاؤ فادر داخلی دروازے کے باہر ہی کھڑا ہو گیا اور بازو اٹھا دیئے۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ وہ اپنی تلاشی دینا چاہتا تھا۔ وہ لوگ آگے بڑھے، انہوں نے تلاشی لی اور وہ راہداری میں چلا گیا۔ میں اس کی اس قدر تابعداری کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے ایک جنٹلمین کی طرح اپنا کوٹ اتار دیا۔ پھر ہماری طرف دیکھنے لگا۔ وہاں پر موجود ایک شخص نے سامنے سیرھیوں کی جانب اشارہ کیا۔ جو کافی بڑی تھیں۔ ہم اس پر چڑھنے لگے۔ یہاں تک کہ ایک ایسے کمرے میں آ گئے، جس کی کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھا جاسکتا تھا اور اسی کھڑکی سے روشنی اندر آ رہی تھی۔ ہم صوفوں پر آئے سامنے بیٹھ گئے۔ وہ کسی سوچ میں کھویا ہوا تھا۔ پھر اچانک اس نے اپنا سر اٹھایا اور میری طرف دیکھ کر بولا۔

”جمال! میں تم پر یہ رعب جھاڑنے کی کوشش نہیں کروں گا کہ میں کتنا طاقت ور ہوں اور میں کیا

میں نے سب کو الٹ کر دیا اور اس وقت ہم اس کے گھر کے قریب ایک ریسٹوران میں جا بیٹھے۔ مجھے پورا یقین تھا کہ جس طرح وہ کل سے اپنی جگہ تبدیل کر رہا ہے، وہ ضرور یہاں سے بھی نکلے گا۔

میں نے محسوس کیا تھا کہ لندن میں بھی طبقاتی بندی ہے۔ گورے ایک ہی علاقے میں رہنا پسند کرتے تھے اور ان میں خال ہی کوئی غیر گورا ہوتا اور ایسے علاقے جہاں ایشیائی لوگ رہتے تھے وہاں خال ہی کوئی گورا دکھائی دیتا تھا۔ اس ریسٹوران میں بھی مجھے کوئی ایشیائی دکھائی نہیں دیا تھا۔ ہم وہاں بیٹھے بالکل الگ سے دھانی دے رہے تھے، یہ خطرناک بات تھی۔ ہمیں وہاں ایک گھنٹے سے زیادہ بیٹھنا پڑا۔ بھی مجھے پتہ چلا کہ وہاں اس گھر سے ایک ایسا شخص پیدل نکلا ہے۔ جیسا میں نے انہیں بتایا ہوا تھا۔ میں بھی ریسٹوران سے باہر آ گیا۔ میرے ساتھ جنید تھا۔ میں نے دیکھا وہ سڑک کے پارک کے سرے پر تھا۔ وہ دائیں طرف سڑک کے فٹ پاتھ پر مڑ گیا اور چلنے لگا۔ میں نے سڑک پار کی اور کچھ ہی دیر بعد اس کے قریب جا پہنچا۔ جیسے ہی میں اس کے برابر چڑھا، اس نے ادھر ادھر دیکھے بغیر کہا۔

”میں جانتا تھا کہ تو مجھے تلاش کر لے گا۔ میں نے چھپنے کی کوشش بھی نہیں کی ہے، اس لیے سکون سے رہو۔ میں تم سے بہت ساری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“ اس نے چلتے ہوئے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

”تو پھر کہاں باتیں کریں۔“ میں نے پوچھا۔

”جہاں تم چاہو۔“ اس نے جواب دیا

”میرے ساتھ چلو گے؟“ میں نے پوچھا۔

”بالکل۔“ اس نے جواب دیا۔

”آؤ پھر۔“ میں نے کہا اور رُک گیا۔ وہ بھی رُک گیا۔

میں نے جنید کو اشارہ کیا۔ وہ کار قریب لے آیا،



لبودینے کو بے تاب ہوتا ہے۔ کس نے کہاں کون سا کام کرنا ہے، اصل بات یہی ہے۔“ جہاں نے بڑے محل سے کہا۔

”میں اصل میں کہنا یہی چاہ رہا تھا کہ جو آپ فیصلہ کر کے مجھے بتائیں گے میں پوری تندہی سے کروں گا۔“ جگتار نے پھر سے یقین دہانی کرا دی۔

”چلو کام کی ہی بات کرتے ہیں۔“ جہاں نے کہا۔ تو جگتار ہمہ تن گوش ہو کر بولا۔

”جی ضرور۔“

”تم جانتے ہو کہ سا کا چور اسی کے بعد اور اندرا گاندھی قتل کے بعد سکھ نو جوانوں کو بے دردی سے قتل کیا گیا۔“ جہاں نے یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھا، جہاں اسے درد محسوس ہوا۔

”ہاں فوج اور ہندو گماشتے راتوں کو گاؤں میں داخل ہو جاتے اور چن چن کر نو جوانوں کو نکالتے اور انہیں گولیوں سے مار دیتے۔“ جگتار نے نفرت سے کہا۔

”اسی تناظر میں سکھ نو جوانوں ایک بہت بڑی تعداد دوسرے ملکوں کی طرف بھاگ گئی۔ جہاں ان کی ایک عمر گزر گئی، ان کی نئی نسل جوان ہو گئی۔ جیسے جیسے وقت گزرا ان کے اندر اپنی تہذیب، سکھ قوم کا قتل اور جلا وطنی کا انتقام بھی بڑھتا گیا۔ اب وہ لوگ واپس نہیں آ سکتے، ان کی نسل نے وہ ظلم نہیں دیکھا، لیکن وہ بھارت میں موجود سکھوں سے یہ امید ضرور کر رہے ہیں کہ وہ سکھی کے لیے وہ سب کریں جو کرنا چاہئے، اس کے لیے انہوں نے دولت کا رخ اس طرف کر دیا ہے، مگر افسوس، کئی ایک سکھ تنظیمیں، اس دولت کا ناجائز استعمال کر رہی ہیں۔ ہمارا سب سے پہلا کام یہی ہے کہ ایسی تنظیموں کو تلاش کیا جائے اور انہیں ختم کیا جائے۔“ جہاں نے اسے سمجھایا۔

تھی۔ جس کی پانچویں منزل پر جگتار سنگھ اس کا انتظار کر رہا تھا۔ جہاں جیسے ہی لفٹ سے نکلا، اسے راہداری سنسان دکھائی دی۔ وہ مطلوبہ دروازے پر پہنچا ہی تھا اور ابھی دستک نہیں دی تھی کہ دروازہ کھل گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ اس عمارت میں خصوصی آلات لگے ہوئے ہیں، ظاہر ہے جو تحفظ ہی کی خاطر ہو سکتے ہیں۔ اس کے سامنے ایک روایتی سکھ جوان کھڑا تھا، جس نے سنہری فریم والی عینک لگائی ہوئی تھی۔ میرون رنگ کی پٹری اور سیاہ سوٹ پہنا ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

”ست سری اکال جہاں سنگھ جی، میں جگتار سنگھ۔“

”ست سری اکال۔“ جہاں نے دھمے سے کہا۔

”آئیے۔“ اس نے اندر آنے کا اشارہ کیا تو جہاں آگے بڑھ گیا۔ وہ اسے اندر کمرے میں لے گیا۔ وہ کافی کشادہ فلیٹ تھا۔ وہ کمرے میں سامنے پڑے ایک صوفے پر جا بیٹھا تو جگتار سنگھ بھی اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ چند لمحے خاموشی کے بعد جگتار ہی نے کہا۔

”سردار سرچیت سنگھ بندیاں جی کا بہت شکریہ کہ انہوں نے اس تنظیم میں اک نئی روح پھونک دی۔ میں جانتا ہوں کہ میں صرف دکھاوے کے لیے سامنے ہوں گا، اصل کام تو آپ نے کرنا ہے۔ آپ جو بھی میرے ذمے لگائیں گے، میں حاضر ہوں گا۔“

”جگتار سنگھ جی! آپ یہ ذہن میں بات بٹھالیں کہ ہم میں نہ کوئی چھوٹا ہے نہ بڑھا، یہ گرو مہاراج جانتے ہیں کہ کون سکھی کے ساتھ کتنا مخلص ہے۔ میں نے نہ آپ کے لیے کچھ کرنا ہے اور نہ آپ نے میرے لئے، اس لیے کسی کا کسی پر کوئی احسان نہیں ہے۔ کوئی بھی تحریک لبو مانگتی ہے، اور سکھ ہمیشہ



پروگرام رکھو۔“

”جی ٹھیک ہے۔“ اس نے کہا اور اٹھ گیا۔ وہ ہسپتال کولفٹ تک چھوڑنے آیا۔

وہ واپس اپنے ٹھکانے پر پہنچا اور سب سے پہلے اس نے بٹالہ میں موجود بندے کو اس ایڈووکیٹ کے بارے میں پوچھا تو اس کے بارے میں اسے پوری معلومات تھی، جو اس نے اسی وقت بتا دی۔ مندر سنگھ ایڈووکیٹ شہر کا مشہور وکیل تھا۔ وہ لوگ تقسیم ہند سے پہلے کے وہاں آباد تھے۔ ان کا خاندان کافی اثر و رسوخ والا تھا۔ وہ بھنڈاری گیٹ کے قریب ایک حویلی میں رہتا تھا، جو ان کی آبائی حویلی تھی۔ مندر سنگھ سے پہلے وہ لوگ سیاست میں دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ مگر مندر سنگھ نے دلچسپی لی اور اپنے آپ کو منوالیا۔ دراصل وہ کالج دور میں غنڈہ گردی کرتا رہا تھا۔ وہ اپنے خاندان کا بگڑا ہوا لڑکا تھا۔ اس کی سرشت میں یہ شامل تھا کہ طاقت کے بل بوتے پر لوگوں کو دبا کر رکھے اور ان پر حکومت کرے۔ وہ مقامی سطح پر اس لیے بھی کامیاب تھا کہ ”را“ اسے اس طرح سپورٹ کرتی تھی۔ وہ سکھ تھا لیکن اس کا دراصل کوئی مذہب نہیں تھا۔ اس کا مذہب فقط دولت تھا۔ اس نے مقامی سکھوں کے بارے میں ”را“ کو پوری جانکاری دینے سے سکھ وہاں کبھی نہیں اٹھ سکے تھے۔ لہذا اس کا پتہ صاف کرنا بہت ضروری تھا۔

ہسپتال نے اس مقصد کے لیے ایک ٹیم بنائی ہوئی تھی۔ جو فقط ایسے ہی کام کرتے تھے۔ یہ ان کا پہلا امتحان تھا۔ وہ لوگ مختلف شہروں میں رہتے تھے۔ انہیں فوری طور پر صبح تک بٹالہ میں گرو دوارہ کاندھ صاحب پہنچ جانے کو کہہ دیا۔ مقامی طور پر اس کی ریکی پر چند لوگوں کو لگا دیا۔

رات گئے تک دونوں اطراف سے خبریں پہنچتی

”جی، یہ میں نے بھی محسوس کیا ہے، آج سے یہ کام شروع سمجھیں۔“ جگتا سنگھ نے کہا۔

”دوسری بات یہ ہے کہ سکھی پنجاب سے جڑی ہوئی ہے، پنجاب کی ثقافت کو کسی دوسرے رنگ میں پیش کیا جا رہا ہے، یوں جیسے سکھ صرف گانے بجانے والے لوگ ہی ہیں، ایک فلم پروڈکشن بنانی ہوگی جو پنجاب کو اس کا اصل رنگ دے کر پیش کرے۔“ ہسپتال نے تنجیدگی سے کہا تو وہ پر جوش لہجے میں بولا۔

”بہت عرصے سے میرے ذہن میں یہی خیال تھا، میں تو اس حد تک سوچ رہا ہوں کہ صرف فلم ہی نہ بنائی جائے، اس کا اصل کام وہ ڈاکومنٹریز ہوں جس میں ایک طرف سکھوں کو ابسرایا جائے تو دوسری طرف ان پر ہونے والے ظلم دکھائے جائیں۔“

”یہ فیصلہ کرنا تمہارا کام ہے۔“ یہ کہہ کر ہسپتال چند لمحوں کیلئے خاموش ہوا پھر بولا۔

”تیسرا کام یہ کہ وہ لوگ جو سکھ تو ہیں لیکن غدار ہیں، وہ زندہ نہیں رہنے چاہئیں۔“

”ہاں میں کئی ایک ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو سکھی کو بہت نقصان پہنچا رہے ہیں۔“ اس نے تیزی سے کہا۔

”مثلاً؟“ ہسپتال نے پوچھا۔

”مثلاً بٹالہ میں ایک ایڈووکیٹ ہے مندر سنگھ، اس نے پورے علاقے کو اس طرح قابو کیا ہوا ہے کہ کوئی اس کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا ہے۔ یہ صرف سیاسی طور پر مستحکم ہونے اور پورے علاقے کو اپنے قابو میں رکھنے کے لیے وہ ”را“ کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ ممکن ہے اس نے اپنا نیٹ ورک بھی بنالیا ہو تاکہ مزید پھیلے۔“ جگتا نے بتایا تو ہسپتال خاموش ہو گیا۔ پھر اٹھتے ہوئے بولا۔

”اب میں چلتا ہوں۔ چند دنوں میں کوئی ثقافتی



رہیں۔ وہ لوگ بھی جو کندھ صاحب پہنچ رہے تھے اور وہ بھی کہ مندر سنگھ کے معمولات کیا ہیں۔

بنالہ شہر میں کندھ صاحب وہ گرو دوارہ ہے جہاں گرو نانک مہاراج شادی کرنے کے لیے بارات کے ساتھ گئے، وہ ایک کندھ (دیوار) کے ساتھ بیٹھ گئے جو بچی تھی اور کسی بھی وقت گر سکتی تھی۔ ایک بوڑی عورت نے گرو نانک مہاراج کو بتایا بھی کہ یہاں مت بیٹھو، یہ دیوار کسی بھی وقت گر سکتی ہے۔ نانک دیو مہاراج نے جواب دیا کہ یہ نہیں گرے گی کیونکہ یہ ہماری شادی کی گواہ ہے۔ پھر ایسا ہوا کہ وہ دیوار نہیں گری، یہاں تک کہ بہت سارا عرصہ گزر گیا۔ اس کی یاد میں یہ گرو دوارہ بنایا گیا، جہاں اب ہر سال میلہ لگتا ہے۔ وہ دو لوگ وہاں پہنچ گئے، جنہوں نے مندر سنگھ کا شکار کرنا تھا۔

رات کے آخری پہر جب گرو دوارہ سے گیانی بولنے لگا، لوگوں کو اٹھ جانے کی تلقین کرنے لگا، ایسے میں وہ دونوں گرو دوارہ سے باہر نکل آئے، انہوں نے چادریں لی ہوئی تھیں اور کافی حد تک منہ بھی ڈھانپ لیا ہوا تھا۔ ان کا رخ بھنڈاری گیٹ کی اس حویلی کی جانب تھا جہاں مندر سنگھ رہتا تھا۔

وہ حویلی پرانے طرز کی تھی اور ایک چھوٹی گلی میں تھی۔ وہی بڑا سا راساہ گیٹ اور دو منزلہ حویلی، جس کا طرز تعمیر تو پرانا ہی تھا لیکن اس پر رنگ و روغن اور دیکھ بھال کی وجہ سے کافی بہتر حالت میں تھی۔ گلی میں ہلکی ہلکی روشنی تھی۔ وہ دونوں ایک موٹر سائیکل پر گلی کی نکر پر آن رکے۔ انہوں نے موٹر سائیکل ایک طرف لگایا اور آگے پیچھے چلتے ہوئے اس حویلی کے پاس جا پہنچے، جس کے آگے ایک مدقوق سا بلب روشن تھا۔ ان میں سے ایک نے چلتے ہوئے ایک پتھر اس بلب پر مارا تو بلب ٹوٹ گیا۔ روشنی بہت حد تک ختم ہو گئی، دور

لگے ایک بلب کی ہلکی سی روشنی آنے لگی۔ گیٹ کافی مضبوط تھا لیکن انہوں نے اس کی طرف توجہ نہیں کی بلکہ الماریوں، درپچوں اور ان کے بنے ہوئے ڈانزنوں پر اپنے قدم جماتے ہوئے دیوار پر چڑھنے لگے۔ یہ ایک خاص طرح کی تربیت ہوتی ہے، جس کی مدد سے بڑی بڑی بلندگوں پر چڑھا جاسکتا ہے۔ تقریباً ایک منٹ میں وہ چھت پر بنی چار دیواری تک پہنچ گئے۔ اگلے چند لمحوں میں وہ چھت پر تھے۔ وہاں کافی اندھیرا تھا۔ گرو دوارہ کے لاؤڈ اسپیکر سے آواز آرہی تھی۔ وہ اس دروازہ کی جانب بڑھے جہاں سے میڑھیاں نیچے جا رہی تھیں۔

وہ پہلی بار اس حویلی میں ہی نہیں اس شہر میں آئے تھے۔ انہیں صرف بتایا گیا تھا کہ مندر سنگھ کا کمرہ کہاں ہو سکتا ہے۔ وہ میڑھیاں پہلی منزل کی چھت پر اتریں۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ دروازے پر بڑا سا تالا لگا ہوا تھا۔ اسی طرح دوسرے کمرے تھے۔ لیکن ایک کمرے میں ہلکی ہلکی روشنی تھی۔ وہ دبے پاؤں اس جانب بڑھ گئے۔ اس کمرے میں ایک بوڑھا سا شخص پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں چھت پر لگیں ہوئی تھیں، یوں لگ رہا تھا کہ یہ مر گیا ہے یا پھر بس مرنے ہی والا ہے۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتے رہے پھر تیزی سے نیچے کی طرف چلے گئے۔ میڑھیاں کھٹے تختن میں اتریں۔ جس کے تین طرف کمرے بنے ہوئے تھے۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ سامنے کے دروازوں میں سے جو دائیں جانب والا ہے، اس کے اندر جا کر مندر سنگھ کا کمرہ تھا۔ وہ دبے پاؤں اندر چلے گئے۔ ہر کمرے میں کوئی نہ کوئی سو رہا تھا۔ مندر سنگھ کی تصویر انہوں نے دیکھ لی تھی۔ اس میں خاص بات یہ تھی کہ اس کی موچھیں نوکیلی اور اوپر کو اٹھی ہوئیں تھیں۔ بند پر لیٹا ہوا وہی تھا۔ ہلکی روشنی میں وہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔



گردن اتر گئی۔ اس کی بیوی کے منہ سے چیخ نکلی۔ تب تک دوسرے نے اُس کا سر زور سے گیٹ میں مارا، وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ انہوں نے باہر گلی میں جھانکا، کوئی نہیں تھا۔ وہ تیزی سے نکلے اور موٹر سائیکل تک جا پہنچے۔ انہوں نے وہ اٹھائی اور وہاں سے نکلتے چلے گئے۔ ان کا رخ شہر سے باہر جانے والے راستے پر تھا۔

جسپال سنگھ کو رپورٹ مل گئی تھی کہ کام ہو گیا ہے۔ وہ دونوں ابھی تک بٹالہ کے مضافات میں موجود ایک گاؤں میں تھے۔ وہاں ان کے رشتے دار رہتے تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ دو دن بعد وہاں سے جائیں گے۔ جس کے پاس وہ ٹھہرے تھے، وہ بھی خالصہ کا سر گرم رکن تھا۔ وہ دونوں سو گئے تھے، لیکن بیوی چیخ رہا تھا۔ اس پر یہی بات سب سے اہم بتائی جا رہی تھی کہ مستدر سنگھ کی بیوی کے مطابق وہ دونوں ڈکیت سکھ تھے، ان کا مقصد ڈکیتی نہیں تھا، کرپان سے قتل کرنے کا مطلب یہ بتا دینا تھا کہ وہ شدت پسند سکھ ہیں۔ ان کا کوئی دوسرا مقصد تھا۔ جسپال مسکرا دیا۔ اس کا پیغام ”را“ تک پہنچ چکا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ بڑی روشن صبح تھی۔ میں حویلی سے نکلا اور مسافر شاہ کے تھڑے پر آ گیا۔ اس دن مجھے اروند نے فرمائش کی کہ وہ بھی وہاں جانا چاہتا ہے۔ میں نے فہیم اور مہوش کو بھی ساتھ لیا اور مسافر شاہ کے تھڑے پر جا پہنچے۔ بڑے دنوں بعد وہ کھلی فضا میں سانس لے رہے تھے۔ میں درختوں کی چھاؤں میں چارپائی پر جا بیٹھا تو وہ تینوں ادھر ادھر سیر کرنے کے لیے نکل پڑے۔ درویش اور فرید ان کی ضیافت کے اہتمام میں لگ گئے اور چارپائی پر لیٹ گیا۔

گاڈ قادر کے ختم ہو جانے کے بعد اگرچہ ایک

دونوں دبے پاؤں اس کے سر ہانے جا کھڑے ہوئے۔ ایک نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ وہ جاگ گیا۔ اس نے صورت حال سمجھی تو ہڑ بڑا گیا۔ تبھی ایک نے اس کے کان میں ہولے سے کہا۔

”چپ چاپ تجوری کی چابیاں دے دو، تعاون کرو گے تو کچھ نہیں کہیں گے ورنہ.....“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہوا تو دوسرے نے ایک لمبی کرپان اس کی گردن پر رکھ دی۔ دہشت سے اس کی آنکھیں ابل کر باہر آ گئیں۔ اس نے سائید نیبل کی طرف اشارہ کیا۔ دوسرے نے دراز کھولی، اس میں چابیوں کا گچھا پڑا ہوا تھا۔

”تجوری والی چابی نکالو۔“ دوسرے نے بڑے سکون سے کہا تو وہ چابی تلاش کرنے لگا۔ اس نے ایک چابی نکالی اور گچھا ان کے حوالے کر دیا۔ پہلے نے کرپان اس کی گردن پر رکھی اور دوسرے نے تجوری کھول لی۔ اس کے ہاتھ میں جتنا مال آیا اس نے لیا اور ایک پھیلی میں ڈال لیا۔

”تیری بیوی کہاں ہے؟“ پہلے نے پوچھا۔ اس نے باہر کی جانب اشارہ کیا تو پہلا ہی بولا۔

”چلو پھر ہمیں باہر تک چھوڑ کر آؤ۔ اس وقت تک نہیں ماریں گے جب تک تم.....“ لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ اس کی بیوی اندر آ گئی۔ پہلے تو اسے پتہ نہ چلا کہ اندر دو لوگ بھی ہیں، اس سے پہلے کہ وہ چیخ ماری، دوسرا بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اس کی بیوی پر جا پڑا اور اس کی گردن دیوچ کر بولا۔

”خاموش، آواز نہیں نکالنی۔“

”چلو دونوں باہر۔“ پہلے نے کہا تو وہ اٹھ گیا۔ وہ چاروں بڑی خاموشی سے حویلی کے گیٹ پر آئے۔ انہوں نے گیٹ کا تالا کھولا، بھی پہلے نے کرپان سے ایک زور دار وار کیا اور مستدر سنگھ کی



”تمہیں یہ بات کس انداز میں بتائی گئی ہے؟“  
”میں نے ان کی باتوں سے اخذ کیا ہے۔“ وہ  
بولے۔

”ممکن ہے کوئی غلط ٹریک دے رہا ہو اور یہ بھی  
ممکن ہے کہ یہ بات سچ ہو۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے تم  
نے اس کے بارے میں بہت کرید کی ہوگی۔ خیر، تم  
اسے چھوڑو اور یہ سب لوگ ان کے حوالے کرو، وہ بھی  
تلاش کر لیتے ہیں۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں سوچنے لگا، ایسا ممکن نہیں تھا کہ وہ ملک کی  
سیکورٹی اداروں سے یہ راز چھپ سکے۔ اتنا ہی اہم  
پلان تھا تو اس قدر لوگوں کو نہیں بتایا جاسکتا تھا۔ یہ ایک  
پوری تنظیم کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ کوئی بھی تنظیم ان  
سیکورٹی اداروں کی نگاہوں سے چھپ نہیں سکتی  
تھی۔ ایسے لوگ اتنے کھل کر سامنے نہیں آسکتے، ان  
کے پیچھے تو بہت خفیہ ہاتھ ہوتے ہیں۔ میں یہی سوچ  
رہا تھا کہ میرا سیل فون بج اٹھا۔ وہ کوئی اجنبی نمبر تھا۔  
میں نے کال ریسیو کی تو دوسری طرف سے میرا نام  
تصدیق کرنے کے بعد کہا گیا

”راشد کو تو نے مردا دیا، میں تمہاری ہمت اور  
رسائی کی داد دیتا ہوں، ڈیورابے چاری اب زندہ  
نہیں ہے، وہ اپنے ہاتھ روم میں مردہ پائی گئی ہے۔  
ظاہر ہے اس نے کہیں بھی جانا تھا، چلی گئی اس دنیا  
سے۔ یہ ابھی کچھ دیر پہلے کی بات ہے۔“

”کہنا کیا چاہتے ہو؟“ میں نے کہا۔

”میں نہیں سمجھتا کہ تم اتنے احمق بھی ہو سکتے ہو، تم  
نے راشد کو مار دیا تو سمجھا کہ ہم ختم ہو جائیں گے،  
نہیں ایسا نہیں ہے، ہم خود اسے مردانا چاہتے تھے، وہ  
اب ہمارے کام کا نہیں رہا تھا، اس پر رسکون زندگی کا  
بھوت سوار ہو گیا تھا۔“ اس نے اسی سکون سے کہا تو  
میں نے پھر پوچھا۔

باب ختم ہو گیا تھا لیکن ابھی اس کا پھیلا ہوا گندویا  
ہی موجود تھا۔ اس نے اپنے ارد گرد جو چند لوگوں کا  
حصار بنایا ہوا تھا، وہ اس وقت میرے قبضے میں تھے۔  
جب تک وہ ختم نہ ہوتے، اس وقت تک یہ باب بند  
ہونے والا نہیں تھا۔ وہ سب جنید کے پاس سیف  
ہاؤس میں تھے۔ اس نے ان تین دنوں میں ان کے  
سارے اکاؤنٹ خالی کر لیے تھے۔ اب ان کے  
رکھنے کا کوئی جواز باقی نہیں تھا۔ یہی بات کہنے کے  
لیے میں نے جنید فون کیا۔ وہ وہیں سیف ہاؤس ہی  
میں تھا۔

”ان سب لوگوں کو طارق نذیر کے حوالے کرو، وہ  
ان سے مزید تفتیش کر لیں گے، تم چاہو تو نورنگر آ جاؤ۔“  
”وہ تو ہو جائے گا، اب ان کے رکھنے کا کوئی فائدہ  
نہیں، لیکن ان سے ایک بات پتہ چلی ہے، وہ بہت  
زیادہ خطرناک ہے۔“ جنید نے تشویش سے بتایا۔

”وہ کیا بات ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”مجھے پوری بات کا نہیں پتہ، لیکن اتنا معلوم ہوا  
ہے کہ یہاں کا ایک سیاست دان ہے، اس کے  
ذریعے ”را“ پاکستان میں دہشت گردی کے لیے ایک  
گروپ تیار کر رہا ہے، اب وہ سیاست دان مہرہ ہے یا  
وہی اسے منظم کرے گا، اس کے بارے میں کچھ نہیں  
کہہ سکتا لیکن انہوں نے پبلک مقامات کو نشانہ بنانا  
ہے، ظاہر ہے اس کا نشانہ بننے والے بچے، بوڑھے،  
عورتیں اور جوان سبھی ہوں گے۔“ جنید نے کہا تو  
میں نے پوچھا۔

”اس سیاست دان کے نام کا کچھ پتہ چلا؟“

”نہیں، ظاہر ہے وہ کوئی دوسرے درجے کا  
سیاست دان ہو گا، کوئی ناکام سیاست دان یا  
پھر.....“ وہ کہنا چاہ رہا تھا کہ میں نے اس کی بات  
کاٹ کر پوچھا۔



انہیں چھوڑ دینے سے کوئی فرق بھی نہیں پڑنے والا تھا اور اب اس سے زیادہ ان سے کوئی اہم بات بھی نہیں نکلتی تھی لیکن وہ سب شیطانی ٹولہ کے افراد تھے، ان کا زندہ رہنا ہی نہیں بنتا تھا۔ میں ان کے بارے میں اس وقت تک سوچتا رہا، جب تک مہوش، اروند اور فہیم واپس نہیں آ گئے۔

”یہاں میلہ لگتا تھا؟“ مہوش نے سامنے والی چار پائی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں، ہر سال لگتا ہے، بس دو تین برس درمیان میں نہیں لگا۔“ میں نے جواب دیا۔

”میرے خیال میں ابھی دو چار مہینے رہتے ہیں۔“ میں نے اسے جواب دیا

”پتہ نہیں تب تک ہم یہاں ہوں گے کہ نہیں۔“ اس نے حسرت سے کہا۔

”ہوں گے تو دیکھ لینا، نہیں ہوں گے تو نہ سہی۔“ فہیم نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

”تجھی در دلش نے دور ہی سے اونچی آواز میں کہا ”او غم کیوں کرتی ہے بیٹی، ہم آج رات ہی میلہ لگا دیتے ہیں، آپ آ جاؤ رات کو۔“

”وہ کیسے؟“ مہوش نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

”کچھ گانے بجانے والے بلا لیں گے، کچھ کھیل تماشے والے، کھانا پینا ہم تیار کر لیں گے۔“ اس نے

سادگی سے کہا تو کبھی ہنس دیے۔ جبکہ درویش ایک طرف نکل گیا، وہ ابھی کھانا بنانے میں مصروف تھا۔

”نہیں بابا جی اصل مزہ تو اسی میلے کا آئے گا نا جو اصل میں لگتا ہے۔“ اس نے کہا تو میں اس کی طرف

دیکھ کر بولا۔

”چل وعدہ رہا، اگر یہاں ہوئے تو ٹھیک، تم دنیا کے جس کونے میں بھی ہوئی، تجھے یہاں بلا لیں گے۔“

”میں پھر پوچھتا ہوں کہ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“ ”دیکھو پرندے ہوا میں اڑتے ہوئے اچھے لگتے ہیں، وہ جہاں دانہ دیکھتے ہیں، وہیں بیٹھ کر چک لیتے ہیں، پھر فضا میں اڑ جاتے ہیں۔ انہیں پنجرے میں قید نہیں کرتے۔“ اس نے سمجھانے والے لہجے میں کہا۔

”تم کیا چاہتے ہو؟“ میں نے جان بوجھ کر پوچھا۔

”یہی کہ پرندے آزاد کر دو۔ میں اسے تمہاری دوستی تصور کروں گا، اپنا راستہ ہمیشہ الگ رکھوں گا۔ ورنہ پھر میرا پہلانا سبک تمہی ہو۔“ اس کے لہجے میں کافی حد تک تکبر چھلک رہا تھا۔

”اور اگر میں ایسا نہ کروں تو.....“ میں نے کہا۔

”تو میں سمجھوں گا کہ تم دنیا کے سب سے بڑے احمق ہو، جسے دوستی کرنا نہیں آتی۔“ اس نے کافی حد تک چڑتے ہوئے کہا تو میں استہزایہ لہجے میں بولا۔

”میں خوب جانتا ہوں کہ دوستی اور دشمنی کیا ہوتی ہے، مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ دوست اور دشمن کون ہوتا ہے۔ اس لیے مجھے سبق مت پڑھاؤ، کام کی بات کرو۔“

”میں تمہارے راستے میں نہیں آؤں گا اور نہ ہی مجھے آنا چاہئے، اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔

پرندے اڑاؤ، یہی خیر سگالی کا پیغام ہوگا، اور بس۔“ اس نے کافی حد تک نرم لہجے میں کہا تو میں افسوس زدہ لہجے میں بولا۔

”تم نے ذرا سی دیر کر دی، میں ان کے لیے فیصلہ کر چکا ہوں، اب میں فیصلہ واپس نہیں لوں گا۔“

”اوکے۔“ اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں چند لمحے فون کو دیکھتا رہا، پھر واپس جیب میں رکھ لیا۔

میں جانتا تھا کہ وہ سب مہرے ہی ہیں۔



”یہ ہوئی تاباں۔“ اس نے خوش ہوتے ہوئے کہا تو ایک دم سے ارونڈ سنگھ بولا۔

”وہ رام لعل جوگی اور اس کا کیسٹ بیٹا، ادھر ہی ملا تھا نا، یہیں رہتے رہے ہیں؟“

”ہاں، لیکن وہ دونوں تمہیں اچانک کیوں یاد آ گئے؟“ میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”اس لیے کہ سندیپ کور والا انسٹیٹیوٹ ابھی تک ختم نہیں ہوا، وہ ویسے کا ویسا چل رہا ہے۔“

”ہاں اسے ختم تو کرنا ہے، لیکن حالات ایسے بنتے گئے کہ اس طرف سوچ ہی نہ سکے۔“ میں نے اعتراف کیا تو وہ بولا۔

”دراصل ہسپتال سنگھ کے ارد گرد ورتیں زیادہ ہونگی ہیں، میرے خیال میں اسے کوئی سدھ بدھ نہیں آ رہی ہے۔ خیر میں نے ایک پلان کیا ہے، اگر اس پر عمل کر لیا جائے تو اس کا نتیجہ بہت شاندار نکلے گا۔“

”بولو، کیا پلان ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”اسر تسر میں تین بندے ہیں، جو اصل میں اس انسٹیٹیوٹ کو چلا رہے ہیں۔ اصل میں وہ بندے نہیں، تین عہدے ہیں، ان پر لوگ آتے جاتے رہتے ہیں، جیسے کہ کچھ عرصہ پہلے ہرنیت سنگھ کو ہسپتال نے مارا تھا، اب اس کی جگہ نیا بندہ آ گیا ہے؟“ ارونڈ سنگھ کہتے ہوئے سانس لینے کوڑکا تو فہیم تیزی سے غصے میں بولا۔

”یار یہ تیری بڑی گندی عادت ہے۔ کہانی گھڑنے بیٹھ جاتا ہے، سیدھی بات بتا۔“

”میں بات ختم کر لوں، پھر کہنا، ابھی خاموش بیٹھ۔“ ارونڈ نے اس کی سنی ان سنی کرتے ہوئے میری طرف دیکھا تو اپنے میں مہوش ہوئی۔

”نہیں تم کہو، ہم شام تک یہیں بیٹھے ہیں۔“

وہ اس طنز کو سمجھ تو گیا لیکن کوئی تبصرہ کیے بنا بولا۔

”انسٹیٹیوٹ تباہ ہوتا ہے یا نہیں، ہم اس پر حملہ کرتے ہیں، وہ ختم ہو جاتا ہے، وہ اسے دوبارہ بنالیں گے لیکن ہم اسے مستقل بند کروانا چاہتے ہیں تو میرے پلان کے مطابق دو فائدے ہوں گے۔“

”کون سے؟“ میں نے پوچھا تو وہ تیزی سے بولا۔

”ایک تو یہ کہ ”را“ پر ہماری دھاک بیٹھ جائے گی، انہیں مجبور کر دیا جائے کہ وہ یہ انسٹیٹیوٹ بند کر دیں۔“

”یہ دھاک کس طرح بٹھانی ہے؟“ مہوش نے ہاتھ کو گھماتے ہوئے پوچھا تو وہ بولا۔

”یہی میرا پلان ہے۔“

”بولو۔“ میں نے کہا۔

”وہ تینوں عہدوں پر مامور لوگ ایک ساتھ ختم کیے جائیں اور باہر کے دو تین لوگ جو انتہائی اہم ہیں را کے انہیں ختم کر دیا جائے تو ہم اپنی بات منوا سکتے ہیں، پچھلے تین بندے بھی اپنے کھاتے میں ڈال لیں۔“ اس نے بتایا تو میں نے پوچھا۔

”اس سب کو آرگنائز کرنے میں تو وقت لگے گا نا؟“

”تم اسے دیکھو، اور پھر جیسے ہی وقت آئے مجھے بتا دینا۔“

”یہی تو بتا رہا ہوں، میں نے ایک میٹ کی دنیا میں ایک جعلی تنظیم بنائی ہوئی ہے۔ اس سے میں کچھ لوگوں کو دھمکیاں دیتا ہوں۔ وہی جو غلط قسم کے سرمایہ دار، دولت والے ہیں۔“ اس نے انتہائی شبیدگی سے بتایا تو فہیم نے ہنستے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

”کیا دھمکیاں دیتے ہو؟“

”یہی کہ میرے لیے چاکلیٹ بھیجو، میری شرٹ پھٹ گئی ہے، وہ لے دو ورنہ میں تمہارا پاجامہ پھاڑ دوں گا۔ یہ کہہ کر.....“ مہوش نے ہنستے ہوئے کہنا چاہا تو وہ غصہ کیے بغیر بولا۔

”یہ کہ کوئی بیمار ہے، اس تک رقم پہنچا دو، یتیم خانوں کو، اسپتالوں کو، بے گھر عورتوں کو مطلب جو



وہ یہ ہے کہ سب لوگ صرف مذہب کے لیے کام نہیں کرتے، بہت کم ہوتے ہیں سر پھرے، اس کے لیے فنڈ اور دولت چاہئے ہوگی اور.....“ اس نے کہنا چاہا لیکن میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے سمجھایا ”دولت کی فکر مت کرو، تمہیں پتہ ہے کہ اس وقت بلین ڈالر ہمارے پاس ہیں، ہاں یہ بات اپنی جگہ بہت اہم ہے کہ ان لوگوں کو بھی استعمال کیا جائے، جو بہر حال دولت کے لیے سب کرتے ہیں۔ خیر یہ انشینیوٹ والا معاملہ دیکھو، پھر اسے پوری طرح منظم کرتے ہیں۔“

”اوکے ڈن ہو گیا، ہم اس پر آج ہی سے کام کرتے ہیں۔“ ارونڈ سنگھ نے کہا۔ ”اچھا، یہ درویش کا کھانا کھاتے ہیں تو اسی پر کام کرتے ہیں۔“ میں نے کہا اور پھر اسی موضوع پر باتیں کرنے لگے۔ بہت کچھ ہم نے وہیں بیٹھے طے کر لیا۔

☆.....☆.....☆

امیر شہر سے شمال مشرق کی جانب تقریباً پندرہ کلو میٹر کے فاصلے پر ایک شاندار فارم ہاؤس تھا۔ سورج مغرب میں ڈوب چکا تھا۔ ابھی تک وہاں پر مہمان تو کیا میزبان بھی نہیں آیا تھا۔ وہاں سیکورٹی کے چند لوگ تھے۔ یا پھر وہ لوگ جو کھانا وغیرہ تیار کر رہے تھے اور اس وقت اپنے کام سے فارغ ہو کر وہاں سے جانے والے تھے۔ دو تین لوگ وہاں رہ گئے تھے۔ جنہوں نے کھانا وغیرہ سرو کرنا تھا۔ یہ اسی فارم ہاؤس کے ہی ملازم تھے۔ وہ سب اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ انہیں بالکل بھی یہ خبر نہیں تھی کہ سہ پہر سے ان کی ریکی ہو رہی ہے۔ چند لوگ انہیں دیکھ رہے ہیں، فارم ہاؤس کی لوکیشن سمجھ چکے ہیں۔ وہ چھ تھے اور اسلحہ کے ساتھ پوری طرح لیس

بھی مجھے ضرورت مند ملائیٹ پر میں نے اس کی مدد کروادی۔“

”یہ تو شاندار بات ہے یار۔“ مہوش نے تالی بجاتے ہوئے کہا تو فہیم بھی اس کی طرف پسندیدہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔

”اچھا اب کہو، ہم نہیں بولیں گے۔“

”میں جھانکتا رہتا ہوں نیٹ پر مختلف لوگوں کے اکاؤنٹ وغیرہ۔ جب سندیپ کور کے انشینیوٹ کی بابت سنا اور پھر اس پر کچھ نہیں ہوا تو میں نے اسے بھی دیکھنا شروع کر دیا۔ مجھے ساری کہانی سمجھ میں آ گئی۔ ان کی ایک بات یہ بھی ہے کہ یہ لوگ وہاں موجود لڑکیوں کا جنسی استعمال بھی کرتے ہیں۔ کل شام ان کی ایک پارٹی ہے اور یہ پارٹی انہوں نے اس انشینیوٹ سے دور رکھی ہے، یہ ان تینوں کو پتہ ہے، یا مجھے معلوم ہے۔ کیونکہ میں ان کی باتیں پڑھ چکا ہوں۔ وہ اپنے ساتھ لڑکیاں لیں گے، جنہیں بالکل پتہ نہیں ہوگا کہ انہیں کہاں جانا ہے۔ وہ وہاں جا میں گے اور.....“ وہ کہتے ہوئے خاموش ہو گیا

”یہ تم نے بڑی خبر دی ہے ارونڈ سنگھ۔“ میں چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”کل شام، ابھی کافی وقت پڑا ہے۔“ ارونڈ نے بات سمجھاتے ہوئے کہا۔ اس کا مطلب تھا کہ اگر یہ کام کرنا ہے تو ہو سکتا ہے۔

”اس سے بھی اہم بات میرے ذہن میں آئی ہے۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”وہ کیا؟“ اس نے پوچھا۔

”یار کیوں نہ ہم اسے ایک تنظیم ہی بنادیں۔ جس کا تہلکہ مچ جائے۔“ میں نے کہا۔

”یہ ممکن ہے اور اسے ہم اس بیج پر چلا سکتے ہیں لیکن اس میں ایک بات بہر حال سامنے آئے گی اور



شراب سے جام بھرا اور شہلے والے انداز میں بکھر گئے۔ یہ بڑے صبر آزمائے تھے۔

ان کی نگرانی کرنے والے چھ لوگ فارم ہاؤس کے اندر آچکے تھے۔ یہاں پر ان کا اندازہ کچھ غلط ہو گیا تھا۔ ان کے گمان میں تھا کہ وہ سب ایک جگہ بیٹھ جائیں گے تو ان پر حملہ کیا جائے گا لیکن وہ جوڑے جوڑے کی صورت میں بکھر گئے تھے۔ اب انتظار کے سوا چارہ نہیں تھا۔ سو وہ اپنی اپنی جگہ دب کر بیٹھے ہوئے تھے۔ لان میں پھرتے ہوئے لوگوں کو یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ موت ان کے کس قدر قریب پہنچ چکی ہے۔ آدھا گھنٹہ اسی انتظار میں گزر گیا۔ وہ لوگ سرور میں آچکے تھے۔ ممکن ہے وہ شہلے ہوئے تھک بھی گئے ہوں، اس لیے ایک کے بعد ایک جوڑا آکر اس میز کے گرد بیٹھنے لگا۔ جیسے ہی سب بیٹھ گئے۔ میزبان نے کھانا لگانے کا اشارہ کر دیا۔ ملازم شاید اسی انتظار میں تھے۔ وہ کھانا لگانے لگے۔ دس منٹ کے اندر کھانا لگ گیا۔ جیسے ہی انہوں نے کھانا شروع کیا۔ ملازم وہاں سے ہٹ گئے۔ ایسے میں وہ چھ کے چھ اچانک نکلے۔ لان میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو اس وقت پتہ چلا جب وہ ان کے سر پر پہنچ گئے۔ تبھی انہیں میں سے ایک نے اٹھ کر اوپچی آواز میں للکار تے ہوئے کہا۔

”کون ہو تم لوگ؟“

لفظ اس کے منہ ہی میں رہ گئے، ایک برسٹ اس پر پڑا، جو اس کے سینے سے لے کر اس کے چہرے تک میں سوراخ کر گیا۔ فائرنگ کی آواز نے ماحول کو ہلا کر رکھ دیا تھا، چیخوں کی آوازوں سے وہاں ہلچل مچ گئی۔ (ان شاء اللہ تعالیٰ باقی آئندہ ماہ)



تھے۔ وہ اسی انتظار میں تھے کہ وہ کب آتے ہیں اور یہ اپنا کام کر کے وہاں سے نکل جائیں۔ انہوں نے وہاں سے نکلنے کے لیے پورا بندوبست کر لیا ہوا تھا۔ اس وقت جہاں سنگھ ان سے پوری طرح رابطے میں تھا۔ اس نے سردار رتن دیپ سے مدد تو کیا انہیں بتایا تک نہیں تھا کہ امرتسر کے نواح میں کیا ہو رہا ہے۔ وہ چھ لوگ پنجاب کے مختلف شہروں سے جمع ہوئے تھے۔ دوپہر کے وقت وہ دربار صاحب پر ایک دوسرے سے ملے اور انہوں نے اس کا پلان کر لیا تھا۔ پارٹی کا بندوبست فارم ہاؤس کی رہائشی عمارت سے ذرا فاصلے پر ایک لان میں کیا تھا۔ وہاں میزیں لگا دیں گئی تھیں۔ ضروری سامان رکھ دیا گیا تھا۔ ہلکا ہلکا میوزک بج رہا تھا۔ دھیمی روشنی تھی۔ کافی حد تک کیف اور ماحول بنا دیا گیا تھا۔ سورج ڈوبتے ہی سب سے پہلے میزبان ہی کی گاڑی اس فارم ہاؤس میں داخل ہوئی۔ وہ اکیلا ہی تھا اور وہ آتے ہی سارے انتظامات کا جائزہ لینے لگا۔ وہ کچھ دیر وہاں رہا اور پھر اندر چلا گیا۔

اگلے آدھے گھنٹے میں وہاں دو گاڑیاں آگئیں، اس میں سے تین مرد اور چار نوجوان لڑکیاں باہر نکلیں۔ ان لڑکیوں نے بہت شوخ، مختصر اور بھڑکیلا لباس پہنا ہوا تھا۔ انہیں دیکھ کر یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ یہاں کس مقصد کے لیے آئے ہیں۔ وہ ہنستے، قہقہے لگاتے ہوئے رہائشی عمارت کے اندر چلے گئے۔ وہ کچھ دیر اندر رہے، پھر کبھی باہر آ گئے۔ ان کا رخ اسی لان کی طرف تھا، جہاں میزیں اور کرسیاں لگی ہوئیں تھیں۔ ان کے بیٹھے ہی میوزک کی آواز کچھ زیادہ ہو گئی۔ وہ سیدھے اس میز کی جناب بڑھے جہاں شراب کی مختلف برانڈ کی بوتلیں پڑی ہوئی تھیں۔ وہیں جام دھرے ہوئے تھے۔ ہر کسی نے اپنی پسند کی



# احساس

نسیم سکینہ صدف

زندگی ہزارہا رنگوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اس کا ہر رنگ ایک  
منی کہانی کا عکس ہوتا ہے۔ بعض رنگ اتنے گہرے اور سفاک ہوتے  
ہیں کہ وہ زندگی کا رخ ہی تبدیل کر دیتے ہیں۔  
ایک عورت کا افسانہ اس کی شخصیت نوکشتیوں میں سوار تھی۔

”سر میں کب سے درد ہے؟“ میں نے سنجیدگی سے  
پوچھا جواب میں عطیہ نے سازھی کے پلو میں منہ چھپالیا  
اور صوفہ میں دھنس کر بیٹھ گئی۔ مجھے یہ منظر دیکھنے کی توقع نہ  
تھی میں کچھ ٹپٹا گئی اور پھر سوال کرتے ہوئے گفتگو کو  
آگے بڑھانا چاہا۔

”آپ کو کیا تکلیف ہے؟ سر کے کس حصے میں درد  
ہے؟ کچھ علاج کیا اب تک؟“ عطیہ نے سراونچا کیا اور  
کہنے لگی۔

”ڈاکٹر صاحب! پروین سے سنا تھا کہ آپ اس شہر میں  
بہت مشہور ہیں بڑے بڑے وزیروں کی بیگمات کا علاج  
کرتی ہیں۔ میں تو غیر معروف فرد ہوں ہے وقت آپ  
کے پاس میری کہانی سننے کا؟“ میں نے عطیہ کا چہرہ غور  
سے دیکھا اس میں دکھ کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔

”میرا خیال ہے آپ کو کسی نسخے کی ضرورت نہیں۔“  
آپ کچھ کہنا چاہتی ہیں؟“ عطیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔  
”ڈاکٹر صاحب! آپ نے سچ تخفیں کی ہے میرے درد کا  
علاج یہی ہے کہ کوئی میری کہانی سن لے۔“ عطیہ کی  
آنکھوں میں غیر معمولی چمک پیدا ہوئی اور آہستہ آہستہ  
بولنا شروع کیا۔

”ایک شام سمندر کے کنارے میں بغیر کسی مقصد کے  
ٹہل رہی تھی جب ذرا رکی تو دیکھا سمندر کی لہریں اچھل  
اچھل کر ریت پر آتیں اور ریت کو دھو کر ایسا شفاف  
بنادیتیں جیسے کسی معمار نے سنگ مرمر کے ذرات تراش کر  
سمندر کے کنارے بچھا دیے ہوں اور لہریں میرے پیروں  
کو چھو کر واپس جاتیں۔ مجھے ان لہروں پر پیارا رہا تھا یہ

میں حسب معمول اسپتال کے شعبہ اضطراری کے دفتر  
میں بیٹھی تھی کہ نرس نے آکر کہا۔  
”ڈاکٹر صاحب! آپ کا فون۔“ میں نے اٹھایا تو جانی  
پچانی آواز آئی۔

”ڈاکٹر صاحب! میں پرایت (مسز محمود) بول رہی  
ہوں۔“

”فرمائیے کیا خدمت کروں؟“ میں نے احتیاطاً کہا۔  
”ڈاکٹر صاحب! اگر آپ کے پاس فرصت ہو تو ہماری  
ایک دوست ہیں، کبھی اسکول میں پڑھاتی تھیں ان کے سر  
میں بہت درد ہے بہت تکلیف میں ہیں۔ آپ انہیں گھر  
آ کر دیکھ لیں۔“ میں نے ہائی بھر لی اپنے کام سے فارغ  
ہو کر شام چھ بجے مسز محمود کے گھر پہنچ گئی۔ گھنٹی بجائی تو  
دروازہ کھلا مسز محمود کی بجائے سینتیس اڑتیس سال کی ایک  
خاتون سازھی میں ملبوس میرے سامنے کھڑی تھیں۔ پتلا  
جسم سانولا چہرہ تکیے نقوش بڑی بڑی آنکھیں میں تھوڑا  
جھجکی کیونکہ میں نے انہیں پہلے نہیں دیکھا تھا۔ خاتون  
نے شاید میری جھجک کو بھانپ لیا بولی۔

”ڈاکٹر صاحب! میں پروین کی سہیلی ہوں۔ آپ  
اندازے۔“

”تو آپ بیمار ہیں؟“ میں نے استفسار سے کہا۔  
”جی ہاں۔“ وہ بولی۔ ذرا تنگ روم میرا دیکھا بھالا تھا۔  
مسز محمود اس کے بچے وہاں نہیں تھے۔  
”آپ کا نام؟“ میں نے پوچھا۔

”مجھے عطیہ کہتے ہیں۔“ غم زدہ چہرے پر کچھ اجنبیت

تھی

READING  
Section

SCANNED BY AMIR





وقار کو ناشتا کون بنا کر دے گا۔ کیا اسے کچھ کھانے کو ملے گا یا نہیں! جب میں نئی جگہ اور نئے شہر پہنچی تو تھکان کے مارے جسم ٹوٹ رہا تھا ہڈیاں تھک گئی تھیں۔ آنکھوں میں آنسو تھے جو پلکوں پر اٹکے ہوئے تھے میرا دل بو جھل تھا مجھے ہر نئی چیز سے خوف آنے لگا۔ نہ جانے یہاں کیسے ماحول کا سامنا ہو روئے کو دل چاہا مگر آنسو رو کے بیٹھی رہی جب نئے ہوٹل پہنچی تو لوگ ملنسار نکلے۔ ذرا ڈھارس بندھی استانیاں مختلف جگہوں کی تھیں نواب شاہ حیدر آباد اور سکھر سے۔ اب میں سندھ آہستہ آہستہ سیکھ رہی تھی بول چال میں آسانی ہونے لگی۔ شہر کی گہما گہمی میں پرانے ہوٹل کی خاموشی کو بدل دیا۔ کمرے کی ایک ساتھی لڑکی سکھر سے تھی بہت خوش اخلاق تھی مجھے ہر وقت ہنسانے کی کوشش کرتی بار بار پوچھتی کہ تم اداس کیوں رہتی ہو میں نے اس ماحول کو اپنا شروع کر دیا تھا۔

میں پاکستان انٹرنیشنل کڈز اسکول میں پڑھاتی تھی بڑھے لکھے آزاد خیال لوگوں سے واسطہ پڑتا تھا۔ بعض لوگ اپنے مسائل اور حالات سننے کے لیے آتے گفتگو چلتی رہتی اکثر جلد ہی گھل مل جاتے۔ میں بھی اسکول میں مقبول ہوتی جا رہی تھی وقت گزرتا گیا آہستہ آہستہ میری ملاقاتوں کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا مختلف سرکاری و غیر سرکاری پارٹیوں کے دعوت نامے آنا شروع ہو گئے میں اپنے ہوٹل میں دیر سے آنے لگی۔ اب وقت دے پاؤں

لہریں اب میری ساتھی بن چکی تھیں شاید یہ لہریں اب میرے تمام چھپے ہوئے رازوں سے بھی واقف ہونا چاہتی تھیں۔ یہی معصوم لہریں میرے ہوٹل کی تنہائیوں کا مضبوط سہارا تھیں اس جنگل کے گاؤں اور ان لہروں پر مجھے بڑا یقین تھا۔ رات کو جب خاموشی ہوتی اور ہر مل سنا چھا جاتا تو یہ لہریں میرے کمرے کی کھڑکی سے نیچے ٹکرا کر شور کرتیں جیسے مجھے بلارہی ہوں لیکن اب مجھے ان لہروں اور اس ماحول کو خیر آباد کہنا پڑا۔

اب مجھے شہر کی مصروف شہری زندگی سے نجات حاصل کر کے جب میں اس گاؤں میں بطور استانی مقرر ہوئی تو میں خوشی سے پھولے نہ سائی۔ سندھ کے اس جنگلی گاؤں میں کتنا سکون تھا لیکن اب مجھے پھر شہر میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ وہ شہر کے روکھے روکھے لوگ ہر طرف بھاک دوڑ مجھے پھر اس کا سامنا تھا جس سے میں گریز کرنے کے لیے اپنا شہر چھوڑ کر آئی ہوٹل کا ڈرائیور عبدال تیزی سے گاڑی چلاتا ہوا اور مجھے سلام کرتا ہوا گزر گیا۔

اچانک میری نظر وقار پر پڑی جسے میں ایک ماہ پہلے سمندر کے کنارے سے اٹھا کر لائی تھی وقار بے چارہ اکیلا اداس میری طرح سمندر کے کنارے کھڑا تھا۔ مجھے بہت پیارا لگا میں اسے ہوٹل لے آئی اور وہ میرے ساتھ رہنے لگا میں نے وقار کو ناشتہ دیا اسے خشک مچھلی بہت پسند تھی۔ میں سوچ رہی تھی اب اگر میں یہاں سے چلی گئی تو



سے انتظار کر رہی تھی اس محبت کا جو منظور میاں بیس سال کی ازدواجی رفاقت میں بھی نہ دے سکے۔

وہ محبت جس کا اظہار مشرقی عورت کے لیے گناہ ہے میں ان جذبات میں کھوئی ہوئی تھی کہ خالد نے مڑ کر پوچھا۔

”تم مجھے کس نام سے پکارو گی؟“ اور میرے منہ سے نکل گیا۔

”صاحب.....“

ہماری ملاقات گھریلو اور سرکاری پارٹیوں میں ہونے لگی ایک شام میں نے کہا۔

”خالد! مجھے کسی کی تحریر دیکھ کر اس کی زندگی کے حالات معلوم کرنے میں مہارت حاصل ہے تم لکھ کر دکھاؤ۔“ خالد مسکرایا اور اس کاغذ پر کچھ سطر لکھ دیں۔ اس شام وہ گاڑی میں آیا مجھے سیر کے لیے چلنے کو کہا اور بولا۔

”ہاں عطیہ! بتاؤ میری لکھائی سے کیا پتا چلا؟ بتاؤ میں کیا ہوں؟ کیا مستقبل ہے میرا؟“ میں نے کہا۔

”تم گاڑی روکو تو بتاؤں گی۔“ ہم سمندر کے کنارے رکے تو شام ہو چکی تھی۔

میں نے اپنا تجزیہ بتا دیا خالد بہت متاثر ہوا اور مسکراتے ہوئے کہا۔

”ایک کمی رہ گئی ہے اور وہ یہ کہ عورتیں میری کمزوری ہیں۔“ میں یکدم سنانے میں رہ گئی۔ مجھے یہ توقع نہ تھی کہ وہ اس قدر دیدہ دلیری سے ایسی بات کہہ دے گا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے مجھے میرے ہوشل میں مچھوڑ دیا ایک ہفتہ بعد میں نے خالد کو فون کیا۔

”میں واپس لاہور جا رہی ہوں گھر والوں سے ملے ہوئے دیر ہو گئی ہے۔“

دو دن بعد وہ میرے ہوشل کے سامنے کھڑا تھا ہم جنگل میں گاڑی چلاتے ہوئے کوسوں دور چلے گئے اور کہا۔

”ہاں ادھر لاؤ۔“ اور اس نے میرے ہاتھ میں جہاز کے دو ٹکٹے تھما دیئے۔

”جاؤ فیملی سے مل آؤ۔“ میرے ہاتھ اس کے ہاتھ

بھاگتا نظر آنے لگا کہاں وہ گاؤں کے نزدیک سمندر اور وہ میری دوست لہریں اور کہاں یہاں کا ماحول ایسا لگتا وقت کے ساتھ میں بھی بھاگ رہی ہوں۔

میری زندگی کی رفتار خطرناک حد تک تیز ہو چکی تھی ایک دن ایسی ہی ایک محفل میں مجھے محسوس ہوا کہ ایک صاحب مجھے بہت غور سے دیکھ رہے ہیں۔ مجھے اس بات کا تصور بھی نہ تھا کہ کوئی بھی اس عمر میں مجھ میں دلچسپی لے سکتا ہے۔ میں سترہ سال کی جوان نہ تھی اور کچھ ایسی خوب صورت بھی تو نہ تھی۔ میری عمر تو اب پختگی کے دائرے میں داخل ہو چکی تھی میں نے نظر انداز کرنے کی کوشش کی اس کو خاص اہمیت نہ دی اور نہ ہی کوئی بات آگے بڑھانے کی کوشش کی مگر وہ ابھی ٹکٹلی ہانڈھے نہ بھدکھیر رہا تھا اور وہ تاجر تھا۔ اس تک پہنچنا تو خواب و خیال میں بھی ممکن نہ تھا۔ اچانک اس نے مڑ کر میرا نام پوچھا اور ساتھ ہی سوال بھی کیا ”کیا کرتی ہو؟“ جواب سن کر اس نے زور سے ہنسنے لگا اور کہنے لگا۔

”مجھے ایک نبوی نے بتایا تھا کہ تمہیں ایک بار پر ایک شادی شدہ عورت سے محبت ہوگی۔“ پھر وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی دردِ دیوار بھی ہنسنے لگے سارا ڈرائنگ روم ہنسنے لگا۔ مجھے ایسا لگا میرا جسم تپ رہا ہے۔

خالد درمیانے قد کا تھا گنٹھا ہوا جسم بھگی موٹھیں کنپٹی پر سفید اور کالے بالوں کا امتزاج جیسے مغرب کے وقت غروب ہوتے ہوئے سورج کی سفید شعاعیں اور کالی لکیریں مل جاتیں مگر ان سب چیزوں میں کوئی کشش تھی اگر کشش تھی تو اس کی آنکھوں میں۔ ایسی آنکھیں میں نے آج تک نہیں دیکھی تھیں گہری نیلی اور وہ آنکھیں میری روح میں پوست ہوتی جا رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں معصومیت بھی تھی اور شیطانیت بھی تھی پھر مسکراہٹ جس میں معنی خیز جاذبیت بھری ہوئی تھی۔ میں ان آنکھوں کے سحر میں کچھ بھول گئی مجھے یہ بھی یاد نہ رہا کہ میں ایک بیوی ہوں اور ایک ماں ہوں ان آنکھوں نے میرے دل میں اس کی محبت کو جگادیا۔ جس کا میں مدتوں



# چٹا

ملک کی مشہور معروف فلمکاروں کے سلسلے وار ناول  
ناولٹ اور افسانوں سے آراستہ ایک مکمل جریدہ  
گھر بھر کی دلچسپی صرف ایک ہی رسالے میں ہے  
جواپ کی آسودگی کا باعث ہو سکتا ہے اور وہ ہے اور  
صرف آنچل آج ہی اپنی کاپی بک کرالیں۔  
ڈونا ہوانارا

امید و دل اور محبت ہمارے دل میں رکھنے والوں کی  
ایک دل نشیں پر خوشبو بھائی سمیہ اشریف طور کی زبانی

شب بھر کی پہلی بارش

محبت و جذبات کی خوشبو میں بسی ایک دلکش  
داستان نازیہ تنول نازی کی دلچسپ کہانی

مومن کی محبت

پیار و محبت اور نازک جذباتوں سے گندھی معروف  
مستند رامت وفا کی ایک دلکش و دل زبانا یاب تحریر

AANCHALNOVEL.COM

پرچہ ملنے کی سورت میں رجسٹریشن (021-35620771/2)

سے ٹکرائے بدن میں ایک جھرجھری سی دوڑ گئی۔ میں نے  
خالد کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔  
”یہ تم کیا کر رہے ہو؟“ اس نے میری ہتھیلی کو چومنا پھر  
میرے ماتھے پر پیار کیا اور کہا۔  
”یہ تو میں اس دن سے کوشش کر رہا ہوں جس دن سے  
تمہیں دیکھا۔“

اس رات میں سونہ سکی دماغ کچھ کہہ رہا تھا ضمیر کچھ اور دل  
کچھ اور پتا نہیں خالد کو دیکھ کر میرے دل میرے جسم میں بجلی  
کی لہر کیوں دوڑ جاتی تھی آنکھوں میں آنسو آگئے اور میں  
تکیے میں منہ چھپا کر رونے لگی راتوں بعد وہ مجھے ایک ہوٹل  
میں نظر آیا۔ میں نے کوشش کی کہ آٹھ ملا کے نہ دیکھوں ابھی  
میں سوچ ہی رہی تھی کہ وہ میرے سامنے کھڑا تھا۔ بغیر کسی  
بات کے اس نے میرا بیگ اٹھایا اور کار میں رکھ دیا اس نے  
مجھ پر کیا جلاو کر دیا تھا میں اس کے ساتھ لا شعوری طور پر کار  
میں بیٹھ گئی۔ میری ذہنی کیفیت کیا تھی اس کا مجھے کچھ اندازہ  
نہ تھا۔ لا شعور اور شعور سب گڈمڈا ہوا ہے تھے۔

میں ان میں تمیز کرنے سے قاصر تھی جب میں ہوش  
میں آئی تو ہم شہر کی حدود پار کر چکے تھے جنگل کے درمیان  
وہ ہلکے ہلکے مسکرا رہا تھا اس نے گاڑی ایک جگہ روکی اس  
نے مجھے جن نظروں سے دیکھا ان کا بیان کرنا میرے بس  
سے باہر ہے۔ آہستہ آہستہ اس نے میرے بالوں میں  
گنگھی کرنا شروع کر دی میری حالت میرا دل میرا جسم کوئی  
بھی چیز میرے قابو میں نہ تھی۔ میں کس مقام پر تھی اس کا  
مجھے اندازہ نہ تھا۔ میرا تمام جسم انگاریے کی طرح دھک رہا تھا  
اس کی لہو خالد کے چہرے پر پڑ رہی تھی اس کے بعد ہم اس  
مقام پر تھے جہاں سے واپسی ناممکن تھی۔ اگلے دن وہ مجھے  
اٹر پورٹ چھوڑنے آیا۔

”جلد واپس آنا یہ آنکھیں تمہارا انتظار کریں گی۔“ یہ  
الفاظ اس نے انگریزی میں کہے جس سے عجب سا لطف  
ابھرا تھا۔

میں لاہور اٹر پورٹ پر اتری تو جواڈ درختاں اور منظور  
میاں کو دیکھ کر خوشی ہوئی منظور میاں دو چار دن تو خوش نظر



زیادہ قریب نہ آ سکا، کبھی کبھی اسی وجہ سے اس کا رویہ مختلف نظر آنے لگا۔

شام کے کھانے کے بعد خالد میرے کمرے میں آیا اور اچانک عطر کی پوری شیشی میرے کپڑوں پر انڈیل دی اور بولا۔

”عطیہ میں تمہاری عصمت اور عزت کا محافظ ہوں۔“

یہ حسین وقت بھی جلد گزر گیا۔ منظور میاں سے ازدواجی

تعلقات ایک عرصہ سے خراب تھے ان کو تو ایک ہی کام سے

غرض تھی جنسی اختلاط اور اس کے بعد باورچی خانہ نہ

جذبات اور نہ محبت۔ عطیہ ان کے لیے ایک مشین تھی پیسہ

کمانا اور ان کو بھیجنا اور ان کا حکم بجالانا اس جمود میں کوئی

انقلاب آئے تو منظور میاں اس کو قبول کرنے کے قابل نہ

تھے۔ جو اد جوان ہو رہا تھا اس کو اس بات کا احساس ہو گیا تھا

کہ ابو اور امی میں شادی کی کمزور رشتی کے علاوہ اور کچھ بھی

نہیں۔ جو اد کو اس انتخاب میں بہت مشکل پیش آ رہی تھی اگر

ابو اور امی میں کوئی گڑبڑ ہو گئی تو اس کی محبت کا کیا بنے گا۔

درخشاں بھی اکثر خلا میں گھورتی رہتی شاید وہ اس بات

کا انتظار کر رہی تھی یا اندازہ کر رہی تھی کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ

اس گھر کو آگ لگ گئی، گھر کے چراغ سے۔ میرا دل و

دماغ فیصلہ کرنے سے انکار کر رہا تھا اگلے دن جہاز میں

سوار ہونا تھا منظور میاں کا موڈ بہت خراب تھا۔ رات کے

کھانے کے بعد منظور میاں نے محبت کی زبان بولنے کی

کوشش کی، میرا دل و دماغ نہیں اور تھا بات بڑھ گئی۔

میرے انکار سے ان کا درجہ حرارت شوٹ کر گیا۔

”جاد چلی جاؤ تم جیسی بازاری عورتیں سڑک پر بہت

ملتی ہیں۔“ پھر آنسوؤں کا تانتا بندھ گیا نہ جانے کسب جہاز

پر سوار ہوئی اور کب درخشاں اور جو اد کو خیر باد کہا۔ جہاز کا رخ

پھر اسی کراچی کی طرف تھا جہاں خالد کی آنکھیں میرا

انتظار کر رہی تھیں۔ میں دوراے پر کھڑی تھی مجھے فیصلہ کرنا

تھا کہ یہ کشتی کس کنارے لگے گی۔ درخشاں اور جو اد کو چھوڑ

دو منظور میاں کو چھوڑ دوں، اولاد اور بیس سال کی رفاقت

کیسے چھوڑ دوں۔ جو اد بھی کوئی بچہ نہیں تھا اسے احساس تھا

کہ امی کس مشکل میں ہیں مگر سامنے وہ بھی کچھ نہ کہتا تھا۔

آئے مگر اس کے بعد اپنے طور طریقوں کی طرف پلٹ گئے۔ چھٹیاں جلد گزر گئیں میں واپسی پر جہاز پر سوار تھی۔

فیصلے کا وقت قریب آتا جا رہا تھا خالد کا چہرہ سامنے تھا۔

سندھ، جنگل، سمندر آنکھیں۔ میں نے جذبات کو قابو

میں رکھنا چاہا میں نے سوچا میں کام میں خود کو اس قدر

مشغول کر لوں گی کہ ماضی فراموش ہو جائے۔ میں ضرور

کوشش کروں گی ضرور کروں گی۔

صرف دو دن ہی گزرے تھے کہ میں نے خالد کو فون

کیا، وہ شام کو آیا ہم دونوں ہوٹل کھانے کے لیے گئے۔

ہوٹل میں رومانی ماحول تھا خالد آج سنجیدگی کے موڈ میں

تھا اچانک اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور سونے کے چار چار

کنگن میری کلائیوں میں چڑھا دیے اور بولا۔

”عطیہ یہ میرا بندھن ہے اب تم ان کے ساتھ مجھ سے

بندھ چکی ہو میں تم سے پیار کرتا ہوں۔“ میری آنکھوں

سے آنسو جاری تھے ایسا تانتا بندھا ہوا تھا کہ رکھتے نہ تھے۔

یہ بات منظور میاں نے بیس سال کی رفاقت میں بھی نہ کہی

تھی۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا سن رہی ہوں میں

نے خالد کے ہاتھوں کو چوما اور واپس آ گئی۔

نئے اسکول کھلنے کے بعد کام بہت بڑھ گیا تھا

چھٹیاں جلد آ گئیں اور میں گرمیوں میں لاہور پھر واپس

آ گئی جو اد تیزی سے جوان ہو رہا تھا۔

درخشاں بھی بالغ ہو چکی تھی منظور کے انداز میں کوئی

تبدیلی نہیں آئی اسی طرح زر خرید غلام سمجھتے رہے جیسا

برسوں سے سمجھتے آ رہے تھے لیکن انہیں بھی اس بات کا

احساس ہو گیا تھا کہ عطیہ کسی اور ہی دنیا میں رہتی ہے۔ جو اد

بہت دنوں سے مصر تھا میں کراچی جانا چاہتا ہوں اور وہاں

میری پڑھائی کا بندوبست کیا جائے میں نے خالد کو فون کیا

اور اپنے پروگرام سے مطلع کیا۔ ہم کراچی اپریل کے آخر

میں پہنچے۔ رات میں خنکی تھی بہار کی آمد تھی خالد اتر پورٹ

پر موجود تھا وہی مسکراہٹ وہی آنکھیں جو اد میں اور خالد

کراچی میں کئی علاقوں کی سیر کرتے رہے ہر طرف سبزہ

پھول رنگینی بہار کا سماں۔ خالد جو اد کی موجودگی میں میرے



## ☆ ☆ مسکراہٹیں ☆ ☆

شیخ کے گھر سے چوہا باہر جا رہا تھا۔  
 ”شیخ! کیا لے کر جا رہے ہو؟“  
 چوہا ”بھائی بھوکا مرنے سے تو بہتر  
 ہے بندہ ہجرت کر جائے۔“

ایک دوست اپنے ہاتھ پر بلیڈ سے  
 لڑکی کا نام لکھ رہا تھا کہ اچانک زور  
 زور سے رونے لگا۔

دوست ”پیار کرتا ہے تو روتا کیوں ہے؟“  
 دوست! ”یار اسپیلنگ غلط ہو گئی  
 ریحانہ ملک کی جگہ رحمان ملک لکھ دیا۔“

## ☆ ☆ ارشد علی..... لاہور ☆ ☆

دن ہیں۔ میری زندگی کا خوب صورت موڑ اس کا انجام  
 صرف میرے آنسو ہیں۔ ڈاکٹر صاحب آپ کے پاس کوئی  
 درد کی گولی نہیں؟ میرا سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔“  
 ”عطیہ! تمہیں کسی گولی کی ضرورت نہیں، تمہیں کسی  
 کندھے کا سہارا چاہیے وہ شخص چاہیے جو تمہاری کہانی سن  
 سکے۔“

”ڈاکٹر صاحب اگر بُرا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں۔  
 آپ کی آنکھیں بہت گہری ہیں ان میں کوئی راز چھپا  
 ہے؟“

”عطیہ میری آنکھیں گہری ضرور ہوں گی ہاں ان میں  
 بھی راز چھپے ہیں مگر یہ نیلی نہیں کالی ہیں۔“ میں نے دروازہ  
 بند کیا اور اسپتال واپس آ گئی۔

خالد آج بھی کراچی میں تاجر ہے اس کی دونوں بیٹیوں  
 کی شادی ہو چکی ہے۔ عطیہ اب بھی لاہور میں رہتی ہے وہ  
 بھی تین نواسیوں کی مانی بن چکی ہے اور میں آج بھی لاہور  
 میں ہوں اور میرا عمل جراحی جاری ہے۔



دور اتنی بہت کوفت میں گزریں مجھے کام سے پیارتھا۔  
 اگلے دن صبح میں نے خالد کو فون کیا ”میری آنکھوں  
 میں آنسو تھے میری آواز کپکپا رہی تھی۔“

”خالد..... خالد میں نے نوکری سے استعفیٰ دے دیا  
 ہے۔ میں واپس جا رہی ہوں۔“ پھر میں نے فون بند  
 کر دیا۔

شام کو خالد مجھے لینے آیا مجھے اپنے سامنے بٹھایا وہ  
 بہت سنجیدہ تھا اس کے چہرے پر کوئی مسکراہٹ نہ تھی اس  
 نے بیگ سے ایک خوب صورت سلکی ساڑھی نکالی اور کہا۔  
 ”اے پہنو اور میرے ساتھ آؤ۔“ تاروں بھری رات  
 تھی ہم دونوں ایک وادی میں چلے گئے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا  
 چل رہی تھی اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھ سے دھیرے  
 دھیرے کہنے لگا۔

”تم جا رہی ہو میں تمہیں روکوں گا نہیں لیکن ایک بات  
 یاد رکھنا میں نے تم سے ہر جگہ ہر موسم میں ہر شہر میں محبت کی  
 ہے اور جب تک میں زندہ رہوں گا اگر پوجنا حرام نہیں ہے تو  
 میں تمہیں پوجوں گا۔ میں تم سے پیار کرتا رہوں گا۔“ میرے  
 دل و دماغ میں میرے پورے جسم نے رونا شروع کر دیا۔  
 پھر اس نے ساڑھی کا پٹو اٹھا کر میرا سر ڈھکا اور دعا کی۔

”اے پروردگار! ایک روز میری عطیہ کو مجھ سے ملا دے  
 تو ہر چیز پر قادر ہے۔“ ہم کار میں بیٹھے میری اور خالد کی  
 آنکھیں لال ہو رہی تھیں۔ نہ جانے کب ہو شل آیا نہ جانے  
 کیسے راستہ کٹا۔ خالد نے خاموشی سے کار کا دروازہ کھولا اس  
 نے مڑ کر نہیں دیکھا وہ گاڑی کو تیزی سے چلاتا ہوا ہوا کے  
 جھونکے کی طرح غائب ہو گیا۔

اگلے دن میں لاہور واپس آ گئی جو ادور درخشاں اتر  
 پورٹ پر موجود تھے منظور میاں کے چہرے پر اطمینان تھا۔  
 میں نے سوچا آخر یہ مرد میرا گناہ کیسے معاف کرے گا۔  
 ”کیسا گناہ..... کون سا گناہ..... عطیہ! یہ تم کیا کہہ  
 رہی ہو؟ محبت کو گناہ نہیں کہتے۔“ میں کسی گہرے خواب  
 سے بیدار ہو رہی تھی۔ میں حقیقت کو کیسے چھپاؤں محبت  
 کی یادوں کو کیسے بھلا دوں وہ جنگل میں میری ممتنی یادیں



# اسیر غم

صہر پرویز احمد

جاگیردارانہ سماج میں عورت کی حیثیت غلام کی سی ہوتی ہے  
اس کے نہ جذبات ہوتے ہیں نہ احساسات اسے صرف اور صرف  
مٹی کا مادہ سمجھ کر استعمال کیا جاتا ہے۔  
یہ سچی کہانی ہمارے بھی سماج کے ہر گاؤں کی ہے جہاں  
بہنوں پر غیبت کے نام پر ہر ظلم روا سمجھا جاتا ہے۔

سائیں کی حمایت کو کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا۔  
گاؤں کی گلیوں بازاروں سے لے کر اقتدار کے  
ایوانوں تک اس کے نام کا چرچا تھا۔  
اس نے بھی اپنے کردار، گفتار، اخلاق، انسانیت،  
شرافت اور انصاف کی بنا پر اپنی شہرت کی حرمت کو  
برقرار رکھا ہوا تھا۔ کوئی بھی حریف آج تک اس کو نیچا  
نہ دکھاسکا تھا۔ برادری کے لوگ اس کی شہرت سے  
تالاں تھے اکثر دے بے لفظوں میں اس کی شکایت بھی  
کرتے لیکن اس کے فیصلے کے خلاف بولنے کی  
جرات نہ رکھتے تھے اور ویسے بھی اس کی برائی کیا  
کرتے بخادت پر لوگوں کو کیسے اکساتے وہ تو خلوص و  
شرافت کا پیکر تھا۔

برادری کے کم ظرف لوگ ہمیشہ اس ٹوہ میں رہتے  
کہ سائیں کی کوئی کمزوری ان کے ہاتھ لگے لیکن وہ  
ہمیشہ ناکام رہتے پھر سائیں کے انصاف کو چیلنج  
کرنے کا موقع انہوں نے خود پیدا کر دیا۔ محسن نامی  
نوجوان سائیں کے قریبی عزیز وڈیرے سلیم کا سرکش  
بیٹا تھا۔ وڈیر سلیم اندر ہی اندر سائیں کا قدر کا سخت  
مخالف تھا مگر حرف مدعا زبان پر نہ لاتا تھا۔ منہ پر  
سائیں کی تعریف کرتا پیٹھ پیچھے برائی کرتے نہ تھکتا۔  
ہمیشہ اس کی شہرت سے جلتا اور کڑھتا رہتا۔

محسن اوباش قسم کا نوجوان تھا اکثر گاؤں کی  
لڑکیوں کے راستے میں کھڑا ہو کر آواز کستا کام کرتا

نسائیں قادر کو اللہ تعالیٰ نے علاقے میں بڑا نام  
دیا تھا وہ تھا بھی بڑا رحم دل ہر عزیز غریبوں کا خیال  
رکھنے والا۔ اعلیٰ ظرفی اور غریب پروری کی وجہ سے  
پورا علاقہ اس کو انتہائی عزت و احترام سے دیکھتا تھا  
اس کا ہر حکم سر آنکھوں پر رکھا جاتا۔ علاقے میں کوئی  
بھی مسئلہ پیدا ہوتا اس کا فیصلہ سائیں کے ڈیرے  
میں ہوتا۔ اس کے حکم کی خلاف ورزی کا سخت بُرا منایا  
جاتا کیونکہ وہ کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کرتا۔ فریقین  
کو مکمل انصاف دیا جاتا یوں اس کے انصاف کا چرچا  
بھی ہر خاص و عام کی زبان پر جاری تھا۔ ہر مسئلے کا حل  
سائیں کے ڈیرے پر موجود تھا یوں اس کی شہرت کو  
چار چاند لگے ہوئے تھے لیکن برادری کے کچھ لوگ  
اس کے خلاف بھی باتیں کرتے تھے مگر جسے اللہ تعالیٰ  
عزت دے اسے کوئی شخص چھین نہیں سکتا اور نہ ہی کمی  
بیشی کر سکتا ہے۔

پورے علاقے کے لوگوں پر اس کا اثر و رسوخ دیکھ  
کر سیاستدان بھی اکثر اس کے ڈیرے کا طواف  
کرتے یوں اس کی عزت اور اہمیت میں مزید اضافہ  
ہو جاتا۔ سیاستدانوں کا بھی وقت اور فاصلہ بچ جاتا اور  
در کی ٹھوکریں کھا کر ووٹ مانگنے کی صعوبت سے جان  
چھوٹ جاتی۔ صرف سائیں کی حمایت پانے سے ان  
کے بہت سے مسائل حل ہو جاتے۔ اخراجات بھی کم  
ہوتے اور ووٹ بھی توقع سے بڑھ کر ملتے یوں





نہیں تھا۔ چوری چکاری اس کا پیشہ تھا، ٹکھٹو بے کار  
نکٹے لوگوں کی فوج ظفر موج پال رکھی تھی۔ مالالتق  
لوگوں کا میلہ ہمیشہ محسن کے ڈیرے پر لگا رہتا۔ خوب  
موج میلہ مستی ہوتی، چرس، بھنگ اور شراب کے دور  
چلتے وہیں پر بیٹھ کر چوری ڈکیتی کے پروگرام بنائے  
جاتے۔ پورے علاقہ کو انہوں نے تنگ کر رکھا تھا۔  
کوئی امیر غریب ان کے شر سے محفوظ نہ تھا، ان کا  
اوڑھنا، بچھونا بے عزتی تھی، اس لیے کوئی بھی غیر  
اخلاقی کام کرتے ہوئے رائی برابر نہ گھبراتے۔ لوگوں  
کو تنگ کر کے ان کو سکون ملتا تھا۔

کسی بھی شخص کی عزت مال، جان ان کے شر سے  
محفوظ نہ تھی، ایسے شر پسند کو رشتہ دینا گویا لڑکی کو زندہ  
درگور کرنے کے مترادف تھا۔ اسی لیے ابھی تک کنوارا  
تھا، والدین نے اپنی بھرپور کوشش کی مگر کہیں بھی بات  
نہ بنی، جس شخص کے پیچھے چوبیس گھنٹے پولیس لگی ہوئی  
ہو، شرافت سے دور دور کا واسطہ نہ ہو، ہر شخص سخت نفرت  
کرتا، ہوا اس کو بیٹی کا رشتہ کون دیتا جب والدین نے ہر  
طرف کوشش کر کے دیکھ لی کہیں سے بھی مراد برناتی  
تو وہ لوگ مایوس ہو گئے اور محسن کو بھی صورت حال سے  
آگاہ کیا اور کرتوت چھوڑنے کی تلقین کی۔

”جب تک یہ بُرے دھندے گندی عادات

ترک نہیں کرو گے کوئی تمہیں منہ نہیں لگائے گا۔“  
محسن بھلا کب اپنی روش بدلنے والا تھا، اس نے  
معاشرے سے انتقام لینے کا فیصلہ کیا اور اس کا مدد  
معاشرے کا ایک پسماندہ شخص رحمت تھا جو سائیں  
قادر کا مزارع تھا، ایک جوان خوب صورت، سلیقہ شعار  
بیٹی کا باپ تھا جس کی غربت کی کشتی بے بسی کے  
گرداب میں پھیرے لے رہی تھی اور وہ مدتوں سے  
اس کو نکالنے کے لیے تنگ و دو میں لگا ہوا تھا۔

ایک دن اپنے چند اوباش ساتھیوں کے ہمراہ محسن  
نے رحمت کی جوان بیٹی کو زبردستی اغواء کر لیا، پورے  
گاؤں میں ہلچل مچ گئی۔ ہر کوئی اس ظلم پر اسٹکبار تھا،  
لوگ کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ توبہ کر رہے تھے۔ اک  
مجبور بے بس غریب آدمی کو دکھوں کے پہاڑ تلے  
دبا دیا گیا۔ زندگی کی بقیہ سانسوں کو اجڑا بنا دیا گیا۔  
سکھ سے اس کا ناتہ توڑ دیا تھا، ایسے ظلم پر تو سات  
آسمانوں کے ادھر بیٹھارت ذوالجلال بھی جوش میں  
آ جاتا ہے۔ زمین پر اس کی وحدانیت کا اقرار کرنے  
والا اور اس کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے  
مطابق ہر غریب و مجبور کو گھر کی دہلیز پر انصاف  
پہچانے والا سائیں قادر کیسے خاموش رہ سکتا تھا۔ اتنا  
بڑا ظلم اس کے گاؤں میں ہوا اور سائیں خاموش



بجائے سکھ کی چھاؤں میں سکون سے بیٹھو گے۔  
دکھوں پریشانیوں اور روزی کی تنگی سے ہمیشہ کے لیے  
چھٹکارا پا جاؤ گے۔“

”میں اگرچہ غریب آدمی ہوں لیکن ایک نوجوان  
بیٹی کا باپ ہوں زندگی کی کتنی ہی گرم و سرد شاخیں گزر  
چکا ہوں حقیقت کے عفریت سے کئی بار پالا پڑ چکا  
ہے۔ زمانے کے اونچ نیچ سے اچھی طرح آگاہ ہوں  
میرا اس بات پر پختہ یقین ہے کہ محل میں بھی ٹاٹ کا  
پیوند نہیں لگ سکتا۔ میرے پاس جتنا مرضی پیسہ  
آجائے میں پھر بھی بے نام ہی رہوں گا کیونکہ غریب  
کا نہ کوئی نام ہوتا ہے نہ مقام ذات پات برادری کچھ  
بھی نہیں ہوتا۔ غریب تو صرف دوسروں کی خدمت  
کے لیے پیدا ہوتا ہے اس کو پیدا کر کے امیروں کو بننے  
مسکرائے کا موقع فراہم کیا گیا ہے۔ غریب کی  
مجبوری بے بسی و ذیروں کے لیے سکون اور راحت کا  
سامان مہیا کرتی ہے۔ و ذیرے مجبوروں کی بے بسی  
سے فائدہ اٹھا کر جب ان کو نشان عبرت بناتے ہیں تو  
ان کو روحانی خوشی ہوتی ہے۔“

غریبوں کو رات کو نیند میں سنہرے خواب نہیں  
آتے اب مجھ کو دن میں خواب دکھارے ہیں۔ محسن  
کی بجائے اگر میں اپنی جیتی جاگتی بیٹی کو اندھے  
کنویں میں دھکا دے دوں تو یہ اسی پر احسان ہوگا۔  
ایک ہی دفعہ مر جائے گی اور زندگی سے جان  
چھوٹے گی۔ محسن تو اس کو روزانہ موت کے حوالے  
کرے گا مگر مرنے نہیں دے گا۔ میری بیٹی موت  
کے حصول کے لیے بھی محسن کی محتاج ہوگی۔ میں  
اس کو بے بسی سے مرتے نہیں دیکھنا چاہتا میں  
غریب ہوں مجھے غریب ہی رہنے دیں۔ یہ کنیا ہی  
میرا محل ہے مجھے اور میری بیٹی کو اسی میں زندگی کی  
بقیہ سانسیں پوری کرنے دیں۔ مجھے زرد جواہر کے

رہے یہ بھلا کیسے ممکن تھا جو نبی سائیں کو پتا چلا وہ  
رحمت کے گھر پہنچ گیا دکھ درد بٹانے لگا ہر طرح اس  
کی مدد کرنے کا وعدہ کیا اور پھر اس نے اصل صورت  
حال دریافت کی تو رحمت بولا۔

”و ذیرہ سلیم ایک دن میرے گھر آیا گھر بار کا  
اجوال پوچھنے کے بعد یوں گویا ہوا ”رحمت تم جانتے  
ہو میں سائیں قادر کا قریبی عزیز ہوں ہمارا علاقے  
میں بڑا نام ہے کسی میں ہمارے سامنے سر اٹھانے کی  
جرات نہیں۔ عزت دولت شہرت کون سی نعمت ہے  
جو اللہ نے ہمیں نہیں دی۔ و ذیرے اور حویلی میں ملازم  
کام کرتے ہیں کسی چیز کی کمی نہیں۔ میرا بیٹا محسن لا  
ابالی بہت ضدی قسم کا نوجوان ہے جو بات منہ سے  
نکالتا ہے اسے پورا کر کے دم لینا ہے۔ ہم نے کئی جگہ  
اس کی شادی کی بات کی ہے مگر وہ مانتا ہی نہیں وہ آپ  
کی بیٹی کو پسند کرتا ہے اسے اپنا نا چاہتا ہے۔ اگر وہ  
اسے نہ ملی تو وہ خودکشی کر لے گا وہ نجمہ کے بغیر نہیں جی  
سکتا۔ وہ اسے رانی بنا کر رکھے گا اپنی تمام بری  
عادات چھوڑ دے گا اس کا تابعدار بن کر رہے گا۔ ان  
کی جوڑی مثالی ہوگی۔ ہم آپ کی بیٹی کی جھولی  
خوشیوں سے بھر دیں گے اس کو کسی چیز کی کمی نہیں  
ہونے دیں گے۔ اس کی تمام خواہشات پوری کریں  
گے ہمارے گھر میں وہ راج کرے گی۔ ہم آپ کے  
تمام مطالبات پورے کریں گے آپ سے جہیز لینے  
کی بجائے آپ کو جہیز کے لیے منہ مانگی رقم دیں  
گے۔ آپ کی بیٹی کے نام رقبہ لگوائیں گے شہر میں  
کوٹھی لے کر دیں گے۔ زندگی کے ہر دکھ درد میں آپ  
کا ساتھ دیں گے ہماری وجہ سے کوئی آپ کی طرف  
میلی آنکھ سے نہیں دیکھے گا۔ آپ کے مکان پر برسوں  
سے منڈلاتے غربت کے بادل ہمیشہ کے لیے  
چھٹ جائیں گے۔ خواہشات کی چکی میں پسے کی



## حکمت کی باتیں

- ✦ جب زمانہ امن کا ہو اور حالات جنگ جیسے ہو تو سمجھو عذاب ہے۔
- ✦ جو سوچو گے وہی پالو گے اس لیے اپنی سوچ مثبت اور تعمیری رکھیں۔
- ✦ ہا مقصد زندگی انسانیت کا پتہ دیتی ہے۔
- ✦ یادیں ماضی کا حسن اور مستقبل کا سرمایہ ہوتی ہیں۔
- ✦ ہر شخص سچا دوست تلاش کرتا ہے لیکن سچا دوست بیٹے کی زحمت گوارا نہیں کرتا۔
- ✦ تعلیم انسانیت بخشی ہے لیکن بہت کم لوگ اس کی حقیقت سے باخبر ہیں۔
- ✦ کسی انسان کا پہلا پیار بننا کوئی بڑی بات نہیں بننا ہے تو کسی کا آخری پیار بنو۔
- ✦ فیاض اسحاق مہمانہ..... سلا نوالی

تو وہ یار اتنا پا ہو گیا۔ بیٹے کی صفائی دینے لگا اور اس کی شرافت اور مسوہیت کے گن گانے لگا۔

”اگر محسن نے غلطی کر لی ہے تو ایسی کون سی قیامت آگئی ہے بچہ؟“ ماہانہ اورنا سمجھ رہے تھے کہ اب بھی عزیز ہے جوانی کے جوش میں اس سے غلطی سرزد ہوئی ہے تو آپ درگزر کریں! رحمت کو مطمئن کریں میں تلاش میں لگا ہوں جو جی ملے ہے میں اس سے نرمی واپس لے آتا ہوں گا۔ آپ تسلی رہیں میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔“ سما میں قادر اور وزیر سے سیم کے جواب سے مطمئن نہیں تھا وہ اپنے انصاف کی راج راجا چاہتا تھا اپنا کردار داغ دار اور انصاف کا عمل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ فیصلہ وہ مثالی کرنا چاہتا تھا صرف لوگوں کے لیے منصف نہیں بننا چاہتا تھا بلکہ اپنی ذات پر بھی فیصلوں کا اطلاق کرنا چاہتا تھا۔

بھاری پتھروں سے مت کچلیں، میری جی کسی بھنے پر اینٹیں تو تھاپ سکتی ہے مگر آپ کی حویلی کا نرم چھانک پٹنگ اس کے نصیب میں نہیں۔ یہ تو خود ملازمہ ہے یہ کسی خادمہ پر کیسے حکم چلا سکتی ہے وڈیرا سائیں! تجھے اس ٹکری میں مت آباد کریں جہاں اندر جانے کا تو راستہ ہے مگر باہر نکلنے کا نہیں۔“

یوں منبت ساجست اور اپنی اوقات بتا کر میں نے وڈیرے سے سائیں سے معذرت کرنی لیکن میرے انکار کی گستاخی وہ برداشت نہ کر سکا اور مجھے خطرناک نتائج کی دھمکیاں دیتا ہوا یہاں سے چلا گیا پھر تنویر سے ہی دن گزرے ہیں کہ دن دہائے میری بیٹی کو اغواء کر لیا گیا اور اغواء کرنے والا سائیں سیم کا بیٹا بن گیا۔ اس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے نجمہ کو تلاش کرنے کی کوشش کی یا سائیں قادر کو بتایا یا دیگر کوئی قانونی چارہ جوئی کرنے کی کوشش کی تو وہ ہماری کھوپڑی آگ لگا دے گا۔ یہ بھی دھمکی دی کہ میں انعام لگا دوں گا کہ وہ ایک روپے میں نجمہ کو اس کے باپ سے خریدا ہے۔ گواہوں کی میرے پاس ہی نہیں تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ اب نجمہ کو بھول جاؤ یہ محسن کی امانت تھی جو واپس لے کر جا رہا ہے۔

”اب یہ محسن کی عزت سے ہوئی اس کو پاس رکھو گا اب تمہاری ذمہ داری ختم اور محسن کی ذمہ داری شروع ہوئی ہے۔ اب اس کے دکھ درد خوشی غم کا سہا جی محسن ہے۔“

محسن اور وزیر سے سیم کے خلاف کس سے فریاد کروں کس سے انصاف مانگوں۔ اپنے ارمانوں کا کہاں ماتم کروں کون سے جو مجھ پر ترس کرے مجھے انصاف دے مجھے میری بیٹی واپس دلا دے۔

رحمت کی رواداسن کراچی شام سائیں قادر نے وزیر سے سیم و وزیر پر ہوا یا محسن کے غلطی کی بات کی



آپ کی بیوی کے بارے میں باتیں نہ کرتا۔“  
جواد سخت غصے میں گھر گیا اور وہاں ہنگامہ کھڑا  
کر دیا سائیں کے بارے میں جو زبردی دے سلیم  
اور اس کی بیوی نے اس کے ذہن میں بھرا تھا وہ وہ  
وہاں جا کر اگلا اور اپنے باپ سے بغاوت پر اتر آیا۔  
سائیں کو یہ سب سن کر بہت افسوس ہوا جواد کو قریب  
بٹھا کر بڑے پیار سے سمجھایا۔

”بیٹا! میں نے صرف بات کی ہے اور وڈیرے  
سلیم کو اتنا دکھ ہو رہا ہے اور وہ سخت غصے میں ہے۔  
مرنے مارنے پر تل گیا ہے تم کو میرے خلاف  
بھڑکایا ہے ہم باپ بیٹے میں دراڑ ڈالنے کی کوشش  
کر رہا ہے۔ نجمہ بھی تو کسی کی بیٹی ہے رحمت بھی تو  
بیٹی کا باپ ہے۔ وہ بھی وڈیرے سلیم کی طرح غیرت  
مند ہے اس کو بھی اپنی بیٹی کی عزت عزیز ہے۔ محسن تو  
اس کا لگتا بھی کچھ نہیں وہ بھی تو دودن سے اس کی بیٹی  
کے سات گل چھڑے اڑا رہا ہے۔ اس کے اندر بھی  
آگ جل رہی ہے اس کی آنکھوں میں بھی خون  
اترا ہوا ہے وہ بھی محسن کو دانٹوں تلے چبا جائے اگر وہ  
اسے مل جائے۔“

”بیٹا! میں ایسا کوئی فیصلہ نہیں کروں گا جس سے  
تمہاری عزت پر حرف آئے۔ میرا تمہارے سوا کون  
ہے میرا سب کچھ تمہارا ہے مجھے اپنی بہو بہت عزیز  
ہے میں اس کی طرف اٹھنے والی سیلی آنکھ کو نکال دوں  
گا۔ میں نے تو صرف دھمکی دی ہے تاکہ غریب  
رحمت کی بیٹی واپس مل جائے اس مجبور کو بھی سکھ کا  
سانس نصیب ہو اس کے دکھوں کا مداوا ہو اس کا اجڑا  
آگن پھر سے آباد ہو جائے۔“ اب ساری بات جواد  
کی سمجھ میں آ گئی اس نے سائیں سے معذرت کی  
یوں باپ بیٹے کے درمیان نفرت کی دیوار تعمیر ہونے  
سے قبل ہی زمین بوس ہو گئی۔

سو وہ حق کے لیے ڈٹ گیا اور پھر ایک ایسا فیصلہ کیا جو  
سونے کے پانی سے لکھنے کے قابل تھا۔ اس نے  
وڈیرے سلیم کو دو نوک الفاظ میں اپنا فیصلہ سنایا۔  
”میں تم کو دودن کا وقت دے رہا ہوں اگر تم نے  
اس مدت کے دوران رحمت کی بیٹی واپس کر دی تو  
ٹھیک ہے ورنہ میں تیری بیٹی کا نکاح رحمت کے بیٹے  
سے کر دوں گا۔“

یہ سننا تھا کہ وڈیرے سلیم کے پاؤں تلے سے  
زمین ٹکس گئی وہ غصے میں آگ بگولا ہو گیا تھر تھر کانپنے  
لگا مگر مجبور تھا۔ اتنی جرأت نہ تھی کہ سائیں کو انکار کرتا۔  
سو غصے میں لال پیلا ہوتا گھر کو روانہ ہو گیا۔ گھر جاتے  
ہی رونا دھونا شروع کر دیا تمام صورت حال گھر والوں  
کو بتائی۔ سائیں کے فیصلے کو خامانہ اور دشمنی پر مبنی  
قرار دیا جو منہ میں آیا سائیں کے خلاف بولا۔ برادری  
کا دشمن قرار دیا رحمت کو بھی برا بھلا بولا اور فیصلے کو  
سازش قرار دیا۔

وڈیرے سلیم کی بیٹی کی منتی سائیں کے بیٹے جواد  
سے کی گئی تھی اب یہ سائیں کی غربت پروری اور اپنے  
انصاف کی انتہا تھی کہ اس نے اپنے بیٹے اور بہو کی بھی  
پروانہ کی اور اپنا فیصلہ وڈیرے سلیم پر ٹھوس دیا۔ وڈیرا  
سلیم سخت مشکل میں پھنس گیا تھا اور اب بچنے کی کوئی  
صورت نظر نہ آ رہی تھی۔

رات کو دونوں میاں بیوی نے جواد کو بلوایا اور  
سائیں کے فیصلے کے بارے میں اس کو بتایا۔ رحمت  
سے سائیں کی ہمدردی کے بارے میں بہت سی اوٹ  
پٹانگ باتیں کیں رو دھو کر اور بہت سی اچھی بُری  
باتیں بتا کر بیٹے کا دشمن ثابت کیا۔ اس کی خواہشات  
اور ارمانوں کا قاتل قرار دیا اور زور لگا کر یہ باور کرایا کہ  
”سائیں تمہاری شادی کرنا ہی نہیں چاہتا اس کو آپ  
سے ذرہ برابر محبت نہیں اگر وہ آپ کو بیٹا سمجھتا تو یہ



دو دن وڈیرے سلیم نے بھاگ دوڑ کر کے محسن کے دوستوں کو ساتھ لیا اور محسن کو تلاش کیا، نجمہ اس سے لے کر سائیں قادر کے حوالے کی۔ سائیں نجمہ کو لے کر رحمت کے گھر گیا، نجمہ کو باپ کے حوالے کیا اک عجیب منظر تھا جب باپ بیٹی ملے۔ دکھ لہو کی مانند ان کی آنکھوں سے ٹپک رہا تھا آنسوؤں کا سیل رواں جاری تھا۔ ان کے کرناک بین دل کو ریزہ ریزہ کر رہے تھے سائیں بھی اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا سائیں ان کو روٹا ہوتا چھوڑ کر گھر آ گیا۔

دوسرے دن رحمت نے وہ گاؤں ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا اور اپنے دور کے رشتے دار کے پاس کافی دور ایک دوسرے گاؤں میں چلا گیا۔ وڈیرے سلیم کو لڑکی واپس کرنے کا بہت دکھ تھا ایک تو اس کے بیٹے کی من کی مراد پورے ہوتے ہوتے رہ گئی دوسرا برادری میں بھی بڑی جنگ ہنسائی ہوئی تھی لوگوں نے وڈیرے سلیم کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا۔

وڈیرا سلیم سائیں قادر کی وجہ سے علاقے میں بدنام ہوا تھا جس نے لڑکی واپس کروا کر وڈیرے سلیم کی ہتک کروائی تھی۔ اب وڈیرا سلیم کھل کر سائیں کی مخالفت کرنے لگا اس کو زک پہنچانے کے منصوبے بنانے لگا پھر ایک ایسا پلان بنانے میں کامیاب ہو گیا جس سے وہ سائیں سے بدلہ لینے لگا اور سائیں کی عزت کو داغ دار کرنے میں وہ کسی حد تک کامیاب ہو گیا۔

اپنی بیٹی جس کی منگنی اس نے سائیں کے بیٹے جواد سے کی ہوئی تھی اس منگنی کو توڑ دیا اور بیٹی کی منگنی ایک ایسی جگہ کر دی جو لوگ سائیں قادر کے سخت مخالف تھے۔ پچھلے الیکشن میں انہوں نے سائیں کے مخالف امیدوار کو ووٹ دیئے تھے اور سائیں سے ہر قسم کا قطع تعلق کر لیا تھا اگرچہ سائیں کو منگنی ٹوٹنے کا

### آبروئے نسواں

لڑکیوں کی عزت کا بچ کی طرح ہوتی ہے جو ہلکی سی ٹھیس سے چکنا چور ہو جاتا ہے اسی طرح کسی کی انھی ایک غلط نگاہ لڑکی کے کردار کے آئینے میں ایسا بال ثابت ہوتی ہے جو کبھی نہیں نکلتا اس لیے اپنی عزت کی اور اپنے آپ کی حفاظت کیجیے۔

یاد رکھیں غلاف میں مقدس اور قیمتی چیزیں چھپا کر حفاظت سے رکھی جاتی ہیں جیسے کعبہ کی عمارت جیسے قرآن پاک اور جیسے تجوری اور ڈبوں میں رقم اور زیورات ہمیں بھی اللہ نے ایک بے حد قیمتی شے سے نوازا ہے جو آبرو کا موتی ہے اس لیے اسے پردے کے غلاف میں لپیٹ کر رکھیں سرعام کھلا نہ چھوڑیں۔

عورت کے لفظی معنی ہیں ڈھکی ہوئی چیز اس لفظ کی لاج رکھیں اور نسوانیت کے نام کو مجروح نہ کریں۔

سید بشیر احمد ..... لاہور

افسوس تو بہت ہوا تھا اور وہ دوسری جگہ منگنی رکوا بھی سکتا تھا مگر اس نے برداشت سے کام لیا اور وڈیرے سلیم کو اس کے حال پر چھوڑ دیا یوں وڈیرے سلیم کی شادی ہو گئی وڈیرے سلیم نے تو فوراً بیٹی کی شادی کر دی مگر اس کے بدلے میں محسن کی شادی کچھ عرصہ بعد ہونا قرار پائی یوں وڈیرے سلیم نے سائیں سے ہمیشہ کے لیے انتقام لیا اور اس کو نیچا دکھایا۔

وقت کا کام ہے چلتے رہنا یہ رک کر کب مسافروں کا انتظار کرتا ہے بستے دریا کی طرح چلتا رہتا ہے جو ساتھ دے وہ منزل مقصود پر پہنچ جاتا ہے اور جو رک جائے اسے پاؤں تلے روند کر آگے نکل جاتا ہے۔

آخر کار وہ دن آ ہی گیا جو محسن کی شادی کے لیے مقرر کیا گیا تھا بڑی دھوم دھام سے تیاری ہوئی وڈیرے سلیم کے گھر خوشیوں کا اک جہاں آباد تھا ہر



چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ زرق برق لباس میں ملبوس لوگ شادی کی خوشیوں میں مگن تھے ہز بونگ مچی ہوئی تھی کوئی آ رہا ہے کوئی جا رہا ہے محسن کے خوشی سے پاؤں زمین پر ٹک نہیں رہے تھے۔

جس کو لوگ سلام لینا گوارا نہیں کرتے تھے اس کے نام سے نفرت کرتے تھے آج اسی محسن کو ایک انتہائی سکھڑ خوب صورت اور تعلیم یافتہ لڑکی مل رہی تھی۔ جہیز کی شکل میں بہت کچھ مل رہا تھا اس خوشی کے موقع پر اس کے لفتنگے دوست پیش پیش تھے۔ شادی کے تمام انتظامات انہوں نے سنبھال رکھے تھے ہر کام ان کے مشورے سے سرانجام دیا جا رہا تھا پھر شادی پر انہوں نے خرچہ بھی دل کھول کر کیا تھا۔ بارات کو لے جانے کے خصوصی انتظامات کیے گئے تھے ہینڈ باسجے جھومر کا خصوصی انتظام کیا گیا تھا۔ کاروں کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ بارات میں شامل ہر بارانی کا انگ انگ خوشی سے دمک رہا تھا محسن کے دوستوں کی خوشیاں دیدنی تھیں۔ جوانی فائزنگ کر کے پورے آسمان کو براؤ لوڈ کر دیا گیا تھا۔

پورا گاؤں خوشیوں کے سمندر میں ڈوبا ہوا تھا جب بارات روانہ ہوئی تو وہ منظر دیدنی تھا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے بہت بڑے نواب کے شہزادے کی بارات جا رہی ہو گاڑیوں کی ایک طویل لائن تھی صرف کاروں کا انتظام کیا گیا تھا منظر آنکھوں کو چکا چوند کر رہا تھا۔ ہر بارانی اپنے انداز میں خوشی کا اظہار کر رہا تھا۔ محسن کے دوست بے پناہ فائزنگ کر رہے تھے راستے میں انہوں نے شراب کے جام بھی چڑھانا شروع کر دیئے جب بارات دلہن کے گھر پہنچی تو وہاں استقبال بارات اور کھانے کے وسیع انتظامات تھے۔ شامیانوں کا اک شہر آباد تھا بہرے وردی پہنے انتظامات میں مصروف تھے کثیر تعداد میں دیہی پک

کر تیار ہو چکی تھیں مزید کھانا تیار کیا جا رہا تھا۔ بارات جو نہی پہنچی شراب کے نشے میں محسن کے دوستوں نے اپنی رائفلوں کے دہانے کھول دیئے۔ یوں لگتا تھا جیسے دشمنوں کے ساتھ جنگ لڑی جا رہی ہو۔ بے تحاشہ فائزنگ سے آسمان آگ کے الاؤ کی طرح دھکنے لگا یوں لگتا تھا جیسے دشمن نے چڑھائی کر دی ہو اور اس سے بچنے کے لیے اپنے تحفظ میں فائزنگ کر رہے ہوں۔ رہی سہی کسر بارود کے گولے چلانے والوں نے پوری کر دی۔ پھلجڑیوں کی بہار سے رنگوں کی قوس و قزح بن گئی تھی۔ یوں باراتیوں نے گولیوں بارود کو پیروں کی طرح آگ لگا دی تھی جن کے پھٹنے سے کانوں کے پردے پھٹ رہے تھے مگر یوں لوگ خوشی سے چور اس شغل میں مصروف تھے۔

میزبانوں نے منت سماجت کر کے فائزنگ سے روکا کرسیوں پر بٹھایا اور ٹھنڈے مشروبات سے ان کی خاطر مدارت کی۔

نکاح کے بعد دلہا کو دیگر رسموں کی ادائیگی کے لیے گھر کے اندر بلایا گیا اس دوران محسن کے دوست بھی ساتھ ہو لیے۔ میزبانوں نے ان کے جانے پر اعتراض کیا محسن اور دیگر رشتے کو بتایا۔

”ہم تو رشتے دار ہیں مگر یہ نوجوان لڑکے صرف مہمان ہیں اور ہمارے لیے اجنبی ہیں اندر آپ کی اور ہماری خواتین ہیں یہ لوگ شراب میں بہرہست ہیں ہو سکتا ہے ان سے بد تمیزی کریں کہیں کوئی مسئلہ نہ کھڑا ہو جائے ہم کس کس خاتون کو ان سے پردہ کرا میں گے اور پھر اندران کا کام بھی کوئی نہیں یہ تو صرف خواتین کو دیکھنے جا رہے ہیں اس میں ہماری ہی بے عزتی ہے آپ سے گزارش ہے کہ آپ ان کو باہر ہی رہنے دیں۔“ اب اپنے دوستوں کی بے عزتی



آنسو

کتابِ ماضی میں ثبت  
یادیں

بے جان تتلی  
سوکھے گلاب

اور  
چند آنسو

جو لکھے لفظوں میں گھل  
چکے ہیں

مفہوم الفت بدل چکے ہیں

آئے بات اس وقت ہاتھ سے پھسلی جب ایک لڑکے  
نے دلہن کی بہن کو بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا پس  
پھر کیا تھا ایک چنگاری تھی جو بھڑک کر آتش فشاں  
پہاڑ بن گئی تھی۔ بارود کے ڈھیر کو پیٹرول چھڑک کر  
آگ لگا دی گئی تھی۔ لڑکی کے بھائیوں نے آؤ دیکھا  
نہ تاؤ تاؤ توڑ پھڑوں کی بارش کر دی۔ ان کی دیکھا  
دیکھی دیگر کاموں میں مصروف لڑکے بھی سب کچھ  
چھوڑ کر ان پر ڈٹ پڑے اور مار مار کر ان کا بھرکس  
نکال دیا۔ دلہا اور ساتھیوں کی وہ ٹھکانی ہوئی کہ خدا کی  
پناہ..... دلہا کا سہرا بکھر گیا ہاتھ پھٹ گیا دوستوں  
کے سر اور ہاتھ پاؤں زخمی ہو گئے پسلیاں ٹوٹ گئیں  
غرضیکہ سب لوگ زخمی ہو گئے۔ لڑائی شدت اختیار  
کرنی لگی باراتیوں نے جب دیکھا کہ کہہ دلہا اور اس  
کے ساتھیوں کی ٹھکانی ہو رہی ہے وہ شدید زخمی ہیں  
اور لڑائی بڑھتی جا رہی ہے ان کا جدھر منہ آیا اپنی  
جانوں کو بچا کر بھاگ گئے۔

دلہا اور اس کے ساتھیوں کو بڑی مشکل سے  
میزبانوں کے چنگل سے چھڑایا گیا یوں بارانی  
جیسے آئے تھے ویسے ہی خالی ہاتھ زخموں کے ہار

بھلا محسن کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ وہ تو اسی کی شہ پر  
اس کے ساتھ تھے لڑکے جب باتیں سن کر واپس  
جانے لگے تو محسن نے ان کو روکا اور خود بھی اندر جانے  
سے انکار کر دیا اور اپنے دوستوں کے ساتھ واپس پلٹنے  
لگا اور ان کا مان بڑھایا اگر انہوں نے محسن کی شادی پر  
دل کھول کر خرچہ کیا تھا اس کی شادی کو چار چاند لگائے  
تھے تو محسن بھی ان کا بھرپور ساتھ دے رہا تھا ان کی  
بے عزتی کو اپنی بے عزتی محسوس کر رہا تھا اب جب  
محسن نے اندر جانے سے انکار کیا تو میزبانوں کے تو  
ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے مجبوراً ان کو خاموش ہونا پڑا  
پھر محسن اپنے دوستوں کے جھرمٹ میں اندر کی طرف  
روانہ ہوا۔

کھانے کے بعد دودھ پلائی کی رسم شروع ہوئی  
دلہن کی بہنیں اور ان کی سہیلیاں دودھ لائیں تو یوں لگا  
جیسے حسن کا دہانہ کھل گیا ہو چاند ستارے زمین پر  
اتر آئے ہوں۔ نور کی بارش ہو رہی ہو لڑکیاں کیا تھیں  
وہ تو حسن کا شاہکار تھیں جیسے جنت ارضی پر حوریں اتر  
آئی ہوں۔ اتنی حسین دوشیزائیں دیکھ کر محسن کے  
دوستوں کی باچھیں کھل گئیں وہ تو ان کے حسن کی  
محویت میں کھو گئے حسن کا جادو ان کے سر چڑھ کر  
بولنے لگا پھر وہ سب کچھ بھول بھال کر ان کے حسن  
سے فیض یاب ہونے کے لیے ان سے چھینر خانی  
کرنے لگے۔ میزبان مرد حضرات نے ان کو ادھیسی  
حرکتوں سے روکا مگر وہ ہوش میں کب تھے جو رکے یا  
احتیاط کرتے۔ ان کے تو من کی مراد برآئی تھی۔

وہ تو ان حسیناؤں کو اپنے من کے جنگل میں چھپانا  
چاہتے تھے سو وہ حواس باختہ ہو گئے ہاتھ پاؤں اور ان  
کے چہرے کو چھونے لگے ان کے بھائی یہ سب کچھ  
کب تک برداشت کرتے۔ وہ بھی ہتھے سے اکھڑتا  
شروع ہو گئے۔ پہلے تو ان کو سختی سے روکا لیکن وہ باز نہ



لے کر واپس چلے گئے۔ شادی والے گھر میں افسردگی پھیل گئی۔

بارات والا گھر افسردگی کی آماجگاہ بننے پر ہر شخص ہکا بکا رہ گیا تھا۔ کتنے ہی لوگوں کی زندگی کا یہ پہلا واقعہ تھا کہ بارات بے عزت ہو کر مار کھا کر بغیر دلہن کے واپس چلی گئی تھی۔ یوں شام تک پورے علاقے میں خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی ہر سننے والا شخص انگشت بدنداں تھا یہ کیا ہو گیا تھا؟ میزبان کیسے تھے جنہوں نے اپنے داماد کو یوں برادری اور دوست احباب کے سامنے زخمی کر کے رسوا اور ذلیل کر کے بغیر دلہن کے واپس کر دیا تھا۔ لوگوں کو ایک موضوع مل گیا تھا پھر خوب مریج مصائد لگا کر اس واقعہ کو ہر چوک دکان تھڑے اور بینک پر بیان کیا جا رہا تھا۔ دڑیرے سلیم کی وہ بے عزتی ہوئی تھی کہ بیان سے باہر ہے۔ اس کی ذات پر جائز و ناجائز کیچڑ اچھالا جا رہا تھا۔ کچھ لوگ اس کی ہتک اور توہین پر خوش ہو رہے تھے کچھ افسوس کر رہے تھے اور اس کی عزت خاک میں ملنے پر ہمدردی کا اظہار کر رہے تھے۔

بارات واپس کرنے والوں کی بھی خوب جگ ہنسانی ہوئی جتنے منہ اتنی باتیں کچھ لوگ تو دلہن کی عزت پر کیچڑ اچھال رہے تھے کچھ میزبانوں کے کردار کو ہدف تنقید بنا رہے تھے کچھ لوگ تو سائیں قادر کی تیار کردہ سازش قرار دے رہے تھے کہ سائیں قادر نے دلہن والوں کے ساتھ صلح کی اور پھر ان کو دڑیرے سلیم اور اس کے بیٹے محسن کے خلاف بہکایا ان کو ذلیل کر کے بارات واپس کرائی اور یوں اپنی بے عزتی کا بدلہ لے لیا جو بے عزتی دڑیرے سلیم نے اس کے بیٹے سے اپنی بیٹی کی منگنی توڑ کر کی تھی۔

اکثر لوگ لڑکی والوں کو مورد الزام ٹھہرا رہے تھے کہ ان کو برداشت سے کام لینا چاہیے تھا اگر لڑکوں

نے بدتمیزی کی تھی تو تحمل سے کام لینا تھا۔ اس بدتمیزی کا اتنا بھیا تک انتقام کہ بارات ہی واپس کر دی یہ بہت بڑی زیادتی تھی۔ بارات جب خالی ہاتھ واپس لوٹی تو دڑیرے سلیم نے یوں اپنی خاک میں ملی عزت کو سنبھالا دیا کہ اپنے بھائی کی بیٹی سے محسن کا نکاح کر دیا۔ وہ لڑکی تھی جو بہت خوب صورت اور تعلیم یافتہ تھی۔ محسن اور اس کا کوئی جوڑ نہ تھا اور دڑیرے سلیم کو بھائی نے کافی عرصہ قبل اس بیٹی کا رشتہ محسن کے لیے دینے سے انکار کر دیا تھا کہ دونوں کے بیچ زمین آسمان کا فرق تھا مگر جب انا غیرت اور خودداری کا مسئلہ بنا دڑیرے سلیم کو اپنی توہین کا اور کوئی حل نظر نہ آیا تو اس نے اپنی سگی پر بھی لکھی۔ سچی کو انا کی بھینٹ چڑھانے کا فیصلہ کیا اور پھر اس کی مرضی پوچھے بغیر اس کو محسن کے لیے باندھ دیا۔

ایک بہت حوا کو قربانی کی صلیب پر لٹکا کر معاشرے سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لیا مگر اس معاشرے کے ٹھیکیداروں نے اپنی انا کی تسکین کے لیے بشری کے ارمانوں کو جلا کر بھسم کر دیا۔ اس مشرق کی بیٹی نے صرف اپنے چچا کی داغ داریک کو صاف شفاف کرنے کے لیے اپنے آپ کو قربانی کے لیے پیش کر دیا۔

دوسری طرف دلہن والوں کی علاقے کے لوگ خوب درگت بنا رہے تھے ان کو آنے والے دنوں کی ہولناکی سے آگاہ کر رہے تھے۔ ان کے سرانجام دیئے گئے کارنامے کے خوفناک نتائج سے آگاہ کر رہے تھے ان کے بھیا تک چہروں کی رعونت سے ان کا آگاہ کر رہے تھے۔

”دڑیرے سلیم کی سرشت میں معافی نام کا کوئی لفظ نہیں“ آخر وہ سائیں قادر کا رشتہ دار ہے بے شک آپس میں نہ بولیں ہیں تو رشتہ دار۔ یہ صرف



ابھی تو سہاگ کی سیج پر بیٹھی ہی تھی کہ اس کے ارمانوں پر ڈاکہ ڈالا گیا۔ اس کو وہیں بیٹھے چھوڑ کر دوسری دلہن بیاہنے چلے گئے وہ دکھ، غم، غصے اور کرب سے لرز گئی اور تو کچھ نہ کر سکی بارات کی روانگی کے بعد گھر میں پڑی زہریلی اسپرے کی بوتل کو منہ لگایا اور کتنے ہی زہر کے گھونٹ پی گئی۔ زہر گلے سے نیچے اتر رہا تھا کہ اس کی زندگی کی سانسیں ہڑپ کر گیا اور لمحوں میں زندگی سے اس کا رشتہ توڑ دیا۔

ادھر جب بارات دلہن کے گھر پہنچی تو اس کو بھی دوبارہ بارات کے آنے کی خبر مل چکی تھی۔ وہ انسانوں کے ہاتھوں کھلونا بن چکی تھی، کبھی دلہن اور کبھی بیوہ سے بھی بدتر۔ سہاگ رات سے قبل ہی طلاق کا جھومر وہ انسانوں کے اس ظلم کو برداشت نہ کر سکی اور گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کر لی۔

یوں دو دھیاں نمایاں انسانی ہوس کی بھینٹ چڑھ گئیں۔



وڈیرے سلیم کی بے عزتی نہیں سائیں قادر بھی اب سر اٹھا کر فخر سے وڈیرے میں فیصلے نہیں کر سکے گا اور محسن اور اس کے دوست وہ تو کسی صورت تم کو معاف نہیں کریں گے۔ وہ تمہارا کوئی ایسا نقصان کریں گے جسے تم صدیوں تک پورا نہیں کر سکو گے۔

تمہاری بہتری اسی میں ہے جس طرح بھی ممکن ہو وڈیرے سلیم کو راضی کرو آج کی معذرت اور منت سماجت مستقبل کے بہت سے مسائل سے تم کو نجات دے گی۔ اس تکلیف کا صلہ تم کو آنے والے دنوں میں ملے گا ورنہ آنے والے دنوں میں ہو سکتا ہے تم پوری برادری سے نکال دیے جاؤ۔ کوئی تم سے رشتہ ناتہ نہ رکھے تمہارے دکھ درد میں شریک نہ ہو۔ یوں رہی سہی سا کھ بھی ختم ہو جائے گی تنہا برادری سے کٹ کر معاشرے میں کیسے جیو گے۔“

بات بڑی وزنی تھی ان کی سمجھ میں آ گئی برادری کے بزرگوں کو اکٹھا کیا تمام صورت حال ان کے سامنے رکھی وہ بھی صلح کے حق میں تھے ان کے ساتھ گھر کی خواتین، بہو بیٹیوں کو لیا اور وڈیرے سلیم کے گھر پہنچ گئے۔ جاتے ہی وڈیرے سلیم کے قدموں میں بیٹھ گئے مردوں نے اپنی پگڑیاں اور خواتین نے اپنے دوپٹے اس کے پاؤں پر رکھ دیئے سب لوگ منت سماجت کرنے لگے اپنی غلطی تسلیم کی۔ شرمندگی اور ندامت سے نگاہیں جھکائے بیٹھے تھے صرف معافی کے خواستگار تھے پھر سخت گریہ زاری اور منت سماجت سے وہ وڈیرے سلیم کو قائل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

یوں رات کو دوبارہ بارات تیار ہوئی اور دلہن کو لینے اس کے گھر کی طرف روانہ ہوئے اس بات کی خبر جب محسن کے ساتھ نکاح پڑھنے والی لڑکی کو ملی تو وہ اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی پر خاموش نہ رہ سکی۔





SCANNED BY AMIR

READING  
Section



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)



## نظر فریب

### حسام بیت

انسان کی زندگی اور شطرنج کی بساط میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔ عملی زندگی میں ہماری ذرا سی لغزش مستقبل میں کیا رنگ دکھاتی ہے اس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اس طرح شطرنج میں غلط چال پوری بساط کو لپیٹ دیتی ہے۔ ماضی کی ایک لغزش کا قضیہ جو مستقبل کے لیے تباہ کن بن رہی تھی۔

معروف آسٹریلوجسٹ وسیم قریشی کی ڈائری سے۔



READING  
Section

SCANNED BY AMIR



لیب دلچسپی سے وہ زندہ دل اور خوش مزاج محسوس ہوتی تھی۔ اس کی سریلی آواز نے میری سماعت میں رس گھول دیا تھا مجھے یوں لگا تھا جیسے جل ترنگ بج اٹھے ہوں۔

یہ تمام خیالات سیکنڈ کے دسویں حصے میں میرے ذہن سے گزرے اور میں نے اس سے ایک اہم سوال پوچھ لیا۔

”محترمہ آپ کو میرا نمبر کس نے دیا ہے؟“  
میرا کانیکٹ نمبر میرے وزیٹنگ کارڈ پر پرنٹ تھا لہذا اس نمبر کا کسی کو علم ہونا کوئی خاص بات نہیں تھی لیکن میرے لیے الجھن اور حیرت کا باعث یہ تھا کہ میرے وزیٹنگ کارڈ پر میرا سیل نمبر اور آفس کے لینڈ لائن نمبرز پرنٹ تھے جبکہ اس اجنبی خاتون نے میرے گھر کے نمبر پر فون کیا تھا اور وہ بھی آدھی رات کو میرا رہائشی فون نمبر صرف انہی لوگوں کے پاس تھا جن سے میرے بہت قریبی مراسم تھے یا پھر وہ کلائنٹس جن کے معاملات ہنگامی نوعیت کے ہوں۔

”ڈھونڈنے والے تو خدا کو بھی پالیتے ہیں، قریشی صاحب۔“ وہ فلسفیانہ انداز میں بولی۔

”ایک فون نمبر حاصل کرنا کون سی بڑی بات ہے؟“

”پھر بھی۔“ مجھے اس کی باتوں میں دلچسپی محسوس ہونے لگی۔ ”اگر کوئی حرج نہ ہو تو آپ میرے سوال کا جواب دے دیں۔“

”کوئی حرج نہیں ہے۔“ وہ فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔ ”میں آپ کے سوال کا جواب ضرور دوں گی لیکن میری ایک شرط ہے۔“

”کیسی شرط؟“ میں پوچھے بنانہ رہ سکا۔

”اصلی شرط ہے۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”سیانے کہتے ہیں کہ چوٹ پر چوٹ نہیں لگنا

ایک رات میں سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ میرے رہائشی فون کی گھنٹی بج اٹھی میں نے تیسری گھنٹی پر ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا اور ماؤتھ پیس میں دھیرے سے کہا۔

”ہیلو۔“  
کال اینڈ کرنے سے پہلے میں ”سی ایل آئی“ کا ڈائل دیکھ چکا تھا وہاں پر دکھائی دینے والا نمبر میرے لیے ناشناس تھا۔

”ہیلو قریشی صاحب!“ ایک نسوانی آواز میری سماعت سے گزرائی۔ ”کیسے ہیں آپ؟“  
”اللہ کا کرم ہے میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”اللہ آپ کو صحیح اور سلامت ہی رکھے۔“ دوسری جانب بولنے والی خاتون نے خلوص دل سے کہا۔  
”جی شکریہ۔“ میں نے کہا۔

”آپ کی شادی ہو گئی ہے؟“ اس نے پوچھا۔  
وہ عورت ایسی بے تکلفی سے بات کر رہی تھی جیسے برسوں سے مجھے جانتی ہو لیکن سچی بات یہ ہے کہ میں اسے پہچان نہیں پایا تھا لہذا پوچھ لیا۔

”آپ کی تعریف؟“  
”آپ اپنی زبان سے کریں گے تو مجھے خوشی ہوگی۔“ وہ شوخی سے بولی۔

”میرا مطلب تھا آپ کون ہیں؟“ میں نے جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”سوری میں آپ کو پہچان نہیں پایا ہوں۔“

”سچا میں گے کیسے قریشی صاحب۔“ وہ ہلکا سا قبضہ لگاتے ہوئے بولی۔ ”آج پہلی مرتبہ ہمارے درمیان بات ہو رہی ہے اس سے پہلے ہم نے کبھی نہ ایک دوسرے کو دیکھا اور نہ سنا۔“

اس کے قبضے میں ایک خاص قسم کی کھنک تھی اپنے



کا نمبر کسی کو نہیں دینا اور اگر دینا ناگزیر ہو تو پہلے مجھ سے ضرور پوچھنا، انیلا کو میں اچھی طرح جانتا تھا وہ ایسی غلطی کبھی نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے تصدیق کی خاطر پوچھ لیا۔

”کیا انیلا نے آپ کو میرا یہ نمبر دیا ہے؟“  
 ”جی نہیں، وہ کوئی صاحب تھے۔“ اس نے بتایا۔  
 ”بہت ہی شائستہ اور مہذب انداز میں بات کر رہے تھے میں نے آپ کا نمبر حاصل کرنے کے لیے ان شریف النفس صاحب سے ایک جھوٹا بھی بولا۔“  
 ”ایک منٹ۔“ میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ”بے حد معذرت کے ساتھ کہوں گا کہ میرے آفس میں میرے علاوہ صرف میری سیکرٹری انیلا ہی ہوتی ہے پتا نہیں آپ کن صاحب کا ذکر کر رہی ہیں۔“  
 ”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں قریشی صاحب۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ ”اور غلط میں بھی نہیں ہوں۔“

”پھر کنفیوژن کہاں ہے؟“ میں تھوڑا چڑسا گیا۔  
 ”کنفیوژن آفس میں ہے۔“ اس نے بڑی سادگی سے کہا۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ میری الجھن میں اضافہ ہو گیا۔

”آپ اپنا آسٹریولوجی والا آفس سمجھ رہے ہیں اور میں دوسرے آفس کی بات کر رہی ہوں۔“ وہ پہیلیاں بکھوانے والے انداز میں بولی۔ میں نے کہا۔ ”مگر میرا تو ایک ہی آفس ہے۔“

”نہیں، اب آپ کے دو آفس ہیں۔“ وہ اصراری لہجے میں بولی۔

”ایک وہ جہاں آپ اپنے کلائنٹس سے ملاقات کر کے انہیں مفید مشورے دیتے ہیں اور دوسرا آفس وہ جہاں سے آپ کے کارناموں کو شائع کیا جاتا ہے

چاہیے اور سوال پر سوال نہیں کرنا چاہیے لہذا پہلے آپ میرے سوال کا جواب دیں اس کے بعد میں آپ کے سوال کا جواب دوں گی۔“

”آپ کا کون سا سوال؟“ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ”آپ کی شادی ہو گئی ہے؟“

”نہیں۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں ابھی تک اس نعمت سے محروم ہوں۔“

”گڈ۔“ اس کی چمک بھری آواز نے میری سماعت تک رسائی حاصل کی۔ میں نے کہا۔

”اب میرے سوال کا جواب۔“

”میں وعدے کی بہت پابند ہوں اور دوسروں سے بھی ایفاء عہد کی توقع رکھتی ہوں۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ”پتا نہیں، میری یہ عادت ٹھیک ہے یا غلط لیکن بس، میں ایسی ہی ہوں۔“

”آپ بہت اچھی ہیں۔“ میں نے اس کی اس عادت پر بے لاگ تبصرہ کر ڈالا۔

”مجھے یقین تھا کہ آپ ضرور میری تعریف کریں گے۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولی۔ ”لیکن یہ کام آپ نے میری توقع سے بہت پہلے کر ڈالا“ پہلی ملاقات سے بھی پہلے۔“

”اب آپ اپنے کیے ہوئے وعدے کو نبھائیں۔“ میں نے یاد دہانی کے انداز میں کہا۔

”دو روز پہلے میں نے آپ کے آفس فون کیا تھا۔“ اس نے بتایا۔ ”بس وہیں سے مجھے آپ کا نمبر مل گیا۔“

مجھے اس کی بات کا یقین نہیں آیا کیونکہ میں نے اپنی سیکرٹری انیلا کو سختی سے منع کر رکھا تھا کہ میرے گھر



البتہ میرے ایک رشتے دار وہاں کے اسٹاف میں ضرور ہوتے ہیں۔ میں اسلام آباد میں رہتی ہوں اور میرا نام مونا ہے۔“

”مونا یا میمونہ؟“ میں نے اچانک پوچھ لیا۔  
”اصل نام تو میمونہ ہی ہے لیکن عام بول چال میں مونا ہی استعمال ہوتا ہے۔“ اس نے جواب دیا جب مجھے آپ کا سیل نمبر مل گیا تو پھر میں نے اپنے ذرائع استعمال کر کے آپ کے گھر کا نمبر بھی حاصل کر لیا یہ ہے کل کہانی۔“

”کہانی تو کافی دلچسپ ہے۔“ میں نے کہا۔  
”لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ جب آپ کو میرا سیل نمبر مل گیا تھا تو پھر لینڈ لائن نمبر کا کھوج لگانے کی کیا ضرورت تھی۔ آپ موبائل فون پر مجھے کال کر لیتیں۔“

”بجا فرمایا آپ نے۔“ وہ توانا لہجے میں بولی۔  
”لیکن مجھے آپ کے ساتھ اطمینان سے فرصت میں بات کرنا تھی جو گھر کے نمبر پر ہی ہو سکتی تھی۔“

”اوکے۔“ میں نے بات کو مختصر کرتے ہوئے کہا۔ ”تھمر کریں۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“

”مجھے آپ کا اپائنٹمنٹ چاہیے دو روز بعد کا۔“ اس نے کہا۔

”اپائنٹمنٹ لے کر کیا کریں گی۔“ میں نے سرسری لہجے میں کہا۔ ”آپ مظفر آباد میں ہیں اور میں کراچی میں آپ فون پر ہی بات کر لیجیے گا۔“

”دو روز بعد کا اپائنٹمنٹ اسی لیے مانگ رہی ہوں کہ اس سے پہلے میں بھی کراچی پہنچ جاؤں گی۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”مجھے آپ کا ڈبل ٹائم چاہیے کیونکہ مجھے بڑی تفصیل سے اپنا مسئلہ سنس کرنا ہے اس کے لیے میں آپ کو ڈبل فیس

یعنی نئے افق ڈائجسٹ کا آفس۔“

”اوہ.....“ میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔ ”تو آپ نے ڈائجسٹ کے آفس فون کیا تھا؟“

”جی ہاں۔“ اس نے اثبات میں جواب دیا۔  
”میں نے نئے افق ڈائجسٹ میں آپ کی کہانی ”ماتم بہار“ پڑھی تو آپ کے علم سے بہت متاثر ہوئی بس پھر میرے دل میں آپ سے ملنے کی جستجو جاگ اٹھی۔ آپ تک رسائی حاصل کرنے کے لیے مجھے آپ کا کانٹیکٹ نمبر پتا چلے۔ لہذا میں نے ڈائجسٹ کے آفس فون کیا اور جن صاحب نے میری کال اینڈ کی میں نے ان سے جھوٹے بول کر آپ کا نمبر حاصل کر لیا۔“

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ نئے افق ڈائجسٹ سے متعلق کسی بھی شخص کے پاس میرے گھر کا نمبر نہیں تھا مجھے یوں محسوس ہوا جیسے دوسری طرف بولنے والی غلط بیانی سے کام لے رہی ہو، میں نے اپنا شک رفع کرنے کی خاطر سوال کیا۔

”کیا ان صاحب نے آپ کو میرے گھر کا نمبر دیا تھا؟“

”جی نہیں۔“ وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔

”وہاں سے مجھے آپ کا سیل نمبر ملا تھا اور وہ بھی بڑی مشکل سے پہلے دن تو مجھے ٹال دیا گیا اگلے روز میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ میں ”پرائم منسٹر ہاؤس آزاد کشمیر کے اسٹاف میں ہوتی ہوں چنانچہ انہوں نے مجھے آپ کا سیل نمبر دے دیا اور.....“ لہجے بھر کورک کر اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

”یہ میں نے ان صاحب سے غلط بیانی کی تھی مگر پرائم منسٹر ہاؤس آزاد کشمیر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“



بھی دوں گی۔“

”ڈبل فیس کی ضرورت نہیں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں اپنے تمام کلائنٹس کی بات پوری توجہ اور تفصیل ہی سے سنتا ہوں آپ کو اس سلسلے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔“

”بہت خوب مجھے یقین تھا کہ آپ ایسے ہی ہوں گے۔“ وہ پرستائش لہجے میں بولی۔ میں نے استفسار کیا۔ ”متا ہے؟“

”ہم درد، غلط، خیر خواہ اور سچے انسان۔“ اس نے جواب دیا۔ ”تو قریشی صاحب دو دن کے بعد آپ کے آفس میں ملاقات ہوتی ہے، اوکے۔“

”اوکے اینڈ ڈان۔“ میں نے کہا۔

الوداعیہ کلمات کے بعد ہمارے بیچ ٹیلی فونک رابطہ منقطع ہو گیا میں نے ریسیور کو کریدل کیا اور میوہ عرف مونا کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ جتنے بے باک اور بولڈ انداز میں بات کر رہی تھی اس سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی وقت محسوس نہ ہوئی کہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی اور اس کا تعلق کسی نمایاں، کھاتے پیتے گھرانے سے تھا یہ سب اندازے اپنی جگہ لیکن سچی بات پوچھیں تو میں مونا کے حوالے سے کچھ بھی نہیں سمجھ پایا تھا اس اسٹائل کی کسی خاتون سے پہلے کبھی میرا سابقہ نہیں پڑا تھا۔



میسونہ عرف مونا اپنی آواز سے زیادہ دلکشی و دل نشیں تھی دور دراز قبل میں نے فون پر اس کی آواز سنی تھی اور اب وہ بے نفس نفیس میرے سامنے بیٹھی تھی میں نے اس کی عمر کا اندازہ تیس کے اریب قریب لگایا۔ ازاں بعد میرا یہ اندازہ صد فیصد غلط ثابت ہوا وہ تینتالیس ویں سال میں تھی۔

رنگی ملیک سلیک کے بعد وہ اپنی روایتی زندہ دلی کا

مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔

”قریشی صاحب ماشاء اللہ آپ کافی ہینڈسم اور اسمارٹ ہیں پھر ابھی تک شادی کیوں نہیں کی؟“

اگر میری جگہ اور کوئی ہوتا تو مونا کے بے باکانہ انداز سے یہی تاثر لیتا کہ وہ ”لائن“ مار رہی ہے لیکن میرے ذہن میں ایک لمحے کے لیے بھی ایسا خیال نہیں ابھرا تھا اور اس کا سبب یہ تھا کہ میں اس کی کلاس کو سمجھ گیا تھا وہ معاشرے کے بالائی طبقے سے تعلق رکھتی تھی اور اس کو دیکھ کر میرا یہ اندازہ بالکل درست ثابت ہوا تھا باقی چیزیں تو رہیں ایک طرف، میں یہاں پر صرف مونا کے ہینڈ بیگ (پرس) ہی کا ذکر کروں گا۔ وہ بیگ کسی بھی طور دو لاکھ روپے مالیت سے کم کا نہیں تھا۔ اپنی ہاؤ، میں نے اس کے استفسار کے جواب میں کہا۔

”مونا جی اگر شادی کا تعلق شکل و صورت سے ہوتا تو پھر کم صورت اور بد صورت خواتین و حضرات تو اس خسرت نما خواہش یا خواہش نما حسرت کو سینے میں لے کر ہی اس دنیا سے رخصت ہو جاتے۔“

”واو، کیا شاعرانہ جواب ہے۔“ وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولی پھر پوچھا۔ ”تو پھر اب تک شادی نہ کرنے کا سبب؟“

”بس، اس حوالے سے کبھی سوچنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔“ میں نے گول مول سا جواب دیا۔

”اوہاں یاد آیا آپ تو مصنف بھی ہیں۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”جب دودھ کام کریں گے تو پھر اس حوالے سے سوچنے کی فرصت کب ملے گی۔“

”میں مصنف نہیں ہوں۔“ میں نے وضاحت کرنا ضروری سمجھا۔

”تو پھر وہ نئے افق ڈائجسٹ والی کہانی کون لکھتا



نے ابتدائی تعارف میں مجھے بتایا تھا کہ اس کے والد صاحب لگا تار تین مرتبہ ایم این اے منتخب ہو چکے تھے۔ ازیں علاوہ وہ دو سینٹ فیکٹریوں، ایک لوہا فیکٹری اور گروپ آف کمپنیز کے مالک بھی تھے جس میں کنسٹرکشن کا بزنس بھی شامل تھا۔ یہ اپنے علاقے کا نام ور خاندان تھا خاندان کے تمام مردوزن اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اونچے عہدوں پر فائز تھے مردوں میں پچاس فیصد افراد نیوی، ایئر فورس، آرمی میں آفیسرز رینک میں تھے مونا خود انکم ٹیکس آفیسر کی بیوی تھی۔

میں نے نگاہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور کہا ”مونا جی آپ نعمان صاحب کے بارے میں کیا پوچھنا چاہتی ہیں؟“

”یہ..... ہی..... کہ..... ان کی شادی کب ہوگی؟“ وہ اٹک اٹک کر بولی ”اکتالیس سال کے ہو گئے ہیں اور.....!“

”ایک منٹ مونا جی۔“ میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا ”کیا آپ نے نعمان صاحب کی تاریخ پیدائش بالکل درست بتائی ہے؟“

”ہنڈ ریڈ پریسنٹ ایکویورٹ۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ میں نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ ”آپ مذاق تو نہیں کر رہی ہیں؟“

”بالکل نہیں قریشی صاحب۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ ”آپ کو ایسا کیوں لگا؟“

”یا خدا۔“ میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھام لیا۔ ”کیا میری ساری زندگی امتحان دیتے ہی گزر جائے گی۔“

”میں کچھ سمجھتی نہیں قریشی صاحب۔“ وہ جزبہ ہوتے ہوئے بولی۔

”مونا جی!“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”اس نے پوچھا۔“ اس کہانی پر مصنف کا نام بھی شائع ہوتا ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”میں حسام بٹ صاحب کو کیس کے پوائنٹس نوٹ کر دیتا ہوں اس کیس کو کہانی کا رنگ وہ خود دیتے ہیں کرداروں کے نام اور مقامات تبدیل کر دیے جاتے ہیں کہانی کی بنیادی ضرورت اور دیگر تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے تھوڑی بہت رنگ آمیزی بھی کی جاتی ہے لیکن اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ کہیں کی صحت متاثر نہ ہو۔“

”گڈ۔“ اس نے سر اٹھنے والے انداز میں کہا۔ ”میرے خیال میں کہانی والا یہ سلسلہ ابھی حال ہی میں شروع ہوا ہے۔“

”ہاں۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلائی پھر اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا۔ ”مونا جی ابھی تک آپ نے اپنی آمد کا مقصد نہیں بتایا؟“

اس نے اپنے بیش قیمت پرس میں سے ایک پرچہ نکال کر میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے ان صاحب کے بارے کچھ پوچھنا ہے۔“

میں نے مذکورہ پرچہ کھول کر دیکھا اس میں نعمان نامی کسی شخص کی تاریخ پیدائش، وقت پیدائش اور مقام پیدائش لکھا ہوا تھا گویا زائچے کی بنیادی ضروریات مکمل تھیں میں نے اپنے کمپیوٹر پر وہ ڈیٹا فیڈ کر کے بارو اسکوپ (زائچے) کا پرنٹ آؤٹ لے لیا۔ معزز قارئین کی آسانی کے لیے عرض کر دوں کہ بارو اسکوپ یا زائچہ یا جنم کنڈلی یا جنم پتری ایک ہی چیز کے مختلف نام ہیں۔

جس دوران میں، میں نعمان صاحب کا زائچہ بنا رہا تھا مونا گہری دلچسپی سے مجھے تکتی رہی تھی۔ یقیناً یہ شخص مونا ایسی امیر و کبیر عورت کے لیے بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہوگا میں آپ کو یہ بتانا بھول ہی گیا کہ مونا



”آپ نے مجھے جو دیٹ آف برتھ، ٹائم آف برتھ اینڈ پلیس آف برتھ دیا ہے اس کے مطابق بننے والا زائچہ بتاتا ہے کہ حامل زائچہ مکمل مئی تا سات مئی سن دو ہزار دو عیسوی میں اس دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ اٹ از ہار واسکوپ آف ڈیڈ مین۔“

میرے الفاظ نے گویا اس پر صور پھونک دیا وہ سناٹے میں آ گئی تھی اور کسی سنگی بت کی مانند یک ٹک مجھے دیکھنے چلی جا رہی تھی میں منتظر تھا کہ وہ کچھ بولے مگر دوسری جانب موت کا سکوت طاری تھا۔ ”مونا جی.....!“ میں نے اسے پکارا۔ اس کے وجود میں کوئی جنبش نہ ہوئی۔

میں نے تشویش بھرے لہجے میں استفسار کیا۔ ”مونا جی، سب خیریت تو ہے نا، آپ خاموش کیوں ہیں؟“

وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ ان لمحات میں وہ ”زیں جنہد نہ جنہد گل محمد کی عملی تفسیر بنی ہوئی تھی میں نے اپنی سیکرٹری کا نمبر ملایا۔“

”انیلا، دو فریش لائم وہ لیمن۔“ ”او کے سر..... ابھی بھجواتی ہوں۔“ انیلا نے کہا۔ ”ابھی نہیں، پانچ چھ منٹ کے بعد۔“ ”ٹھیک ہے سر۔“

ریسیور رکھنے کے بعد میں نے اپنی میز پر زوردار ہاتھ رسید کیا اور بہ نسبت بلند آواز میں پکارا ”مونا جی۔“

یہ ترکیب کار گرا ثابت ہوئی اور اس کا سکتہ نوٹ گیا۔ وہ ایسی نظر سے مجھے دیکھنے لگی جیسے میں کسی اور سیارے کی مخلوق ہوں یا میں کوئی بہت بڑا جادوگر ہوں جس نے اپنے کسی طلسماتی عمل سے اسے سحر میں جکڑ لیا ہو۔

”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ میں نے ہم

دردی بھرے لہجے میں پوچھا۔ ”جی میں ٹھیک ہوں۔“ وہ سنبھلے ہوئے انداز میں بولی۔

”یہ آپ کو اچانک کیا ہو گیا تھا؟“ ”آپ نے میرے سر پر ایٹم بم پھوڑ ڈالا اور اب پوچھ رہے ہیں کہ مجھے کیا ہو گیا تھا۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”آپ بھی کمال کے آسٹرو لو جسٹ ہیں قریشی صاحب۔“ اسی دوران میں انیلا ایک ٹرے میں دو فریش لیمن اینڈ لائم کے گلاس لٹائی میں نے انیلا کے جانے کے بعد کہا۔ ”یہ لیں اس سے آپ کی طبیعت پوری طرح بحال ہو جائے گی۔“

وہ فریش لائم کی چسکی لینے کے بعد بولی۔ ”قریشی صاحب کیا آسٹرو لو جی اتنا گہرا علم ہے۔“

”ہاں۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلائی لیکن اس کے لیے دو چیزیں نہایت ہی اہم ہیں ایک، درست ڈیٹا، دوم ماہر آسٹرو لو جسٹ۔“ پھر میں نے اس سے پوچھا۔ ”یہ نعمان صاحب ہیں کون اور آپ کو میرا امتحان لینے کی کیا سوجھی؟“

”نعمان میرا چھوٹا بھائی ہے..... مطلب تھا۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ”وہ مجھ سے ایک سال چھوٹا تھا اور اپنی موت سے پہلے عرصہ دس سال سے وہ اسٹینٹس میں مقیم تھا۔ اس نے امریکا ہی میں اپنی تعلیم مکمل کی اور پھر وہیں اسے اچھی جاب بھی مل گئی۔ وہ نیویارک کی جس آرگنائزیشن میں کام کر رہا تھا اس کا آفس ڈبلیو ٹی سی میں تھا آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟“ لمحائی توقف کر کے اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

”جی بالکل سمجھ رہا ہوں۔“ میں نے اثبات میں جواب دیا۔



ہی خطرناک ثابت ہوتا ہے اور اسے ڈیٹھ پلینٹ (DEATH PLANET) بھی کہا جاتا ہے پھر روہین میں جب بھی زحل اس مقام سے گزرتا ہے اس وقت امریکی دشمن سیارے سے اس کا ملاپ ہو جانے تو ان دونوں سیاروں کی باہمی دھینگا مشقی حاصل زائچہ کی موت کا سبب بنتی ہے اور یہ موت یا تو طویل یا اعلان امراض کی وجہ سے ہوتی ہے اور یا پھر اچانک کسی بڑے حادثے کے باعث زائچہ چونکہ نعمان صاحب کی صحت کو سرفٹ ظاہر کر رہا تھا لہذا میں نے یہی اندازہ قائم کیا کہ موصوف کو کوئی خطرناک حادثہ پیش آ گیا ہوگا لیکن اس سے پہلے کہ میں آپ سے مزید کوئی سوال کرتا آپ پر سکتے طاری ہو گیا تھا۔

”جہاں اتنا کچھ بتایا ہے وہاں یہ بھی بتادیں کہ اس کمینے زحل کی اپنے کس دشمن سے مدد بھیڑ ہو گئی تھی؟“ وہ دھپسی لیتے ہوئے بولی۔

”مونا جی کسی بھی انسان کے زائچے کے تین گھر بہت فتنہ پرور اور شر انگیز ہوتے ہیں۔“ میں نے نہایت ہی سادہ الفاظ میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”یعنی چھٹا گھر، آٹھواں گھر اور بارہواں گھر۔ آٹھواں گھر کی زبان میں اسے ”شیطان گھر“ کہا جاتا ہے کیونکہ ان گھروں کی منسوبیات سے انسان کی زندگی میں آنے والی مشکلات، پریشانیوں، تباہ کاریوں اور بربادیوں کو ناپا جاتا ہے جیسے چھٹے گھر سے صحت کے تمام معاملات بارہویں گھر سے خفیہ دشمنوں کے معاملات اور آٹھویں گھر سے زندگی اور موت کے معاملات اب میں نعمان صاحب کے زائچے کی بات کرتا ہوں۔ میں نے سانس ہموار کرنے کے لیے سحابی توقف کیا پھر سسہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”ڈبلیو ٹی سی کا مطلب ہے ورلڈ ٹریڈ سینٹر جسے ”ٹوئن ٹاورز“ بھی کہا جاتا تھا۔“

”جب نائن الیون کا واقعہ ہوا تو اس وقت نعمان اپنے آفس میں موجود تھا۔“ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں بتایا اور خاموش ہو گئی۔

اس کے بعد کچھ بتانے کے لیے بچا ہی نہیں تھا۔ وہ واقعہ اس دنیا میں پیش آنے والے خوفناک واقعات میں سے ایک تھا۔ جس میں پانچ ہزار سے زائد افراد اپنا فانا میں رقمہ اجل بن گئے تھے اور ہزاروں شدید زخمی، ان زخمیوں میں سے اکثریت چند روز یا چند ہفتے ہی جی پائے تھے نعمان بھی انہی افراد میں شامل تھے جسے مجھے میں سے شدید زخمی حالت میں نکالا گیا تھا وہ لگ بھگ آٹھ ماہ تک زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہا تھا اور بالآخر چار مئی دو ہزار دو سو کی دوپہر وہ اس جہان فانی سے کوچ کر گیا تھا۔

”میرا میسٹ تو آپ نے لے لیا اور اللہ کا شکر ہے کہ اس نے میری اور میرے عمر کی عزت بھی رکھ لی۔“ میں نے مونا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اب یہ بھی بتادیں کہ میں مزید آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“

”ضرور بتاؤں گی۔“ وہ نولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

”پہلے آپ بتائیں کہ سٹار بوڈی اتنی گہرائی تک کیسا اثر جاتی ہے۔“

”دوپہری تپیل۔“ میں نے کہا۔ ”نعمان صاحب کے پیدائشی زائچے (NATAL CHART) میں طالع پیدائش یعنی لگان (LAGAN) جوڑا ہے اور اس طالع میں زحل بیٹھا ہوا ہے جو آٹھویں گھر یعنی جدی کا حاکم ہے۔ آٹھویں گھر کا حاکم جب کسی زائچے کے پیدائشی طالع میں آ کر بیٹھ جائے تو یہ بہت



نہیں ہوں۔“ وہ اپنے بیک کے ساتھ مصروف ہوتے ہوئے بولی۔ ”اس عشق کے سائیڈ ایفیکٹس نے مجھے خوفزدہ کر رکھا ہے۔“

”یہ تو انیس اور بیس کا حسین سنگم ہے۔“ میں نے کہا ”انہیں آٹھ دس سال عشق کرنے دیں جب تک ان کی تعلیم بھی مکمل ہو جائے گی اور عشق میں پختگی بھی آجائے گی پھر ان کی شادی کر دیجیے گا البتہ سائیڈ ایفیکٹس والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔“

”ابھی سمجھاتی ہوں۔“ اس نے کہا۔ میں نے انیس سالہ ثوبیہ اور بیس سالہ جبران کے حسین سنگم اور ان کے آٹھ دس سال کے عشق کے حوالے سے اوپر جو بات کی ہے وہ بعض قارئین کو ناگوار بھی گزری ہوگی۔ ایسے قارئین سے میں انتہائی معذرت خواں ہوں، ساتھ ہی یہ وضاحت بھی کہ دوں کہ میرا وہ تبصرہ معاشرے کی جس روشن خیال کلاس کے لیے تھا ان کے ہاں ایسی چھوٹی موٹی باتوں کو معیوب نہیں سمجھا جاتا بلکہ دقیانوسی تصور کیا جاتا ہے۔

”یہ جبران اور ثوبیہ کا بیٹا ہے۔“ وہ ایک تہ شدہ کاغذ میری جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”آپ پہلے ان کے زائچے دیکھ لیں پھر میں اپنی پریشانی کا سبب بتاؤں گی اور.....“ لمحاتی توقف کر کے اس نے سوچتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھا اور ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

”آپ اپنے وقت کی فکر نہیں کیجیے گا قریشی صاحب میں نے آپ کی سیکرٹری سے معلوم کر لیا ہے آپ ایک زائچے کی جو فیس لیتے ہیں میں اسی حساب سے ان تمام زائچوں کی فیس ادا کروں گی جو یہاں بنائے جائیں گے جیسے ایک زائچہ آپ نے نعمان کا بنایا دوزائچے جبران اور ثوبیہ کے بنا رہے ہیں

”جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا ہے نعمان کے زائچے کے پہلے گھر یعنی لگن جوزا میں موت کا سیارہ زحل موجود تھا ”موت کا سیارہ“ اس لیے کہ زحل آٹھویں گھر کا حاکم بھی ہے اب میں نے یکم مئی تا سات مئی دو ہزار دو کا جو وقت بتایا اس دوران میں زحل لگن میں موجود تھا اور اس کا دشمن مرتخ بھی یہاں پر موجود تھا ایسا نہیں ہے کہ یہ دونوں خبیث الابخث اسی ہفتے جوزا میں داخل ہوئے ہوں زحل تو لگن بھگ ایک سال سے یعنی 2001ء سے یہاں موجود تھا اور مریض بھی مہینہ بھر پہلے یہاں آیا تھا۔ ایک ہی گھر میں موجود ہونے کے باوجود بھی ان دونوں کے بیچ اچھا خاص فاصلہ موجود تھا۔ میں نے خصوصی طور پر مئی 2002ء کے جس ہفتے کا ذکر کیا اس دوران میں یہ دونوں شیطان ایک ہی درجے پر دست دگریاں تھے۔“

”اوہ میں سمجھ گئی سب۔“ وہ ایک جھرجھری لیتے ہوئے بولی۔

”جب سمجھ گئی ہیں تو اب آپ اپنی آمد کا اصل مقصد بھی بتا دیں۔؟“ میں نے کہا۔

”میرا ایک ہی بیٹا ہے جبران۔“ اس نے بتایا۔ ”عمر بیس ہے ابھی پچھلے سال اس نے (A-LEVEL) کیا ہے۔ جبران کی وجہ سے سخت پریشان ہوں کیونکہ اس نالائق کو ایک لڑکی سے طوفانی قسم کا عشق ہو گیا ہے لڑکی کا نام ثوبیہ اور عمر انیس سال اور ثوبیہ اکلوتی اولاد ہے۔“

”تو اس میں پریشانی والی کون سی بات ہے۔“ میں نے کہا۔ ”عشق کرنا تو اس دنیا کا عظیم کام ہے۔“

عشق میں بو ہے کبریائی کی  
عشق جس نے کیا خدائی کی  
”میں ان لوگوں کے عشق کی وجہ سے پریشان



اور وہ برج جدی میں ہے۔ مشتری یہاں بہت خراب ہوتا ہے۔ لہذا ثوبیہ کو کبھی بھی جگر کا کوئی خطرناک ایٹھ ہو سکتا ہے۔“

”ٹھیک ہے اب آپ میری پریشانی کا احوال بھی سن لیں۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

”میں آپ کے علم کو چیلنج کرنے کا تو سوچ بھی نہیں سکتی۔ اس سلسلے میں ایک تجربہ ہی کافی ہے۔ آپ نے اپنے علم کی روشنی میں نعمان کا زائچہ دیکھ کر جو انکشاف کیا اس نے مجھے اندر باہر ہلا کر رکھ دیا ہے۔“ وہ رکی ایک طویل بوجھل سانس خارج کی پھر کہا۔

”میں یہ چاہتی ہوں کہ جبران ثوبیہ کو اپنے دل و دماغ سے نکال دے۔“ اس کی آواز میں گہرا کرب چھپا ہوا تھا۔

”میں اس محبت اور شادی کے حق میں نہیں ہوں۔“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”مگر کیوں؟“

”اس لیے کہ ثوبیہ جبران کی بہن ہے۔“ اب مونٹا نے میرے اوپر بم پھوڑا تھا میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا ”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں آپ نے تو بتایا تھا کہ جبران آپ کی اکلوتی اولاد ہے؟“

”میں نے آپ سے کوئی غلط بیانی نہیں کی۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”جبران میری اور اسد کی اکلوتی اولاد ہے جبکہ ثوبیہ اسد اور نورین کی اکلوتی اولاد ہے۔“

”تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ثوبیہ کی والدہ نورین نے اسد سے شادی کی تھی۔“ میں نے کہا۔ ”اگر ایسا ہے تو یہ بات ثوبیہ اور جبران کے علم میں ہونا چاہیے اور انہیں اس قسم کے عشقیہ چکروں سے پرہیز کرنا چاہیے۔“

یہ ہو گئے تین، ان کے علاوہ دو یا تین زائچے میں مزید ڈسٹکس کروں گی کل پانچ زائچے ہوں یا چھ میں سب کی فیس ادا کروں گی۔“

میں نے مونٹا سے تو کچھ نہیں کہا اور اپنے کمپیوٹر کے ساتھ مصروف ہو گیا تاہم دل میں یہ خود کلامی ضرور کی۔

”مونٹا جی اللہ میرے تمام کلائنٹس کو آپ جیسا اصول پسند بنادے۔“

جب زائچے تیار ہو گئے تو میں نے مونٹا سے کہا۔ ”بہت عمدہ میچ ہے۔“

”میں سمجھی نہیں۔“ وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

”جبران کا سن سائن کینسر اور مون سائن ٹاورس جبکہ ثوبیہ کا سن سائن ٹاورس اور مون سائن کینسر ہے۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔

”اگر دو افراد کا سن اور مون ایک دوسرے کے اوپر پڑے تو ان دونوں کے بیچ غضب کی باہمی کشش پائی جاتی ہے ان کی دوستی اور محبت مثالی ثابت ہوتی ہے پھر ٹاور (ثور) اور کینسر (سرطان) کے حاکم سیاروں قمر (مون) اور زہرا (ونس) کی بھی آپس میں گہری دوستی ہے۔ ازیں علاوہ۔۔۔!“ میں نے ایک لمحے کے لیے توقف کر کے گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”جبران کا زہرہ (VENUS) ثوبیہ کے قمر (MOON) پر برج سرطان میں ہے زہرہ اور قمر کی باہمی کشش کے بارے میں میں آپ کو بتا چکا ہوں انہی نظرات (ASPECTS) کی بنا پر میں نے ثوبیہ اور جبران کے میچ کا ایڈیل قرار دیا تھا البتہ۔“

”البتہ کیا قریشی صاحب؟“ میں نے جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ جلدی سے مستفسر ہوئی۔

”ثوبیہ کا مشتری (CAPRICORN) چھنے گھر



”ان دونوں بچوں کو کچھ پتا نہیں ہے قریشی صاحب۔“ وہ شکستہ دلی سے بولی ”حتیٰ کہ یہ راز اسد کو بھی معلوم نہیں اسد یہی سمجھتا ہے کہ ثوبیہ نورین اور خالد کی اولاد ہے اسی لیے ان سے ان کی محبت سے کوئی پریشانی نہیں ہے۔ سارا عذاب واقف حال کے لیے ہوتا ہے میں چونکہ اس راز کو جانتی ہوں اسی لیے اذیت میں مبتلا ہوں اور چاہتی ہوں کہ آپ میری اس پریشانی کا کوئی حل نکالیں۔“

”آپ کی باتوں کا لب لباب تو یہ ہے کہ ثوبیہ اسد اور نورین کی ناجائز اولاد ہے۔“ میں نے دو ٹوک الفاظ میں کہہ دیا۔

”جی ایسا ہی ہے۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

”کالد بھی اسد ہی کے رینک کا آفیسر ہے اسد کا اکثر اس کے گھر میں آنا جانا تھا اور اسد یہ بات تسلیم بھی کرتا ہے کہ نورین کے ساتھ اس کا بہت کلوز معاملہ رہا ہے۔“

”اگر وہ یہ تسلیم کرتا ہے تو پھر وہ اس بات پر بضد کیوں ہے کہ ثوبیہ خالد کی اولاد ہے؟“ میں نے ایک اہم سوال کیا۔

”وہ اس لیے کہ اسد، خالد کے ایک راز سے واقف نہیں ہے۔“ وہ اسرار بھرے لہجے میں بولی۔

”راز۔“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”کیسا راز؟“

”یہ میں آپ کو بعد میں بتاؤں گی پہلے آپ مزید تین زاپچے بنا میں۔“ وہ ایک مرتبہ پھر اپنے قیمتی بیگ کے ساتھ مصروف ہوتے ہوئے بولی۔ ”اگر آپ کے علم نے اس راز کو فاش نہ کیا تو پھر میں کھل کر آپ کو بتاؤں گی۔“

میں نے اپنی سیکرٹری کے سیل فون پر میسج کیا اور

پوچھا کہ وزیٹنگ روم کا کیا حال ہے اس کارپلائی آیا کہ کوئی بھی کلائنٹ وزیٹنگ پر نہیں ہے میں نے کہا مجھے میڈم مونا کے ساتھ ابھی مزید ٹائم لگے گا اگر کوئی کلائنٹ آجائے اور کوئی ایمر جنسی کا معاملہ نہ ہو تو آپ کل کا ٹائم دے دیں اس کارپلائی آیا اوکے سر۔ یہ مختصر ٹیکسٹ چیٹنگ میں نے اس لیے کی تھی کہ مونا کو کچھ فیل نہ ہو پھر میں نے انٹرکام پر ایلا سے کہا۔

”عمدہ قسم کے سینڈویچز اور چائے آرڈر کر دیں۔“

”میرے لیے کافی قریشی صاحب۔“ مونا نے کہا۔

”اوکے۔“ میں نے کہا پھر ایلا کو نوٹ کر دیا۔

”میرے لیے چائے اور میڈم مونا کے لیے کافی۔“

مونا نے ایک کانڈ میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”قریشی صاحب یہ نورین خالد اور اسد کا ڈیٹا ہے آپ ان کے زاپچوں پر ایک ماہرانہ نگاہ ڈالیں پھر بات کرتے ہیں۔“

دس منٹ میں، میں نے وہ تینوں زاپچے تیار کر لیے پھر جب میں نے ان پر سرسری نگاہ ڈالی تو ایک سفاک حقیقت کھل کر میرے سامنے آ گئی میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور الجھن زدہ نظر سے مونا کی طرف دیکھا۔

”جی قریشی صاحب۔“ وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

”کیا ریڈ کیا آپ نے؟“ ”ریڈ تو بہت کچھ کیا ہے۔“ میں نے کہا ”شروع کہاں کروں؟“

”جہاں سے دل چاہے، شروع ہو جائیں۔“ وہ فراخ دلی سے بولی۔

اور میں شروع ہو گیا۔ ”نورین کے زاپچے میں آٹھویں گھر کا حاکم پانچ ویں گھر میں بیٹھا ہے پانچ واں گھر اولاد سے منسوب ہے لہذا آٹھویں گھر کا حاکم



صاف گوئی مگر محتاط الفاظ کے استعمال کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

”بس یہی وہ راز ہے جو میں آپ کو بتانا چاہ رہی تھی۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”مجھے بہت پہلے خالد کی اس خامی کا علم ہو گیا تھا۔“

”مگر آپ کو کیسے پتا چلا تھا؟“ میں پوچھنے بنا نہ رہ سکا۔

”خالد اور نورین کی شادی کے دو سال بعد تک جب ان کے ہاں اولاد نہیں ہوئی تو حسب روایت علاج معالجے کا سلسلہ شروع ہوا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”میری ایک دوست اسلام آباد کے ایک بہت مہنگے پرائیویٹ اسپتال کی لیبارٹری انچارج ہیں ایک روز میں اپنی دوست کے پاس بیٹھی ہوئی تھی تو اس نے مجھ سے کہا۔“

”مونا تمہارے ہنزینڈ کا دوست بڑا عجیب و غریب انسان ہے۔“

”میرے ہنزینڈ کے تو درجنوں نہیں، سیکڑوں دوست ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”تم کس دوست کی بات کر رہی ہو؟“

”ارے یار وہ نورین کا ہنزینڈ نہیں ہے۔“

”کون..... خالد۔“

”ہاں، ہاں وہی۔“ وہ جلدی سے بولی۔

”کیا کر دیا خالد نے؟“ میں نے پوچھا۔

”نورین کا کسی گائنی کے پاس علاج چل رہا ہے۔“ اس نے بتایا۔

”ظاہر ہے جب کوئی گائنی اولاد کے حوالے سے علاج شروع کرتی ہے تو شوہر کا ٹیسٹ بھی کراتی ہے تاکہ اس کی اہلیت / نا اہلیت کو بھی چیک کیا جاسکے خالد نے اپنا ٹیسٹ ہماری لیبارٹری سے کرایا اور اس کی رپورٹ مل یعنی زیر ہے۔ اس کے صاحب اولاد

یہاں پر بے اولادی یا بچوں کی موت یا بارش یا مس کیرج کو ظاہر کرتا ہے لیکن اس زائچے میں یہ خرابی اتنی خطرناک نہیں ہے کیونکہ نورین کا قمر (MOON) گیارہویں گھر میں ہے جو کہ امیدوں اور خواہشات کا گھر ہے اور قمر خاص طور پر اولاد کے معاملات کو بھی کنٹرول کرتا ہے۔ لہذا میں کہہ سکتا ہوں کہ مشکل اور پریشانی تو پیش آ سکتی ہے مگر نورین ایک نہ ایک دن صاحب اولاد ضرور ہوں گی۔“

”اور خالد کا زائچہ کیا کہتا ہے؟“ مونا نے اضطرابی لہجے میں سوال کیا۔

”آٹھویں گھر کا حاکم سات ویں گھر میں بیٹھا ہے اور وہ بھی راہو کے ساتھ۔“ میں نے بتایا۔

”نتیجہ..... بد قسمت شادی، ناخوش گوار ازدواجی تعلقات، شریک حیات کی موت یا علیحدگی آٹھویں گھر پر مرخ، زحل اور مشتری قابض، وہ بھی اس طرح کہ زحل اور مشتری حالت قران (CONJUNCTION) میں، مرخ آٹھویں گھر میں اختلافات، جھگڑے رنجشیں لاتا ہے بار بار حادثات اور قانونی معاملات میں الجھتا ہے بے پروا، بے فکر اور فضول خرچ بناتا ہے اور اس کے ساتھ ہی شہوانی بیماریاں اور پوشیدہ اعضا کی خرابیاں بھی دیتا ہے اور.....!“ میں نے لمحائی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”اور..... اگر کسی شخص کے زائچے کے آٹھویں گھر میں زحل اور مشتری حالت قران میں پائے جائیں تو لازمی نامردی (IMPOTANCY) لاتے ہیں۔“

”اب آپ کیا فرماتے ہیں بیچ اس مسئلے کے؟“ مونا نے مجھ سے پوچھا۔

”یہی کہ نورین کی قسمت میں اولاد تو ہے مگر اس شوہر سے نہیں بلکہ کسی اور شوہر سے۔“ میں نے



”کیا ہوا قریشی صاحب؟“ وہ تشویش بھرے لہجے میں بولی۔

”مونا جی ثوبیہ کی تاریخ پیدائش 1996ء کی ہے۔“ میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا ”آپ کو کب پتا چلا کہ اسد اور نورین کے بیچ کوئی سنجیدہ تعلق رہا ہے؟“

”چند سال پہلے یہ راز میرے علم میں آیا تھا۔“ اس نے جواب دیا ”میں نے جب اس موضوع پر اسد سے بات کی تو وہ پہلے تو آمیزش میں، ہائیں شائیں کرتا رہا پھر میں نے اس سے قبول کرا ہی لیا ہمارے بیچ تھوڑی سی بد مزگی ہوئی اور پھر اسد نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ نورین سے ہر تعلق ختم کر لے گا اور پتا ہے اس نے یہ وعدہ کہاں پر کیا تھا؟“ میں نے کہا۔ ”نہیں میں نہیں جانتا۔“

”دو سال پہلے ہم لوگ یورپ کے ٹور پر تھے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔

”ہمارا قیام نیدر لینڈ کے ایک مضافاتی قصبے لم برگ (LIMBURG) میں تھا۔ تاہم جرمنی، ہالینڈ اور فرانس اکثر آتے جاتے رہتے تھے۔ انہی دنوں سپرمون کی رات ہم پیرس میں تھے۔ سپرمون (SUPER MOON) کو آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں کیونکہ یہ آسٹرو لوجیکل معاملہ ہے خیر، تو میں آپ کو بتا رہی تھی کہ اس سپرمون کا نظارہ ہم نے ہفل ٹاور کے اوپر کھڑے ہو کر کیا تھا پیرس ہی میں ایک بہت بڑا تالاب ہے جس کے اندر آپ کو لا تعداد تالے پڑے نظر آئیں گے یہ محبت کرنے والوں کا ”کارنامہ“ ہے۔ روایت کے مطابق، محبت کرنے والے جوڑے مختلف عہد و پیاں کو تالوں میں بند کر کے پانی سے بھرے ہوئے حوض میں ڈال دیتے ہیں اس روز اسد نے ”تالا بند عہد“ بھی کیا تھا

ہونے کے امکانات صفر کے برابر ہیں اپنی رپورٹ پڑھنے کے بعد وہ مجھ سے ملا اور مجھ سے درخواست کی کہ اگر میں اس کی رپورٹ کو پازیٹو کر دوں تو وہ مجھے پچاس ہزار تک دینے کو تیار ہے۔ میں نے صاف انکار کر دیا۔ وہ پاؤں بیچ کر چلا گیا اور جاتے ہوئے خاصے دھمکی آمیز الفاظ میں کہہ گیا ”آپ نے میرا کام نہیں کیا ٹھیک ہے لہذا برائے مہربانی اس سلسلے میں اپنی زبان بند رکھیے گا۔ مجھے پتا ہے جس کام کے وہ مجھے پچاس ہزار دے رہا تھا وہی کام کسی ضمیر فروش لیبارٹری والے نے پانچ دس ہزار میں کر دیا ہوگا مجھے چونکہ اس سے اور اس کے معاملے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لہذا میں نے ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دی اور کسی سے ذکر نہیں کیا۔“

میں اپنی دوست کے پاس سے اٹھ کر گھر آ گئی۔ ذہن میں کئی بار یہ خیال آیا کہ اسد سے ذکر کروں لیکن پھر یہ سوچ کر خاموش ہو گئی کہ اللہ پردے کو پسند فرماتا ہے مجھے خالد کے کسی انتہائی نازک معاملے کی تشہیر نہیں کرنا چاہیے لیکن جب یہ آگ میرے گھر کو لپٹنے کے درپے ہے تو میں خاموش نہیں بیٹھ سکتی اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل تو نکالنا ہے نا آخر۔“

”صرف اسی مسئلے کا نہیں بلکہ دنیا کے ہر مسئلہ کا حل نکالنا چاہیے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”اور آپ کا مسئلہ تو بالکل آسان ہے۔“

”آسان ہے کیا مطلب؟“ وہ سینڈوچ کی بائٹ لیتے ہوئے بولی۔

”آپ نے اب تک خالد کے راز کو سینے میں دبائے رکھا۔“ میں نے کہا۔ ”اب وقت آ گیا ہے کہ اپنے شوہر سے ڈسکس کریں اور اسد کو بتائیں کہ خالد کے ساتھ کون سا میڈیکل ایشو ہے اور اسے یہ بھی بتائیں کہ ثوبیہ.....!“ میں بولتے بولتے اچانک رکا۔



ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”یہ تو ایک الو ہی جذبہ ہے یہ جسم کا نہیں، روح کا رشتہ ہے اور روحانی معاملات میں یہ سب کچھ ممکن ہے لیکن نورین کا کیس مختلف ہے اور اگر آپ کو میری بات کا یقین نہیں آ رہا تو آپ نورین، اسد اور ثوبیہ کے زاپچوں کو میچ کر کے دیکھ لیں کہ یہ ایک ہی فیملی ہے یا نہیں۔“

”اگرچہ میں ان تینوں زاپچوں کی اسٹڈی سے کسی منطقی اور حتمی نتیجے پر پہنچ سکتا ہوں۔“ میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔

”لیکن میں ایسے کام نہیں کرتا۔“

”کیوں قریشی صاحب؟“ وہ چونکے ہوئے لہجے میں بولی۔

”اس لیے کہ میرے اللہ کو پردہ بہت پسند ہے ثوبیہ خالد کی بیٹی ہے یا اسد کی باپھر کسی اور کی یہ صرف ہمارے بیچ ڈسکس ہو رہا ہے لیکن میرے پروردگار نے پچھلے انیس سال سے اس راز پر پردہ ڈال رکھا ہے اور دنیا والے یہی سمجھتے ہیں کہ ثوبیہ خالد کی بیٹی ہے اسی حقیقت کو اسٹیمبلش رہنا چاہیے بیٹیاں اللہ کی رحمت ہوتی ہیں اور اس ”رحمت“ کو آسٹروولوجی کی آپریشن ٹیبل پر لا کر اپنی زندگی کو ”رحمت“ کا تحفہ نہیں دینا چاہیے پتا نہیں اس مالک کائنات نے ہمارے کن کن عیوب پر پردہ ڈال رکھا ہے۔“

”میں آپ کی بات سے اتفاق کرتی ہوں قریشی صاحب۔“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی ”لیکن میں آنکھوں دیکھی کبھی کو نگل نہیں سکتی۔“

”تو آپ اسد سے کہیں کہ وہ نورین سے بات کرے۔“ میں نے مشورہ دیا۔ ”نورین کو اعتماد میں لے کر یہ سارا معاملہ سلجھایا جاسکتا ہے۔“

”نورین سے بات نہیں ہو سکتی، ناممکن۔“ وہ حتمی لہجے میں بولی۔

اور پھر اب تک وہ اپنے عہد پر قائم ہے۔“

میں نے پوری توجہ سے اس کی بات سنی اور آخر میں کہا۔

”جب آپ کے علم میں یہ بات آئی کہ اسد اور نورین کے بیچ کچھ خطرناک چل رہا ہے اس وقت ثوبیہ کی عمر کتنی تھی؟“

”تیرہ یا چودہ سال۔“ اس نے جواب دیا۔

”پھر آپ اتنے وثوق سے ثوبیہ کو اسد کی بیٹی کیسے کہہ سکتی ہیں؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”یہ ٹھیک ہے کہ ثوبیہ خالد کی بلڈ لائن نہیں لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ انہی دنوں نورین کا کسی اور مرد سے بھی ”ایچٹ“ رہا ہو؟“

”آپ کا سوال اپنی جگہ پر بہت اہم ہے قریشی صاحب لیکن ثوبیہ میں اسد کی شباهت پائی جاتی ہے۔“ اس نے اپنے جواب سے مجھے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

”میں شباهت والے معاملے پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔“ میں نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ ”عورت جس مرد سے سچی محبت کرتی ہے اس شخص کی صورت ہر وقت اس کے تصور میں موجود رہتی ہے اور اگر یہ تصور بہت زیادہ گہرا ہو تو نو ماہ تک اس کے پیٹ میں پلنے والا بچہ بھی وہی خال و خط اختیار کر لیتا ہے جو تصور والے شخص کے ہوتے ہیں اس کی سب سے بڑی مثال امرتا پریم اور ساحر لدھیانوی کی ہے یہ دونوں ایک دوسرے سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے لیکن ساحر کی بزدلی شادی کے راستے کی رکاوٹ بن گئی تاہم دیکھنے والے بتاتے ہیں کہ امرتا پریم کا بیٹا ساحر کی ڈٹوکا بیٹی تھا۔“

”محبت کا معاملہ الگ ہے قریشی صاحب۔“ وہ



کی آزادی دے رکھی ہے وہ ثوبیہ کے ذریعے جبران کو  
شکار کر کے اسد سے اور نورین سے انتقام لینا چاہتا  
ہے اب آپ میری بات کو اچھی طرح سمجھ گئے ہوں  
گے۔“

”بالکل سمجھ گیا ہوں۔“ میں نے اثبات میں  
گردن ہلائی۔ ”ثوبیہ اس کی نظر میں بیٹی نہیں بلکہ ایک  
کھلونا ہے ریس کا ایک گھوڑا ہے شطرنج کا ایک مہرہ  
ہے لہذا وہ بڑے صبر و سکون کے ساتھ یہ بازی کھیل کر  
آپ لوگوں کی فیملی کو تباہ کرنا چاہتا ہے۔“

”اب آپ بتائیں ان حالات میں، میں کیا  
کروں؟“ وہ روہاسی ہو گئی

میں نے کہا۔ ”صرف ایک کام۔“  
”کون سا ایک کام؟“ اس نے پوچھا۔

”آپ بھول جائیں کہ نورین نام کی کوئی عورت  
اس دنیا میں موجود ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے  
لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ”اس بات کو بھی فراموش  
کر دیں کہ اسد کو اس معاملے سے کوئی خاص دلچسپی  
نہیں ہے اس زیر کو بھی اپنے ذہن میں جگہ نہ دیں کہ  
خالد ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت آپ لوگوں کی  
فیملی کو تباہ و برباد کرنا چاہتا ہے بس، آپ کا فوکس  
جبران پر ہونا چاہیے۔“

”قریشی صاحب میرا فوکس جبران پر ہی ہے۔“  
وہ اصراری لہجے میں بولی۔ ”لیکن میری سمجھ میں کچھ  
نہیں آرہا جیسی تو آپ کے پاس آئی ہوں بتائیں  
میں کیا کروں۔“

”آپ کو کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں۔“ میں  
نے کہا۔ ”اور نہ ہی اس سلسلے میں کسی عامل کامل کے  
پاس جانے کی ضرورت ہے۔“ پھر میں نے پوچھ لیا  
”آپ نے ابھی تک ایسی کوئی لڑائی کی تو نہیں؟“  
”نہیں قریشی صاحب مجھے ان لوگوں سے گھن

میں نے پوچھا ”وجہ۔“  
”لاسٹ ڈسمبر میں اسے فالج کا ایک آیا تھا۔“  
اس نے بتایا۔ ”وہ پچھلے پانچ ماہ سے بیڈ پر ہے ایک  
زندہ لاش کی مانند نہ مل سکتی ہے نہ جل سکتی ہے، نہ سن  
سکتی ہے نہ بول سکتی ہے بے تاثر آنکھوں کے ساتھ  
دیکھتی رہتی ہے۔“

”اوہ۔“ میں نے ایک گہری سانس خارج کی ”یہ  
تو واقعی خاصی ٹہیجھ صورت حال ہے۔“

”کوئی ایسی ویسی۔“ وہ عجیب سے لہجے میں  
بولی۔ ”خالد سے بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا یہ  
حقیقت اس سے زیادہ اور کوئی نہیں جانتا کہ وہ باپ  
بننے کے قابل نہیں اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس  
معاشرے کے سامنے وہ پچھلے انیس سال سے ایک  
بیٹی کا باپ ہے ظاہر ہے وہ نورین کی بے وفائی سے  
بخوبی آگاہ ہے اور وہ یہ بھی بہت اچھی طرح جانتا ہے  
کہ نورین سے زیادہ کلوز کون رہا ہے لہذا اسے بھی اس  
بات میں کس شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ ثوبیہ اس کی  
بیٹی ہے۔“

”تو پھر خالد اس مسئلے کو بآسانی ہینڈل کر سکتا  
ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اسے چاہیے کہ وہ ثوبیہ کو کنٹرول  
کرے۔“

”وہی تو ثوبیہ کو کنٹرول کر رہا ہے۔“ مونانے زہر  
خند لہجے میں کہا۔

”کیا مطلب؟“ میں نے پوچھا۔  
”آپ نے خالد کا زانچہ بنایا ہے۔“ وہ گہری  
سنجیدگی سے بولی۔

”آپ کو اچھی طرح اندازہ ہوگا کہ وہ کتنا کینہ  
پرور، پھٹے باز اور گھٹیا خیالات کا مالک ہے۔ اس  
وقت ثوبیہ کا ذہن پوری طرح خالد کی مٹھی میں ہے۔  
وہ ثوبیہ کا بیسٹ پاپا ہے کیونکہ اس نے ثوبیہ کو ہر قسم



فیس کا مطالبہ بھی کریں گے تو میں بصد احترام دوں گی۔“ وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔ ”کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا کہ تمام تر اختیارات اور مال و دولت ہونے کے باوجود بھی میں اس وقت کس قدر مجبور ہوں۔“

”اور کوئی اندازہ لگا سکے یا نہ لگا سکے مگر مجھے آپ کی حالت کا بخوبی اندازہ ہے۔“ میں نے ہم دردی بھرے دوستانہ لہجے میں کہا۔ ”اور میں کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کو گناہ کبیرہ سمجھتا ہوں۔ آپ اپنے خدا پر کامل یقین رکھیں اور مجھے عمل کرنے دیں۔ ان شاء اللہ چالیس دن کے اندر نتائج برآمد ہوں گے، مثبت نتائج۔“

”اللہ آپ کی زبان مبارک کرے قریشی صاحب۔“ وہ فرط جذبات سے کپکپاتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گی۔“

”مونا جی میں آپ پر کوئی احسان نہیں کر رہا۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اللہ نے ہر انسان کو کسی دوسرے انسان کے کام آنے کے لیے پیدا کیا ہے اگر انسان اپنی اس ذمہ داری کا خود ہی احساس کر لے تو اس کی زندگی آسان اور پرسکون ہو جاتی لیکن اگر انسان غفلت میں پڑ کر صرف اپنی ذات کا ہو کر رہ جائے اور اسے مخلوق خداوندی کا کوئی احساس نہ ہو تو پھر وہ قدرت کی پکڑ میں ایسا آتا ہے کہ اگلی پچھلی ساری کسر نکل جاتی ہی کیونکہ جو بھی ضرورت مند شخص چل کر آپ کے پاس آتا ہے وہ اللہ کا بھیجا ہوا ہوتا ہے جس کا مطلب یہ کہ اللہ آپ سے خوش ہے وہ آپ کے فیض کو عام کرنا چاہتا ہے، آپ کے ہاتھ سے دوسروں کا بھلا چاہتا ہے۔ اگر آپ اللہ کے بھیجے ہوئے بندے کو نظر انداز کریں گے یا مایوس کریں گے یا دھتکاریں گے تو پھر آپ کس طرح اس ذات پاک سے کسی لطف و کرم کی

آتی ہے۔“ وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولی۔ ”اگر مجھے ان کے پاس جانا ہوتا تو پھر آپ کے پاس نہ آتی۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

”آپ میرے پاس آ چکیں، مجھ سے مل چکیں اور اپنی پریشانی تفصیل سے مجھے بتا چکیں میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ”اب آپ چپ چاپ واپس اسلام آباد چلی جائیں۔“

”کیا مطلب؟“ وہ بے ساختہ بول اٹھی۔ ”مطلب یہ کہ آپ اپنا کام کر چکیں اب یہاں سے میرا کام شروع ہوتا ہے۔“ میں نے بدستور اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”آپ گھر جائیں اور پھر جبران کی تین چیزیں کسی کوریئر سروس سے مجھے بھیج دیں۔“

”کون سی تین چیزیں قریشی صاحب؟“ اس نے پوچھا۔

”نمبر ایک، ہاتھ یا پاؤں کے ترشے ہوئے چند ناخن، نمبر دوسرے چند بال، نمبر تین اس کے بدن کا پہنا ہوا کوئی کپڑا۔“ میں نے کہا ”کوئی رومال، کوئی جراب، کوئی بنیان یا کوئی بھی شرٹ کیا آپ یہ کر لیں گی۔“

”جی بالکل کر لوں گی یہ کون سا مشکل کام ہے۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولی۔

”لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ آپ ان چیزوں کا کیا کریں گے؟“

”میں کوئی بولتا جادو فلاں ڈھمکان بابا“ تو نہیں ہوں لیکن چند آزمودہ ٹوٹکے مجھے ضرور آتے ہیں۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”آپ فکر نہ کریں میں جو بھی عمل کروں گا اس کی کوئی فیس نہیں ہوگی۔“

”اگر آپ اس کام کے لیے بھاری سے بھاری



امید کر سکتے ہیں؟“ اور اس دوران میں آپ نے کوئی بھی اسپئیر

پارٹ نہیں کھانا۔“

”اسپئیر پارٹ..... مطلب؟“ اس نے پوچھا۔

”مطلب یہ کہ کھجی، پائے، سری، مغز، پوٹا (سنگ دانہ) گردے..... وغیرہ۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”جی سمجھ گئی۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

اس کے بعد اس نے مگر مجھ کی کھال سے تیار کردہ اپنا بیش قیمت پرس اٹھایا اور ممنونیت بھرے انداز میں مجھے ”خدا حافظ“ کہہ کر رخصت ہو گئی۔



تین روز بعد جب میں آفس پہنچا تو میری ٹیبل پر ایک معروف کوریئر کمپنی کا پیکٹ پڑا ہوا تھا میں نے اس پیکٹ کو الٹا کر دیکھا تو وہاں بھیجنے والے کا نام میمونہ نکھا نظر آیا میں سمجھ گیا کہ اس پیکٹ میں کیا ہو سکتا ہے۔

میں نے مذکورہ پیکٹ کو کھولا تو اس کے اندر سے پیک کی ہوئی ایک استعمال شدہ مردنہ شرٹ برآمد ہوئی اس کے ساتھ ہی سیلوفین کی دو چھوٹی تھیلیاں بھی رکھی تھیں جن میں سے ایک میں ترشے ہوئے چند انسانی ناخن اور دوسری میں چند بال تھے میں نے ناخن اور بالوں والی دونوں تھیلیوں کو اٹھا کر ڈسٹ بن میں ڈال دیا اور شرٹ کو اپنے بریف کیس کے ساتھ رکھ لیا۔

”میں روزانہ جب آفس آتا اور جاتا تھا تو اللہ والی چورنگی سے میرا گزر ہوتا تھا وہاں چورنگی پر میں نے ایک ملنگ کو کھڑے دیکھا تھا جس نے شلوار کے اوپر ایک شرٹ پہنی ہوئی تھی اس کی شرٹ پر میل کی اتنی تھیں جمی ہوئی تھیں کہ یہ اندازہ لگانا دشوار تھا کہ وہ

”میں آپ کی باتوں سے مکمل اتفاق کرتی ہوں

قریشی صاحب۔“ وہ عقیدت بھرے انداز میں بولی۔

”اتفاق کرنے کے ساتھ ساتھ آپ کو ایک کام اور بھی کرنا ہے۔“ میں نے کاغذ قلم سنبھالتے ہوئے کہا ”ایک لائن لکھ کر دے رہا ہوں آپ نے اسے روزانہ رات تین اور چار بجے کے درمیان کسی بھی وقت صرف تینتیس مرتبہ پڑھ کر اپنے مقصد کے لیے اللہ سے دعا کرنا ہے کام بہت آسان ہے بمشکل پانچ سے دس منٹ میں نمٹ جائے گا لیکن اس وقت کو بیچ کرنا بہت مشکل ثابت ہو سکتا ہے۔“

”میں بیچ کر لوں گی۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”میں رات کو دیر تک جاگنے کی عادی ہوں۔ بعض اوقات تو فجر کی اذان بھی ہو جاتی ہے۔“

میں نے ایک پرچہ اس کی جانب بڑھا دیا اس نے پڑھا۔

”یا رحیم ارحمنی“

”بالکل درست۔“ میں نے کہا ”صرف 33

مرتبہ پڑھنا ہے۔“

”یہ تو بہت ہی سہل ہے قریشی صاحب۔“ وہ حیرت بھرے لہجے میں بولی۔

”ہاں سہل تو ہے مگر اثر پذیری میں کسی عمل انگیز کی طرح کام کرتا ہے۔“ میں نے پورے وثوق سے کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ یہ سادہ سی لائن رحمت خداوندی کو جوش میں لائے گی۔“

اس نے میرا ڈھیروں شکریہ ادا کیا اور چھ زاپخوں کی فیس کی رقم کرارے نوٹوں کی شکل میں میری جانب بڑھادی میں نے گنے بغیر وہ نوٹ اس کے ہاتھ سے لے کر اپنی میز کی دراز میں ڈال لیے اور یاد دہانی کرائے والے انداز میں کہا۔



”اللہ خیر ہی کرتا ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے

انداز میں کہا۔

”لیکن اکثر اوقات انسان کو یہ ”خیر“ راس نہیں آتی اور وہ ”شر“ انگریزی کی کوششوں میں مبتلا رہتا ہے۔“ لہجائی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”آپ اللہ پر کامل بھروسہ رکھیں اور پھر دیکھیں کہ چالیس روز کے اندر کیا ہوتا ہے؟“

”جی..... بہت بہت شکریہ۔“ وہ تشکرانہ انداز

میں بولی۔ دو چار مزید باتوں کے بعد ہمارے بیچ ٹیلی

فونک رابطہ موقوف ہو گیا۔ اس روز جب میں اپنے

آفس سے نکلا تو جبران کی استعمال شدہ شرٹ پیک

حالت میں میرے بریف کیس کے اندر موجود تھی۔

جب میں اپنی گاڑی میں بیٹھا تو میں نے وہ شرٹ

بریف کیس میں سے نکال کر پنجرہ سیٹ پر رکھ لی

تھی۔ جب میری گاڑی اللہ والی چورنگی پر پہنچی تو وہ

ملنگ مجھے نظر آ گیا جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔

میں نے اس کے بالکل قریب پہنچ کر گاڑی روک

دی پھر اپنی سرائیڈ کا شیوہ گرا کر میں نے مذکورہ شرٹ

اس ملنگ کی جانب بڑھا دی۔

اس نے نگاہ اٹھا کر میری جانب دیکھا لیکن منہ

سے کچھ نہیں بولا۔ میں نے شرٹ اسے دیتے

ہوئے کہا۔

”بچہ نادان ہے زندگی کی تلخ حقیقتوں سے انجان

ہے جب تک پاک پروردگار توفیق نہ دے کوئی کچھ

نہیں کر سکتا کوئی کچھ نہیں جان سکتا، کوئی کچھ نہیں سمجھ

سکتا۔“ اس نے سرخ انگارہ آنکھوں سے گھور کر مجھے

دیکھا پھر چپ چاپ وہ شرٹ مجھ سے لے لی۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس ملنگ نے وہ قیمتی برانڈڈ

شرٹ اپنی میلی کھلی شرٹ کے اوپر پہن لی اور دنیا و

شرٹ چپک دار تھی دھاری دار یا پلین وہ ملنگ کسی

سے کچھ نہیں مانگتا تھا بس چپ چاپ ایک جانب

کھڑا رہتا تھا کسی نے کچھ دے دیا تو فیہا ورنہ اللہ

مالک ہے میں نے یہ شرٹ اس ملنگ کو دینے کا فیصلہ

کیا تھا۔

ہمیں پیشہ ور بھکاریوں اور فقیروں میں فرق ضرور

کرتا چاہیے پیشہ ور بھکاری اپنی کمائی اور دھندے

کے لیے کھڑے ہوتے ہیں اور بعض اوقات تو وہ اس

طرح آپ کے پیچھے پڑ جاتے ہیں کہ جان چھڑانا

مشکل ہو جاتی ہے جبکہ فقیر اور ملنگ بھی آپ سے کوئی

تقاضا نہیں کرتے۔ دراصل وہ اس لیے ہاتھ نہیں

پھیلاتے کہ انہیں کسی چیز کی حاجت ہی نہیں ہوتی۔

وہ بھیک مانگنے کے لیے نہیں بلکہ اپنی ڈیوٹی پر کھڑے

ہوتے ہیں۔ یہ کون لوگ ہیں ان کے اندر روحانی

طاقتوں کے کون کون سے خزانے چھپے ہوتے ہیں ان

کی ڈیوٹی کون لگاتا ہے اور کیوں لگاتا ہے یہ ایک

طویل موضوع ہے اس کہانی کے مجدد صفحات ایسے

حساس موضوع پر تفصیلی گفتگو کے متحمل نہیں ہو سکتے

لہذا میں بھی صرف نظر کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہوں

بس اتنا بتا دوں کہ ان میں بعض ایسے ملنگ اور فقیر بھی

ہوتے ہیں جو بیک جنبش نگاہ اس کائنات کو الٹا سکتے

ہیں۔ اگلے روز مونا کا فون آ گیا رسی علیک سلیک

کے بعد اس نے کہا۔ ”قریشی صاحب میں نے آپ

کی مطلوبہ چیزیں بھیج دی ہیں امید ہے آپ کو مل گئی

ہوں گی۔“

”جی بالکل مل گئی ہیں اور میں نے گزشتہ رات ہی

سے عمل بھی شروع کر دیا ہے۔“ میں نے کہا۔

”گڈ۔“ وہ ستائشی لہجے میں بولی۔ ”آپ نے

اطمینان دلایا ہے تو میرے ذہن کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے

اللہ خیر کرے۔“



ما فیہا سے بے خبر انداز میں اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا میں نے اپنی گاڑی آگے بڑھادی۔

آئندہ روز جب میں اللہ والی چورنگی سے گزرا تو یہی توقع کر رہا تھا کہ آج اس ملنگ نے میلی شرٹ اتار کر اجلی شرٹ پہن لی ہوگی لیکن وہ ملنگ ہی کیا جو آپ کی سمجھ میں آ جائے اگر کسی ملنگ کے بارے میں آپ کے اندازے صد فیصد درست ثابت ہوں تو پھر وہ ملنگ، ملنگ نہیں رہتا اور آپ ایک عام انسان نہیں رہتے جب آپ کے انداز و اطوار اور سوچ بچار ایک عام انسان کی ذہنی سطح سے بلند ہو جاتی ہے تو پھر چیزوں کی حقیقت آپ پر آشکار ہونے لگتی ہے تب پتا چلتا ہے کہ ملنگ کے روپ میں وہ شخص کون تھا۔

اس ملنگ نے میرے اندازے کی ایسی کم تسمی کر ڈالی میلی اور اجلی شرٹ کا معاملہ تو رہا ایک طرف وہ تو سرے سے غائب ہی ہو گیا تھا جہاں میں روزانہ اسے دیکھتا تھا اب وہ جگہ خالی تھی خالی اور خاموش بالکل اس ملنگ کی طرح چپ چاپ.....! اس دن کے بعد سے پھر وہ ملنگ مجھے کہیں دکھائی نہیں دیا نہ اللہ والی چورنگی پر اور نہ ہی شہر کے کسی حصے میں کم از کم میرے روت پر وہ مجھے نظر نہیں آیا۔ مکروہات زمانہ کی مصروفیت کے باعث چند روز بعد میں بھی اسے بھول گیا۔

لگ بھگ ایک ہفتے بعد مونا کی کال آئی اس وقت میں اپنے گھر میں تھا۔

”السلام علیکم قریشی صاحب۔“ اس نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔

”وعلیکم السلام۔“ میں نے جواب دیا۔

”میں نے اس وقت فون کر کے آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا؟“

”اپنی گنجائش کہاں ہے کہ آپ کو کامیابی حاصل

ہو سکے۔“ میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔

”کیا مطلب قریشی صاحب۔“ وہ حیرت بھرے لہجے میں بولی۔ ”میں کبھی نہیں۔“

”میرا مطلب یہ تھا کہ میں آل ریڈی اتنا ڈسٹرب ہوتا ہوں کہ کوئی مجھے مزید کیا ڈسٹرب کرے گا۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔

”اوہ آئی ایم سوری قریشی صاحب۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”آپ کیوں ڈسٹرب ہیں سب خیریت تو ہے نا۔ میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں۔“

”نہیں، نہیں ایسی کوئی بات نہیں مونا جی۔“ میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں وہ ڈسٹرب والی بات میں نے ایک خاص تناظر میں کی تھی۔“

”کیا میں وہ تناظر جان سکتی ہوں؟“ اس نے پوچھا۔

”ضرور کیوں نہیں۔“ میں نے دوستانہ انداز میں کہا پھر پوچھا۔

”آپ نے بلاٹنگ پیپر (BLOTting PAPER) کا نام سنا ہے نا۔ میرا مطلب ہے سیاہی چوس؟“

”جی بالکل سنا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”کانج کے زمانے میں کیمسٹری کے پریکٹیکل میں اکثر بلاٹنگ پیپر استعمال کرتے تھے لیکن یہاں اس بلاٹنگ پیپر کا آپ کے ڈسٹرب ہونے سے کیا تعلق؟“

”بہت گہرا تعلق ہے۔“ میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”جس طرح بلاٹنگ پیپر کی سیاہی چوسنے کی ایک حد ہوتی ہے جب وہ سیاہی چوسنے کے قابل نہیں رہتا یعنی وہ اتنا ڈسٹرب ہو چکا ہوتا ہے کہ اسے مزید ڈسٹرب کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی میں بھی.....!“



”سب سمجھ گئی۔“ وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھی۔

”آپ کے پاس آنے والا ہر شخص آپ کو اپنی دکھ بھری کہانیاں سناتا ہے آپ کو بڑے صبر و تحمل کے ساتھ سب کی پتا سننا پڑتی ہیں جس کی وجہ سے آپ کے اندر کرب اور اذیت کے زہر غیر محسوس انداز میں جمع ہوتے چلے جاتے ہیں اور پھر ایک ایسا وقت بھی آتا ہے جب جی اوب جاتا ہے۔“

”آپ نے بالکل درست اندازہ لگایا ہے مونا جی۔“ میں نے تائیدی انداز میں کہا۔

”واقعی بعض اوقات میں بہت فیڈ اپ ہو جاتا ہوں یہ میرے پیشے کی مجبوری ہے کہ کوئی خوش باش شخص میرے پاس بیٹھ کر گپ شپ نہیں کرتا بلکہ ہر کوئی اپنے عذاب ڈسکس کرنے آتا ہے۔“

”تو آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے؟“ وہ شرارت بھرے لہجے میں بولی۔ ”زندگی کا کوئی ساتھی ہوگا تو آپ اس کے ساتھ بیٹھ کر اپنی پسند کی گپ شپ کر سکیں گے۔“

”آئیڈیا تو اچھا ہے۔“ میں نے بھی شوخی سے کہا۔ ”اب دیکھیں کب خدا کو منظور ہوتا ہے۔“

”میں نے سنا ہے جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں۔“ اس نے کہا ”آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟“

”جب ہم آسمانوں کا ذکر کرتے ہیں تو اس کا مطلب ہوتا ہے اللہ تعالیٰ جب بھی ہم اللہ کا تصور کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں یہی آتا ہے کہ ہمارا پروردگار آسمانوں کے اوپر کسی مسند اولیٰ پر فردکش ہے جہاں سے وہ پوری کائنات پر نگاہ رکھے ہوئے ہے لیکن حقیقت تصور سے بالکل مختلف ہے پاک پروردگار کسی کمپنی کے بگ باس کی طرح انسانی وجود کا

مالک نہیں ہے جو آسمانوں کے اوپر کسی بندائز کنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھاسی سی ٹی وی کی مدد سے سب کو وایج کر رہا ہو۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”وہ مالک کائنات ہے اور کائنات کے ذرے ذرے کے اندر موجود ہے وہ ایک طاقت ہے، ایک توانائی ہے جو ہر ذی روح کے اندر رواں دواں ہے اس کی تلاش میں دشت و صحرا کی خاک چھانتا، پہاڑوں کی چوٹیوں پر جھنڈے گاڑھنا اور سمندروں کی تہوں میں غوطے لگانا وقت اور توانائی ضائع کرنے کے سوا کچھ نہیں۔ اللہ کوئی گم شدہ شے نہیں جسے ڈھونڈا جائے۔ وہ تو آپ کے اندر موجود ہے آپ کی ہبہ رگ سے زیادہ قریب۔ بس ذرا خلوص نیت اور دیانتداری کے ساتھ اپنے اندر جھانکنے کی ضرورت ہے آپ اسے پالیں گے۔ جو لوگ اللہ کو اپنے وجود کے باہر زمین و آسمان کی دسعتوں میں تلاش کرتے ہیں ان کی زندگی ٹامک ٹوئیاں مارتے گزر جاتی ہے اور اب میں آپ کے سوال کی طرف آتا ہوں۔ میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”اس کائنات میں ہر کام کے ہونے یا نہ ہونے کا ایک وقت مقرر ہے اور اس قدرت مطلق کی مرضی کے بنا نہ تو کوئی جوڑا بن سکتا ہے اور نہ ہی اس کی منشا کے بغیر کوئی جوڑا ٹوٹ سکتا ہے جب اس کا حکم ہوگا تو میری شادی بھی ہو جائے گی۔“

”بالکل ٹھیک قریشی صاحب۔“ اس نے تائیدی انداز میں کہا ”میں یہ پوچھ کر بات کو طویل نہیں کروں گی کہ آپ نے اپنا زانچہ بنا کر یہ پتا چلانے کی کوشش کی ہوگی کہ آپ کی شادی کب تک متوقع ہے کیونکہ اس وقت میں نے آپ کو ڈسٹرب کرنے کے لیے نہیں بلکہ ایک خوش خبری سننے کے لیے فون کیا تھا۔“ ”کیسی خوش خبری مونا جی؟“ میں ہمہ تن گوش



(MERCURY) کا برج سرطان میں قرآن ہے  
دونوں سیارے انیس ڈگری پر حالت قرآن میں ہیں  
ان دونوں سیاروں کا ملاپ ایک انسان کو ذہین،  
چالاک، جاسید اور گاڑیوں کا مالک بنادیتا ہے۔

وہ شخص تفریح کا اور فنون لطیفہ کا شوقین ہوتا ہے  
اسے بد نظمی سے نفرت ہوگی یہ ملاپ ایک خوش گوار  
شادی شدہ زندگی کی نشان دہی بھی کرتا ہے اور خوب  
صورت شریک حیات کی گارنٹی دیتا ہے۔ ایسا شخص  
سماجی اور معاشی دونوں میدانوں میں بہت زیادہ  
کامیابیاں سمیٹاتا ہے اگر یہ قرآن زائچے کے  
تیسرے یا نویں یا دسویں گھر میں ہو تو حامل زائچہ  
پڑھنے کا شوقین ہوگا ادب اور شاعری کی جانب اس کا  
خصوصی رجحان ہوگا۔ خوش قسمتی سے جبران کے  
زائچے کے نویں گھر یعنی سرطان میں یہ ملاپ ہو رہا  
ہے اور اس کا شمس بھی برج سرطان ہی میں ہے  
جہاں شمس کو اوج حاصل ہوتا ہے لہذا قدرت کی  
طرف سے جو بھی ہو رہا ہے ہونے دیں، جبران کو فوراً  
آسٹریلیا بھیج دیں اس میں جبران کی بھلائی اور بہتری  
ہے۔ وہ ثوبیہ سے دور چلا جائے گا تو اس زہریلے عشق  
کا بخار خود بخود اتر جائے گا۔

”میں نے آپ کے بارے میں اسد سے ذکر کیا  
تھا۔“ مونانے بتایا ”وہ بھی آپ سے بات کرنا چاہتے  
ہیں اگر آپ کے پاس وقت ہو تو دو باتیں ان سے بھی  
کر لیں۔“

”کیا اسد اس وقت آپ کے پاس موجود ہیں۔“

میں نے حفظ ماتقدم کے طور پر پوچھ لیا۔

”نہیں، وہ دوسرے روم میں ہیں۔“ مونانے  
بتایا۔

”بات کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔“ میں  
نے کہا۔ ”لیکن مجھے بریف کر دیں کہ آپ نے اسد کو

ہو گیا۔  
”جبران آسٹریلیا جانے کی ضد کر رہا ہے۔“ اس  
نے بتایا۔

”اچھا۔“ میں نے متعادل لہجے میں کہا پھر  
پوچھا۔ ”وہ کس سلسلے میں آسٹریلیا جانا چاہتا ہے، سیر و  
تفریح کے لیے یا کوئی اور مقصد ہے۔“

”اسٹڈی کے لیے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں  
نے آپ کو بتایا تھا جبران نے حال ہی میں اے  
لیول کیا ہے اسد اس کا کہیں اسلام آباد میں ایڈمشن  
کرنا چاہ رہے تھے لیکن جبران کی ضد ہے کہ وہ  
اسٹڈی کے لیے آسٹریلیا جائے گا اصل میں اس کا  
ایک کلاس فیلو بھی آسٹریلیا جا رہا ہے بس اس کے  
ساتھ جبران کا بھی پروگرام بن گیا ہے بارہ سے چودہ  
لاکھ کا خرچہ ہے لیکن یہ ہے کہ زندگی بن جائے گی۔ یہ  
پہلے تین سال کا خرچہ ہے بعد کے دو سال میں پانچ  
چھ لاکھ مزید لگ جائیں گے۔ اگر وہ پانچ سال  
آسٹریلیا میں رہ کر پڑھ لے گا تو اس میں اسی کا بھلا  
ہے۔“

”بالکل اسی کا بھلا ہے اور بہت زیادہ بھلا ہے۔“  
میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا پھر  
پوچھا۔

”وہ آسٹریلیا کی کس اسٹیٹ میں جائے گا۔“  
”میلبورن میں“ اس نے بتایا۔ ”آپ اس کے  
زائچے کی روشنی میں بتائیں کہ یہ کام اس کے لیے  
کیسا رہے گا؟“

”بہت مفید اور کارآمد رہے گا۔“ میں نے صاف  
گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا ”وہ جیسا کہ آپ  
نے بتایا آسٹریلیا بزنس کی تعلیم حاصل کرنے جا رہا  
ہے تو آج کل بزنس ہی کا زمانہ ہے جبران کے  
زائچے میں زہرہ (VENUS) اور عطارد



”بس سب ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے۔“ وہ سرسری لہجے میں بولا۔ ”بھئی میری بیگم تو آپ کے علم کی معتقد ہو گئی ہے۔ ابھی اسلام آباد آنا ہو تو ہمیں شرف میزبانی ضرور بخشے گا۔“

”جی..... ضرور.....!“ میں نے کہا۔  
”پورے پاکستان میں آپ کا انکم ٹیکس کا کوئی ایٹو ہو تو آپ بلا تکلف مجھے بتا سکتے ہیں۔“ وہ دوستانہ انداز میں پیش کش کرتے ہوئے بولا۔ ”آپ کے کسی بھی کام آ کر مجھے دلی مسرت ہوگی۔“

”اول تو یہ کہ میں اپنی سالانہ آمدنی پر بالکل نیٹ اینڈ کلیئر ٹیکس ادا کرتا ہوں۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”لہذا اس طرف سے تو مجھے کوئی ٹینشن نہیں ہے۔ بہ فرض محال اگر کوئی ایٹو بھی سامنے آ یا تو پھر آپ کو ضرور زحمت دوں گا۔“

”موسٹ ویلکم۔“ وہ خلوص دل سے بولا پھر پوچھا۔ ”سیاسی حالات کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں کیا موجود حکومت اپنی مدت پوری کرے گی؟“  
”پاکستانی سیاست کے بارے میں پیش گوئی کرنا سب سے مشکل کام ہے، اسد صاحب۔“ میں نے کہا۔

”اور پاکستان کی آرکٹ کے بارے میں بھی۔“ وہ ایک قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

”بجا فرمایا آپ نے۔“ میں نے تائیدی انداز میں کہا ”اس لیے میں ان دونوں شعبوں کے حوالوں سے لب کشائی کرتے ہوئے بہت محتاط رہتا ہوں البتہ جس روز اس الیکشن کے نتائج آئے تھے اور یہ حکومت بنی تھی میں نے پریس کلیک میں اپنے چند دوستوں کے بیچ بیٹھ کر یہ بات کی تھی کہ اس حکومت پر آزمائش کے دو بڑے مرحلے آئیں گے اگر حکومت نے ان دونوں مراحل کا پریش جھیل لیا تو پھر یہ اپنی

میرے بارے میں کیا کیا بتا رکھا ہے تاکہ میرے منہ سے کوئی ایسی بات نہ نکل جائے جسے بعد میں آپ کے لیے پیچ کرنا مشکل ہو جائے۔“

”آپ پریشان نہ ہوں میں نے اسد کے سامنے آپ کے علم اور تجربے کی تعریف ہی کی ہے۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”میں اسے بتا چکی ہوں کہ میں نے کراچی میں آپ سے ملاقات کی تھی اور آپ سے کچھ معاملات ڈسکس کیے تھے دراصل جب میں کراچی آ کر آپ سے ملی تھی تو اس وقت اسد بھی میرے ساتھ کراچی آیا ہوا تھا ہم کسی شادی کی تقریب میں شرکت کے لیے آئے تھے اور ایک دن کے بعد ہی واپس اسلام آباد آ گئے تھے میں نے آپ سے ہونے والی ملاقات کے بارے میں اسد کو بعد میں بتایا تھا۔“

”کیا اسد یہ بات جانتا ہے کہ آپ مجھے اس کے اور نو رین کے ”خفیہ تعلقات“ کے بارے میں بتا چکی ہیں؟“ میں نے ایک نہایت ہی اہم سوال کیا۔  
”بالکل نہیں۔“ وہ قطعی لہجے میں بولی۔ ”اگر یہ بات اسد کے علم میں آئی تو اسے یقیناً برا لگے گا۔ لہذا آپ بھی اس سے بات کرتے ہوئے محتاط رہیے گا۔“  
”شیور۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”میں نے بھی اسی احتیاط کے پیش نظر ہی آپ سے یہ سوال کیا تھا۔“

”ٹھیک ہے میں آپ کی اسد سے بات کراتی ہوں۔“ اس نے کہا۔

ایک منٹ کے بعد مونا کا شوہر اسد لائن پر تھا اس نے بھاری بھر کم آواز میں کہا۔

”اسلام علیکم قریشی صاحب کیسے ہیں آپ؟“  
”اللہ کا کرم ہے اسد بھائی۔“ میں نے کہا۔  
”آپ سنائیں کیسی گزر رہی ہے؟“



## یاد رکھنا

زندگی میں انسان ہر قدم محض اپنی خوشی کے لیے نہیں اٹھاتا بعض اوقات اسے خود سے وابستہ لوگوں کے لیے بھی جینا پڑتا ہے ان کی خوشیوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔

احمد علی.....ملتان

وقت پر ہی۔“

”ویری گڈ۔“ میں نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔ ”اللہ کرم کرے گا۔“

”قریشی صاحب آپ اپنا اکاؤنٹ نمبر مجھے ٹیکسٹ کر دیجیے گا۔“ مونانے کہا۔

”وہ کس لیے؟“ میں نے پوچھا۔

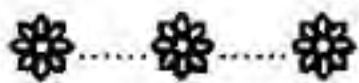
”گھبرا میں نہیں یہ کوئی انکم ٹیکس کا ایشو نہیں ہے۔“ وہ شوٹی سے بولی۔

”پھر بھی بتائیں تو سہی۔“ میں نے کہا۔ ”آپ میرے اکاؤنٹ کی ڈیٹیل کیوں مانگ رہی ہیں؟“

”قریشی صاحب اس دنیا کی سب سے زیادہ قیمتی شے وقت ہے۔“ وہ گہمیر لہجے میں بولی۔ ”اور آپ نے مجھے اپنی یہ قیمتی چیز دی ہے لہذا میرا بھی کچھ فرض بنتا ہے۔“

”اوکے۔“ میں نے اس کے مقصد کی تہ میں اترتے ہوئے کہا۔ ”میں ابھی آپ کو اپنی اکاؤنٹ ڈیٹیل سینڈ کرتا ہوں۔“

اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور اختتامیہ کلمات کے بعد فون بند کر دیا۔



لگ بھگ ایک ماہ کے بعد مونانے کی کال آئی اس وقت میں اپنے آفس میں موجود تھا۔ ریکی علیک سلیک

مدت ضرور پوری کرے گی۔“

”ذرا ان دونوں مراحل کے بارے میں بھی بتا دیں۔“ اسد نے پوچھا۔

”پہلا مرحلہ تو وہ تھا جب آپ کے اسلام آباد میں دھرنا ہوا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”حکومت نے اپنے اعصاب کی مضبوطی کا مظاہرہ کیا اور اس طوفانی ریلے سے صحیح سلاست نکل گئی۔ دوسرا مرحلہ اس سال یعنی 2015ء میں جولائی کے اختتام سے ستمبر کے وسط تک کا ہے۔“

”اوہ..... مطلب یہ کہ ملک میں کسی نئے انتشار کی آمد آمد ہے۔“ اسد نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

”میرا علم تو یہی بتاتا ہے۔“ میں نے سادہ انداز میں کہا ”باقی جو اللہ کو منظور۔“

”اللہ کرے سب خیریت گزرے۔“ وہ امید بھرے لہجے میں بلا۔ ”جمہوریت کو چلنا چاہیے۔“

”میں بھی جمہوریت کے چلنے کا قائل ہوں، بشرطیکہ وہ جمہوریت ہو۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”ایسی جمہوریت جس کے ہوتے ہوئے کسی شخص کو یہ شعر پڑھنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔“

اے مہرتاب ناک، تیری روشنی کی خیر کچھ لوگ زیر سایہ دیوار جل گئے

”آپ نے بہت گہری بات کر دی ہے قریشی صاحب۔“ وہ سرسرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”ان شاء اللہ آپ سے ملاقات میں مزہ آئے گا۔“

”ان شاء اللہ۔“ میں نے کہا۔

پھر مونالائسن پر آگئی میں نے پوچھا۔ ”میں نے آپ کو پڑھنے کے لیے کچھ بتایا تھا۔“

”جی وہ میں نہایت پابندی سے پڑھ رہی ہوں۔“ اس نے بتایا۔ ”اور وہ آپ کے بتائے ہوئے

145



”کیسا انکشاف؟“ مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔

”توبہ کو“ سی“ ہو گیا ہے۔“

”آپ کا مطلب ہے ہیپاٹائٹس سی؟“ بے

ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

”جی، میرا یہی مطلب ہے۔“ وہ ایک ایک لفظ پر

زور دیتے ہوئے بولی۔

”ہیپاٹائٹس سی یعنی کالا یرقان۔“

”اوہ، یہ تو واقعی بڑی فکر مندی والی بات ہے۔“

میں نے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر اس مرض

میں ذرا سی بھی کوتاہی یا اس کے علاج میں تاخیر

ہو جائے تو بڑے سنگین نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔“

”جی بات تو یہ ہے کہ توبہ کی بیماری کا سن کر مجھے

دلی صدمہ ہوا تھا مونا کے خانگی مسائل جو بھی رہے

ہوں مگر اس میں توبہ کا کوئی قصور نہیں تھا۔ اسے بھری

جوانی میں ایسا خطرناک مرض نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ

ابھی محض انیس سال کی تھی۔ جبران انیس سو پچانوے

کی پیدائش تھا اور توبہ انیس سو چھیانوے کی یہ عمر تو

زندگی کو انجوائے کرنے کی ہوتی ہے۔“

”قریشی صاحب۔“ میری سماعت میں مونا کی

آواز ٹکرائی۔ ”توبہ کے سلسلے میں کوتاہی بھی ہو چکی اور

تاخیر بھی۔“

”کیا مطلب؟“ میں چونک اٹھا۔

اس نے بتایا ”جیسے ہی پتا چلا تھا کہ اسے

ہیپاٹائٹس سی ہو گیا ہے تو فوراً کسی مستند ڈاکٹر سے اس کا

میڈیکل ٹریٹ منٹ شروع ہو جانا چاہیے تھا لیکن

یہاں ہوا یہ کہ ایک ہفتہ تو دم درد اور یرقان جھڑوانے

میں گزر گیا اس سے توبہ کا تو کچھ بھلا نہ ہوا تاہم بعض

باباؤں کی خوب کمائی ہو گئی۔“ لمحے بھر کو وہ سانس ہموار

کرنے کے لیے متوقف ہوئی پھر شکستہ لہجے میں اپنی

بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

کے بعد میں نے پوچھا۔

”جبران کیسا ہے اس کے اسٹڈی پراسس کا کیا

ہوا؟“

”وہ تو پچھلے ہفتے میلبورن جا چکا۔“ اس نے بتایا۔

”اگست سے اس کی کلاس شروع ہو جائیں گی۔“

”یہ بہت اچھا ہوا۔“ میں نے سراہنے والے انداز

میں کہا ”اب پانچ سال کے لیے آپ کو بیٹے کی جدائی

برداشت کرنا ہوگی لیکن یہ ہے کہ ان کی زندگی بن

جائے گی۔“

”پانچ سال کی جدائی برداشت کریں میرے

دشمن۔“ وہ چمک کر بولی۔ ”سال میں ایک آدھ چکر

آسٹریلیا کا ہم لگائیں گے اور یونیورسٹی کی سالانہ

چھٹیاں گزارنے وہ پاکستان آ جایا کرے گا۔“

”دوسری پارٹی کا کیا حال ہے؟“ میں نے معنی

خیز انداز میں کہا۔

”سچ پوچھیں تو میں نے اس وقت توبہ کے لیے

آپ کو فون کیا ہے۔“ وہ پریشانی سے لبریز لہجے میں

بولی۔

”کیوں۔“ میں نے سوال کیا ”کیا ہوا توبہ کو؟“

”میں ذرا اس کے چارٹ کی اسٹڈی کرانا چاہتی

ہوں۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”اگر آپ اس وقت فری

ہوں تو ورنہ میں بعد میں فون کر لوں گی۔“

میں اس وقت فارغ ہی بیٹھا تھا لہذا میں نے

کہا۔ ”آپ کے لیے میں فری ہی ہوں کہیں کیا

معاملہ ہے۔“

”قریشی صاحب پچھلے چند روز سے توبہ کی

طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ اس نے تشویش بھرے

لہجے میں بتایا۔ ”پہلے تو میں یہی سمجھ رہی تھی کہ یہ جبران

کے آسٹریلیا چلے جانے کی وجہ سے ہے لیکن کل اس

کے بارے میں ایک ہولناک انکشاف ہوا ہے۔“



”قریشی صاحب۔ میں ثوبیہ کی دشمن نہیں ہوں وہ بہت پیاری، بہت معصوم بچی ہے پلیز آپ اس کا زائچہ اسٹڈی کر کے کوئی امید افزا بات بتائیں۔“

”میں آپ کے احساسات اور جذبات کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”آپ اپنے منہ سے نہ بھی کہیں تو میں جانتا ہوں کہ آپ ثوبیہ کی دشمن نہیں ہیں آپ تو اپنے بیٹے کو محض اسے لیے ثوبیہ سے دور کرنا چاہتی تھیں کہ گناہ کے تسلسل کو روکا جاسکے میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟“

”جی، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ وہ تائیدی انداز میں بولی۔

”اب بتائیں ثوبیہ کا زائچہ کیا کہہ رہا ہے؟“

”جیسا کہ میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا تھا کہ ثوبیہ کا مشتری زائچے کے چھٹے گھر جدی میں بیٹھا ہے چھٹا گھر بیماری کو ذیل کرتا ہے اور مشتری انسان کے جگر اور لیلے کو کنٹرول کرتا ہے اور آپ جانتی ہیں کہ ہیپاٹائٹس سی کا ڈائریکٹ تعلق جگر سے ہی ہے۔ مشتری ویسے بھی جدی میں حالت بیہوش (DEBILITATION) میں ہوتا ہے لہذا ثوبیہ کے ساتھ جگر کا کوئی ایشو تو ہونا ہی تھا جبکہ مشتری پانچویں اور آٹھویں گھر کا حاکم بھی ہے۔ آٹھویں گھر کا حاکم جب چھٹے گھر میں ہوتا ہے تو شدید نوعیت کی بیماری لاتا ہے۔ ازیں علاوہ... میں نے لمحائی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”ثوبیہ کے زائچے کے نویں گھر یعنی حمل (ARIES) میں زحل، کیتو اور مریض موجود ہیں۔ زحل، برج حمل میں حالت بیہوش ہوتا ہے جبکہ یہ مریخ (MARS) کا اپنا گھر ہے۔ کیتو (KETU) کی تاثیر مریخ کے برابر مانی جاتی ہے اور یہ دونوں یعنی

**فلسفہ زندگی**

زندگی کو جب بھی دیکھا عجب ہی پایا، کبھی یہ دھنک کی طرح سات رنگ بکھیرتے ہوئے نظر آتی، کبھی گہرے بادل کی طرح اپنے اوپر اداسی کا گہرا خول لیے نظر آتی، کبھی میں نے زندگی کو دریاؤں اور سمندروں کی جوش مارتی ہوئی لہروں کی طرح متحرک پایا۔ کبھی میں نے زندگی کو برف پوش پہاڑوں کی مثل منجمد پایا جو حرارت ملتے ہی چٹخ جاتے ہیں کبھی زندگی کو برستی ہوئی موسلا دھار بارش کی مانند پایا جو دکھوں اور غموں کی کثافت کو شفاف کر دیتا ہے۔ کبھی زندگی کو ابھتی ہوئی ڈور کی مانند پایا جو رشتوں میں ابھتی ہوئی ہے کبھی زندگی کو میں نے خوب صورت تلی کی مانند دیکھا جو اڑتی ہوئی سب کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لیتی ہے لیکن جب میں نے زندگی کی حقیقت کو بہت قریب سے جانا تو سمجھ میں آیا کہ یہ تو خدا کی لازوال نعمت ہے جس کا ہم شکر ادا نہیں کرتے۔

**شامد ہاشم..... کھڈیاں خاص**

مریض اور کیتو، زحل (SATURN) کے ازلی ابدی دشمن ہیں اب آپ خود اندازہ لگالیں کہ ثوبیہ کے زائچے کے نویں گھر میں کیا اودھم مچا ہوگا جبکہ زحل چھٹے گھر کا حاکم بھی ہے۔ میرے خیال میں ثوبیہ کو دوا سے زیادہ دعا کی ضرورت ہے۔

”اوہ، آپ تو مجھے مایوس کر رہے ہیں قریشی صاحب۔“ وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولی۔

”نہیں، میں آپ کو مایوس نہیں کر رہا۔“ میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ”میں تو آپ کو اللہ کے نزدیک کر رہا ہوں صرف دعا ہی اللہ اور بندے کے بیچ ڈائریکٹ تعلق ہے اور یہ بات بھی ذہن میں رکھیں کہ صدقہ اور دانا ممکن کو ممکن بنا دیتے ہیں۔ کیونکہ کوئی کام انسان کے لیے ناممکن ہو سکتا ہے مگر پروردگار کے لیے نہیں۔ وہ قادر مطلق ہے۔ اس کے ”کن“



کہنے سے ”فیکون“ ہو جاتا ہے۔  
 ”اس بات سے تو میں اتفاق کرتی ہوں۔“ اس نے کہا۔

میں کافی دیر تک اس کے ساتھ تسلی بخشی کی باتیں کرتا رہا میری باتوں سے اسے خاصی تقویت حاصل ہوئی۔ میں نے اسے صدقہ کی تاکید کی۔ اس نے میری ہدایت پر عمل کرنے کا وعدہ کیا نیلی فونک سلسلہ موقوف کرنے سے پہلے کہا۔

”قریشی صاحب آپ اپنا اکاؤنٹ چیک کر لیجیے گا میں نے صبح آپ کی فیس آن لائن ڈیپازٹ کرادی تھی۔“

”شکریہ۔“ میں نے مختصر جواب پراکتفا کیا۔  
 اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ ثوبیہ کی بیماری کا سن کر میں بھی رنجیدہ ہو گیا تھا اور میری دلی دعا تھی کہ اللہ اسے صحت کاملہ عطا فرمائے۔

دو روز بعد مونا کا فون آیا وہ خاصی گھبرائی ہوئی تھی میں اس وقت گھر ہی میں تھا اور آفس جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس نے چھوٹے ہی پوچھا۔

”قریشی صاحب آپ کا عمل کہاں تک پہنچا؟“  
 سچی بات تو یہ ہے کہ میں کوئی عمل دل نہیں کر رہا تھا اس کے بھیجے ہوئے جبران کے ناخن اور بال میں نے ڈسٹ بن میں پھینک دیے تھے البتہ میں نے کیلنڈر پر چالیس روز کی تاریخوں کو دائرہ بند کر دیا تھا میں نے اس کے سوال کے جواب میں بتایا۔

”آج چالیس واں دن ہے یعنی آج میرا عمل مکمل ہو جائے گا۔“

”آپ بہت با کمال انسان ہیں قریشی صاحب۔“ وہ روہاسی ہو گئی۔ ”میرا کام تو ہو گیا لیکن ایک بات کا مجھے ساری زندگی افسوس رہے گا۔“

”آپ کے لہجے سے پریشانی جھلک رہی ہے۔“ میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ”سب خیریت ہے نا؟“

”قریشی صاحب پچھلی رات ثوبیہ کی ڈیٹھ ہو گئی۔“

”اوہ ویری سیڈ۔“ میں نے مغموم لہجے میں کہا۔ ”یہ سن کر بہت افسوس ہوا جو اللہ کی مرضی۔“

”قریشی صاحب ہم نے خلوص نیت سے جبران کو ثوبیہ سے دور کرنے کی کوشش کی تھی۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”کیونکہ ان کے بیچ جو معاملات تیزی سے پروان چڑھ رہے تھے وہ بہت زہریلے اور خطرناک تھے میں نے بھی ثوبیہ کا برا نہیں سوچا تھا میں تو صرف یہ چاہتی تھی کہ گناہ کا جو ڈراما نورین اور اسد نے رچایا تھا اس کی اگلی قسط میں جبران اور ثوبیہ نئے کردار نہ ہوں۔“

”آپ بالکل مطمئن رہیں اور اپنے ذہن پر کسی قسم کا بوجھ نہ ڈالیں۔“ میں نے اس کی دلجوئی کرتے ہوئے کہا۔ ”اس میں آپ کا قطعاً کوئی قصور نہیں ہے۔ یہ مسئلہ نہ تو آپ کے بس کا تھا اور نہ ہی میری آسٹروولوجی کے بس کا اس لیے ہم نے اس معاملے کو اللہ پر چھوڑ دیا تھا۔ جب کوئی معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا جائے تو پھر اس کی طرف سے آنے والے فیصلے کو بھی قبول کرنا چاہیے۔ اس کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ اس نے آپ کی سن لی مگر اپنے انداز میں ہم پاک پروردگار کو ڈکٹیشن نہیں دے سکتے۔ صرف اس کے حضور درخواست ہی کر سکتے ہیں۔ آپ نے رات کے آخری پہر میں اپنے مسئلے کے لیے جولائن پڑھ کر دعا کی اس کے معنی ہیں۔ ”اے رحم کرنے والی ذات میرے حال پر رحم فرما۔“ آپ نے اپنا کام کر دیا اس کے بعد پروردگار کی مرضی کہ وہ اپنا



کی تلخ حقیقتوں سے ان جان ہے جب تک پاک پروردگار توفیق نہ دے کوئی کچھ نہیں کر سکتا، کوئی کچھ نہیں جان سکتا، کوئی کچھ نہیں سمجھ سکتا۔“

اس ملنگ نے سرخ انگار آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے نہ صرف یہ کہ وہ شرٹ مجھ سے لے لی تھی بلکہ اسی وقت اسے اپنی میلی شرٹ کے اوپر پہن بھی لیا تھا گویا یہ اس بات کی دلیل تھی کہ اس نے نادان بچے کو زندگی کی تلخ حقیقتوں سے روشناس کرنے کا عندیہ دے دیا تھا۔ پروردگار سے توفیق دلانا انہی لوگوں کے بس کی بات ہے کیونکہ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے اندر اللہ کو تلاش کر چکے ہوتے ہیں اور ڈائریکٹ اس ذات باری سے جڑے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ شمشیر برہنہ کی مانند ہوتے ہیں ان کے سامنے سوچ پر بھی پکڑ ہو جاتی ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے فرمان الہی ہے کہ جو میرا ہو جاتا ہے میں اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں اس کی آنکھیں اور اس کی زبان بن جاتا ہوں۔

میری شدت سے خواہش ہے کہ وہ ملنگ مجھے دوبارہ نظر آئے تاکہ میں بھی اس کے توسط سے کسی نظر فریب نظارے سے مستفید ہو سکوں۔ اگر وہ ملنگ آپ کو کہیں دکھائی دے تو پلیز مجھے ضرور بتائیے گا..... شکریہ۔



کام کس انداز میں کرے۔ مالک نے آپ پر رحم فرمایا اور جبران اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے آسٹریلیا چلا گیا یعنی ٹوبیہ سے دور ہو گیا۔ ٹوبیہ کی موت میں سراسر اس کے ورثا کا ہاتھ ہے آپ خود کو قصور وار نہ سمجھیں اگر بروقت ٹوبیہ کو میڈیکل ٹرینسٹ مل جاتی تو اس کی جان بچائی جاسکتی تھی۔ اپنی ہاؤ..... اللہ کے معاملات کو اللہ پر ہی چھوڑ دینا چاہیے۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں قریشی صاحب۔“ وہ ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ”اللہ ہم سب پر رحم فرمائے۔“

”آمین۔“ میں نے تہہ دل سے کہا۔ دو چار رسمی باتوں کے بعد ہم نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ دیا۔

آپ سب جانتے ہیں کہ میں نے جبران کو ٹوبیہ سے دور رکھنے کے لیے کسی قسم کا کوئی عمل نہیں کیا اگر کبھی یہ کہانی مونا کی نظر سے گزری تو وہ بھی حقیقت حال کو سمجھ جائے گی اور اسے مطمئن کرنے کے لیے بھی میرے پاس بہت سے دلائل ہیں۔ جہاں تک ٹوبیہ کو ہیپاٹائٹس سی ہو جانے کا تعلق ہے تو اس بیمار کا راجحان پہلے سے اس کے زائچے میں موجود تھا۔ اگر جبران کے ساتھ اس کا کوئی سنجیدہ معاملہ نہ بھی ہوتا تو زندگی کے کسی موڑ پر اس کے جگر نے بے دفاعی تو کرنا ہی تھی اب باقی رہ جاتی ہے مونا کی آخر شب کی چالیس روزہ دعائیں بے شک وہ خالق سب کی سنتا ہے اور اپنی مرضی کے مطابق بندوں کی دعاؤں کو شرف قبولیت بھی بخشتا ہے۔ وہ مسبب الاسباب ہے لیکن میں اس کیس میں ایک اور پہلو کو نظر انداز نہیں کر سکتا اور وہ پہلو ہے اللہ والی چورنگی سے غائب ہو جانے والے ملنگ کا۔ میں نے جبران کی شرٹ اس ملنگ کو دیتے ہوئے کہا تھا ”بچہ نادان ہے، زندگی



## منہا کوٹ

## محمد جاذب

چوری ایک قبیح حرکت اور ناقابل معافی جرم ہے لیکن چوری کا مال خریدنا بھی کسی جرم سے کم نہیں۔  
خوب صورت اور قیمتی اشیاء کی شائق ایک حسینہ کا قرضہ اس نے غلطی سے ایک مسروقہ منک کوٹ خرید لیا تھا۔

”ارے مئی یہ خبر سنیں۔“ انیبل نے چائے کی پیالی ایک طرف کھسکاتے ہوئے اخبار میز پر پھیلا دیا اور غور سے ایک خبر پڑھنے لگی۔

”میں ساری رات سو نہیں سکی ہوں انیبل۔“ اس کی مئی نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

خرچ کرنا بھی تو حماقت ہے۔“

”آ خر وہ رقم آپ کسی نہ کسی چیز کو خریدنے میں خرچ تو کریں گی؟“ انیبل نے کہا۔

”نہیں میں تمہیں منک کوٹ خریدنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔“

”ساری رات میری پلک نہلکی نہیں جھپکی ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ گھر میں جو اتنی بڑی رقم رکھی ہے اس کو کہاں محفوظ کروں، مجھے ڈر ہے کہ یہیں اس رقم کی وجہ سے ہم کسی مصیبت میں نہ پھنس جائیں۔“

”ٹھیک ہے میں آفس جاتے ہوئے راستے میں اس کوٹ کو ایک نظر دیکھوں گی تو ضرور کیونکہ اسے دیکھ لینے میں تو کوئی حرج نہیں ہوگا۔“ انیبل نے مردہ لہجے میں کہا۔

مئی آپ خبر تو سنیں۔“ انیبل نے ان کی بات پر کوئی توجہ نہ دی وہ خبر سنانے کے لیے بے چین ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں آج کا تازہ اخبار تھا اور اس نے اشتہارات والا صفحہ کھولا ہوا تھا۔

”ایک خوب صورت منک کوٹ فروخت کے لیے موجود ہے جو بہت ارزاں قیمت پر دیا جائے گا خواہش مند جمعہ کی صبح جلد از جلد چار سو سولہ اسٹریٹ ولن پر پہنچ جائیں۔“

ماحول کے مطابق ہی رہنا چاہیے۔“ اس کی مٹی نے سمجھانے کی کوشش کی۔

”آخردیکھ لینے میں کیا خرچ ہے؟“

”پھر کیا کرو گی؟ تمہیں تو اچھی فکر کی بھی پہچان

”اوہ، انیبل تمہیں کب عقل آئے گی؟“ اس کی نہیں ہے۔“ اس کی مہی نے کہا۔

”مجھے سب پہچان ہے اور میرے پاس بانج سو مہی نے کہا۔

”مئی آپ ہمیشہ میری ہر بات پر انکار کر دیتی ہیں۔“ ائمیل نے برا مانے ہوئے کہا۔

ڈالر بھی موجود ہیں۔“ ائمیل نے اپنا کوٹ پہنتے ہوئے اس کی جیب پر ہاتھ مارا۔

”لیکن یوں الٹی سیدھی چیزیں خریدنے پر رقم خرچ کرنا بھی تو حماقت ہے۔“

”آخروہ رقم آپ کسی نہ کسی چیز کو خریدنے میں  
”آپ کو کچھ بھی پتا نہیں ہے۔“ انیمل نے چڑکر





وہ کار سے اتر کر مکان کے دروازے کی طرف  
 بڑھی اس کے بائیں ہاتھ والے دروازے پر چار سو  
 چودہ نمبر لکھا تھا اور چار سو سولہ نمبر اوپر تھا جس کے  
 لیے دائیں ہاتھ پر زینہ بیٹا ہوا تھا ابھی انیل وہاں  
 کھڑی یہ سوچ ہی رہی تھی کہ زینے سے اوپر جائے یا  
 نہ جائے کہ بائیں ہاتھ کے دروازے کا پتہ کھلا۔  
 دروازے کے سامنے آج کا اخبار پڑا تھا پتہ کے  
 پیچھے سے ایک ہاتھ باہر آیا اور اخبار اٹھا کر واپس اندر  
 چلا گیا۔ انیل کو اچانک خیال آیا کہ اب تک بہت  
 سے لوگ صبح کا اخبار لے چکے ہوں گے اور ان میں  
 سے کئی ہوں گے جو اشتہار دیکھ کر کوٹ خریدنا بھی  
 چاہیں گے اس نے سوچا کہیں اسے یہاں پہنچنے میں  
 دیر تو نہیں ہوگئی وہ تیزی سے زینے چڑھتی ہوئی اوپر  
 پہنچ گئی اور دروازے کی اطلاعی گھنٹی بجائی۔

کہا اور دیوار پر لگی گھڑی پر نظر ڈالی ابھی اس کا دفتر  
 کھلنے میں کافی دیر تھی کیونکہ جمعے کو اس کا دفتر دیر سے  
 کھلتا تھا وہ آفس جاتے ہوئے راستے میں بڑی  
 آسانی سے اس کوٹ کو دیکھ سکتی تھی۔ گھر سے نکلتے  
 نکلتے اس کی می نے کئی بار اسے سمجھانے کی کوشش کی  
 تھی لیکن اس نے ان کی ایک بھی نہیں سنی تھی۔

ولسن اسٹریٹ کے علاقے میں اس نے اپنی کار  
 کی رفتار سست کر دی جس گھر کا نمبر اخبار میں لکھا ہوا  
 تھا اس پر دو نمبر پلیٹیں لگی تھیں۔ انیل کو اس حماقت پر  
 ہنسی آگئی تھی۔ انیل نے اس مکان کے سامنے کار  
 روک دی اس کے سیدھے ہاتھ میں آج کا اخبار تھا  
 جس کا اشتہار والا صفحہ اب بھی اوپر ہی تھا۔ اشتہار پر  
 اس نے پرے رنگ کی روشنائی سے لہریے دار لائن  
 کھینچ دی تھی۔



دروازہ ایک دراز قد اور سرخی مائل بھورے رنگ کے بالوں والی عورت نے کھولا تھا۔

”جی؟“ اس نے پوچھا۔

”میں اشتہار دیکھ کر آئی ہوں۔“ انیل نے کہا۔

”اوہ اچھا، اندر آ جاؤ۔“ عورت نے راستہ چھوڑتے ہوئے کہا اور انیل اندر داخل ہو گئی۔

”تم کافی جلدی آئی ہو۔“ اس عورت نے کہا وہ کچھ بانپ رہی تھی۔

”کیا تم اکیلی ہو؟“

”ہاں میں اکیلی ہوں، کیا میں وہ کوٹ دیکھ سکتی ہوں؟“ انیل نے کہا۔

”جی ہاں، ضرور۔“ اس عورت نے باہر کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا اور کمرے میں ٹھلنے والے دوسرے دروازے کی طرف بڑھ گئی انیل اپنی جگہ کھڑی تھی ایک لمحے کو اسے خیال آیا تھا کہ اس نے اپنی می کی بات نہ مان کر شاید کوئی غلطی کی ہے یہ بھی ممکن تھا کہ وہ کوٹ پرانا ہوتا پھر اس کے پاس صرف پانچ سو ڈالر کی رقم تھی جو کسی طرح بھی ایک منک کوٹ کی خریداری کے لیے کافی نہیں ہو سکتی تھی۔

چند لمحوں بعد سرخی مائل بھورے بالوں والی وہ دراز قد عورت کمرے میں دوبارہ داخل ہوئی اس کے ہاتھ میں ایک نیامنک کوٹ تھا۔

”میرا خیال ہے کہ تم اسے پہن کر دیکھنا پسند کرو گی؟“ اس نے انیل سے پوچھا اور انیل نے کسی معمول کی طرح اپنا پرس قریب رکھی میز پر ٹکا دیا۔

ساتھ ہی اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا اخبار بھی رکھ دیا اور منک کوٹ تھام لیا۔ اس کی چکنی اور نرم آستین میں ہاتھ ڈالتے ہوئے اس نے انجانی خوشی محسوس کی تھی وہ سوچ رہی تھی کہ یا تو وہ پاگل ہو گئی ہے اور یا یہ کوٹ ہی اتنا اچھا ہے کہ وہ اسے کسی قیمت پر اب

خود سے جدا نہیں کرنا چاہتی۔

”اس کی کیا قیمت ہے؟“ اس نے دراز قد عورت کو دیکھتے ہوئے کہا جبکہ اس کے ہاتھ کوٹ پر آہستہ آہستہ پھسل رہے تھے وہ اس کی نرمی کو محسوس کر رہی تھی۔

”تم کیا قیمت دے سکتی ہو؟“ اس عورت نے پوچھا۔

”اس کے علاوہ میں یہ بتا دوں کہ میں کیش لینا پسند کروں گی۔“

”میرے پاس پانچ سو ڈالر ہیں اور بس۔“ انیل نے کہا اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اسے خدشہ تھا کہ کہیں وہ عورت اتنی کم رقم میں کوٹ دینے سے انکار نہ کر دے۔

”رقم میں ابھی لوں گی تمہارے پاس اس وقت رقم ہے؟“ اس نے انیل سے پوچھا۔

”ہاں۔“

”ٹھیک ہے۔“

”یہ کوٹ نیا سا لگ رہا ہے۔“ انیل نے خود سے سرگوشی کی۔

”ہاں یہ نیا ہی ہے۔“ وہ عورت جلدی سے بولی میں نے اب تک نہیں پہنا۔“ اس عورت کے لہجے میں بیزاری تھی، جیسے وہ جلد از جلد انیل سے پیچھا چھڑانا چاہتی ہو۔ انیل نے اپنے سر اپا پر نظر ڈالی وہ کوٹ اس کی لمبائی کے لحاظ سے بالکل ٹھیک تھا جبکہ دراز قد عورت کے لیے وہ چند انچ چھوٹا ہوگا۔

”کیا یہ تمہارا کوٹ نہیں ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”یہ میرے لیے نہیں بنایا گیا تھا بلکہ یہ مجھے میری نند نے تحفے میں دیا تھا اس نے بھی اسے کبھی نہیں پہنا تھا مجھے اچانک رقم کی ضرورت پڑ گئی ہے اگر تم اسے پسند نہیں کرو گی تو اسے کوئی اور لے جائے گا



پیار.....! انسیت اور اپنائیت کا نام ہے۔

محبت ہماری ضرورت ہے بقاء ہے۔

پیار وقتی ضرورت ہوتا ہے

محبت اس سے بہت آگے ہوتی ہے محبت میں قربانی ہوتی ہے مان ہوتا ہے ضرورت ہوتی ہے اس کے بنا سانس چلنا دشوار ہوتی ہیں۔

عشق کا درجہ ان سب سے اوپر ہے اس میں نہ کوئی چاہ اور نہ ہی تسکین ہوتی ہے۔

عشق مجازی عشق حقیقی کا جز ہے۔ عشق مجازی کی سیرمی عشق حقیقی تک پہنچا دیتی ہے۔ یہ عشق حقیقی کرنا

سکھا دیتی ہے عشق مجازی میں طلب ہے جنون ہے۔

عشق حقیقی میں سرور ہے عشق حقیقی صرف اسے ملتا ہے جو اپنی تیسری آنکھ کھول لے۔ قسمت والوں کی تیسری

آنکھ کھلتی ہے وہ آنکھ دیکھنے سے نہیں کھلتی بلکہ جب انسان شعور و تدبیر کی منزلیں طے کر لیتا ہے تو تیسری آنکھ کھل

جاتی ہے۔ شعور کی بہت منزلیں ہوتی ہیں ناقہ ادا نہیں طے کرتا کرتا انسان بوڑھا بھی ہو جاتا ہے مگر صوفی کی

منزل تک نہیں پہنچ پاتا اور کبھی انسان ایک سجدے میں ہی خدا کو پا لیتا ہے پھر جو پانے میں وجد اور تسکین ہوتی ہے

وہ ہماری روح کو پروانہ بنا دیتی ہے۔ ہمارے دل کی ہمارے اندر کی جب تیسری آنکھ کھلتی ہے تو علم غائب ظاہر و

باطن سب سمجھ میں آنے لگتا ہے۔ تب جو نشہ تیسری آنکھ سے دیکھنے سے ملتا ہے وہ دوا آنکھوں سے کہاں..... جو

حقیقت کامل یقین اور بھروسے سے سب دیکھتی ہے سب.....

نور الدین..... کراچی

اشتبہ اردیکھ کر بہت سے لوگ یہاں آئیں گے؟“ ایسا ہی تھا جیسے وہ اب انیبل کو مزید برداشت نہیں کرنا

اس نے کہا۔ چاہتی جبکہ انیبل ابھی تک اس کوٹے ہی میں ابھی

”نہیں یہ بات نہیں یہ مجھے پسند آیا ہے۔“ انیبل ہوئی بھی وہ گھوم گھوم کر کوٹ کو دیکھ رہی تھی۔

نے جلدی سے کہا۔ ”تمہارے اوپر یہ کوٹ بہت اچھا لگ رہا

ہے۔“ اس عورت نے آخری تیر چھوڑا اور انیبل

مسکراتے لگی اس کی پرسوں کی حسرت پوری ہوئی تھی

سالوں سے اسے تمنا تھی کہ وہ بھی ایک منک کوٹ کی

مالک ہو اور اب یہ خواہش پوری ہو گئی تھی۔

”پورے پانچ سو ڈالر ہیں؟“ اس عورت نے

پوچھا۔ ”کیا میں اسے پیک کر دوں؟“ اس عورت نے

پوچھا۔ ”نہیں اس کی ضرورت نہیں۔“ انیبل نے جلدی

”ہاں۔“ ”ٹھیک ہے اچھا شکریہ۔“ عورت نے کہا انداز سے کہا۔ ”میں اسے پہنے ہی رہوں گی۔“



”اچھا تو پھر خدا حافظ۔“ عورت نے آگے بڑھ

کر دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ”ہاں ہاں بالکل میں چلی جاؤں گی۔“ انیل

نے جواب دیا اور اس عورت نے دروازہ بند کر دیا۔ ”ارے کیا آپ مجھے رسید وغیرہ نہیں دیں گی؟“

انیل نے باہر نکلتے نکلتے رک کر کہا۔ ”اوہ ضرور۔“ عورت کہتی ہوئی اندر کی طرف پلٹی

پھر وہ کمرے میں کوئی کاغذ تلاش کرنے لگی۔ ”کوئی کاغذ ہی نہیں مل رہا۔“ اس نے کہا۔

”یہ لے لیں۔“ انیل نے میز پر رکھے اپنے

اخبار کا ایک کونا پھاڑ کر اسے دیا۔ ”میرے پاس کوئی پن بھی نہیں ہے۔“ عورت

نے کہا۔ ”یہ لیں۔“ انیل نے اپنا پن اس کی طرف

بڑھایا جس میں ہری روشنائی بھری تھی۔ ”لاؤ۔“ اس عورت نے پن لیا اور اخبار کے

پھٹے ہوئے کونے پر لکھنے لگی۔ ”میں نے ایک منک کوٹ مس۔“ وہ انیل

کی طرف پلٹی۔ ”انیل سائمن۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ پھر لکھنے لگی۔ ”میں نے ایک منک کوٹ مس انیل سائمن کو

پانچ سوڈالر میں فروخت کیا ہے۔“

بی بیلڈون

اس نے عبارت لکھنے کے بعد کاغذ اور قلم انیل

کی طرف بڑھا دیا۔ ”شکریہ۔۔۔۔۔ بہت بہت شکریہ مس۔۔۔۔۔ مسز

بی بیلڈون۔“ انیل نے کاغذ قلم لیتے ہوئے کہا۔

”شکریہ۔“ اس عورت نے کہا۔

”میرا خیال ہے تم زینے سے نیچے تو خود ہی اتر

جاؤ گی۔“ اس نے انیل سے پوچھا۔

”مجھے جلدی ہے کیونکہ مجھے لباس تبدیل کرنا

”فرمائیے۔“ دروازہ کھولنے والے نے پوچھا۔

”ہاں ہاں بالکل میں چلی جاؤں گی۔“ انیل

نے جواب دیا اور اس عورت نے دروازہ بند کر دیا۔

انیل اپنا پرس لیے کار میں آ بیٹھی اور آفس کی

طرف روانہ ہو گئی۔

کارڈرائیونگ کرتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ

اس نے یہ کوٹ خرید کر کہیں کوئی حماقت تو نہیں کی

اسے شبہ تھا کہ شاید یہ منک کوٹ نقلی نہ ہو اس لیے وہ

اسے اتنا سستا ملا ہو۔

جب وہ دفتر پہنچی تو ساڑھے آٹھ بجے تھے جبکہ

دفتر نو بجے کھلتا تھا اس نے کار پارک کی اور اس میں

بی بیٹھی رہی وہ بار بار منک کوٹ کی فریئر ہاتھ پھیر

رہی تھی جو دھوپ پڑنے سے چمک رہی تھی وہ بالکل

نیا کوٹ تھا اس پر کوئی ایسی شکن نہیں تھی جس سے یہ

اندازہ ہو کہ اسے کسی نے پہنا ہے۔ کوٹ کے کالر پر

دو حروف ”اے“ اور ”ایم“ لکھے تھے۔ جو بی بیلڈون

کا مخفف نہیں ہو سکتے تھے انیل کو خیال آیا کہ یہ

حروف بی بیلڈون کی منہ کے نام کا مخفف ہوں گے ان

حروف میں سے ”اے“ انیل کا مخفف ہو سکتا تھا

جبکہ ”ایم“ اس کے لیے بے کار تھا۔

وہ پانچ منٹ تک اپنی کار میں بیٹھی رہی پھر اپنے

کوٹ کو سنبھالتی ہوئی کار سے اتر کر فٹ پاتھ پر ٹھہرنے

والے انداز میں آہستہ آہستہ چلنے لگی گے ایک اسٹور

تھا جس پر کمبلری فرز کا بورڈ لگا تھا اچانک انیل کے

ذہن میں خیال آیا کہ منک کوٹ کے اصل یا نقل

ہونے کی پہچان کے لیے یہ بہترین جگہ ہو سکتی ہے وہ

اسٹور کے قریب پہنچ گئی اندر روشنی تھی اور کسی مرد کا

ہیوا نظر آ رہا تھا اس نے شوکیس کے شیشے کو ہلکے سے

کھٹکھٹایا اور کسی نے اسٹور کا دروازہ کھول دیا۔

”فرمائیے۔“ دروازہ کھولنے والے نے پوچھا۔



”میں ایک مشورہ لینا چاہتی ہوں۔“ اس نے کہا۔

”آپ اندر تشریف لے آئیں۔“ اس شخص نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا وہ ایک نوجوان تھا۔

”میرا خیال ہے کہ آپ اچھی فر کی پہچان رکھتے ہوں گے؟“ اس نے نوجوان سے پوچھا۔

”جی ہاں۔“

”مہربانی کر کے بتائیں کہ میں نے جو کوٹ پہنا ہوا ہے وہ کیسا ہے؟“

”تو پھر مہربانی کر کے آپ کوٹ اتار کر مجھے دے دیں۔“ اس نوجوان نے سگراتے ہوئے کہا۔

”میں اس کا جائزہ لے کر آپ کو بتاتا ہوں۔“

انہیل نے اس کے کہنے پر کوٹ اتار کر اس کے حوالے کر دیا اور نوجوان نے کاؤنٹر پر کوٹ بچھا کر اس پر انگلیاں پھیرنا شروع کر دیں وہ بغور اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

”کیا یہ منک ہے؟“ انہیل نے پوچھا۔

”جی ہاں بالکل یہ اصلی منک ہے۔“ نوجوان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”کیا یہ اچھی منک ہے بہت اچھی؟“ انہیل نے تجسس سے پوچھا۔

”جی ہاں بالکل۔“ نوجوان نے کہا پھر وہ کاؤنٹر کے قریب سے ہٹ گیا۔

”آپ ایک منٹ ٹھہریں میں ابھی آتا ہوں۔“ اس نے کہا اور اندر کی جانب سے کھلنے والے ایک دروازے سے اسٹور کے اندرونی حصے میں چلا گیا وہ اب انہیل کو نظر نہیں آ رہا تھا لیکن وہ اس کی آواز کی ہلکی ہلکی گونج سن سکتی تھی۔ وہ کسی سے آہستہ آہستہ باتیں کر رہا تھا پھر چند لمحوں بعد وہ واپس آ گیا تھا۔

”اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو فر کے متعلق بہت

کچھ بتا سکتا ہوں؟“ اس نے انہیل کا نام جاننا چاہا۔

”انہیل..... انہیل سائمن۔“ اس نے کہا پھر وہ اسے ایک اچھی منک کی خصوصیات بتانے لگا تھا اس نے اسے بتایا تھا کہ ایک اچھی منک کو کس طرح پہچانا جاسکتا ہے وہ غور سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ کافی دیر گزر جانے کے بعد اسے دفتر کا خیال آیا لیکن اس نے آج منک کوٹ خریدنے کی خوشی میں چھٹی کرنے کا فیصلہ کیا تھا وہ یہ سارا دن خوش رہ کر گھوم پھر کر گزرتا رہا جیسا کہ کچھ دیر بعد اسٹور کے دروازے کی گھنٹی بجی تھی۔

”معاف کیجیے گا۔“ نوجوان نے اس سے کہا اور دروازہ کھولنے کے لیے آگے بڑھا۔

”کیا تم نے ہی فون کیا تھا؟“ آنے والے نے پوچھا۔

”میرا نام جارج ہے اور میرا تعلق پولیس ڈیپارٹمنٹ سے ہے۔“ آنے والے نے اپنا تعارف کرایا۔

”جی ہاں جناب۔“ نوجوان نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

”لیفٹیننٹ جارج یہ مس انہیل سائمن ہیں جن کے پاس ان کوٹوں میں سے ایک کوٹ ہے جو پچھلے جون میں کارسن اسٹور سے چرائے گئے تھے۔“

”واقعی؟“ جارج نے اندر آتے ہوئے کہا۔

”یہ کوٹ رعایتی قیمت میں بھی بارہ ہزار ڈالر سے کم نہیں ہوگا میں معافی چاہتا ہوں مس سائمن۔“

نوجوان اسٹور کیپر نے انہیل کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔

”مجھے اس کی رپورٹ ہر حالت میں کرنا تھی کیونکہ اگر میں ایسا نہ کرتا تو ایک اچھا شہری ہونے کا حق ادا نہ کر سکتا تھا۔“

”حق ادا نہ کر سکتا تھا۔“

”حق ادا نہ کر سکتا تھا۔“

”حق ادا نہ کر سکتا تھا۔“

”حق ادا نہ کر سکتا تھا۔“

”حق ادا نہ کر سکتا تھا۔“

”حق ادا نہ کر سکتا تھا۔“

”حق ادا نہ کر سکتا تھا۔“



”بہت خوب۔“ انیل نے کہا۔

”کیا تم سمجھتے ہو کہ میں چور ہوں۔ میں نے یہ کوٹ چرایا ہے؟“ انیل نے غصے سے کہا۔

”نہیں۔“ نو جوان نے ناگواری سے کہا۔

”اگر تم نے یہ کوٹ چرایا نہیں ہے تو یہ تمہیں کہاں سے ملا؟“ لیفٹیننٹ جارج نے اس کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

جارج کے سوال پر انیل نے سارا واقعہ اسے سنا دیا تھا۔

”ٹھیک ہے پھر ہم اس جگہ چلتے ہیں۔“ جارج نے کہا۔

”کیا میں بھی آپ کے ساتھ چلوں لیفٹیننٹ؟“ اسٹور کیپر نے پوچھا۔

”ضرور۔“ جارج نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔“ نو جوان نے کہا اور اندر سے کسی کو آواز دے کر پکارا۔

”البرٹ تم ذرا اسٹور کا خیال رکھنا میں ابھی آتا ہوں۔“

”مسٹر کمبلری یہ کوٹ کسی محفوظ جگہ رکھ دو۔“ لیفٹیننٹ جارج نے اسٹور کیپر کو مخاطب کر کے کہا۔

”بہت بہتر۔“ کمبلری نے کہا۔

پھر وہ سب لیفٹیننٹ جارج کی کار میں ولسن اسٹریٹ تک پہنچے۔

”مجھے یقین نہیں ہے کہ مجھے میری رقم کبھی واپس مل سکے گی۔“ انیل نے لیفٹیننٹ جارج کی کار میں بیٹھے بیٹھے کہا۔

”میں نے بھی کیا حماقت کی ہے۔“ وہ خود سے ہمکلام تھی۔ اس کی بات کا کسی نے جواب نہیں دیا تھا۔

پھر وہ اس گھر کے سامنے اترے جہاں سے

انیل نے منک کوٹ خریدا تھا۔

”چلو اب ہمیں راستہ دکھاؤ۔“ لیفٹیننٹ جارج نے اس سے کہا اور وہ دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

”ہمیں زینوں سے اوپر جانا ہوگا دائیں جانب سے۔“ اس نے بتایا وہ دونوں اس کے ساتھ ہی اوپر پہنچے تھے۔ اس کی دستک پر ایک عورت نے دروازہ کھولا جس کا قد لمبا اور سر کے بال سرخی مائل بھورے تھے لیکن انیل نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

”جی فرمائیے۔“ دروازہ کھولنے والی عورت نے پوچھا۔

”ہم منک کوٹ کے بارے میں پوچھنے آئے ہیں۔“ سارجنٹ نے کہا۔

”میں سمجھی نہیں؟“ اس عورت نے حیرت سے کہا۔

”اس لڑکی نے تم سے ایک کوٹ خریدا تھا؟“

”میں اب بھی نہیں سمجھی۔“ اس عورت نے کہا۔

”یہ وہ عورت نہیں ہے۔“ انیل نے لیفٹیننٹ سے کہا وہ خود کو بہت چھوٹا اور خوفزدہ سا محسوس کر رہی تھی۔

”یہ وہ نہیں؟“ لیفٹیننٹ نے بھی حیرت سے انیل کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”پھر مس سیلڈون کہاں ہے؟“

”یہاں اس نام کا کوئی نہیں رہتا۔“ عورت نے جواب دیا۔

”میرا نام مسز جان اسپینسر ہے۔“ اس نے اپنا نام بتایا۔

”کیا وہ گھر یہی ہے؟“ لیفٹیننٹ نے انیل سے پوچھا۔

”ہاں یہ وہی گھر ہے؟“ انیل نے جواب دیا۔

”مسز اسپینسر میرا نام لیفٹیننٹ جارج ہے میرا



تعلق پولیس ڈپارٹمنٹ سے ہے کیا ہم لوگ اندر آ سکتے ہیں؟“

”جی ہاں آپ اندر آ جائیں لیکن میں ابھی تک اصل معاملے کی تہہ تک نہیں پہنچ سکی ہوں۔“ مسز اسپینسر نے انہیں اندر آنے کی اجازت دیتے ہوئے کہا۔

”کیا یہی گھر ہے؟“ اندر آنے کے بعد پولیس آفیسر نے ایک بار پھر ائیل نے پوچھا۔

”ہاں۔“ ائیل نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”مجھے یقین ہے کہ یہ وہی گھر ہے۔“

”اس لڑکی نے آج صبح یہاں سے ایک منک کوٹ پانچ سو ڈالر میں خریدا ہے۔“ پولیس آفیسر نے مسز اسپینسر سے کہا۔

”واقعی؟“ مسز اسپینسر نے ہنستے ہوئے کہا اندازہ ایسا ہی تھا جیسے انہوں نے کوئی لطیفہ سنا ہو لیکن میرے پاس تو کبھی کوئی منک کوٹ نہیں تھا۔“ اس نے بدستور ہنستے ہوئے کہا پھر اس نے خود کو ذرا سنبھالا۔

”میں معافی چاہتی ہوں دراصل میں کچھ سمجھ نہیں پارہی ہوں، میں ابھی پندرہ منٹ پہلے ہی سوکر اٹھی ہوں۔“ مسز اسپینسر نے کہا۔

”یہاں کوئی اور تو نہیں رہتا؟“ پولیس آفیسر نے پوچھا۔

”نہیں۔“

”آپ یہاں کب سے رہتی ہیں؟“

”دو سال سے۔“

”اگر میں یہاں اطراف کا جائزہ لینا چاہوں تو آپ کو اعتراض تو نہیں ہوگا۔“

”نہیں۔“ مسز اسپینسر نے سوچتے ہوئے کہا اور لیفٹیننٹ اندر جانے والے راستے کی طرف بڑھ گیا مسز اسپینسر ائیل کی طرف مخاطب ہو گئی تھی۔

”آپ بیٹھیں مس..... مس؟“

”یہ مس ائیل سائمن ہیں اور مجھے کمبلری کہتے ہیں۔“ نو جوان اسٹور کیپر نے تعارف کرایا۔

”یہ سب کیا ہے؟“ مسز اسپینسر نے پوچھا۔

”میں بھی اچھی طرح نہیں جانتا۔“ کمبلری نے کہا اور ائیل کو بیٹھنے کا اشارہ کرتا ہوا خود بھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

”یہاں تو اور کوئی نہیں ہے؟“ لیفٹیننٹ نے واپس کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

”تمہاری وہ مس یا مسز بیلڈون کیسی تھیں، ان کا حلیہ بتاؤ؟“ اس نے ائیل کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”دراز قد اور سرخی مائل بھورے بالوں والی۔“ ائیل نے جواب دیا۔

”یہاں تو ایسا کوئی نہیں ہے ہو سکتا ہے تم سے کوئی غلطی ہوئی ہو؟“ مسز اسپینسر نے مداخلت کی۔

”ہاں ممکن ہے۔“ پولیس آفیسر نے کہا وہ چبھتی ہوئی نظروں سے ائیل کو دیکھ رہا تھا۔

”اخبار کے اشتہار کے بارے میں کیا خیال ہے؟ اس پر اس گھر کا پتا ہی دیا گیا ہے اور میں اسی پتے پر یہاں آئی تھی۔“ ائیل نے جلدی سے کہا۔

”کیا آپ کے پاس آج کا اخبار ہے محترمہ؟“ پولیس آفیسر نے مسز اسپینسر سے پوچھا۔

”نہیں میں معافی چاہتی ہوں میرے پاس کوئی اخبار نہیں ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”آپ یہی کہہ رہی ہیں تاکہ آپ کے پاس کوئی منک کوٹ نہیں تھا اور آپ نے کوئی کوٹ نہیں بیچا۔“ پولیس آفیسر نے پوچھا۔



”جی ہاں میں نے یہی کہا ہے؟“ مسز اسپینسر نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے شکریہ۔“ پولیس آفیسر نے کہا اور پھر کمبلری اور انیبل سے مخاطب ہوا۔

”آؤ چلیں۔“ اس نے بیرونی دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ انیبل اور کمبلری بھی اس کے ساتھ ہی باہر آئے تھے اور خاموشی سے زینے اترتے ہوئے بیچے گئے۔

”مجھے یقین ہے کہ یہاں کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔“ انیبل نے کہا۔

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ کمبلری نے اس کی تائید کی۔

”ہاں۔“ پولیس آفیسر نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا اور اس کے ساتھ ہی انیبل نے بغیر سوچے سمجھے بائیں جانب والے دروازے کی اڑھائی گھنٹی کا بٹن دبا دیا جس کا نمبر چار سو چودہ تھا۔

”یہ کیا کر رہی ہو؟“ پولیس آفیسر نے پوچھا۔

”ہمیں اخبار تو دیکھنا چاہیے میں آپ کو اخبار دکھاؤں گی آج صبح یہاں اخبار آیا ہے میں نے دیکھا تھا وہ دروازے کے سامنے پڑا تھا۔“

اسی وقت چار سو چودہ کا دروازہ کھلا اور ایک مرد نے جھانک کر باہر دیکھا۔

”جی؟“

”کیا ہم آپ کا اخبار دیکھ سکتے ہیں؟“ کمبلری نے کہا۔

”میرا..... مم.....!“ اس شخص نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر چپ ہو گیا۔

”میرا تعلق پولیس ڈپارٹمنٹ سے ہے اور مجھے لیفٹیننٹ جارج کہتے ہیں پولیس آفیسر نے انیبل کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے کہا۔

”پولیس؟“

”تمہارے یہاں آج کا اخبار آیا ہے؟“

”وہ..... ہاں..... لیکن وہ تمہیں کیوں چاہیے؟“

”میں صرف ایک نظر اخبار دیکھنا چاہتا ہوں اور چند سوالات پوچھنا چاہتا ہوں۔“ پولیس آفیسر نے کہا۔

”بہتر۔“ اس شخص نے کہا اور پورا دروازہ کھول دیا اور وہ تینوں گھر میں داخل ہو گئے۔

”تم اس جگہ کے مالک ہو؟“ پولیس آفیسر نے پوچھا۔

”جی ہاں میرا نام فرگوسن ہے بتائیں کیا بات ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”بس، چند سوالات پوچھنا ہیں پہلے تم اپنا اخبار دکھا دو۔“ پولیس آفیسر کے کہنے پر فرگوسن نے ایک میز سے اخبار اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دیا جسے اس نے انیبل کو دے دیا اور انیبل اس کے اشتہارات والے صفحے پر جھک گئی۔

”یہ..... یہ ہے وہ اشتہار۔“ اس نے کہا اور اس کے ساتھ ہی ”ہلری اور لیفٹیننٹ دونوں ایک ساتھ اس اخبار پر جھک گئے پھر ان دونوں کے سر تائید میں ملنے لگے تھے۔

”کیا بات ہے؟“ فرگوسن نے پوچھا۔

”مجھے تمہاری بات پر یقین ہے؟“ کمبلری نے انیبل سے کہا۔

”اس کے علاوہ ایک بات اور ہے۔“ انیبل نے کچھ اور کہنا چاہا لیکن اس سے پہلے ہی پولیس آفیسر فرگوسن سے مخاطب ہو گیا۔

”اس لڑکی کا کہنا ہے کہ آج صبح اس نے ایک قیمتی سنک کوٹ اوپر والے گھر سے خریدا ہے۔“

”اوپر سے؟ مسز اسپینسر سے، لیکن میں نے تو



اسے کبھی کوئی منک کوٹ پہنے نہیں دیکھا۔“  
”کبھی نہیں دیکھا، کیا تم شادی شدہ ہو مسٹر فرگوسن؟“ آفیسر نے پوچھا۔

”نہیں۔“ اس نے جواب دیا اس کی نظریں پولیس آفیسر کی نظروں کا تعاقب کر رہی تھیں جو ایک گری پر رکھے ہوئے ادھورے سوٹر پر جمی تھیں جسے کوئی خاتون بی بن سکتی تھی۔

”میری بہن مجھ سے ملنے آتی رہتی ہے وہ چند روز کے لیے یہاں آئی ہے اور اس وقت بازار گئی ہوئی ہے۔“ فرگوسن نے کہا۔

”اگر میں اطراف کا جائزہ لوں تو تمہیں اعتراض تو نہیں ہوگا؟“

”نہیں..... بالکل نہیں.....!“ فرگوسن نے جواب دیا اور لیفٹیننٹ اس کے ساتھ اس کے گھر کا جائزہ لینے چلا گیا کمرے میں انیبل اور کمبلری رہ گئے تھے۔

”تم کیا کہنے والی تھیں مس انیبل؟“ کمبلری نے جلدی سے پوچھا۔

”یہ وہ آدمی نہیں ہے۔“  
”کیا مطلب؟“

”میں نے آج صبح جس آدمی کو یہاں سے اخبار اٹھاتے دیکھا تھا وہ یہ نہیں تھا۔“ انیبل نے کہا۔

”لیکن تم نے کہا تھا کہ تم نے ایک مردانہ ہاتھ دیکھا تھا پھر تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ وہ کس کا ہاتھ تو ہو سکتا ہے؟“

”اس نے اپنی کلائی پر گھڑی الٹی باندھی ہوئی تھی یعنی گھڑی کا فیہ اوپر کی طرف تھا اور گھڑی کلائی کی اندرونی جانب۔“ انیبل نے کہا۔

”ادھر“ کمبلری نے پر تشویش لہجے میں کہا۔  
”مسٹر کمبلری ہم جس عورت سے ملے وہ اصل

عورت نہیں ہے ہم جس مرد سے ملے وہ اصل مرد نہیں ہے لیکن یہ وہی جگہ ہے۔“ انیبل نے کہا۔  
”شش۔“ کمبلری نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اس وقت پولیس آفیسر اور فرگوسن کمرے میں داخل ہوئے۔

”ٹھیک ہے مسٹر فرگوسن ہم آپ کو پھر زحمت دیں گے۔“ پولیس آفیسر نے فرگوسن سے کہا اور کمبلری اور انیبل کے ساتھ گھر سے باہر آ گیا جہاں پورچ میں مسز اسپنسر کئی عورتوں اور مردوں کے درمیان برہم کھڑی تھی اس کے ہاتھ میں اخبار تھا اور وہ انہیں سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”لیفٹیننٹ جارج مہربانی کر کے میرا پیچھا ان لوگوں سے چھڑاؤ۔“ اس نے پولیس آفیسر کو آواز دی۔  
”انیبل بتاؤ کہ یہ اشتہار غلطی سے چھپا ہے میں نے کوئی اشتہار نہیں چھپوایا اور میرے پاس فروخت کے لیے کوئی منک کوٹ نہیں ہے۔“

”یہ صحیح ہے حضرات۔“ پولیس آفیسر نے اونچی آواز میں کہا۔

”ایسا لگتا ہے کہ اخبار میں میں یہ اشتہار غلطی سے چھپ گیا ہے۔“

اس نے کہا اور لوگ اس کے گرد جمع ہونے لگے۔

”ادھر وہ آدمی..... وہ وہی ہے۔“ انیبل نے ایک سمت کھڑے شخص کی طرف اشارہ کیا جس نے براؤن رنگ کا سوٹ پہنا ہوا تھا کمبلری تیزی سے اس کی طرف چھٹا وہ شخص وہاں سے فرار ہونا چاہتا تھا لیکن کمبلری نے اسے موقع نہیں دیا اور گیٹ سے نکلنے سے پہلے ہی اسے پکڑ لیا سب لوگ ان کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

”یہ سب کیا ہے کمبلری؟“ پولیس آفیسر نے اس



کی طرف آتے ہوئے پوچھا۔ کوئی بھی استعمال کر سکتا ہے۔“ پولیس آفیسر نے کہا

اور اسی وقت کمبلری بول پڑا۔ ”یہ..... یہ وہی آدمی ہے جس نے صبح چار سو چودہ نمبر میں سے اخبار اٹھایا تھا۔“ انیل نے کہا۔ ”آپ اس کی گھڑی دیکھیں۔“ انیل کے کہنے پر پولیس آفیسر نے اس شخص کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور گھڑی دیکھی۔

”کیوں کیا بات ہے؟“ اس نے انیل سے پوچھا۔

”اس نے گھڑی کا فیتہ باہر کی جانب رکھا ہے اور اسی انداز سے گھڑی اس ہاتھ پر بھی بندھی ہوئی تھی جس نے صبح اس کے گھر کے باہر سے اخبار اٹھایا تھا۔“ انیل نے بتایا پھر اس کی نظریں زمین پر پڑے اخبار کی طرف اٹھ گئیں۔

”اس کا اخبار اٹھالیں۔“ اس نے کہا اور پولیس آفیسر نے وہ اخبار اٹھالیا۔

”تمہیں کیسے معلوم کہ یہ اس کا اخبار ہے؟“ پولیس آفیسر نے پوچھا۔

”یہاں موجود تمام لوگوں کے ہاتھوں میں اخبار ہے اور اس کے ہاتھ میں نہیں اور ایک ہی اخبار نیچے پڑا ہے یہ اس کا ہی ہے۔“ انیل کی اس بات پر پولیس آفیسر نے گھوم کر چاروں طرف دیکھا انیل درست کہہ رہی تھی۔

”پھر؟“

”پھر یہ کہ یہ اس کا نہیں میرا اخبار ہے۔“ انیل نے ایک اور انکشاف کیا۔

”آج صبح یہاں سے واپس جاتے ہوئے میں اپنا اخبار مسز اسپینسر کے گھر میں بھول گئی تھی اس میں موجود اشتہار پر میں نے ہرے رنگ کی روشنائی سے لہریے دار لکیر کھینچی ہوئی ہے۔“

”یہ کوئی خاص پہچان نہیں ہے ہر روشنائی تو

”جی ہاں۔“

”اس کا مطلب ہے کہ تمہیں کوئی نہیں جانتا تم یہاں نہیں آئے تھے تب تو تم بے گناہ ہو۔“ پولیس آفیسر نے براؤن سوٹ والے شخص سے کہا۔

”جی ہاں۔“

”جی ہاں۔“



”تو کیا تم اپنے ہاتھ پر بندھی ہوئی گھڑی کی رسید دکھا سکو گے؟“ پولیس آفیسر نے کہا۔  
 ”جی وہ..... وہ تو میرے گھر پر ہے۔“ پھر اس نے اپنے گھر کا پتا بتایا۔

”ہیری۔“ اس شخص پر نظر پڑتے ہی مسز اسپینسر چیخنی۔ اس نے ابھی تک ہیری کو نہیں دیکھا تھا۔  
 ”اوہ اسپینسر، میں نے تمہیں پہلے بھی منع کیا تھا کہ ایک شادی شدہ شخص پر وقت ضائع مت کرو۔“ قریب کھڑے فرگوں نے کہا اور پولیس آفیسر حیرت سے اس سرخ بالوں والی عورت کو دیکھنے لگا جسے وہ ابھی تک شادی شدہ سمجھ رہا تھا۔ کیونکہ اس نے مسز اسپینسر کہہ کر اپنا تعارف کرایا تھا۔

”بھلا ہیری اور مجھے کیسے پتا چلنا کہ اس کی بیوی ہم دونوں کے ملنے پر اتنی خفا ہو جائے گی کہ ہیری کا دیا ہوا یہ کوٹ بھی فروخت کر دے گی؟“ اسپینسر نے کہا جسے فرگوں نے اپنی بہن بتایا تھا۔  
 ”خاموش ہو جاؤ۔“ براؤن سوٹ والے شخص نے کہا۔

پھر لیفٹیننٹ جارج ہیری فرگوں اور مس اسپینسر کو اپنی کار کی طرف لے گیا۔ کمبلری بھی اس کے پیچھے تھا وہاں کچھ دیر تک باتیں ہوتی رہیں جس کے بعد پولیس آفیسر مس اسپینسر اور ہیری کو اپنے ساتھ کار میں بٹھا کر لے گیا اور کمبلری واپس انیبل کے پاس چلا آیا تھا۔

”ہمیں ایک گھنٹے بعد اپنا بیان لکھوانے پولیس اسٹیشن جانا ہے۔ میں منک کوٹ لے کر پولیس آفیسر کے پاس جاؤں گا تم میرے ساتھ چلو گی؟“ کمبلری نے انیبل سے پوچھا اور اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”جس عورت نے تمہیں منک کوٹ فروخت کیا

تھا وہ ہیری کی بیوی تھی۔“ کمبلری نے اسے بتایا۔  
 ”اور ہیری اور اس کی بیوی دونوں چور ہیں مس اسپینسر جو خود کو مسز اسپینسر کہہ رہی تھی فرگوں کی بہن ہے وہ ہیری سے محبت کا ڈھونگ رچا رہی تھی جس کا اس کی بیوی کو علم ہو گیا اور اس نے ہیری سے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا یہ بات ہیری نے ہی پولیس آفیسر کو بتائی ہے۔“

”کوٹ بیچنے کی وجہ رقم کی ضرورت بھی تو ہو سکتی ہے۔“ انیبل نے کہا۔  
 ”ہاں لیکن چوری کا کوٹ فروخت کرنا بھی تو حماقت ہے۔“ کمبلری نے جواب دیا۔  
 ”ہاں لیکن وہ کوٹ اس کے سائز کا بھی تو نہیں تھا۔“

”ہوں۔“ کمبلری نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔  
 اور آپ نے تو حد کر دی میرے کہنے پر ہیری جیسے عادی مجرم کو پکڑنے کے لیے دوڑ پڑے اگر وہ آپ کو کوئی نقصان پہنچا دیتا تو؟“

”نہیں میں نے کوئی حماقت نہیں کی میرا خیال ہے کہ میں نے زندگی میں ایک یہی اہم کام کیا ہے۔“ کمبلری نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا اور اس کا ہاتھ نھام کر اس کے ساتھ قدم ملاتا آہستہ آہستہ ولسن اسٹریٹ سے دور ہوتا چلا گیا۔







SCANNED BY

READING  
Section





## روپا بروپا

سلیم اختر

اس دنیا میں لوگوں کے کلی روپ ہوتے ہیں 'ہر روپ دوسرے سے جدا اور نرالا ہوتا ہے۔ کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس نے دنیا کو جان لیا ہے' سمجھ لیا ہے' جو بھی دنیا کے روپ کو سمجھنے کا دعویٰ کرتا ہے اس کے سامنے ایک نیا بہر روپ سامنے آ جاتا ہے۔ اس رنگ بدلتی دنیا کا احوال' نئے افق کے کدہ مشق لکھاری محمد سلیم اختر کے قلم سے ایک طویل ناول کی پہلی قسط۔



READING  
Section

SCANNED BY AMIR



میں چھوٹے سے ذہن کا چھوٹا سا آدمی ہوں آدمی کے اندر بڑائی یوں نہیں ہوتی کہ اس کے پاس کاریں، کوٹھیاں، جائیدادیں، فرم، فیکٹریاں، تعلقات، پولیس کے افسران، ہر دور حکومت کے وزراء، غیر ملکی سفیر و کیل، جج، بیرٹریہ سب اس کے دوست ہوں اس کے آگے پیچھے پھرتے ہوں اس کی عزت کرتے ہوں۔

میرے ارد گرد ایسے تمام لوگ موجود ہیں۔ میری عظیم الشان کوٹھی میں ایک دن میں لوگ ہر چیز نہیں دیکھ سکتے ملازمین اور ساری چیزیں جو کہ انسانی ضرورت سے تعلق رکھتی ہیں میری زندگی میں موجود ہیں لیکن بنیادی طور پر ایک تشنگی میری ذات میں چھپی ہوئی ہے سب سے بڑی چیز انسان کے اندر یہ ہوتی ہے کہ وہ اندر سے مطمئن ہو میں نہیں جانتا کہ وہ کون لوگ ہیں جو مکمل ذات کے مالک ہیں۔ کہیں نہ کہیں کوئی خامی، کوئی نہ کوئی کمی انسان میں رہ جاتی ہے میں..... جسے پوچھا جاتا ہے جسے یہ تمام لوگ بڑے احترام اور اہتمام کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں جس کی طرف پیٹھ کر کے لوگ جانا پسند نہیں کرتے بلکہ ان کے ہاتھ بندھے ہوتے ہیں اور سر جھکے ہوتے ہیں اور وہ اُلٹے قدموں سے چل کر میرے آستانے سے باہر نکلتے ہیں کیونکہ میں بہت بڑا پیر ہوں۔

لوگ مجھے درویش مانتے ہیں مگر جانتے ہیں آپ کہ اس درویش میں کیا کمی ہے اس کے ماں باپ نہیں ہیں وہ نہیں جانتا کہ ماں کیا ہوتی ہے وہ نہیں جانتا کہ باپ کیا ہوتا ہے اور یہ اسے کبھی نہیں پتہ چل سکا اور جو پتہ چلا ہے وہ بڑا تکلیف دہ ہے جسے بیان نہیں کیا جاسکتا یہ تشنگی میری ذات میں آج تک چھپی ہوئی ہے وہ سارے لوگ جو میرے ارد گرد موجود ہیں میری بے حد عزت کرتے ہیں۔ میں نے ملکی سیاست میں کبھی حصہ نہیں لیا لیکن سیاست دانوں کی ہر طرح خدمت

کی اور کسی ایسے لیڈر کو شکایت کا موقع نہیں دیا جس کے برسرِ اقتدار آنے کے امکانات ہوں۔ آپ چاہیں تو اسے میری سیاسی بصیرت بھی کہہ سکتے ہیں۔ بعض اوقات تو سٹے اور ریس میں جیتنے والے گھوڑے کے نمبر کی طرح یہ اندازے بھی کئے گئے ہیں کہ میں کسے سپورٹ کر رہا ہوں اور جسے میں سپورٹ کر رہا ہوتا ہوں اس کی کامیابی کے امکانات سو فیصد ہو جاتے ہیں خواہ اس کی سیاسی پوزیشن کتنی ہی کمزور کیوں نہ ہو اور وقت ثابت کرتا ہے کہ میرا فیصلہ کبھی غلط نہیں ہوتا۔ اس طرح میں ایک سیاسی درویش کی حیثیت بھی رکھتا ہوں۔

میں بات کر رہا تھا بڑے لوگوں کے چھوٹا پن چھپانے کی میں بھی خود کو ایک حد تک چھپانا چاہتا ہوں۔ بس اس حد تک جہاں ضروری سمجھتا ہوں لیکن میں نے آپ کو یہ بتا دیا کہ میرے ماں باپ اس کائنات میں ہوں گے تو ضرور لیکن میں ان سے لاعلم ہوں۔ میں اپنے آپ کو کچھ بھی کہہ سکتا ہوں کیونکہ کوئی میرا ماضی نہیں جانتا لیکن میں بہت سی روایات سے منحرف ہوں۔ روایت سے انحراف کے بارے میں مختصر کہوں گا کہ ہر بچہ معصوم ہوتا ہے بے بس ہوتا ہے اچھا ہوتا ہے نیک ہوتا ہے نیک رہنا چاہتا ہے یا آپ پر منحصر ہے کہ آپ اسے کیا بتاتے ہیں۔

تخلیق کنندہ اسے گوشت پوست کے لٹھڑے کی شکل میں روح پھونک کر آپ کے حوالے کر دیتا ہے اس کے بعد آپ کا کام شروع ہوتا ہے کہ آپ اس کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں بات تقدیر کے حوالے کر دی جاتی ہے جتنی طور پر بیوں، ولیوں اور درویشوں نے نیکیوں اور بدی کی تشہیر کر دی ہے کھلے لفظوں میں سمجھا دیا ہے کہ اس امتحان گاہ میں آپ کو پیر دینے ہیں ان پر کیا لکھنا ہے یہ آپ کا کام ہے۔ بول کے درخت پر آم نہیں لگتے۔

خیر میرا خیال ہے میں کچھ زیادہ بول گیا اس لیے



اس موضوع کو ختم کرتا ہوں بات روایات سے منحرف ہونے کی ہے اس لیے اپنی صفائی پیش کرنے لگا تھا ہر شخص یہی کہہ رہا ہے کہ سماج میں معاشرے میں اور ماحول میں برائیاں بڑھتی جا رہی ہیں اور کوئی بھی اپنی ذمہ داری قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے پہلے اپنے اطراف پر الزامات لگائے جاتے ہیں اس کے بعد ماضی کا رخ کیا جاتا ہے اب یہ بتائیے کہ ماضی میں جو بگاڑ پیدا ہو گیا ہے وہ حال میں کیسے دور کیا جائے ماضی والے تو جا چکے آپ جا رہے ہیں چلتے رہیں جو ہو گا دیکھا جائے گا۔

میں نے جس کوٹھی میں آنکھ کھولی وہ بھی بے مثال تھی، لیکن میری اس کوٹھی سے نہیں کمتر جو اس وقت میری ذاتی کوٹھی ہے یہ لوگ پتہ نہیں کیا نمبر رکھتے تھے صف اول کے لوگ کہلاتے تھے اس وقت سے جب وہ دس نمبری تھے پھر وہ نو نمبر کہلائے تو سے سات تک، پہنچے اور پھر تین نمبری ہوئے یہاں تک کہ ایک نمبری ہو گئے اور ایک نمبری ہونے کے بعد انہوں نے سارے نمبر بھلا دیئے اور اپنے ہر دور کے رازداروں کے دشمن بن گئے۔ سمجھ رہے ہیں نا آپ ساحل سمندر پر آباد یہ عظیم الشان کوٹھی بہت خوبصورت بنی ہوئی تھی کیونکہ جب میں نے ہوش سنبھالا تو میں نے اسی کوٹھی کو دیکھا لیکن سونے کے چمچے کے ساتھ نہیں جناب بلکہ ہاتھ میں ملے جھاڑن کے ساتھ جس سے میں کمرے کی صفائی کرتا تھا۔ اس کوٹھی میں بے شمار کمرے تھے جنہیں بے شمار لوگ صاف کیا کرتے تھے، لیکن چونکہ میری عمر کم تھی اس لیے میرے حصے میں صرف تین کمرے تھے۔

کیسی دلچسپ بات ہے انسان اپنے بارے میں سب کچھ جانتا ہے وہ کچھ بھی جو دوسرے نہیں جانتے لیکن زندگی لانے کے بعد وہ ایک ایسے وقت کو نہیں جانتا

جو اس کا اپنا ہوتا ہے اس کے بارے میں صرف دوسرے جانتے ہیں ان کی مرضی ہے بتائیں یا نہ بتائیں اور وہ وقت ہوتا ہے عمر کے ابتدائی سال کہاں پیدا ہوئے کیوں پیدا ہوئے کیسے پروان چڑھے یہ جھاڑن ہاتھ میں کہاں سے آیا جس کوٹھی میں صفائی سنبھالی کرتا تھا وہاں اتنے لوگ آباد تھے کہ یہاں کے سب کے نام گنوانے بیٹھ جاؤں تو شاید مشکل پیش آ جائے ہاں البتہ ایک ایک کر کے ان سب سے روشناس کراتا ہوں گا۔ ویسے زندگی میں کائنات کی سب سے پہلی ساخت ماں ہوئی ہے چنانچہ میں اس کہانی کا دوسرا کردار اسے بنا رہا ہوں کیونکہ پہلا کردار تو میں خود ہوں میں..... جس کا نام آپ کچھ بھی تصور کر لیجئے بچپن میں مجھے جہانو کہا جاتا تھا لیکن اس کے بعد نام تبدیل ہوا اور آج کل میں جہانزیب شاہ کہلاتا ہوں۔

جہانزیب شاہ اور اس کے بعد میں اپنی ماں کے بارے میں بتاؤں گا میری ماں کا نام حسن بانو تھا، بعض والدین اپنی اولاد کے ساتھ ایسا ہی مذاق کرتے ہیں کوئلے جیسی سیاہ موٹی ناک لمبے دانت نام حسن بانو یا ہتھوڑے جیسے ہاتھ گھوڑے جیسی شکل بکرے جیسی آواز اور نام شکیل احمد جمیل احمد تو میری ماں حسن بانو تھی اور یہ حسن بانو اس کوٹھی کے سرورنٹ کوارٹر نمبر سولہ میں رہتی تھی۔ اس کا کام چھوٹے بچوں کے کپڑے واشنگ مشین میں دھونا تھا کچن کے برتن دھونا تھا اور بس اس کے بعد عیش ہی عیش۔

عیش تو خیر میں بھی کرتا تھا تین کمروں کا فرنیچر صاف کر لؤ پھر چھٹی اس کے بعد لان پرآوارہ گردی کرو چاہے باہر نکل جاؤ شام کو بڑے آدمیوں کے بچوں کو کھیلنے دیکھو مگر ان کے پاس نہ جاؤ ہاں اگر خوبصورت گیند اچھل کر تم تک آ جائے تو اسے اٹھا کر ان کی طرف پھینک دو مگر دور سے قریب جانے کے لیے



خصوصی ممانعت تھی۔ ماں کے بارے میں جذباتی لوگ بہت سی کہانیاں سناتے ہیں کہ بچہ پیدائش کے فوراً بعد اس کی آغوش کا شناسا ہو جاتا ہے اس کے لیے ہمسکتا ہے اس کے لیے روتا ہے ماں اسے زمانے کے سرد و گرم سے بچاتی ہے، مامتا نامی کوئی جذبہ یا چیز ہوتی ہے مگر میری ماں کے صندوق میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی کیونکہ جب اس عظیم الشان کوٹھی میں جو سمندر کے ساحل پر واقع تھی اور سمندر کی طرف سے ٹھنڈی لہریں اٹھ کر اس کی جانب رخ کرتی تھیں اور سرد ہوائیں چلتی تھیں تو میں نے خود کو ماں کی آغوش میں نہیں پایا۔ سینے پر ہوا لگی تو الٹا ہو گیا، کمر پر ہوا لگی تو پھر سیدھا ہو گیا، ہاتھ پیروں کو ہوا لگتی تو گھڑی بن جاتا اور پھر اسی طرح صبح ہو جاتی، قصہ ختم، ماں کی آغوش تو کبھی نہ پائی بلکہ بعض اوقات تو ماں ہی نہ پائی اور کمرے کی دیواروں پر بھوت چلتے ہوئے پائے جو آنکھیں زور سے بند کر لینے سے بھاگ جاتے تھے۔

خیر بات حسن بانو کی تھی جسے میری ماں کہا جاسکتا تھا اور مجھے اس کا بیٹا، باپ کے بارے میں میں نے نہ کبھی کسی سے پوچھا اور نہ مجھے کسی نے بتایا مجھے خیال ہی نہیں تھا کہ باپ بھی ہوتے ہیں اور ضروری ہوتے ہیں، بہت دن تک خیال نہ آیا تھا، حسن بانو میرے لیے کچھ نہیں کرتی تھی میں بھی اسے اپنے لیے کچھ کرنے کو نہیں کہتا تھا، عادت ہی نہیں تھی بچپن سے البتہ ایک عادت ضرور تھی مجھ میں وہ یہ کہ میں لوگوں کو دیکھتا تھا ان سے سیکھتا تھا ان کے اچھے برے میں تمیز کرتا تھا اس طرح کاروبار زندگی چل رہا تھا۔

اس گھر میں بہت سے بچے تھے بہت سے بڑے تھے ہر عمر اور ہر فکر کے لوگ، کچھ آقا تھے کچھ غلام تھے مجھے ان کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا، لیکن میں انہیں ضرور جانتا تھا، یعنی ان سر کو جو پڑھانے کے لیے

آیا کرتے تھے اور جو کچھ سران بچوں کو پڑھاتے تھے وہ میں بھی سیکھ لیتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ہمایوں بابر بادشاہ کا بیٹا تھا، قائد اعظم نے پاکستان بنایا تھا اور لیاقت علی خان شہید ہوئے تھے ایسی لاتعداد باتیں میں سیکھ گیا تھا اور میری معلومات احمد میاں سے کسی طور کم نہیں تھیں۔

بہت سے بڑے تھے بہت سے چھوٹے تھے لیکن سب سے بڑے جو تھے ان کا نام حیدر شاہ تھا، خیر اپنے آغاز کا تعارف کتنا اچھا لگتا ہے بتایا نہیں جاسکتا، میں نے آپ کو اپنی زندگی کے دور رخ فوراً بتا دیئے، یعنی ایک وہ رخ جب میرے ہاتھ میں جھاڑن ہوتی تھی اور میں سر سے پاؤں تک جھاڑن بنا رہتا تھا، دوسرا موجودہ رخ جس میں میں آپ کو اپنی جائداد کوٹھیوں اور لوگوں سے اپنے تعلقات کے بارے میں بتا چکا ہوں۔ واقعات زندگی کی امانت ہوتے ہیں اور کبھی کبھی انہیں دہرانے میں لطف آتا ہے بہت سے واقعات ہیں میری زندگی میں ایک واقعے کا تذکرہ ضرور کروں گا۔

ایک دن احمد میاں اپنے نیچر سے پڑھ رہے تھے اور میں قائلین برش کر رہا تھا، نیچر نے اس سے سوال کیا۔ ”ہاں میاں، کیا بتایا تھا میں نے تمہیں، بجلی کا بلب کس نے ایجاد کیا؟“

”بجلی کا بلب..... بلب..... بلب.....“ احمد میاں انکے لگے تو نیچر نے غصے لہجے میں کہا۔

”کتنی بار بتایا ہے تمہیں اگر کسی گدھے کو بھی یہ سب کچھ بتایا جاتا تو وہ یاد کر سکتا تھا، تم سے یہ نہیں بتایا جا رہا کہ بجلی کا بلب کس نے ایجاد کیا، اے لڑکے..... تم بتا سکتے ہو کہ میں انہیں کیا پڑھا رہا ہوں؟“ نجانے کیوں سر نے مجھ سے سوال کر لیا۔

”جی سر، بجلی کا بلب ایڈیسن نے ایجاد کیا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”جی احمد صاحب کچھ شرم آئی آپ کو۔“ نیچر نے



www.paksociety.com

میں جان آئی اور میں نے گردن جھکا کر کہا۔

”جی بڑی مالکن۔“

”ارے مجھ سے کیوں ڈر رہا ہے تو ادھر آ۔“ انہوں نے کہا اور میں ان کے قریب پہنچ گیا۔ انہوں نے پیار سے مجھے پاس بٹھایا اور بولیں۔

”ڈرتے ہو مجھ سے۔“

”نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”کوئی تکلیف تو نہیں ہے تمہیں یہاں۔“

”نہیں بڑی مالکن۔“

”پیٹ بھر کر کھانا کھاتے ہو؟“

”جی ہاں۔“

”تمہاری ماں کبھی مارتی تو نہیں ہے؟“

”نہیں۔“

”تمہارا خیال رکھتی ہے؟“

”جی ہاں۔“

”کچھ پیسے تو نہیں چاہئیں؟“

”نہیں۔“

”چلو ٹھیک ہے، لو یہ رکھ لو۔“

خیر ایک ایسا ہمدرد تو تھا جو مجھے اس نرم لہجے میں پکار لیا کرتا تھا اور یہی میں جانتا تھا کہ خدا کے لیے جب کوئی انسان کچھ کرتا ہے تو اس کا دل خود بخود نرم ہو جاتا ہے اور یہاں بھی ایک نرم شخصیت یعنی بڑی مالکن زلیخا بیگم تھیں جو کبھی بھی مجھ سے سخت رویہ اختیار نہ کرتی تھیں یہ دل کے چھالے ہیں جنہیں میں چھیڑ رہا ہوں لیکن بہت کہہ چکا اس بارے میں آخری بات سنا کر یہ تذکرہ ختم کرتا ہوں۔

یہ ایک سنسان دوپہر کی بات ہے تیز دھوپ پڑ رہی تھی شدید لو چل رہی تھی ماں نے وہی منگوا یا تھا اور دکان بہت دور تھی وہی لے کر اندر داخل ہوا تو پسینہ پسینہ ہو رہا تھا اندر آ گیا دھوپ سے سر چکر رہا تھا

کہا۔

”تو یہاں کیا کر رہا ہے کتے؟“ احمد میاں نے شدید غصے کے عالم میں ایک زرد دارلات میرے رسید کردی میں زمین پر بیٹھا ہوا قالین کو برش کر رہا تھا اور وہ کرسی پر تھے اس لیے دارلات میرے سر پر پڑی اور میں بری طرح گر بڑا ٹیچر جلدی سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے انہوں نے غصیلی نگاہوں سے احمد میاں کو دیکھا اور شاید برداشت نہ کر سکے چنانچہ انہوں نے ایک تھپڑ احمد میاں کے منہ پر رسید کر دیا اور قیامت آ گئی۔ اس کے بعد ٹیچر کی بھلا اس گھر میں کیا گنجائش تھی انہیں کھڑے کھڑے نکال دیا گیا۔

خیر اب یہ بات بھی نہیں ہے کہ یہاں کوئی کسی کا ہمدرد تھا ہی نہیں ایک خاتون تھیں جن کا نام زلیخا تھا۔ گھر کی بزرگ تھیں اللہ کے پاس جانے کے لیے تیار بیٹھی ہوئی تھیں اس لیے شاید دنیا سے کچھ لے جانے کی خواہش مند تھیں بس وہی تھیں جو کبھی کبھی میرے ساتھ ہمدردی کر لیا کرتی تھیں ایک دن کسی کام سے دوپہر کے وقت ان کے کمرے میں چلا گیا وہ سو رہی تھیں میرے قدموں کی چاپ پر جاگ گئیں مجھے دیکھا تو میں ہم گیا وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

”یہ..... یہ یہ پیڑ رکھنے آیا تھا باہر سوکھ رہا تھا۔“ میں نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

”نہیں نہیں کوئی بات نہیں ہے جہانو۔“ انہوں نے مجھے مخاطب کیا میں نے پہلے آپ سے عرض کیا تھا کہ بچپن میں میرا نام جہانو تھا۔ میں خود بھی نہیں جانتا تھا کہ میرا پورا نام جہانزیب شاہ ہے جوانی میں جب حالات ذرا کچھ بہتر ہوئے تو جہانزیب کے نام سے پکارا جانے لگا اور جب وقت نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا تو میں جہانزیب شاہ ہو گیا ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ زلیخا بیگم نے مجھے جہانو کہہ کر پکارا تو میری جان



زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ بڑی ماں اچانک داخل ہو گئیں، حسن بانو یعنی میری والدہ محترمہ وہی کی لسی بنا رہی تھیں بڑی مالکن کو دیکھ کر ششدر رہ گئیں کیونکہ ان کا اس کوارٹر میں آنا ناقابل یقین سی بات تھی۔ لیکن بڑی مالکن نے کرخت لہجے میں کہا۔

”کہاں گیا تھا یہ؟“

حسن بانو کی حالت خراب ہو گئی اس کا چہرہ اتر گیا وہ چوری بن گئی جواب دینا ضروری تھا اس لیے اس نے کہا۔

”دہی دہی منگوا رہا تھا بڑی بیگم صاب۔“

بڑی مالکن کی آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹنے لگیں انہوں نے سرد لہجے میں کہا ”دھوپ اور گرمی کا کچھ اندازہ ہے نہ؟“ ہے باہر کیسی لو چل رہی ہے۔“

”جی بڑی مالکن۔“

”دوسرے لوگ بھی ہوتے ہیں گھر میں تم جانتی ہو حسن بانو کہ میرے ایک اشارے پر تمہارا جو حشر ہو سکتا ہے اس کا تمہیں کچھ اندازہ ہے تم اپنی کٹی ہوئی زبان اور تیزاب سے جھلسے ہوئے چہرے کے بارے میں سوچ سکتی ہو کرائے پر جرم کرنے والے بہت معمولی سے آدمی کے لیے یہ مشکل نہ ہوگا اور معاوضہ کیا دینا پڑے گا بس صرف چند ہزار روپے کا غذ کے چند نوٹ۔“

”مم..... معافی معافی چاہتی ہوں بڑی بیگم صاب۔“ حسن بانو نے لرزتے ہوئے کہا۔

”بہتر ہے خود کو سنبھالو اس بیچارے کی کالی تقدیر میں جو کچھ لکھا ہے اسے بھگتتے دو اس میں اور اضافہ نہ کرو سمجھیں۔“

”آئندہ ایسا کبھی نہیں ہوگا بڑی بیگم صاب۔“ حسن بانو نے کہا اور بڑی مالکن مزید کچھ کہے بغیر خاموشی سے باہر چلی گئیں میں اتنا تو سمجھا رہا تھا کہ ان

کی اس محبت کو سمجھ سکتا لیکن وہ اس قدر اچھی ہیں اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا اور میں سچ کہہ رہا ہوں کہ اچھے اور برے کی تمیز مجھے صرف بڑی مالکن کی وجہ سے ہوئی تھی بڑوں کے درمیان تو میں تھا ہی لیکن یہاں ایک اچھا بھی تھا جو ہر موقع پر میرا ساتھ دیتا تھا جب بڑی مالکن چلی گئیں تو حسن بانو نے میری طرف دیکھا اور پتھر ایک دم سنبھل گئی۔

”لسی پیو گے۔“

”پلا دو۔“ میں نے جواب دیا اور اس نے لسی کا گلاس بھر کر مجھے دے دیا۔

خیر یہ اس طرح کے واقعات تھے جن سے میں روشناس ہوتا جا رہا تھا گھر کے تمام افراد تھے لڑکیاں تھیں لڑکے تھے اور بہت سے مصیبت زدہ ملازم تھے کچھ شادی شدہ تھے غیر شادی شدہ تھے خواتین میں میرا مطلب ہے ان لڑکیوں میں جو یہاں آباد تھیں کچھ شادی شدہ تھیں ایک آدھ ہی ایسی تھیں جو شادی شدہ نہیں تھیں اور اس کے لیے رشتوں کا انتظار کیا جا رہا تھا خیر ہم اپنی بات کرتے ہیں ہم اس گھر کے ملازم تھے میری ماں نوکرانی تھی۔

چھوٹے چھوٹے بچے بوڑھے ملازموں کو جھاڑ دیا کرتے تھے اور ان سے بدتمیزی کر لیتے تھے کوئی انہیں کچھ نہیں کہتا تھا خیر یہ سب کچھ چل رہا تھا واقعات بڑے دلچسپ تھے اس دن حیدر شاہ صاحب کہیں باہر سٹائے تھے اور پورچ میں کار سے اترے تھے بچے زیادہ دور نہیں تھے وہ رک گئے میں اس وقت اتفاق سے بچوں سے قریب ہی تھا وہ میرے پاس پہنچ گئے۔

”تو یہاں کیا کر رہا ہے؟“ وہ سرد لہجے میں بولے۔

”کک..... کچھ نہیں کچھ بھی نہیں۔“ میں ہکلا



## رشتہ احساس کا

محبت، عشق، جنوں، پیار، جاہت تو اپنی کوئی حقیقت نہیں رکھتے شاید اصل رشتے کا نام ہے احساس اور ان سب ناموں کی حقیقت بھی احساس کا دوسرا نام ہے جیسے جیسے احساس کی شدت بڑھتی چلی جاتی ہے ویسے ہی اس کے نام بھی تبدیل ہوتے جاتے ہیں۔ اصل خوشی بھی اسی جذبے میں پوشیدہ ہے احساس ہی تو ہے جس کے تحت ہم سبھی رشتوں میں بندھتے چلے جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کے دکھ درد کو سمجھتے ہیں احساس کے بغیر تو صرف نام کے رشتے باقی بچتے ہیں اور جب اپنوں کو یادگار لمحوں میں سر پر اتر دیتے ہیں تو ان لمحوں میں جو خوشی ہمیں ملتی ہے وہ ہم لفظوں میں بیان نہیں کر سکتے۔ احساس سے ہی رشتوں کی اپنائیت بڑھتی چلی جاتی ہے یہی تو زندگی کے اصل رنگ ہیں۔ سو پلیز صرف اپنی ہی دھن میں من نہ رہیے۔ اپنے ارد گرد بھی نگاہ دوڑائیے شاید کسی کو آپ کی ضرورت ہو اور اس سے بڑی خوشی نصیبی کیا ہو سکتی ہے کہ ہم کسی کے خوش رہنے کا سبب بن سکیں۔

عاصم بٹ ..... گوجرانوالہ

”سن بات سن ادھر آ“ یہ کپڑے کہاں سے آئے تیرے پاس؟“

”میری ماں نے بازار سے خریدے ہیں۔“ میں نے پراعتماد لہجے میں کہا اور پلٹ کر واپس چل پڑا آج میں ان سے بالکل نہیں ڈر رہا تھا جبکہ گھر کے تمام لوگ ہی حیدر شاہ صاحب سے دہشت زدہ رہتے تھے میرے دل میں ایک نفرت سی بیدار ہو گئی تھی۔ نجانے کون ہیں یہ لوگ کیوں دوسروں پر حکم چلاتے ہیں کیا

گیا۔  
”سن آج کے بعد کبھی تجھے ان بچوں کے ساتھ کھیلتے نہ دیکھا جائے سمجھ گیا۔“

”جی۔“ میں نے لرزتے ہوئے کہا۔  
”دفعان ہو جا۔“ وہ بھیا ٹک آواز میں غرائے اور میں وہاں سے بھاگ آیا پھر کبھی ہمت نہیں پڑی بچوں کے کھیل میں شریک ہونے کی۔

دوسری بار غالباً عید کا یا بقر عید کا دن تھا میں نے بھی نئے کپڑے پہنے تھے۔ بچے لائن لگا کر حیدر شاہ صاحب سے عیدی وصول کر رہے تھے جس جگہ یہ تماشہ ہو رہا تھا وہ کوٹھی کے صدر دروازے کے پاس ہی تھی میں صفائی کر کے باہر آیا تھا تو یہ دلچسپ تماشہ دیکھا یونہی قدم رک گئے تھے۔ آخری بچے کو نمٹانے کے بعد ہی حیدر شاہ صاحب نے مجھے دیکھا تھا اور ایک دم سے ہی ان کا مسکراتا ہوا چہرہ بگڑ گیا تھا۔

”کیا ہے؟“ انہوں نے بلند آواز میں کہا۔  
”کک..... کچھ نہیں۔“

”عیدی چاہیے۔“

”نہیں۔“ میں نے متانت سے کہا۔ مانگنا میری عادت نہیں تھی حیدر شاہ صاحب نے مجھے غور سے دیکھا اور بولے۔

”عیدی چاہیے۔“

”نہیں۔“ میں نے اسی لہجے میں کہا۔

”تو یہاں کیوں مر رہا ہے؟“

”ادھر سے جا رہا تھا غلطی سے رُک گیا۔“ میں نے غصے سے کہا۔

”تو اب کیوں رُکا ہوا ہے؟“

”جا رہا ہوں۔“ میں نے غضبناک لہجے میں کہا نجانے کیوں دماغ گھوم گیا تھا میں مڑا ہی تھا کہ حیدر شاہ صاحب نے مجھے پھر پکارا۔



فرق ہے دوسروں میں اور مجھ میں۔ ”کون بیچے گا تم مجھے بیچو گی؟“ میں نے غرائے

ہوئے لہجے میں کہا اور کتاب اٹھا کر پھینک دی پھر وہاں سے باہر نکل آیا پوری صفائی بھی نہیں کی تھی میں نے نازیہ چیخ چیخ کر رونے لگی میں باہر نکل آیا تھا پھر میں انتظار ہی کرتا رہا لیکن اتفاق کی بات ہے کہ نازیہ کی دادرسی کرنے والا اس وقت کوئی موجود نہیں تھا البتہ اس کے الفاظ مجھے کھولا رہے تھے یہ ساری کتابیں اتنے پیسوں کی ہیں کہ تجھے بیچ دیا جائے تب بھی پیسے پورے نہ ہوں کیا میں اتنا ہی سستا ہوں اتنا سستا ہوں کیا میں میرے دل میں پہلی بار یہ خیال ابھرا تھا اور اس خیال کے ساتھ ہی میرے دل میں انتقام کا جذبہ پروان چڑھنے لگا۔

صفائی تو خیر مجھے اس کمرے کی کرنی ہی پڑتی تھی لیکن جب بھی میں کتابوں کی الماری پر نگاہ ڈالتا میرے کانوں میں نازیہ کے الفاظ چبھنے لگتے میرا دل چاہتا کہ اس الماری کو آگ لگا دوں اس میں موجود کتابیں اس قدر قیمتی ہیں کہ مجھے بیچ کر بھی ان کی قیمت پوری نہیں ہو سکتی مجھے بیچ کر مجھے بیچ کر میں ہمیشہ نفرت بھری نگاہوں سے اس الماری کو دیکھتا تھا جسے خاکستر کر دینا میرے لیے مشکل نہیں تھا کتابوں کے اس ڈھیر کو میں تھوڑی سی کوشش کر کے ہمیشہ کے لیے فنا کر دینا چاہتا تھا لیکن شاید عقل کا آغاز ہو گیا تھا اور میں جانتا تھا کہ اس طرح کتابوں کی الماری کو آگ لگانے کی ذمہ داری مجھ پر ہی آ کر پڑے گی۔

برچند کہ مجھ سے ایسے کسی معاملے میں پوچھ گچھ نہیں ہوگی لیکن اب چونکہ یہ ساری باتیں میری سمجھ میں آنے لگی تھیں اس لیے میں جانتا تھا کہ کافی لوگوں کا سامنا کرنا پڑے گا ویسے ہی مجھ سے بہت سے لوگ نفرت کرتے تھے نفرت تو میں نے ہر شخص کی

میں نے آدھی رات تک چہرہ بار بار آئینے میں دیکھا تھا اور یہ سوچتا رہا کہ آخر مجھ میں اور دوسروں میں کیا فرق ہے کوئی خاص بات نہیں ہوئی بس میں کچھ تلخ ہو گیا۔ اس دن کے بعد یہ سب میرے لیے قابل نفرت تھے ٹوٹی حوض کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے پر چھلانگ لگا رہا تھا ایک بار اس کا پاؤں پھسلا اور وہ نیچے گر پڑا حوض کا کنارہ اس کے سر پر لگا اور اس کے سر سے بھل بھل خون بہنے لگا میں نے اسے دیکھا اور اطمینان سے آگے بڑھ گیا کسی کو میں نے اس کے بارے میں نہیں بتایا تھا یہ بھی گھر کا ایک بیٹا تھا بعد میں زیادہ خون بہہ جانے سے اس کی حالت خراب ہو گئی تھی اور سارا گھر پریشان رہا تھا۔

میری فطرت میں یہ نیکی بڑھتی تھی مگر اس کا اظہار کسی چیز چڑے پن سے نہیں کرتا تھا بلکہ ایک نیا بنی رنگ اختیار کرتا جا رہا تھا۔ نازیہ جو احسان شاہ کی بیٹی تھی اس کے کمرے کی صفائی میرے ہی ذمے تھی ایک دن میں اس کے کمرے کی صفائی کر رہا تھا کہ اس کے خوبصورت شیف سے ایک کتاب نیچے گر گئی اس میں جنگلی جانوروں کی تصویریں تھیں بڑی خوبصورت تصویریں تھیں میں ورق الٹ الٹ کر دوسری تصویریں دیکھنے لگا کہ نازیہ آگئی۔

”ارے یہ کیا کر رہا ہے؟“  
”بڑی خوبصورت تصویریں ہیں۔“  
”تو نے میری کتاب شیف سے کیوں نکالی؟“  
”نکالی نہیں گر پڑی تھی۔“

”بکواس کرتا ہے جانتا ہے کتنی قیمتی کتابیں ہیں میرے ماموں امریکہ سے لائے تھے یہ ساری کتابیں اتنے پیسوں کی ہیں کہ تجھے بیچ دیا جائے تب بھی پیسے پورے نہیں ہوں گے۔“



نگاہوں میں دیکھی تھی، لیکن چونکہ ایک واقعہ ہو چکا تھا اس کے بعد سے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ زلیخا بیگم میری طرف دار ہیں اور زلیخا بیگم یہاں بڑی بیگم صاب کی حیثیت رکھتی تھیں اور ان کے کسی معاملے میں کوئی دخل نہیں دے سکتا تھا۔

پھر ایک دن کو از نمبر دو میں آگ لگ گئی اس کو ارڈر میں چوکیدار اپنے مختصر سے خاندان کے ساتھ رہتا تھا۔ آگ خوب زوردار لگی تھی کوئی جانی نقصان تو نہیں ہوا لیکن ایک کمرے کا کافی سامان جل گیا تھا لوگ ایک دوسرے کو بتانے لگے کہ آگ شارٹ سرکٹ سے لگی ہے یہ شارٹ سرکٹ کیا ہوتا ہے میرے ذہن میں تجسّس ابھر آیا اور پھر میں نے چھ لوگوں سے اس بارے میں معلومات حاصل کرنا شروع کر دیں۔ شارٹ سرکٹ کی پوری تفصیل میری سمجھ میں آ چکی تھی لیکن کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں شارٹ سرکٹ سے اتنی واقفیت کیوں حاصل کر رہا ہوں۔

اس کے بعد دوسرے دن میں نے نازیہ کے کمرے کو خاص نگاہوں سے دیکھا تھا اور یہاں شارٹ سرکٹ کا جائزہ لیا تھا میری خوش قسمتی تھی کہ یہ الماری دیوار کے ساتھ اسی جگہ لگی ہوئی تھی جہاں سے الیکٹرک کے تار گزرتے تھے الماری کے بالکل قریب ہی نائلون کا ایک باریک پردہ پڑا ہوا تھا جو تاروں کو چھوتا ہوا گزرتا تھا اور سارا منصوبہ میرے ذہن میں آ گیا۔

میں جانتا تھا کہ بجلی کے ننگے تاروں کو اگر چھری سے بچ کیا جائے تو کرنٹ لگ سکتا ہے لیکن ان تاروں کو چھیلنا بھی ضروری تھا۔ چنانچہ اس کے لیے میں نے ایک ایسی چیز حاصل کر لی جس میں لکڑی کا دستہ لگا ہوا تھا اور اس کا اگلا سرا دھار دار تھا۔ اس کی مدد سے کچھ تار ننگے ہو گئے اور اب ایک لکڑی بی سے مجھے

وائرنگ کے ان تاروں کو ادھر پر کر کے ایک دوسرے سے ملانا تھا جلد بازی کسی طور مناسب نہیں تھی چنانچہ میں اطمینان سے اپنے اس منصوبے پر عمل کرتا رہا یہاں تک کہ ایک دن مجھے موقع مل گیا۔

نازیہ اسکول گئی ہوئی تھی اور میں حسب معمول اس کے کمرے کی صفائی کر رہا تھا سارا منصوبہ ذہن میں تھا چنانچہ ایک لمبی لکڑی سے جو جالے صاف کرنے کے کام آتی تھی میں نے ان دونوں تاروں کو ملا دیا ایک زوردار چنگاری پیدا ہوئی اور شاید کہیں فیوز بھی اڑ گیا لیکن اس چنگاری سے اس نائلون کے اس پردے میں آگ لگ گئی میں پر مسرت نگاہوں سے اس آگ کو پھیلنے دیکھتا رہا مجھے اس کا گمان بھی نہیں تھا کہ آگ اتنی تیزی سے دوسری چیزوں کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی لیکن جب میں نے یہ دیکھ لیا کہ الماری پوری طرح آگ کی زد میں آ گئی ہے تو میں کمرے سے کل بھاگا اور عمارت کے بیرونی حصے میں آ کر میں نے زور زور سے آگ کا شور مچایا۔

غظیم الشان کو بھی میں لوگ اپنے اپنے معمولات میں مصروف رہتے تھے کوئی کسی کی جانب توجہ نہیں دیتا تھا اور یہ چیز بھی میرے لیے کام آمد ثابت ہوئی کیونکہ میری آواز سن کر باہر نکلنے والے بھی بہت دیر کے بعد باہر نکلے تھے اور اس دوران کتابوں کی خواہ صورت الماری نذر آتش ہو چکی تھی۔ میں نے انہیں بتایا کہ اچانک ہی بجلی کے تاروں سے چنگاریاں نکلنے لگیں اور نائلون کے پردے نے آگ پکڑ لی خیر جب آس پاس دھواں پھیلنے لگا تو لوگ بدحواس ہو کر آگ بجھانے کی فکر کرنے لگے۔

آگ بجھ گئی لیکن اس شکل میں کہ کمرے کا بہت سارا سامان راکھ میں تبدیل ہو چکا تھا اور پھر نازیہ اسکول سے واپس آ گئی اس کی حالت دیکھنے کے قابل



تھی۔ آٹھ آٹھ کے بجائے سولہ سولہ آنسو روئی تھی اسے سب سے زیادہ دکھ اپنی الماری کے جل جانے کا تھا، لیکن میری مسرت کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا، ایک ایسی چیز خاکستر ہوئی تھی جس کے بارے میں کہا گیا تھا کہ اگر مجھے بھی بچ دیا جائے تو اس کی قیمت پوری نہ ہوگی تو اپنی جگہ موجود تھا لیکن وہ چیز اب موجود نہیں تھی۔

مجھے اپنی اس کامیابی پر اتنا سر دنا یا تھا کہ میں خوشی سے پھولا نہیں سمارہا تھا۔ البتہ مجھے ایک اور سبق ملا تھا، میری سوچ میں یہ تصور بھی شامل ہو گیا تھا کہ جو کام بھی کیا جائے اسے ذہانت سے کیا جائے اور کام بھی ہو جائے اور کسی کو شبہ کا موقع بھی نہ ملے۔ دوسروں کو بس اس طرح ہراساں کیا جائے کہ وہ اپنے نقصان پر ہاتھ ملتے رہ جائیں۔ لیکن یہ نقصان پہنچا کر اپنے دل کو جو ٹھنڈک ملے وہ ساری محنت کا حاصل ہو اور یہ بات میری فطرت میں رچتی چلی گئی۔

میری سوچوں میں ایک انوکھی تبدیلی رونما ہوئی، میں ہر چیز کو گہری نگاہوں سے دیکھنے کا عادی تھا اور میری سوچوں میں اب گہرائی بھی پیدا ہو گئی تھی، میرا ذہن ایک خاص انداز میں ترتیب پاتا جا رہا تھا۔ گھر کے دوسرے ملازمین اور ان کے ہال بچے بھی تھے وہ غلطی کرتے تھے تو اس غلطی پر ان کے ساتھ کافی برا سلوک کیا جاتا تھا بعض کو تھپڑ بھی پڑ جاتے تھے میرے ساتھ ایسا بہت کم ہوا تھا اور میری شخصیت میں ایک ناہمواری پیدا ہو گئی تھی۔

بے شک کبھی کسی کی نگاہوں میں میرے لیے محبت نہیں تھی، لیکن خیر دوسرے ملازموں کو عید یا بقر عید پر خوش بھی کیا جاتا تھا، میری ماں حسن بانو اس عنایت میں شامل ہوتی تھی لیکن مجھے یوں لگا جیسے میرے لیے کبھی کوئی اہتمام نہ کیا گیا ہو البتہ جب بھی کبھی موقع ملتا ہی بیگم صاحبہ میرے ساتھ اچھا سلوک کر دیا کرتی

تھیں، مثلاً غیر ملکی چاکلیٹ کے وہ پیکٹ جو انہوں نے ایک دن مجھے کیاری میں کام کرتے ہوئے دیئے تھے اور کہا تھا کہ ان کے بارے میں اپنی ماں تک کو نہ بتانا اور کہیں خاموشی سے بیٹھ کر کھا لینا۔ جو قیمتی چیزیں وہ مجھے دیتی تھیں اس کے بارے میں ہدایت کر دیتی تھیں کہ میری ماں کو بھی ان کا پتہ نہ چلے۔

خیر وقت گزر گیا، ایک دن میں گھر میں کام کرتے کرتے اپنی ماں سے کوئی ضرورت محسوس کر کے کچن کی جانب چل پڑا، مجھے اندازہ تھا کہ اس وقت وہ کچن میں کام کر رہی ہوگی، کچن کے دروازے کو کھول کر میں نے تھوڑا سا اندر جھانکا تو ایک عجیب و غریب منظر دیکھا۔ باورچی غلام خان، حسن بانو سے مذاق کر رہا تھا، اس نے حسن بانو کے دونوں بازو پکڑے ہوئے تھے اور حسن بانو ہنس رہی تھی، بے اختیار ہنس رہی تھی وہ میں نے حیرت بھری نگاہوں سے اسے دیکھا وہ عام طور سے اتنا نہیں ہنستی تھی میں نے اسے ایسے ہنستے ہوئے کبھی نہیں دیکھا تھا اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا، تبھی ان دونوں کی نگاہیں مجھ پر پڑ گئیں اور باورچی نے جلدی سے حسن بانو کو چھوڑ دیا۔ حسن بانو بھی عجیب سی کیفیت کا شکار ہو گئی تھی اس نے خود کو سنبھال کر کہا۔

”کیا ہے؟“

”کچھ کام تھا تم سے امان“ میں نے کہا، نجانے کیوں میرے دل میں دھواں سا بھر گیا تھا، یہ سب کچھ مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔

”کیا مصیبت پڑ گئی تجھ پر؟“ حسن بانو نے تنک کر پوچھا اور میں نے اسے وہ کام بتا دیا جس کے لیے میں اس تک آیا تھا۔

”دفعان ہو جا دیکھتا نہیں کام کر رہی ہوں۔“ اس نے کہا اور میں وہاں سے چلا آیا لیکن پتہ نہیں کیوں یہ بات ذہن کو سخت ناگوار گزری تھی، ملازم تو ہمارا کوئی بھی



## گولڈن الفاظ

گناہ سے ہر وقت بچو مگر  
تنہائی میں بالخصوص بچو کیونکہ  
اس گناہ کا گواہ خود خدا ہوگا  
رزق کے پیچھے اپنا ایمان خراب  
مت کرو کیونکہ رزق انسان کو اس  
طرح تلاش کرتا ہے جیسے مرنے والے  
کو اس کی موت۔

اپنی زبان کی تیزی اس ماں پر  
مت جھاڑو جس نے تمہیں بولنا  
سکھایا۔

لفظ انسان کے غلام ہوتے ہیں مگر  
بولنے سے پہلے بولنے کے بعد انسان  
اپنے لفظوں کا غلام بن جاتا ہے۔

کوشش کرو کہ تم دنیا میں رہو  
دنیا تم میں نہ رہے کیونکہ کشتی  
جب تک پانی میں رہتی ہے خوب  
تیرتی ہے لیکن جب پانی کشتی میں  
آجائے تو وہ ٹوب جاتی ہے۔

دنیا کا سب سے مخلص رشتہ ماں  
کا ہے ماں تیری عظمت کو سلام  
محمد حنیف..... جہانیاں منڈی

صاف کرنے کا وہ لکڑی کا برش جس کے ذریعے میں  
نے شارٹ سرکٹ یعنی دو تاروں کو ملایا تھا میرا بہترین  
ہتھیار تھا چنانچہ بلی کی طرح دبے قدموں میں اس  
کھڑکی تک پہنچا اور اس کے بعد یہ دیکھا کہ باورچی  
معمول کے مطابق کاؤنٹر سے لگا بیٹھا ہے میری ماں  
سنگ پر برتن دھو رہی تھی گویا اس وقت باورچی میری

نہیں ہے باورچی ہے وہ صرف اسے میری ماں سے  
اس قدر بے تکلفی کا مظاہرہ کرنے کی ہمت کیسے پیدا  
ہوئی لیکن تصور تو میری ماں کا بھی تھا ظاہر ہے تالی  
ایک ہاتھ سے نہیں بچتی۔

خیر نجانے کیوں مجھے اس کی ٹوہ لگ گئی۔ باورچی  
خانے میں جو کاؤنٹر تھا اور جس پر چولہے وغیرہ لگے  
بیٹھے تھے اور جس میں ایک طرف بہت بڑا سا  
الیکٹرک اوون تھا اس کے سامنے ایک کھڑکی تھی جو  
پچھلی گلی میں کھلتی تھی اور یہ پچھلی گلی کوڑے کرکٹ کے  
لیے استعمال کی جاتی تھی میں نے اس کھڑکی کو اپنا  
ٹھکانا بنا لیا اور اکثر کام کرتے کرتے اچانک میں  
چھپ کر کھڑکی کے سامنے پہنچ جاتا اور وہاں سے اندر  
جھانکتا۔ اس کا مقصد ہے کہ میری ماں اس باورچی  
سے بہت بے تکلف ہے کیونکہ اکثر وہ اسی قسم کے ہنسی  
مذاق میں نظر آتے جو میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا  
تھا اور میرے ذہن میں ایک انتقامی جذبہ پھرا بھرا آیا  
ماں کے لیے نہیں بلکہ باورچی کے لیے۔

اسے میری ماں کی یہ ہمدردی اور دلچسپی کیوں  
حاصل ہے اور جس چیز کے لیے میرے دل میں انتقام  
جاگنے لگا اسے میں شارٹ سرکٹ کے ذریعے بھسم کر  
دیتا لیکن یہ باورچی کتابوں کی الماری نہیں تھا کہ میں  
اس میں آگ لگا دیتا اس کے لیے الگ ہی ترکیبیں  
سوچنا پڑتی تھیں اور ایک ترکیب میرے ذہن میں  
آ گئی۔ باورچی بڑی بڑی ہانڈیاں چولہے پر چڑھانے  
کے بعد کاؤنٹر کے سامنے بیٹھ جاتا تھا اور ایک چولہا  
کھڑکی کے عین سامنے تھا میں نے ایک دو بار اسے  
بیٹھے ہوئے دیکھا تھا حسن بانو بھی اس کے آس پاس  
ہی کہیں ہوتی اور اس دن میں نے اپنے منصوبے پر  
عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

کھلتی ہوئی ہانڈی چولہے پر رکھی ہوئی تھی جالے



رینج میں تھا چنانچہ برش آہستہ آہستہ آگے بڑھا کھولتی اور پکتی ہوئی بانڈی پر لگا اور بانڈی پوری قوت سے باورچی برالٹ گئی باورچی کی دلخراش چیخ میں وہ آواز بھی دب گئی تھی جو برش کو باہر کھینچتے ہوئے کھڑکی کی گرل سے لگ کر پیدا ہوئی تھی۔ میں تو وہاں سے فوراً ہی بھاگ آیا لیکن باورچی کے سلسلے میں بڑی بھاگ دوڑ ہو گئی۔ اس وقت کوئی گاڑی گھر میں موجود نہیں تھی سب لوگ کسی نہ کسی کام سے گئے ہوئے تھے چنانچہ کسی اسپتال کو فون کر کے ایمبولینس منگوائی گئی اور باورچی کو اس ایمبولینس میں ڈال کر اسپتال لے جایا گیا۔

وہی سرور وہی لطف مجھے محسوس ہوا تھا جو کتابوں کی الماری کو جھلانے کے بعد میرے دل میں اتر آیا تھا اور اس دوسرے منصوبے کی کامیابی نے مجھے واقعی باہمت کر دیا تھا اور میں اب ان تمام لوگوں سے کوئی نہ کوئی انتقام لینا چاہتا تھا جو میری توہین کا باعث تھے۔ یہ سارے احساسات میرے دل میں پروان چڑھتے رہتے تھے۔ میری عمر بھی آہستہ آہستہ بڑھتی جا رہی تھی اور اب میرے سپرد کچھ ذمے داریاں مزید کر دی گئی تھیں۔ مثلاً یہ کہ کبھی مجھے باہر کسی کام سے بھی بھیج دیا جاتا تھا۔ ظاہر ہے میں اس کو بھی کا ایک ملازم تھا چنانچہ کوئی کام کرنا مجھے برا نہیں لگتا تھا۔ لیکن اپنے ذہن کی ان سوچوں کو کیا کرتا جو میری زندگی کو بدلتے میں مصروف تھیں۔

مجھے باہر جانے کا موقع ملا تھا اور یہ میرے لیے انتہائی دلچسپ مشغلہ تھا میں باہر کی دنیا دیکھ رہا تھا بڑی بڑی عمارتوں کے بارے میں سوچ رہا تھا جو زمین پر اگائی گئی تھیں خود نہ اگی تھیں یہ عمارتیں اگانے والے کون لوگ ہیں اتنا سرمایہ ان کے پاس کہاں سے آیا۔ یہ سب کچھ کہاں سے آ جاتا ہے بڑے لوگ کہاں پیدا

ہوتے ہیں اور کس طرح ان کی پرورش ہوتی ہے۔ میں ان علاقوں سے واقف ہوتا جا رہا تھا۔ میری نگاہیں چاروں طرف بھٹکتی رہتی تھیں کہ ایک لمحے کے لیے ٹریفک سگنل رکتا ہے کہ کاروں کا اتنا ہجوم نظر آتا ہے کہ جہاں تک نظر جائے گاڑیاں ہی گاڑیاں ہوتی ہیں کمال بے وقافی کمال ہے۔

پھر ایک دن میں نے دیکھا کہ ایک مخصوص حصے میں بہت سے لوگ پانچے چڑھائے گاڑیاں دھونے میں مصروف تھے ان کے خلیے اور چہرے غریبوں کے تھے گویا یہ لوگ میری طرح غریب ہی ہیں بڑی عجیب سی کیفیت ہوئی تھی انہیں دیکھ کر میری زندگی کے شب و روز آگے بڑھتے رہے اور میں پندرہ سال کا ہو گیا اتنی عمر بہت کچھ سمجھا دیتی ہے میں نے بھی بہت سی چیزیں خود بخود سمجھ لی تھیں کچھ تبدیلیاں بھی ہوئی تھیں گھر میں اور معاملات خاصے دلچسپ ہو گئے تھے۔

پھر اس رات میں حسب معمول سویا ہوا تھا لیکن رات کے ڈیڑھ یا پونے دو بجے کا وقت ہو گا جب میں نے کوارٹر میں کچھ آٹھیس محسوس کیں اور اس کے بعد میں نے چند لوگوں کے بولنے کی آوازیں بھی سنیں جن میں بڑی بیگم صاحبہ کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ میں کمرے میں سو رہا تھا اور باتیں دالان میں ہو رہی تھیں۔ بڑی بیگم صاحبہ کے الفاظ سنائی دیے۔

”یہ شریفوں کا گھر ہے حسن بانو بہت دنوں سے اس سلسلے میں افواہیں سن رہی تھی لیکن آج میں کہتی ہوں تجھے یہ جرات کیسے ہوئی ایسی ہی دیوانگی تھی تو ہم سے نہیں کہہ سکتی تھی تو کہیں نکاح وغیرہ کر دیتے ڈوب مر کجست جس حالت میں پکڑی گئی ہے کوئی اور دیکھ لیتا تو کیا ہوتا تیرا۔“

میں حیران رہ گیا اپنی جگہ سے اٹھ کر خاموشی سے



آوارہ عورتوں کی۔“  
”دیکھیے آپ آپ.....“

”زبان چلا رہی ہے حرامزادی زبان نکلوا لوں گی تیری بے شرمی کی حد ہو گئی چوری اور سینہ زوری اسے کہتے ہیں چلو بہو یہ خود اپنے بارے میں فیصلہ کر لے گی۔“

وہ لوگ چلے گئے حسن بانو دالان ہی کے تخت پر بیٹھی رہی اور میں دروازے کے پاس کھڑا سوچتا رہا کہ یہ سب کیا ہے۔ یہ جو کچھ میرے کانوں نے سنا ہے اب میری سمجھ میں آ رہا تھا دماغ پر ایک دھواں سا چھایا ہوا تھا بڑی بیگم کے الفاظ کی تشریح تو نہیں ہو پا رہی تھی لیکن کچھ کچھ سمجھ میں آ رہا تھا بہت دیر گزر گئی باہر خاموشی طاری ہو گئی تھی پھر دوسری صبح مجھے کسی نے جھنجھوڑ کر جگایا۔

”جہانو..... اٹھ جا اٹھ جا جہانو۔“  
میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا نمیلہ خالہ تھیں اس کوٹھی کی ایک بوڑھی ملازمہ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”کیا بات ہے خالہ؟“  
”حسن بانو کہاں ہے؟“  
”تخت پر ہو گی باہر۔“

”نہیں ہے ساڑھے نو بج رہے ہیں باورچی خانے میں بھی نہیں ہے شاہ صاحب نے شور مچایا ہوا ہے۔“

”مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے؟“ میں نے جواب دیارات کے واقعات یاد آ رہے تھے۔

”ارے دیکھ بابا اسے میں تو اسے ہر جگہ تلاش کر آئی ساڑھے نو بجے ہیں غضب خدا کا دیکھو کہاں چلی گئی باورچی بھی کہیں ڈوب مرا ہے ادھر شاہ صاحب نے ہم پر زندگی دو بھر کر رکھی ہے جا جلدی سے دیکھ

دروازے سے جا لگا باہر مدہم روشنی ہو رہی تھی حسن بانو تخت پر بیٹھی ہوئی تھی بڑی بیگم اور چھوٹی بیگم بس یہ دو خواتین وہاں موجود تھیں حسن بانو کا سر جھکا ہوا تھا بڑی بیگم کہنے لگیں۔

”میں تو خیر اس بات کو خاموشی سے پی جاؤں گی لیکن اگر شاہ جی کو پتہ چل گیا تو گولی مار دیں گے تجھے کمبخت بہو بیٹیوں کا گھر ہے اور یہاں تو نے یہ گل کھلائے ہیں حسن بانو کی سسکیاں ابھر رہی تھیں سسکتے سسکتے وہ ایک دم ابل پڑی۔

”آپ نے بھی تو مجھے جانور سمجھ رکھا ہے ساری زندگی آپ کے در پر گزر گئی سوچا بھی آپ نے میرے بارے میں اس گھر کے علاوہ کوئی اور گھر دیکھا ہے میں نے یہیں پلی بڑھی ہوں میرے بھی جذبات ہیں آپ نے ایک کنواری لڑکی کو زبردستی یاں بنا دیا وہ لڑکا میرا بیٹا کہاں سے آ جائے آپ میرا بیٹا میرا بیٹا کہہ کر میرے اوپر مسلط کر چکی ہیں اور اب اس کی عمر پندرہ سال ہے مجھ پر بھی تو آخر غور کر لیا ہوتا۔

”لو سناتم نے بہو کیا کہہ رہی ہیں حسن بانو اسے بی بی ہم نے کوئی ٹھیکہ تھوڑی لے رکھا ہے تمام گھروں میں ملازم ہوتے ہیں پیدا بھی ہوتے ہیں پلتے بڑھتے بھی ہیں تنخواہ لیتے ہیں تمہیں بھی سب کچھ ملا۔ کیا نہ ملا تمہیں اس گھر سے جو چاہتی کرتیں لیکن شرافت تو اختیار کرتیں تم نے تو رنگ ہی دوسرے اختیار کر لئے نہیں حسن بانو اب اپنا ٹھکانا کر لو اس گھر میں اب تمہارے لیے جگہ مشکل ہے۔“

”تو میں بھی مری نہیں جا رہی اس گھر کے لیے سمجھیں آپ آج تک دل پر پتھر رکھ کر جو کچھ کرتی رہی ہوں اب نہیں ہو گا مجھ سے۔“

”تو بی بی دفعتاً ہو جاؤ یہاں سے کس نے کہا ہے کہ یہاں مری رہو ہمیں بھی ضرورت نہیں ہے تم جیسی



بیٹا۔“ یہ کہہ کر خالہ باہر چلی گئی۔

میں نے کہا۔

”ماں یاد آ رہی ہے؟“

”پتہ نہیں۔ مگر ایک بات بتائیں بیگم صاحبہ کیا واقعی وہ میری ماں تھی؟“ میں نے کہا اور بیگم صاحبہ چونک پڑیں پھر انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا پھر وہاں سے اٹھنے کے بعد بولیں۔

”اگر چاہو تو چوکیدار کے کوارٹر میں سو جاؤ میں کہے دیتی ہوں۔“

”نہیں میں وہاں نہیں سوؤں گا۔“

وقت گزرتا چلا گیا اور میں اکیلے رہنے کا عادی ہو گیا کچھ بھی تبدیلی نہیں ہوئی تھی لوگ آتے جاتے رہتے ہیں غرضیکہ میں اب ذرا دوسری سوچوں میں گھر گیا تھا سب ایک دوسرے کے چاہنے والے ہیں چاہتوں کا نام ہی گھر ہوتا ہے جہاں کوئی نہ ہو سوائے کوارٹر نمبر چار کے وہ گھر کہاں ہوتا ہے کیا میں کوارٹر نمبر چار کا قیدی ہوں میں یہاں کیوں قید ہوں اب تو وہ نام بھی نہیں ہے جو ماں کہلاتا ہے۔

یہ بات تو مجھے پتہ چل گئی تھی کہ حسن بانو میری ماں نہیں ہے یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ وہ باورچی کے ساتھ بھاگ گئی ہے میں یہاں کیوں ہوں آخر میں کسی کے ساتھ کیوں نہیں بھاگ جاتا آخر کار فیصلہ یہی کیا کہ یہ کوٹھی چھوڑ دوں اور دوسرے دن میں نے اپنے اس فیصلے پر بھی عمل کر ڈالا میں باہر آ گیا باہر آنے کے بعد میں نے سوچا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔

ہر کوٹھی میں نوکروں کی ضرورت ہوتی ہے دولت مندوں کو حکم چلانے کے لیے ہم جیسوں کی ضرورت ہوتی ہے ٹھکانہ ملنا مشکل نہیں ہوگا جس دروازے کے سامنے رکوں گا وہاں نوکری مل جائے گی مگر لوگ ویسے ہی ہونگے جیسے حیدر شاہ صاحب تھے حقارت سے دیکھنے والے حقارت سے مسکرانے والے دل

میں کئی منٹ تک اسی طرح بیٹھا رہا پھر باہر آ کر تخت کو دیکھا اس کے بعد منہ ہاتھ دھویا اور باہر نکل گیا کوٹھی ہی میں کہیں ہوگی اور کہاں جاسکتی ہے میں نے سوچا۔ اندر کوئی خاص بات نہیں تھی کچن کا رخ کیا تو خالہ کو دیکھا جو ایک اور نوکرائی کے ساتھ مل کر ناشتہ تیار کر رہی تھیں۔

”کچھ پتہ چلا؟“

”نہیں مجھے چاہئے دو۔“ میں نے کہا۔

”ایک منٹ رگ جامیرے لعل شاہ صاحب کے لیے ناشتہ لگا دوں۔ اے مہر النساء ذرا دیکھ یہ انڈے ٹھیک سے اُبل گئے ہیں نا۔“ خالہ نے کہا۔

ناشتہ تیار کر کے نرالی پر سجایا گیا اور پھر مجھے بھی ناشتہ مل گیا خالہ کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے اس نے کئی بار چورنگا ہوں سے مجھے دیکھا تھا ناشتے کے بعد میں اپنے کام سے چل پڑا مجھے نہیں معلوم کہ کیا ہوا البتہ شام تک مجھے پتہ چل گیا کہ حسن بانو وہاں سے چلی گئی ہے۔ وہ اپنا سامان بھی ساتھ لے گئی تھی میں نے اندر جا کر دیکھا تو وہ پرانی ایچی غائب تھی جس میں حسن بانو کے کپڑے رہتے تھے البتہ میری تمام چیزیں وہیں موجود تھیں میرا دماغ گم صدم سا ہو گیا اب کیا ہوگا میرے ساتھ کون رہے گا۔

رات کے واقعات بھی یاد آ رہے تھے میں وہیں تخت پر بیٹھ گیا پھر نجانے کتنا وقت گزر گیا تھا مجھے اندازہ نہیں ہو سکا البتہ شام کو بڑی بیگم صاحبہ کوارٹر میں آ گئیں۔

”کیا کر رہا ہے تو جہانوا کیلا پریشان ہو رہا ہوگا؟“

”نہیں۔“

”رات کو ڈرتو نہیں لگے گا؟“

”نہیں بڑی بیگم صاحب اب میں بڑا ہو گیا ہوں۔“



”تو پھر چلو ادھر سے آگے بڑھ جاؤ استاد رمضان کی کھوپڑی بہت خراب ہے بہت مارتا ہے وہ۔“ اس نے کہا۔

”لائسنس کہاں ملتا ہے؟“

”رمضان خان دیتا ہے پر ابھی ادھر اسٹاف پورا ہے۔“

”ٹھیک ہے میں ادھر سے ہٹ کر کام کروں گا۔“

”ارے بابا کیوں صبح ہی صبح دھندہ خراب کر رہا ہے ادھر تیرے کو کوئی کام نہیں کرنے دے گا۔“

”جانتا ہے یا نہیں صبح کا وقت ہے ابے کام کا ٹائم ہے اور تم ادھر گول میز کانفرنس کرتا پڑا ہے۔“ ایک لمبے چوڑے بدن کے آدمی نے ایک گاڑی کے عقب سے سر ابھار کر کہا۔

”ذرا ادھر آؤ رمضان خان دیکھو یہ کتنا بڑا بد معاش آیا ہے ادھر۔“ کسی نے کہا اور رمضان خان آگے بڑھ آیا۔ لمبا چوڑا آدمی تھا کھلا ہوا گریبان نیلے رنگ کی شلوار قمیص میں بلبوس چوڑے سینے والا۔ اس نے سرخ سرخ آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا بات ہے بھئی کیا ہو لیا تیرے کو۔“

”میں یہاں کام کرنا چاہتا ہوں رمضان بھائی۔“ میں نے کہا۔

”کیا کام کرے گا ہیں..... ادھر سب ٹھیک ہے تو کدھر اور کام دیکھ۔“

”میں یہیں کام کرنا چاہتا ہوں۔“

”کیسے کام کرے گا ہم نہیں بولے گا تو تم کیسے کام کرے گا بابا؟“

”کرے گا اور ضرور کرے گا کیا سمجھے کوئی نہیں روک سکتا مجھے۔“ میں نے کہا اور لمبے چوڑے بدن والا رمضان خونی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا وہ بھی زیادہ

چاہتا تھا کہ ان کی مسکراہٹیں ہمیشہ کے لیے چھین لوں ایسا کر دوں انہیں کہ وہ پھر نہ مسکرا سکیں۔ کیسے ہوتے ہیں یہ لوگ۔

فضا میں پرندے پرواز کر رہے تھے آزاد..... کسی بھی پابندی سے آزاد رزق تلاش کرتے ہوئے کھاتے پیتے ہوئے اور جیتے ہوئے جتنی جس کی زندگی ہے وہ اتنا ہی جیتا ہے چاہے پرندے ہوں جانور ہوں یا انسان ایک بس میں بیٹھ کر چل پڑا تھوڑے سے پیسے موجود تھے جو محفوظ رکھے ہوئے تھے وہ میرے کام آ رہے تھے۔ اچانک ہی مجھے وہ جگہ بھی نظر آئی جہاں ایک بار میں نے کچھ لوگوں کو گاڑیاں دھوتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں گاڑیاں دھو سکتا ہوں میں نے دل میں سوچا اور تھوڑی دیر کے بعد وہاں جا پہنچا۔ میری آنکھوں میں چمک تھی انداز میں خود اعتمادی تھی ایک گاڑی دھونے والے سے میں نے کہا۔

”سنو میں گاڑی دھونا چاہتا ہوں۔“

”دھو ہم کب منع کر رہے ہیں بھائی۔“ وہ بولا۔

”اس کے لیے کیا کرنا ہوگا؟“

”گاڑی دھونا ہوگی۔“ اس نے کہا اور ہنس پڑا۔

دوسرے دوڑ کے بھی وہاں آ گئے۔

”کیا بات ہے چاچا؟“

”بچے کام کرنے آیا ہے کہتا ہے گاڑیاں دھونے آیا ہے۔“

”نہیں بابا ادھر پہلے ہی زیادہ اسٹاف ہے کوئی اور ٹھکانہ پکڑو۔“

”تمہارے پاس کام کروں گا مجھے پیسے کی ضرورت ہے۔“ میں نے کہا۔

”لائسنس لینا پڑتا ہے چار سو روپے دینے پڑتے ہیں چار سو روپے ہیں تمہارے پاس۔“



میں سے پچھتر روپے تیرے پچاس روپے میرے۔“  
 ”ٹھیک ہے رمضان بھالی۔“ میں نے جواب دیا  
 اور وہ لوگ میرے دوست بن گئے۔

یہاں میں نے پہلا سبق سیکھا وہ سبق یہ تھا کہ  
 کائنات پر طاقت حکمراں ہے بازو کی قوت صرف کرو  
 پوری قوت لگا دو ماحول تمہارے قبضے میں آ جائے گا اور  
 اس پہلے سبق کو میں نے گرہ میں باندھ لیا۔ خوش بختی  
 تھی کہ ٹھوڑی دیر کے بعد ایک نئی گاڑی آ گئی اور ان  
 میں سے ایک لڑکے نے مجھے گاڑی دھونا سکھایا۔ یہ  
 لوگ بے شک ذرا مختلف قسم کے تھے لیکن میں یہ  
 محسوس کر رہا تھا کہ وہ ہمدردی کے جذباتوں سے نا آشنا  
 نہیں ہیں۔ وہ شخص بھی میری مدد کر رہا تھا جس نے  
 میری مخالفت کی تھی اور میں نے اس کی ہدایت کے  
 مطابق اسے استاد مانتے ہوئے ایک ایک عمل کیا اور  
 گاڑی چمکا کر رکھ دی گاڑی کے مالک نے ایک سو  
 پچیس روپے میرے ہاتھ پر رکھے مگر میں نے انہیں  
 استاد کے حوالے کر دیا۔

”بس تم مجھے بغیر لائسنس کے پکے ہو گئے یہ پیسے  
 رمضان کو دے دو۔“  
 ”ٹھیک ہے۔“

رمضان نے پوری ایمانہ اری سے پچھتر روپے  
 میرے حوالے کروائے تھے پھر اس نے کہا۔

”سیانا م ہے تیرا؟“

”جہانو۔“

”جہانو یا جہانو؟“

”نہیں جہانو۔“

”پہلی بار کام کرنے نکلا ہے۔“

”ہاں۔“

”تیرا ہاتھ بہت ٹکڑا ہے اس سے پہلے کیا کرتا

تھا؟“

عمر کا نہیں تھا زیادہ سے زیادہ چوبیس پچیس سال کا ہوگا  
 لیکن لمبے چوڑے بدن کی وجہ سے وہ نمایاں حیثیت کا  
 حامل نظر آتا تھا۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ سیدھا کر دیا اور  
 بولا۔

”دیکھو پولیس والے لوگ ادھر گھومتے پھرتے  
 ہیں اگر وہ لوگ نہیں ہوتا تو میں ایک دم تیرے کو ایسا  
 سبق سکھاتا کہ تو زندگی بھر یاد رکھتا ٹھیک ہے ادھر  
 ہاتھ لانا کچھوں تیرے میں کتنا جان ہے۔“

میں اس کے اٹھے ہوئے ہاتھ کو دیکھتا رہا پھر میں  
 نے اپنا ہاتھ بھی اٹھا دیا کبھی اسے آپ پر غور نہیں کیا  
 تھا طاقت کا مظاہرہ اس سے پہلے کبھی نہیں کیا تھا لیکن  
 اس وقت زندگی اور موت کا معاملہ تھا میں اپنی زندگی  
 اپنے مستقبل کا آغاز کرنا چاہتا تھا اگر پہلے ہی مرحلے  
 پر ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تو زندگی آگے نہ بڑھ سکے گی  
 رمضان خان کے ہاتھ میں سنجہ ڈال دیا کچھ اور  
 دوسرے لوگ بھی جمع ہو گئے۔ رمضان میرے ہاتھ پر  
 قوت صرف کرنے لگا لیکن بات اس وقت قوت  
 آزمائی کی نہیں تھی بلکہ اپنی بقاء کی تھی چنانچہ میں بھی  
 اپنی بقاء کی جنگ لڑنے لگا اور رمضان کسی ایسے شخص کا  
 مقابلہ نہیں کر سکا جس نے ابھی زندگی کا آغاز کیا تھا  
 میں نے اس کا ہاتھ موڑ کر اس کی پشت پر رکھ دیا  
 رمضان مجھے غور سے دیکھنے لگا پھر بولا۔

”دیکھو ادھر مار پیٹ منع ہے خیر ایک بات سن لے  
 میری اور تیری فائٹ ایک بار کھلے میدان میں ضرور ہو  
 گی۔“

”میں لڑنا نہیں چاہتا بس مجھے اپنے ساتھ کام پر لگا  
 لو۔“ میں نے کہا اور رمضان پر خیال نگاہوں سے مجھے  
 دیکھنے لگا پھر اس نے کہا۔

”ٹھیک ہے چلو اس کو کپڑا اور بالٹی دو اور سن ایک  
 گاڑی ایک سو پچیس روپے میں ملتا ہے ایک سو پچیس



بارہ بجے گاڑیاں آگئیں اس کے بعد دو گاڑیاں دھونے میں ڈیرھ بج گیا رمضان نے میرے لیے ایک گاڑی والے سے بات کر لی تھی اور اس نے مجھے گاڑی کے اندر سونے کی اجازت دے دی تھی اس سے زیادہ ابھی اور کچھ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ گاڑی کے اندر یہ پہلی آرام گاہ مجھے بڑی عجیب لگی لیکن یہ زندگی کا آغاز تھا اپنی پسند کی زندگی کا۔ ایک آواز زندگی کا اور میں اس آغاز سے غیر مطمئن نہیں تھا۔

دوسری صبح حلوہ پوری کا ناشتہ کیا گیا ساڑھے دس بجے رمضان آگیا اور اس کے بعد پھر وہی ساری ذمے داریاں بڑی صبح جگہ تھی اور وہاں میں نے اپنا ٹھکانہ بنا لیا تھا ہم لوگ مل کر گاڑی دھوتے تھے اور میرے پاس اچھے خاصے پیسے آتے تھے بس والوں سے مہینہ الگ بندھا ہوا تھا جس میں رمضان خان نے مجھے میرا حصہ بتا دیا تھا ہم اب بہت زیادہ کھل مل گئے تھے لیکن اس سے زیادہ مجھے رمضان خان کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ کبھی کبھی وہ خود ہی مجھے اپنی کہانیاں سنا دیا کرتا تھا وہ کہتا۔

”دولت اپنے مقدمے میں نہیں ہے بہت کوشش کیا کہ کہیں ایک بار داؤ لگ جائے اور اب بھی چانس میں ہے ایک بس خریدوں گا اور تجھے اس کا میجر بنا دوں گا۔“ وہ بڑے انوکھے انوکھے خواب دیکھا کرتا تھا۔ ایک دن دوپہر کے تقریباً ڈھائی بجے تھے ایک ہنڈا سٹی آکر رکی رمضان نے فوراً اسے پکڑ لیا۔ ہنڈا سے ایک شخص نیچے اترا تھا اوہیڑ عمر کا تھا سفید پتلون پہنے ہوئے تھا۔ کالا کوٹ تھا اس نے چابی رمضان کو دیتے ہوئے کہا۔

”ذرا جلدی کر دینا میں مارکیٹ جا رہا ہوں ابھی آتا ہوں۔“

وہ چلا گیا اور رمضان گاڑی کے پیڈ نکالنے لگا میں

”کچھ نہیں۔“

”کدھر رہتا ہے؟“

”کوئی ٹھکانہ نہیں۔“

”کیا؟“

”ہاں کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔“

”ارے بابا کدھر سے آئے ہو؟“

”بس ایک کوٹھی میں رہتا تھا وہاں سے نکال دیا گیا۔“

”تو پھر تم کدھر نام گزارو گے؟“

”دیکھ لوں گا پہلے پیٹ بھرنے کے لیے پیسے چاہیے تھے وہ تمہاری مدد سے مل گئے ہیں اب رہنے کا ٹھکانہ بھی تلاش کر لوں گا۔“

”ہوں..... اچھا..... دیکھو میری بات سنو رات کو ادھر چار پانچ گاڑیاں آکر کھڑی ہوتی ہیں ان کا کام کرنا پڑتا ہے میرے پاس ان کا ٹھیکہ ہے تو اگر دیا ہے تو میرے ساتھ کام کرنا دن میں زیادہ محنت مت کرنا رات میں گاڑی دھولینا میں استاد لوگ سے بول دوں گا کہ اسے گاڑی میں سونے دو صبح کو سامنے پٹرول پمپ کے پاس حلوہ پوری کا ناشتہ ملتا ہے اور اس کے برابر ہوٹل میں کھانا مل جاتا ہے عیش کرے گا زندگی بھر۔“

”بہت بہت شکریہ رمضان بھائی تم نے میری بڑی مشکل حل کر دی ہے میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔“

”ارے چھوڑو میں نے تیرے کو کہنا کہ میں دل کا برا نہیں ہوں بس ٹھیک ہے اب اپنا کام کر۔ کیا سمجھا۔“

اور میں نے اپنے کام کا آغاز کر دیا دن میں دو گاڑیاں اور دھوئیں اور میرے پاس اچھی خاصی رقم جمع ہو گئی۔ اس کے بعد رات کا کھانا وغیرہ کھایا ساڑھے



میں موجود بکس نکال کر اس میں سے عینک نکالا جانتا ہے اس بکس میں کیا تھا؟“  
”کیا تھا؟“

”اوپر تک نوٹ بھرے ہوئے تھے مجھے دو دن تک افسوس کا بخار چڑھا رہا میری تقدیر ایک دفعہ پھر کالی ہو گئی تھی خیر چانس میں رہنا چاہیے۔“

ہم دونوں نے بجلی کی تیزی سے گاڑی صاف کر دی کچھ دیر کے بعد کالے کوٹ والا واپس آ گیا رمضان سگریٹ سلگا کر ایک طرف بیٹھ گیا تھا اسی وقت ہمارے ایک ساتھی نے مجھے آواز دی اور میں اس کے پاس چلا گیا۔

”یار ذرا اس گاڑی میں ہاتھ لگوا دے جلدی کی گاڑی ہے۔“

”کوئی بات نہیں۔“ میں نے کہا مگر میرے ذہن میں وہی بریف کیس گھوم رہا تھا اور اس میں اوپر تک نوٹ بھرے ہوئے نظر آ رہے تھے یہ نوٹ آدھے میرے ہوں گے اور آدھے رمضان خان کے اتنی رقم کیسے خرچ کروں گا ہنڈاسٹی چلی گئی تھی لیکن زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ وہ آکر میرے پاس رک گئی کالے کوٹ والا بیٹھا ہوا تھا مگر اس وقت وہ شلوار قمیض میں تھا وہ ادھر ادھر نظریں دوڑا رہا تھا پھر اس نے رمضان خان کے بارے میں پوچھا۔

”میں نے ابھی گاڑی دھلوائی تھی وہ بندہ کدھر ہے؟“

”رمضان خان۔“

”ہاں ہاں کہاں ہے وہ؟“

”اے تم ادھر آؤ۔“ ہنڈاسٹی والے نے مجھے اشارہ کیا اور گاڑی سے اتر آیا۔ میں اس کے پاس پہنچا تو اس نے بغور مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم بھی تو اسی کے ساتھ تھے۔“

بالٹی اور پانی تیار کرنے لگا رمضان نے ڈکی کھولی اور اس کے اندر سے پیڈ نکالنے لگا مگر میں نے اسے چونکتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا میں اس کے پاس پہنچ گیا۔

”جہانو۔“ رمضان کی آواز میں کوئی عجیب سی بات تھی۔

”کیا ہو گیا رمضان بھائی؟“

”ادھر دیکھ۔“ اس نے کہا اور میری نگاہ بھی اندر پڑ گئی سیاہ رنگ کا ایک بریف کیس اندر رکھا ہوا تھا۔  
”کیا بات ہے؟“

”یار اس میں ہماری تقدیر بھی ہو سکتی ہے غائب کر دے اسے۔“

”مگر رمضان بھائی چاہی آپ اسے پاس ہے؟“  
”اویار تو اسے لے کر پھوٹ لے ادھر سامنے ایک جلا ہوا ڈرم پڑا ہوا ہے اس میں چھپا کر تیزی سے واپس آ جا۔“

”گڑبڑ نہ ہو جائے۔“

”جا پار جیسا میں بولتا ہوں ویسا کرو۔ دیر نہیں ہونی چاہیے تو فکر مت کر میں سب سنبھال لوں گا۔“ اس نے بریف کیس نکال کر میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

میں جانتا تھا کہ یہ چوری سے ڈاکا ہے اس سے پہلے میں نے یہ کام کبھی نہیں کیا لیکن رمضان خان کا حکم تھا میں نے بریف کیس اس جگہ چھپا دیا رمضان صابن سے پیڈ دھو رہا تھا۔

”ہو گیا کام؟“

”ہاں“

”کام سے لگ جاؤ ابھی تھوڑے دن پہلے کی بات ہے ایک صاحب کرولا دھلوانے لائے تھے گاڑی چھوڑ کر چلے گئے میں نے کام کیا صاحب واپس آیا تو چابی اس کو دے دیا ان صاحب نے ڈکی کھولی اس



نیچے اتر اور اس نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”ایک یہ ہے اور ایک اور اس کے ساتھ تھا۔“  
ایس آئی نے آگے بڑھ کر مجھے گریبان سے پکڑ لیا اور گالی دیتا ہوا بولا ”کہاں ہے تیرا ساتھی؟“  
”گالی نہیں صاب گالی نہیں۔“ میں نے غرا کر کہا اور ایس آئی کا پارہ نبجانے کیوں پھیکا پڑ گیا۔  
”شریف زادے تیرا ساتھی کہاں ہے؟“ اس نے کہا۔ اس دوران پولیس تمام گاڑی دھونے والوں کو پکڑ لائی تھی اور آس پاس لوگ جمع ہونے لگے تھے۔  
”وہ ابھی تک نہیں آیا۔“

”پتہ نہیں۔“  
”چلو اسے بٹھاؤ اسے بھی تلاش کر لیں گے اور کون کون تھا اس کے ساتھ۔“  
”ویسے تو یہ سب یہاں تھے مگر میری گاڑی ان دونوں نے دھونی تھی۔“ ہنڈاشی والے نے جواب دیا۔  
”سب کو اٹھا لیں۔“ ایس آئی نے پوچھا۔  
”نہیں یہی کافی ہے یہی بتائے گا۔“ ہنڈاشی والا بولا اور مجھے گھسیٹ کر پولیس کی گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔  
ایس آئی نے دو پولیس والوں کو یہاں چھوڑ دیا تھا اور پھر خود جیپ میں آ کر بیٹھ گیا تھا اور جیپ اشارٹ ہو کر چل پڑی زندگی نے ایک نئے کھیل کا آغاز کر دیا تھا اور اس نے کھیل کے بارے میں مجھے فیصلہ کرنا تھا میں نے راستے میں ہی فیصلہ کر لیا۔ کچھ دیر کے بعد گاڑی پولیس اسٹیشن میں داخل ہو گئی مجھے نیچے اتار کر ایک بڑے سے کمرے میں لے جایا گیا۔ راستے میں پولیس کا ایک افسر ملا جسے سیلوٹ کیا گیا تھا۔ اس نے فوراً پوچھا۔

”کیا ہوا کیل صاحب کام بن گیا؟“  
”ابھی کہاں آدمی مل گیا ہے اب دیکھیں یہ آپ

”ہاں۔“  
”ڈکی میں ایک بریف کیس رکھا ہوا تھا دیکھو کہیں رکھ تو نہیں دیا تمہارے ساتھی نے۔“  
”بریف کیس کیا ہوتا ہے صاب؟“ میں نے انجان بن کر پوچھا۔  
”کالے رنگ کا ایک بریف کیس تھا تم اسے بلاؤ کدھر گیا ہے وہ؟“  
میں نے رمضان خان کو تلاش کیا مگر وہ نظر نہیں آیا تھا۔  
”بات کیا ہے صاب؟“ ہمارے ایک ساتھی نے پوچھا۔

”کوئی خاص بات نہیں ایک بریف کیس رکھا تھا گاڑی میں میں نے گھر جا کر دیکھا تو وہ مجھے نہیں ملا۔“  
”نہیں صاب ادھر ایسا نہیں ہوتا ایمان دھرم کی کھاتے ہیں ایک کیل حرام سمجھتے ہیں سالوں سے یہاں کام کرتے ہیں۔“  
”ہوں..... کہیں اور بھول گیا ہوں گا تمہارا شکریہ۔“ وہ دو پارہ گاڑی میں جا بیٹھا اور گاڑی اشارٹ ہو کر آگے بڑھ گئی یہ خطرہ اس طرح ٹل جائے گا مجھے امید نہیں تھی۔  
”بس کیا کہیں رمضان خان کا ہاتھ خراب ہے دوسرے ایسا نہیں کرتے مگر وہ کیا کہاں؟“

میں جانتا تھا کہ رمضان خان کہاں گیا ہے کچھ نہ کچھ ضرور تھا مگر مجھے میرا حصہ ضرور ملے گا۔ ایک اور گاڑی آگئی اور میں دوسرے بندے کے ساتھ اس کام میں مصروف ہو گیا زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ اچانک ہی پولیس کی ایک گاڑی قریب آ کر رکی اور اس میں سے چھ سات پولیس والے نیچے کود کر ہماری طرف لپکے وہ دُور دُور تک پھیل گئے تھے اس کے ساتھ ہی وہ ہنڈاشی بھی موجود تھی اس سے وہی شخص



کے ایس آئی صاحب کیا کام دکھاتے ہیں؟“ ہنڈاسٹی والے نے کہا۔

”یہ ہے؟“ بڑے افسر صاحب نے بھی چوڑے اور کھرورے ہاتھ سے میرا رخسار دباتے ہوئے کہا پھر بولا۔ ”سوہنا منڈا ہے۔ ہمارے یار کا بریف کیس واپس کر دے بیٹا ورنہ یہ رنگ کالا پڑ جائے گا چلو ذرا چیک کر دے اس کو ننھا بچہ ہے اچھا وکیل صاحب میں تو ذرا کام سے جا رہا ہوں آپ کا کام تو ابھی ہوا جاتا ہے۔“ افسر چلا گیا اور مجھے ایک کمرے میں لے جایا گیا۔

”ہاں شہزادے اب بتا بریف کیس کہاں ہے؟“ ایس آئی نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ وکیل صاحب بھی پاس ہی بیٹھ گئے تھے۔

”میں نے آپ کو بتایا تھا نا مجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔“

”یہاں آنے کے بعد بھی نہیں معلوم پکا حرامی لگتا ہے کتے کا بچہ۔“

”دیکھو گالی مت بکو میں نے پہلے ہی منع کیا تھا اگر تیسری بار تم نے گالی دی تو تو.....“ میرا سانس پھولنے لگا۔

”اوئے ہوئے ہوئے ہوئے سنا وکیل صاحب آپ نے کیا ہوگا بیٹا اس کے بعد.....؟“

”اتنے ٹکڑے کروں گا تمہارے کہ گنے نہ جاسکیں اسے لکھ لو پولیس افسر صاحب جو کہا ہے وہ کر دکھاؤں گا۔“ میں نے شدید سفاک لہجے میں کہا اور ایس آئی چونک کر مجھے دیکھنے لگا اسی وقت ایک زوردار ہاتھ میری گدی پر پڑا اتنی طاقتور ضرب تھی کہ میں میز پر اونڈھ گیا۔ یہ ہاتھ ایک لمبے چوڑے آدی نے میری گدی پر جمایا تھا پھر اس نے عقب سے میرے بال پکڑ کر مجھے سیدھا کر لیا۔

”ربان نکال لو اس کی انسپکٹر صاحب۔“

”چھوڑ دے اسے چھوڑ دے۔“ ایس آئی بولا اور اس نے جھٹکے سے میرے بال چھوڑ دیئے۔

”بریف کیس کہاں ہے حرامی کے بچے۔ میں نے تجھے تیسری گالی دے دی ہے۔“ وہ بولا اور میں سپاٹ نظروں سے اسے دیکھنے لگا اس کا رنگ سانولا تھا عمر بتیس تینتیس سال کے قریب تھی نقش موئے اور بھدے تھے میں نے یہ نقوش دل میں اتار لئے۔

”دیکھو لڑکے اس میں کوئی رقم وغیرہ نہیں ہے میرے بہت ضروری کاغذات ہیں اگر وہ تم مجھے دے دو تو میں تمہیں ایک ہزار روپے دوں گا۔“

”صاحب مجھے اس کے بارے میں نہیں معلوم آپ جس طرح بھی چاہیں تفتیش کر لیں۔“

”مگر تمہارا ساٹھی کہاں بھاگ گیا؟“

”اگر آپ کا بریف کیس اس نے نکالا ہے تو وہ ضرور اسے لے کر بھاگ گیا ہوگا۔“

”کہاں رہتا ہے وہ؟“

”میر نہیں جانتا۔“

”کیا نام ہے اس کا؟“ اس بار ایس آئی نے پوچھا۔

”رمضان خان۔“

”تو اس کے ساتھ کام کرتا تھا؟“

”ہاں۔“

”کہاں رہتا ہے تو؟“

”وہیں گاڑیوں میں۔“

”پتہ بتا اپنا۔“

”بس میں نے کہا نا دن بھر وہاں رہتا ہوں جہاں سے پکڑا گیا ہوں رات کو وہاں کھڑی ہونے والی بسوں میں سوتا ہوں۔“

”دیکھا آپ نے وکیل صاحب صورت دیکھو عمر دیکھو اور پکا پن دیکھو یہ تو مجھے عادی چور لگتا ہے اب اس



سے پہلے کہاں رہتا تھا یا اسی بس میں پیدا ہوا تھا کوئی اور ہے تیرا؟“  
”کوئی نہیں ہے۔“

”ہوں وکیل صاحب معاملہ کچھ لمبا ہو جائے گا کچھ اور چھو کرے بھی اٹھانے پڑیں گے آپ آرام کریں ہم ذرا اس کو ڈرائنگ روم دکھائیں گے تو کام بن جائے گا آپ فکر نہ کریں۔“

”بڑے ضروری کاغذات ہیں میرے بڑی اہم دستاویزات ہیں کئی کیس خراب ہو جائیں گے۔“  
”وہ تو ٹھیک ہے جی مگر کیا کیا جاسکتا ہے۔“ ایس آئی نے خشک لہجے میں کہا، ”روکیل صاحب کچھ لمحے سوچتے رہے پھر بولے۔“

”دیکھو لڑکے تم چاہو تو مجھ سے تعاون کر سکتے ہو میں تم سے سختی نہیں ہونے دوں گا وعدہ کرتا ہوں۔“  
میں نے رخ بدل لیا تھا۔ پھر ایس آئی وکیل صاحب کے ساتھ باہر نکل گیا اور تھوڑی دیر کے بعد اندر آیا اور اس سادہ لباس شخص سے بولا۔

”چلو اسے اندر کر دو اور تم مجھے ساتھ چلو میں باہر گاڑی میں انتظار کر رہا ہوں۔“

”جی صاب۔“ سادہ لباس شخص نے کہا اور آگے بڑھ کر میرا بازو پکڑ لیا۔ کسخت کا ہاتھ فولادی معلوم ہوتا تھا پھر مجھے ساتھ لے کر سلاخوں والے دروازے کے پاس پہنچا ایک سپاہی چابی لے کر پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ اس نے دروازے کا تالا کھولا اور مجھے اندر دھکیل کر دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ اندر کچھ اور لوگ بھی تھے ہم مدہم آواز میں ایک کورس سنائی دیا۔

”آگے آگے گھر آگے گئے بلم پردیسی جن پردیسی آگے گھر آگے۔“

میں نے بوکھلائی ہوئی نگاہوں سے انہیں دیکھا پانچ افراد تھے عجیب سی شکلوں کے مالک۔

”آؤ آؤ پری زاد! ابے کوہ قاف سے آرہے ہو کیا دیکھو بھائی دیکھنا مکھن چاچا کیا چیز بھیجی ہے اللہ نے۔“  
”پکا شہزادہ ہے کیا سمجھے؟“

”کیا کرتے ہو شہزادے قینچی کا کام کرتے ہو کیا کس کے سکھائے ہوئے ہو؟“

”یار تم نرے آلو ہو چھری تلے دم تو لینے دو بچے کو۔ ہاں شہزادے کہاں سے پکڑے گئے؟“

”کیا بد تمیزی ہے سنتری کو آواز دوں۔“ انہی میں سے ایک کسی قدر معقول سا آدمی تھا اسی نے یہ الفاظ کہے تھے۔

”ابے اویسا سی لیڈر تم ہمیشہ قوم کی گردن پر چھری ہی چلاؤ گے ابے لاڈلے یہ اپنی فیلڈ ہے اپنا کام کرنے دو یار۔“

”بس خاموشی اختیار کرو۔“

اس چڑیا گھر میں سارے پرندے چوں چوں کر رہے تھے میں ایک گوشے میں جا بیٹھا وہ لوگ نجانے کیا کیا بکاؤ اس کرتے رہے رات کو نو بجے میری اس جگہ کے دو بندے اور لاک اپ میں پہنچا دیئے گئے یہ دونوں بھی وہیں کام کرتے تھے جہاں سے مجھے لایا گیا تھا انعام نے روتے ہوئے کہا ”اللہ کی قسم میں نے تو ایک رومال بھی نہیں چھریا کسی کا یہ لوگ میرے کو زبردستی اٹھالائے ہیں۔“

”اور میں تو جیسے گاڑیاں صاف کرنے کے بجائے چوریاں ہی کرتا رہا ہوں۔“ دوسرے آدمی نے کہا۔

”تمہیں بھی اس چکر میں لائے ہیں یہ لوگ؟“ میں نے پوچھا۔

”تو اور کیا یار گھر میں اماں انتظار کر رہی ہوگی۔“ اس نے روتے ہوئے کہا۔

”رمضان استاذ نہیں آیا۔“

”اب کیا واپس آئے گا کام دکھا گیا حرامی ہمیں



پھنسا گیا۔

”ایک بات بتاؤ؟“

”کیا؟“

”یہ رمضان استوار ہوتا کہاں ہے؟“

”بس..... اللہ بخش جانتا ہے صاف قسمیں کھا

گیا، اللہ بخش دے کا مریض ہے اس لیے پولیس

والوں نے اسے چھوڑ دیا، بس ایک بات تو بتا دیجئے

جہاں نو بکرہ رمضان خان نے نکالا یا نہیں؟“

”یہ بات جانتا تو پولیس والوں کو نہ بتا دیتا۔“

”تیرے سامنے نہیں نکالا۔“

”نہیں۔“

”پتہ نہیں اب کیا ہوگا؟“

”تیری تو بڑی دوستی تھی رمضان خان سے اس کے

گھر کا پتہ تجھے بھی نہیں معلوم۔“

”میں نے کبھی پوچھا ہی نہیں؟“

”یار ایک بات بتاؤں تجھے جہاں نو وہ پولیس والا

ہمیں یہ کہہ کر لایا ہے کہ ہم تجھ سے بکسے کے بارے

میں پوچھیں اگر پتہ چل گیا تو ہمیں چھوڑ دیا جائے گا

تجھے پتہ ہے تو بتا دے بھائی، تیرا بھلا ہوگا۔“

”دماغ خراب ہے تیرا اگر مجھے معلوم ہوتا تو

پولیس کو نہ بتا دیتا یہاں تک کیوں آتا۔“

”یار بلا وجہ پھنس گئے۔“

گیارہ بج گئے پھر دو سپاہیوں نے ان دونوں کو باہر

نکالا اور پھر ساتھ لے گئے حوالات کے قیدی زمین پر

اوندھے سیدھے لیٹ گئے تھے میں بھی تھک گیا تھا

کوئی پونے بارہ بجے کے قریب حوالات کا دروازہ پھر

کھلا اور مجھے سپاہیوں نے آواز دی۔ میں چونک کر اٹھ

گیا، سپاہیوں نے مجھے آنے کا اشارہ کیا اور میں

خاموشی سے اٹھ کر باہر نکل آیا اس کے بعد مجھے ایک

اور دوسرے کمرے میں لے جایا گیا جہاں دو تین میز

کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ایک کرسی پر میز کے پیچھے

ایس آئی بیٹھا ہوا تھا اس کے پاس دو آدمی اور بھی تھے۔

جو مجھے یہاں لائے تھے وہ اس کمرے میں چھوڑ کر

چلے گئے ایس آئی نے میری طرف رخ کر کے کہا۔

”تجھے یاد آیا کہ بریف کیس کہاں لے جایا گیا

ہے؟“

”نہیں جناب میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا

آپ سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔“

”اور وہ رمضان خان کہاں رہتا ہے یہ بھی نہیں

معلوم تجھے؟“

”مجھے تو یہاں کام کرتے ہوئے زیادہ دن بھی

نہیں ہوئے میں نہیں جانتا وہ کہاں رہتا ہے؟“

”چلو اس کی ہٹ دھرمی نکالو۔“

ایس آئی نے دونوں آدمیوں کو حکم دیا جو اس کے

پاس موجود تھے ان میں سے ایک نے جو گہرے سیاہ

رنگ اور بڑی بڑی مونچھوں کا مالک تھا میرے قریب

پہنچ کر کہا۔

”بیٹا، بہت بُری بات ہے زبان کھول دے کیا

فائدہ تیرا ڈیزائن بڑ جائے گا۔“

میں نے خاموشی سے اسے دیکھا اور ٹھنڈی سانس

لے کر بولا۔ ”اگر مجھے..... لیکن میرے منہ سے اتنا ہی

نکلا تھا کہ ایک بھر پور ٹھٹھیر میرے گال پر پڑا اور میں دو

تین قدم پیچھے ہٹ گیا، لیکن وہ بد بخت میرے ساتھ

ہی ساتھ آیا اور اس نے میرے بال پکڑ کر مجھے زمین پر

گرادیا پھر میرے شانے پر پاؤں رکھتے ہوئے بولا۔

”ہڈیاں پسلیاں سب ٹوٹ کر برابر ہو جائیں گی

سمجھا بتانا بہت ضروری ہے۔“

میں نے اب خاموشی اختیار کرنے کے سوا اور کوئی

چارہ کار نہیں سمجھا۔ اس نے ایک ٹھوکر میری پسلیوں پر

لگائی اور میں نے ہونٹ بھیج لیے اور آنکھیں بند کر



لیں اس نے ایک بار پھر مجھے بالوں سے پکڑ کر اٹھایا اور سیدھا کھڑا کر دیا پھر اس نے میری گردن پکڑ کر مجھے زور سے دیوار کی جانب دھکا دیا اور میں دیوار سے جا لگا۔ وہ مسلسل مجھے مار رہا تھا، پھنر گھونٹنے میرے ہونٹوں سے خون نکل آیا، میں خاموشی سے پٹ رہا تھا اس نے مجھے سیدھا کرتے ہوئے کہا۔

”کس استاد کا شاگرد ہے میری جان مار کھانے میں تو خاصا ماہر ہو گیا ہے زبان کھولے گا یا نہیں؟“ میں نے سرد نگاہوں سے اس شخص کو دیکھا اور اس کے بعد دیوار سے ٹک کر کھڑا ہو گیا۔

”مار دوں گا سا لے بہت ڈھیٹ بن رہا ہے تو۔“  
”گالی نہیں گالی نہیں۔“ میں نے انگلی اٹھا کر کہا۔  
اس بار ایس آئی اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

”ابے شریف زادے گالی اتنی بری لگتی ہے تجھے ہمیشہ دھمکی دیتا رہتا ہے لیکن یہ نہیں بتاتا کہ بریف کیس آخر کیا کہاں چوری ہوئی ہے اس کی کسی نے تو چرایا ہی ہوگا۔“

”میں نے نہیں چرایا یہ میں تمہیں بتا چکا ہوں۔“  
”ایک بات سن لے کان کھول کر اگر یہ معلوم ہو گیا کہ تو نے بریف کیس چرایا ہے تو پھر تو یہاں سے زندہ نہیں جاسکے گا یہ میرا قول ہے۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو ایس آئی بولا۔ ”بند کر دو اسے مر جائے گا سالہ میرے ہاتھوں بڑی بدتمیزی کر چکا ہے مجھ سے اسے چھوڑ دوں گا نہیں آسانی سے۔“

وہ دونوں مجھے لیے ہوئے باہر نکل آئے اور ایک بار پھر مجھے حوالات میں دھکیل دیا گیا، حوالات کے قیدی اٹھ کر بیٹھ گئے تھے اندر ایک مدہم سا بلب جل رہا تھا وہ میرا جائزہ لیتے رہے اور اس کے بعد ان میں سے ایک نے کہا۔

”مار پڑی ہے شہزادے کو؟“

”خاموشی سے سو جاؤ ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔“ میں نے کہا اسی وقت ایک سنتری حوالات کے سامنے سے گزرا تو وہ جلدی سے منہ پر کبل لے کر کرڈٹ بدل کر سو گیا۔ میں خاموشی سے ایک گوشے میں جا بیٹھا تھا اس مصیبت سے چھٹکارہ کیسے حاصل کیا جائے پھر رمضان خان پر غصا آنے لگا میں جانتا تھا کہ اس نے بریف کیس اپنے قبضے میں رکھا ہے یہ تو ایک دھوکا دہی ہے۔ میں نے تو ایسی کوئی کوشش نہیں کی تھی لیکن بلاوجہ ہی اس چوری میں شریک ہو گیا تھا۔ رات آہستہ آہستہ گزرتی رہی تھا نے میں خاموشی چھا گئی تھی۔

صبح ہو گئی اور اس کے بعد وقت آہستہ آہستہ گزرنے لگا ہمیں چائے اور ڈبل روٹی کے دو دو ٹکڑے دیئے گئے میں نے ڈبل روٹی کے ساتھ چائے لے لی تھی رات بھر کے جگر اتے اور پھر ان لوگوں کے تشدد سے سخت مڈھال ہو گیا تھا لکھ میرے حوصلے پست نہیں تھے البتہ اب رمضان خان کے لیے میرے دل میں نفرت پیدا ہوتی جا رہی تھی ادھر ان دونوں کو چھوڑ دیا گیا تھا جو بعد میں لائے گئے تھے پھر تقریباً ڈیڑھ بجے کا وقت تھا جب مجھے دوبارہ اسی کمرے میں لایا گیا وہاں ایس آئی موجود تھا۔

”ہاں یاد آ گیا تجھے؟“

”نہیں کچھ یاد نہیں آیا۔“

”زبان تو تیری ایسی کھلے گی جتنا کہ زندگی بھر یاد رکھے گا..... اچھا یہ بتا اس سے پہلے کہاں رہتا تھا؟“

”بتا چکا ہوں کہیں نہیں۔“

”مطلب یہ کہ فٹ پاتھوں پر ہی زندگی گزاری ہے۔“

”ہاں بس میں سوتا تھا۔“

”اور اس سے پہلے؟“



میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا اور اس کے بعد گردن جھکا کر وہاں سے نکل آیا۔ وکیل صاحب ایس آئی کے پاس ہی بیٹھ گئے تھے۔ خیر تھانے کی عمارت سے نکلنے کے بعد میں نے باہر کے ماحول کو دیکھا، بدن بری طرح دکھ رہا تھا، چہرے پر جگہ جگہ نیلے نشان پڑے ہوئے تھے، جسم کے اور بھی حصے زخمی ہو گئے تھے۔ میں تھکے تھکے انداز میں چلتا رہا اس کے بعد ایک جگہ جا بیٹھا، سامنے ہی ڈیننگ۔ پیننگ کی ایک دکان تھی اور وہاں ہتھوڑی کی ٹھکانا ٹھک سائی دے رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔

خود غائب ہونے کے ساتھ اگر وہ مجھے بھی لے جاتا تب تو میں اسے مخلص مانتا مجھے نہیں پتہ تھا کہ میرے ساتھ یہ حالات پیش آئیں گے، بہر حال میرے دل میں نفرت کا ایک جذبہ ابھر اور میرے قدم خود بخود اسی طرف اٹھ گئے جہاں میں کام کرتا تھا۔ زندگی وہاں اسی طرح رواں دواں تھی مجھے دیکھ کر سب میرے گرد جمع ہو گئے، چاہا نے ہمدردانہ نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

”مار پڑی تھی۔“

”نہیں بڑی محبت سے پیش آئے تھے وہ لوگ۔“  
 ”ویسے رمضان نے غداری کی تیرے ساتھ کیا تجھے یہ نہیں پتا کہ ایسی کوئی چیز وہ لے گیا ہے۔“  
 ”نہیں مجھے نہیں معلوم۔“

”اسی لیے وہ غائب ہو گیا ہے جیٹا اب یہاں نہیں آئے گا۔ ویسے اس نے یہاں بڑی بد معاشی قائم کر رکھی تھی، محنت ہم لوگ کرتے تھے اور ہماری محنت کا آدھا حصہ وہ لے جاتا تھا۔ اچھا ہوا دفع ہو گیا، چل آ جا اب میرے ساتھ اس میں کام کر، چل چوٹیں تو زیادہ نہیں لگی ہیں؟“

”نہیں چاہا۔“ میں نے جواب دیا اور کام کرنے

”کسی اور اڑے پر تھا۔“  
 اسی وقت میں نے اس کا لے کوٹ والے کو دیکھا جو بریف کیس کا مالک تھا وہ قریب پہنچا تو ایس آئی نے کہا۔

”یار وکیل صاحب کیا چیز ہمارے حوالے کر دی آپ نے؟“ سالے کا ڈیزائن دیکھو اور ہماری محنت دیکھو رات بھر پٹائی کرتے رہے ہیں مگر زبان نہیں کھول کر دی۔“

”میرا خیال ہے اب اسے چھوڑ دیجئے۔“  
 ”کیا مطلب؟“

”ہو سکتا ہے یہ اس میں ملوث نہ ہو وہ اصل کمبخت نکل گیا جو وہاں کا ہیڈ تھا اس کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات خود بھی حاصل کر چکا ہوں اس بچے کے بارے میں سنا ہے کہ یہ اچھا لڑکا ہے اور وہاں بسوں اور گاڑیوں کا کام کرتا ہے ایک بس میں سو جاتا ہے اگر بریف کیس اس کے پاس ہوتا تو اس نے کہیں نہ کہیں تو رکھا ہی ہوتا جبکہ اس کے سابقہ ٹھکانے کا بھی کوئی علم نہیں ہے۔ اصل آدمی وہی ہے۔“

”مگر اس کا پتہ بھی تو ضروری ملنا چاہیے۔“

”چھوڑیے اب جو ہو گا دیکھا جائے گا اللہ مالک ہے۔“

”آپ کی مرضی ہے بڑے صاحب سے بات کر لی ہے آپ نے؟“

”ہاں..... اس کے خلاف کوئی کیس نہیں بن سکتا میں نہیں چاہتا کہ بلا وجہ ایک لڑکے پر سختی ہوتی رہے چھوڑ دیں آپ۔“

”آپ کی مرضی ہے وکیل صاحب.....“ اس کے بعد وہ مجھے دیکھتا ہوا بولا ”سن رمضان خان کا پتہ جب بھی معلوم ہو جائے سپدھے ادھر آ جا اور اس کے بارے میں بتا جانا، چل دفع ہو جا یہاں سے۔“



میں مصروف ہو گیا۔  
 ”کچھ کھایا پیا ہے تو نہ؟“  
 ”ہاں دوپہر کو تھوڑی سی روٹی کھائی تھی۔“  
 ”وہ حوالات کی روٹی بھی کھالی تو نے بیٹا! خیر تجربہ اسی طرح حاصل ہوتا ہے زندگی میں اب کسی پر اتنا بھروسہ مت کرنا۔“ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ رات تک کام میں مصروف رہا تھوڑے بہت پیسے آگئے تھے رات کا کھانا خوب پیٹ بھر کر کھایا وہ پولیس افسر بھی یاد آیا مجھے جس نے گالیاں دی تھیں اور میں نے اس کے لیے دل میں تہیہ کر لیا تھا۔  
 دوسرے دن پھر اسی طرح زندگی کا آغاز ہو گیا۔ اب میں چاچا کے ساتھ کام کرنے لگا تھا دوپہر تک کام کیا اس کے بعد جب ذرا سنا ہوا لیا تو میں اور چاچا ایک دیوار کے سامنے بیٹھے میں نے چاچا سے کہا۔  
 ”ایک بات بتاؤ چاچا۔ پولیس نے تم سے رمضان کا پتہ پوچھا تھا؟“  
 ”ہاں پوچھا تھا بس یوں سمجھ لے اللہ نے بچا لیا ورنہ میں چکر میں پھنس جاتا۔“  
 ”میں یہ بات جانتا ہوں چاچا کہ تمہیں رمضان کا پتہ معلوم ہے۔“  
 ”کبھی گیا تو نہیں اس کے ہاں ایک بار اس نے بتایا تھا کہ کون سے محلے میں رہتا ہے۔ مکان وغیرہ کا نمبر بھی بتایا تھا اس نے۔“  
 ”کیا نمبر ہے؟“ میں نے پوچھا اور چاچا چونک کر مجھے دیکھنے لگے پھر بولے۔  
 ”اب جان بچ گئی تو چھوڑ اس چکر کو رمضان ذرا بد معاش قسم کا آدمی ہے۔“  
 ”یونہی پوچھ رہا تھا مگر مجھے اس کا پتہ تو بتا دو۔“  
 ”مکان نمبر تین سو تیرہ ہے ایک ہوٹل اس کے سامنے ہے اس علاقے میں ایک ہی ہوٹل ہے۔“

”تین سو تیرہ“ میں نے نمبر ذہن نشین کر لیا۔  
 بہر حال مقررہ وقت پر میں وہاں چل پڑا اور راستے معلوم کرتا ہوا وہاں پہنچ گیا جہاں وہ ہوٹل نظر آ رہا تھا۔ ہوٹل میں میں نے ایک چائے پی۔ شام کے تقریباً سو پانچ بج رہے تھے پھر میں وہیں سے مکان نمبر تین سو تیرہ پہنچ گیا اور آخرا ایک بوسیدہ مکان کے سامنے پہنچ گیا۔ اس پر کوئلے سے تین سو تیرہ لکھا ہوا تھا۔ میں نے دروازے پر دستک دی اور انتظار کرنے لگا۔ دوسری یا تیسری بار دستک پر دروازہ کھلا اور ایک آواز سنائی دی۔  
 ”کون ہو بابا! کیوں دروازہ توڑتے ہو؟“  
 میں نے ایک عمر رسیدہ عورت کو دیکھا جو میلے کپڑے کپڑوں میں ملبوس تھی۔  
 ”رمضان خان یہاں رہتا ہے؟“  
 ”ہاں بولو کیا بات ہے۔“  
 ایک لمحے میں میں نے محسوس کر لیا کہ وہ اندھوں کی طرح پلکیں جھپک رہی ہے۔ ”رمضان خان اندر ہے۔“  
 ”نہیں۔“ عورت نے کہا۔  
 ”کہاں گیا ہے؟“  
 ”مجھے نہیں معلوم۔“  
 ”آپ کو یہ جی نہیں معلوم کہ کب آئے گا؟“  
 ”نہیں۔“  
 ”اچھا ٹھیک ہے میں پھر آؤں گا۔“  
 ”کون ہو تم؟“  
 ”میں اس کا دوست ہوں آپ رمضان کی کون ہیں؟“  
 ”ماں ہوں اس کی۔“  
 ”اچھا اماں جی میں چلتا ہوں۔“  
 ”اچھا پھر کب آؤ گے؟“ عورت نے پوچھا۔  
 ”جب بھی فرصت ملی آؤں گا اماں۔“ میں نے کہا



”بیٹھو۔“ اس نے ایک تخت کی طرف اشارہ کیا اور میں بیٹھ گیا۔

”میں سمجھا کہ تم پولیس کو لے کر آئے ہو میری تو جان ہی نکل گئی تھی۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو رمضان بولا۔ ”مگر تمہیں یہاں کا پتہ کس نے دیا؟“

”تم نے مجھے دھوکا دیا ہے رمضان خان۔“

”خدا کی قسم لعنت ہے دھوکا دینے والے پر مگر کیا کرتا تم پھنس گئے تھے میں نے سوچا کہ میں بچ جاؤں تجھے بہت مارا ہے نا پولیس والوں نے۔“

”بریف کیس کہاں ہے؟“

”رکھا ہوا ہے یا نقدیر نے یہاں بھی دھوکہ دیا ہے اس میں تو کاغذ ہی کاغذ ہیں اور کچھ بھی نہیں نکلا۔“

”ایک بات بتاؤ رمضان اگر میں تمہیں تلاش نہ کرتا تو تم مجھے ملتے۔“

”خدا کی قسم تیری پوری پوری خبر رکھتا۔ تیری ضمانت کراتا۔“

”اب کیا کرو گے؟“

”اور دروازہ تلاش کریں گے بہت سے اڈے ہیں یہاں پر تو نے میری ماں کو دیکھا ہے میرے سوا اس کا اور کوئی نہیں ہے دنیا میں وہ اندھی ہے ڈاکٹر لوگ کہتے ہیں آپریشن ہوگا۔ بہت بڑا خرچہ آئے گا یا میری ایک آرزو ہے۔“

”کیا؟“

”ویسے تو آرزوئیں بہت سی ہوتی ہیں لیکن میں چاہتا ہوں کہ ماں کا آپریشن ہو جائے پر نقدیر ساتھ نہیں دے رہی۔“

”اچھا چل تجھے چائے پلاؤں۔“

”نہیں چائے میں نے سامنے والے ہوٹل سے پی لی ہے۔“

اور دروازے سے واپس پلٹ پڑا۔ رمضان کی ماں اندھی عورت ہاں وہ اندھی ہی تھی اور شاید گھر میں اکیلی تھی اور یہ گھر عورت اس کا سہارا رمضان دل نے کہا اچھا ہوا رمضان نہیں پکڑا گیا اگر وہ پکڑا جاتا اور بریف کیس اس کے پاس سے مل جاتا تو اس کی اندھی ماں کا کیا ہوتا یہ کہاں ٹھوکریں کھاتی پھرتی کون اس کے گھر کا چراغ جلاتا۔ اچھا ہوا بہت اچھا ہوا میرا کون ہے اگر سزا بھی ہو مجھے تو تکلیف کسے ہوتی کسی کو نہیں۔ دل پر جیسے سبب کے قطرے پڑے تھے۔ ایک ٹھنڈک سی محسوس ہونے لگی تھی پہلے رمضان کے خلاف دل میں غصہ تھا گھٹن تھی مگر اب نہیں۔

ہوٹل کے سامنے سے گزرا سامنے ہی نظر پڑی رمضان ہی تھا وہ شاید اپنے گھر کی طرف جارہا تھا میں ٹھنک گیا اب یہاں آیا ہوں تو اس سے مل ہی لوں مگر میں نے خود کو اس سے چھپا لیا اور اس کا پیچھا کرنے لگا وہ اپنے گھر کی طرف جارہا تھا وہ اسی گھر میں داخل ہوا تھا۔ دو چار منٹ کے بعد میں نے دروازے پر دستک دی تو دروازہ رمضان نے ہی کھولا تھا۔ اس نے میری صورت دیکھی اور اس کا چہرہ ایک دم زرد ہو گیا پھر اس نے گردن اٹھا کر میرے پیچھے دیکھا اور کسی کو نہ پا کر گہری گہری سانسیں لینے لگا پھر بولا۔

”آؤ اندر آ جاؤ ابھی تھوڑی دیر پہلے تم ہی آئے تھے یہاں؟“

”ہاں۔“

”اماں نے مجھے بتایا تھا آؤ اندر آ جاؤ۔ میں جانتا ہوں تم مجھ سے ناراض ہو گے۔“

میں اندر داخل ہو گیا عسرت زدہ گھرانے میں پہلے اندھیرا تھا اب روشنی ہو گئی تھی یہ روشنی یقیناً رمضان نے جلائی ہوگی وہ نہ آتا تو روشنی نہ ہوتی وہ اس گھر کا چراغ تھا۔



نے تیرے ساتھ دھوکا نہیں کیا، اپنا دل صاف ہے پھر  
بھی اگر تیرے دل میں برائی ہے تو تیری مرضی ہے  
میری ماں کا اور کوئی سہارا نہیں ہے اس بات کا خیال  
رکھنا۔“ رمضان خان نے کہا اور اندر چلا گیا پھر اس  
نے بریف کیس لا کر میرے سامنے رکھ دیا میں نے  
بریف کیس کھول کر دیکھا اس میں بہت سے  
کاغذات رکھے ہوئے تھے مگر ان کاغذات کو پڑھ نہیں  
سکتا تھا میں۔

بریف کیس کی تلاشی لینے میں چھوٹے چھوٹے  
کارڈ بھی نظر آئے ایسے کارڈوں کے بارے میں میں  
جانتا تھا کہ ان پر نام پتہ لکھا ہوتا ہے۔ بہر حال میں  
نے اس سے کہا۔

”چلتا ہوں تیرے پاس کبھی کبھی آتا ہوں گا۔“

”اسی اڈے پر کام کرے گا۔“

”نہیں۔ اب دیکھوں گا کوئی اور اڈہ تلاش کروں  
گا۔“

”مگر تیرا دل ابھی صاف نہیں ہوا ہے تیری مرضی  
ہے اور کچھ نہیں کہوں گا تجھ سے۔“

میں وہاں سے باہر نکل آیا اندھیرا چھانے لگا تھا۔  
میں نے سوچا کہ بریف کیس کے ساتھ اب مجھے اپنے  
ٹھکانے پر نہیں جانا چاہیے رات گزارنے کے لیے اور  
کوئی جگہ بھی نہیں تھی میرے پاس بہت دیر تک سوچتا  
رہا اور اس کے بعد میں نے وہی ٹھکانہ پسند کیا چنانچہ  
بریف کیس کو میں نے اپنی اسی ٹوٹی ہوئی گاڑی کے  
نیچے چھپا دیا جس کا پتہ رمضان نے مجھے دیا تھا۔ پھر  
رات کو معمول کے مطابق بس میں کام کیا اور بس میں  
ہی سو گیا۔

دوسرے دن صبح حلوہ پوری کا ناشتہ کیا آج کام نہ  
کرنے کا ارادہ کر لیا تھا پہلے بریف کیس کا مسئلہ حل کر  
لیا جائے بریف کیس اسی جگہ رہنے دیا اور وہ کارڈ جو

”ناراض ہے مجھ سے؟“

”اب نہیں ہوں۔“

”پہلے تھے۔“

”ہاں۔“

”اب کیوں نہیں ہو؟“

”اس لیے کہ تیرے پاس ماں ہے اندھی ہے اور تو  
اس کا علاج کرانا چاہتا ہے اس لیے رمضان تجھے سب  
کچھ جائز سے ہاں یہ بریف کیس مجھے دے دے اگر  
تیرے کام کا نہیں ہے۔“

”تم کیا کرو گے اس کا؟“ رمضان نے پوچھا۔

”اسے اس کے مالک کو واپس کر دوں گا۔“

”تمہیں کیا ملے گا؟“

”کچھ نہیں یا ر دنیا کو سمجھ رہا ہوں آزمانا چاہتا

ہوں۔“

”واہ پڑھے لکھوں جیسی بات کرتے ہو مگر یہ دنیا تم  
کیا سمجھو گے دنیا کو سب مطلب کے لوگ ہیں کوئی  
کسی کے کام نہیں آتا۔ تم بریف کیس لے کر جاؤ گے  
وہ پوچھے گا کہ یہ بریف کیس کدھر سے ملا کیا بولو گے  
اس کو؟“

”بریف کیس اس کے حوالے کر دوں گا اور اس  
سے کہوں گا کہ اس کی چیز اس کے حوالے ہے اس سے  
زیادہ مجھ سے کچھ نہ پوچھو۔“

”گردن پھنس جائے گی تیری نیکی مت کر کچھ  
نہیں ملتا نیکی کرنے میں بس اپنا دھندہ دیکھ اب تو  
میرے گھر آ گیا ہے تو پھر ایسا کر ابھی میرے ساتھ رہ  
جا کسی اور جگہ دھندہ کریں گے ادھر بڑی گڑبڑ ہے۔“

”یہ سب بعد کی باتیں ہیں رمضان۔ لاؤ بریف  
کیس مجھے دے دو۔“

”ٹھیک ہے جیسی تیری مرضی ایک بات میں  
بہنوں تیرے کو ابھی میرا نام پولیس کو مت دینا میں



ان کی نظر میرے پاس رکھے ہوئے بریف کیس پر پڑی اور وہ بے اختیار اس کی جانب لپکے۔  
”یہ..... یہ..... باب..... بریف کیس مم..... میرا ہے۔“

”جی جناب آپ ہی کا ہے۔“

”ارے اوہ اوہ.....“ انہوں نے جلدی سے بریف کیس اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ایک صوفے پر بیٹھ کر بے تابی سے اسے کھولنے لگے۔ پھر وہ دیوانوں کی طرح اس میں موجود کاغذات دیکھتے رہے پھر جب انہوں نے تمام کاغذات دیکھ لیے تو ان کے چہرے پر گہرا سکون نظر آیا انہوں نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔  
”کیا نام ہے تمہارا۔ غالباً جہانو بتایا تھا تم نے یہی نام ہے نا تمہارا؟“

”جی صاب۔“

”کیا یہ بریف کیس تم مجھے پہنچانے آئے ہو؟“  
”جی..... مجھے علم تھا کہ اس میں آپ کے ضروری کاغذات ہیں آپ نے تھانے دار کے سامنے یہ الفاظ کہے تھے اور اس کے علاوہ آپ نے میرے اوپر احسان بھی کیا تھا آپ کے کہنے پر مجھے چھوڑ دیا گیا میں نے سوچا کہ اب یہ میری ذمہ داری ہے بریف کیس تلاش کر کے آپ تک پہنچاؤں سنئے وکیل صاحب بریف کیس میں نے نہیں چر لیا تھا اسے گاڑی صاف کرنے والا رمضان خان لے گیا تھا مجھے واقعی اس کے گھر کا پتہ نہیں معلوم تھا پولیس نے مجھے بہت نارا پیٹا ہے بہت سختی کی ہے میرے ساتھ اور مجھے گالیاں بھی دی ہیں لیکن آپ نے میرے اوپر جو احسان کیا ہے میں نے اس کا صلہ آپ کو چکا دیا ہے۔“

”مگر یہ بریف کیس تم کہاں سے لائے؟“

”رمضان خان کا پتہ معلوم کر کے اس کے گھر پہنچا اور اس سے یہ بریف کیس لے کر آپ کا گھر تلاش کرتا

بریف کیس کی ایک جیب میں رکھے ہوئے تھے انہیں اپنے ساتھ لے لیا ایک ہی جیسے کارڈ تھے ایک پڑھے لکھے آدمی کو دیکھ کر میں نے اسے روکا سلام کیا اور کارڈ اس کے سامنے کرتا ہوا بولا۔

”آپ مجھے یہ بتا سکتے ہیں؟“

”یہ بتا یہاں کا نہیں ہے اس میں کسی رحمان بیگ ایڈووکیٹ کے بارے میں لکھا ہے اور ان کا دفتر سٹی چیمبر میں ہے۔“

اس نے مجھے سٹی چیمبر کا پتا بتایا اور میں نے کارڈ واپس جیب میں رکھ لیے بہر حال بہت دیر تک سوچتا رہا اس کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ وہیں پر پہنچنا چاہیے جہاں کا پتا دیا گیا ہے۔ شام ساڑھے چھ بجے میں نے ادھر ادھر دیکھنے کے بعد بریف کیس اس جگہ سے نکالا اور اسے ہاتھ میں لیے چل پڑا اس کے دفتر اور گھر کے بارے میں مجھے تفصیلات معلوم ہو چکی تھیں چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد میں بس سے اتر کر اس جگہ پہنچ گیا جہاں وکیل صاحب کی رہائش گاہ تھی۔

جب میں نے دروازہ کی بیل پر انگلی رکھی تو ایک درمیانی عمر کی خاتون باہر نکل آئیں اور آہستہ سے بولیں۔

”کس سے ملنا ہے؟“

”وکیل صاحب یہیں رہتے ہیں۔“

”ہاں آؤ اندر آ جاؤ۔“

نجانے ان کی آنکھوں میں کیسے تاثرات تھے غالباً میرے چہرے کی نیلاہٹیں انہیں میرے بارے میں عجیب و غریب احساسات کا شکار کر رہی تھیں انہوں نے دروازہ کھولا اور مجھے اندر بٹھا دیا۔ صاف ستھرہ سا کمرہ تھا۔ صوفے پڑے ہوئے تھے میں اطمینان سے بیٹھ گیا چند ہی لمحوں کے بعد وکیل صاحب اندر آ گئے انہوں نے مجھے دیکھا اور بری طرح اچھل پڑے پھر



ہوا یہاں آ گیا۔“  
”تمہیں میرے گھر کے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟“

”نہیں میں کسی کی مدد نہیں چاہتا۔“ میں نے جواب دیا۔

وکیل صاحب مجھے بہت کچھ سمجھاتے رہے تھے لیکن میں نے ان کی ایک نہ مالی اور ان کے پاس سے واپس چلا آیا دل پر ایک عجیب سا بوجھ طاری تھا آج یوں لگ رہا تھا جیسے میری زندگی خود مجھ پر بھاری ہو گیا کروں کہاں جاؤں کیسے وقت گزاروں ایک بات جو سمجھ میں آ رہی ہو کوئی تبھی فیصلہ کرنے سے قاصر تھا

ان دنوں جو گزری تھی مجھ پر میرا دل ہی جانتا تھا نجانے کیوں شہر سے وحشت ہونے لگی۔ نگاہوں کے سامنے جو کچھ آ رہا تھا برا لگ رہا تھا رمضان نے جن حالات میں وہ عمل کیا تھا وہ بھی کافی پریشان کن تھے۔

یونہی ٹھہلتا ٹھہلتا ریلوے اسٹیشن کی جانب نکل آیا اور پھر دل میں نجانے کیا سمائی کہ ریلوے پلیٹ فارم پر پہنچ گیا ایک ٹرین آ کر رکی تھی لوگ اتر رہے تھے چڑھ رہے تھے زندگی بڑی ہنگامہ پرور تھی میرے قدم خود بخود ریل کے ڈبے کی جانب اٹھ گئے اور اس کے بعد میں ریل پر چڑھ گیا۔ بالکل دیوانگی کا سا عالم طاری

تھا مجھ پر میں ایک جگہ بیٹھ گیا اور بھاگتے دوڑتے لوگوں کو دیکھتا رہا۔ مجھے یہ اندازہ نہیں ہو سکا کہ کب ریل کو جھکا لگا اور وہ آہستہ آہستہ رینگنے لگی ایک عجیب سی کیفیت تھی میری آنکھیں بند ہو گئی تھیں اور مجھے کچھ ہوش نہیں رہا تھا۔

☆☆☆

زندگی کے نجانے کتنے رخ ہوتے ہیں مجھ پر یہ مشکلیں نہ ٹوٹیں تو بالکل ہی بے وقوف ہوتا۔ بس نوکری کرتا رہتا لیکن اس کو بھی سے نکل آیا تھا اور اب پہلی بار ریل سے سفر کر رہا تھا۔ پھر ریل میں مجھے شبیر علی ملے اسکول ماسٹر تھے۔ مجھ سے سلام دعا ہوئی اور

انہوں نے کہا اور میں نے جیب سے وہ کارڈ نکال کر ان کے سامنے کر دیئے۔ ”یہ کارڈ آپ کے بریف کیس کی جیب میں موجود تھے وکیل صاحب نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا اور بولے۔

”میں تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں جہاں پورا نام کیا ہے تمہارا؟“

”چھوڑیے وکیل صاحب ہم لوگوں کے نام پورے نہیں ہوتے ویسے بس چھوڑیے۔“

”تمہارا بہت شکریہ۔ یہ کاغذات میرے لیے زندگی کی طرح سے تھے وکیل ہوں وکالت کرتا ہوں اگر یہ کاغذات مجھے نہ ملتے تو تم میرے نقصان کا اندازہ نہیں لگا سکتے تھے کچھلی رات ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سو سکا خیر میں تم سے معافی مانگتا ہوں میں اٹھا تو وہ جلدی سے بولے۔

”نہیں سنو بیٹھو بیٹھو تمہیں کہیں جانے کی جلدی ہے؟“

”نہیں اب میرا یہاں رکننا مناسب نہیں ہے۔“

”بیٹھو اپنی عمر سے بہت بڑی باتیں کرتے ہو میں جانتا ہوں تمہارے اندر اور بھی کچھ ہے۔“

”اجازت چاہتا ہوں۔“

”نہیں تمہیں چائے پی کر جانا ہوگا۔“

”نہیں وکیل صاحب مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے میرے ساتھ جو ہوا ہے میں نہیں جانتا کہ اس کے بعد کیا ہوگا۔“

”زندگی بہت طویل ہوتی ہے اور راستے بہت وسیع تم اگر اپنے لیے کسی راستے کا تعین کرو گے تو تمہیں بہت سی مشکلات پیش آئیں گی میں تمہاری مدد کروں



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)



یہ جان کر کہ میں دن ماں باپ کا ہوں مجھے اپنے گھر لے گئے نیک اور دین دار آدمی تھے۔ مجھے اپنے گھر میں رکھ لیا..... اور زندگی نئے تجربوں سے دوچار ہونے لگی۔ میں گھر کے کام کاج کرتا تھا وہ مجھے پڑھاتے تھے یہاں سے میں پڑھنا لکھنا سیکھ گیا اور ماسٹر صاحب بہت خوش ہوئے۔ ان کی پانچ بیٹیاں تھیں بیٹا کوئی نہیں تھا۔ سب سے بڑی لڑکی خالدہ تھی مجھ سے ایک سال چھوٹی تھی مگر چند سال بڑی لگتی تھی میں اسے خالدہ باجی کہتا تھا۔

ایک دن صبح میں پمپل کے پیڑ کے نیچے سو رہا تھا کتا نکھ کھل گئی کوئی میرے پاس آ کر لیٹ گیا تھا۔ ”کون ہے؟“ میں نے حیرت سے کہا تو میرے منہ پر ایک ہاتھ آجما۔ ”شور کیوں مچا رہا ہے؟“ سرگوشی خالدہ باجی کی تھی۔ ”باجی!“

”کیا باجی باجی لگا رکھی ہے چھوٹی ہوں تجھ سے۔“ ”یہاں کیوں آ گئیں؟“ ”اندر بڑی گرمی ہے دیکھ تو پسینے میں بھیگ رہی ہوں۔“ انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے میس کے نیچے پسینہ دکھایا عجیب پسینہ تھا۔ میں نے جلدی سے ان سے ہاتھ چھڑا لیا اور پلنگ سے نیچے اتر آیا۔ ”میں کہیں اور سو جاتا ہوں۔“ ”یا گل ہوا ہے کیا۔ چپکا پڑا رہ۔“ ”ہیں باجی۔“

”پھر باجی.....“ ”باجی آپ جائیں یہاں سے۔“ ”نہیں جاؤں گی۔“ ”میں ماسٹر صاحب کو آواز دے لوں گا۔“ ”جہانو..... تو جوان ہو چکا ہے کیا تجھے اپنی جوانی

کا احساس نہیں؟“ ”بس آپ جائیں.....“ میں نے کہا۔ اسی وقت ماسٹر شبیر علی کی کھانسی کی آواز ابھری اور خالدہ باجی بجلی کی طرح تڑپ کر اٹھ گئیں اور پھر دبے پاؤں اندر چلی گئیں۔ دوسرے دن میں ماسٹر شبیر علی کے ساتھ اسکول گیا تو انہوں نے کپڑوں کی ایک پولی مجھ دے کر کہا۔ ”جہانو بیٹے! تو بہت اچھا ہے۔ خدا تجھے خوش رکھے۔“

”مگر یہ کیا ہے ماسٹر صاحب!“ ”تیرے کپڑے۔“ ”کیا کروں ان کو؟“ ”یہ پانچ سو روپے ہیں۔“ ماسٹر صاحب نے مجھے نوٹ دیتے ہوئے کہا۔ ”کہیں جاتا ہے؟“ ”ہاں“ ”کہاں؟“

”اپنی نقد پر رہ رہو سہ کر جہاں بھی تجھے لے جائے“ ”میں اب میں تجھے گھر میں نہیں رکھ سکتا“ بچیاں جوان ہو گئی ہیں لوگ انگلیاں اٹھاتے ہیں۔“ میں نے خاموشی سے یہ چیزیں ان سے لے لیں۔ میں سمجھ گیا تھا کہ رات کو ماسٹر صاحب جاگ رہے تھے۔ واقعی میں جوان ہو گیا تھا کیونکہ میں نے ماسٹر صاحب سے کچھ نہیں کہا تھا اور خاموشی سے وہاں سے چل پڑا تھا۔

بہت کچھ ملا تھا مجھے اس گھر سے۔ اتنا علم مل گیا تھا کہ دنیا کو سمجھ سکوں۔ اعتماد بھی پیدا ہو گیا تھا۔ وہ شہر بھی چھوڑ دیا اور ایک نئے شہر میں آ گیا۔ یہاں ریلوے کے ایک مال خانے کے منشی صاحب تھے۔ نام جمیل بیگ تھا۔ انہوں نے مجھے حساب کتاب کی نوکری



دے دی جس کی تنخواہ وہ اپنے پراسرار وسائل سے ادا کرتے تھے۔ ریلوے کے کوارٹر میں رہتے تھے۔ ایک بیٹا جمال بیگ تھا، بیوی تھیں، مجھے بھی اسی گھر میں ہی پناہ مل گئی۔

جمال بیگ آوارہ منش تھا، پورا گھرانہ دلچسپ تھا۔ جمیل بیگ کے بارے میں پتہ چلا کہ دنیا کا ہر نشہ کر چکے ہیں اور اب ہر نشہ ان پر بے اثر ہے۔ پھر بھی اخلاقاً انہوں نے کھالیا کرتے تھے وہ کسی خاص مشن پر کام کر رہے تھے۔ عجیب عجیب بھٹیاں بنا رکھی تھیں، عجیب برتنوں میں کچھ پکاتے رہتے تھے۔

”یا آپ کیا کرتے ہیں جمیل چچا؟“  
”اپنے کام سے کام رکھا کر.....!“ انہوں نے مجھے ڈانٹ دیا۔

”میں نے تو ایسے ہی پوچھ لیا تھا۔“

”میرے ساتھ کام کرے گا؟“

”کیا کام!“

”یہی جو میں کرتا ہوں۔“

”میں نے پوچھا تو تم نے ڈانٹ دیا۔“

”رازداری کا وعدہ کر۔“

”کیا..... میں نے کہا۔“

”سونا بنانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ کیمیا بنا رہا ہوں۔“

”یہ کیا ہوتا ہے؟“

”اس سے سونا بنتا ہے۔“

”تو پھر.....؟“

”بس ذرا سی کسر رہ جاتی ہے لیکن کامیاب ہو جاؤں گا۔“

پھر میں نے بھی ان کے ساتھ کام شروع کر دیا۔ نہ جانے کیسی کیسی جڑی بوٹیاں تلاش کرتے پھرتے تھے مجھے بھی ان کے ساتھ جھک مارنی پڑتی تھی۔

ایک دن جمال نے ہنستے ہوئے کہا۔  
”تو آج کل تم بھی ابا کے ساتھ سونا بنا رہے ہو؟“  
”پتہ نہیں۔“ میں نے بے زاری سے کہا۔  
”یہ دونوں پاگل ہیں۔“

”دونوں کون؟“

”اماں اور ابا۔“

”کیا بکو اس ہے؟ اپنے ماں باپ کے بارے میں ایسی باتیں کرتے ہو؟“

”کیا کروں! بچپن سے یہی دیکھ رہا ہوں۔“

”مگر چچی کیا کرتی ہیں؟“

”دیکھا نہیں تم نے؟“

”کیا؟“

”اُلٹے سیدھے وظیفے پڑھتی رہتی ہیں۔ جنات

اور آسیب کو قبضے میں کرنے کے لیے۔“

”کیا.....؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

”دونوں ہی مریض ہیں.....“

جمال بیگ اپنے ماں باپ کی ذرا بھی عزت نہیں کرتا تھا۔ دیسے خود بھی کوئی بہتر انسان نہیں تھا لیکن مجھے ان تمام باتوں سے کیا غرض..... وقت گزر رہا تھا اور میں بہت کچھ سیکھتا جا رہا تھا۔ جمیل بیگ کیمیا بنانے کی کوشش میں اپنا وقت ضائع کرتا رہا اور پھر ایک دن آدھی رات کے وقت جب تمام لوگ گہری نیند سو رہے تھے۔ اچانک جمیل بیگ کی چیخوں سے سارا گھر لرزنے لگا۔ سب ہی جاگ گئے، جمیل بیگ شعلوں میں گھرا ہوا تھا اور پورے گھر میں لوٹا پھرتا تھا لیکن عجیب سی آگ تھی یہ آگ اس کے لباس سے اٹھتی محسوس نہیں ہوتی تھی بلکہ یوں لگتا تھا جیسے اس کے بدن کی کھال جل رہی ہو، گوشت جلنے کی چرا اند اور نیلے شعلوں نے اس کے پورے بدن کو اپنے لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ جمال بیگ کنبل لے کر اس کی طرف دوڑا تو



اس کی ماں نے جمال بیگ کا کارل پیچھے سے پکڑ لیا اور اسے ایک جانب دھکیلتی ہوئی بولی۔  
”اگر تو اس کے قریب پہنچا تو تیری کیفیت بھی اس سے مختلف نہیں ہوگی۔“

”مم ٹکر دہرجائے گا“

”اس نے یہ موت خود خریدی ہے حالانکہ میں نے اسے منع کیا تھا۔“

”کیا مطلب؟“ جمال بیگ بولا۔

”کیا یہ مطالبہ تانے کا وقت ہے۔“ اس کی ماں نے جسے میں چچی کہا کرتا تھا..... سخت لہجے میں کہا، مجھے بہت عجیب سا محسوس ہوا۔ چچی کی کیفیت بتا رہی تھی کہ وہ جمیل بیگ کو جلنے دینا چاہتی ہے لیکن کیوں.....؟ آخر کیوں.....؟ بات میری سمجھ میں بالکل نہیں آئی تھی۔ جمیل بیگ زمین پر گر کر رڑ پتار ہا اور ٹھوڑی ہی دیر کے بعد جھلس کر چر مر ہو گیا۔ میرے لیے یہ نہایت سنسنی خیز لمحات تھے، جمال بیگ بھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے باپ کو موت کی آغوش میں جاتے دیکھ رہا تھا، چچی جان نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

”میرا سہاگ ختم ہو گیا، لیکن کیا کروں۔ اس  
انسان کو کس طرح سمجھاتی۔ پوری زندگی ہی سمجھاتے  
سمجھاتے گزری ہے نہ باپ نے بھی کچھ کہا نہ بیٹے  
نے کانتوں کی پیچ پڑھلتی رہی ہوں۔“

"لے لیں لے لیں"

”نہیں..... بیکار ہے جہانو بیٹے بیکار ہے۔ نہ تم  
کچھ کر سکتے ہو نہ میں اور نہ ہی جمال بیگ کچھ کر سکتا  
تھا۔ جمیل بیگ کو مرنا ہی تھا۔ میں جتنی کوشش کر سکتی تھی  
کر لی کامیاب نہیں ہو سکی.....“ اس کی آنکھوں سے  
آنسو رواں ہو گئے۔

عجیب کردار تھا اس عورت کا کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی تھی میرے۔

بہر حال اہل محلہ کو علم ہوا کہ جمیل بیگ مجلس کرمر گیا ہے۔ سب ہی اس سے نالاں معلوم ہوئے۔ میں حالانکہ خاصا عرصہ یہاں گزار چکا تھا لیکن نجانے کیوں یہ خاندان میری نگاہوں میں بے حد پراسرار تھا۔ اب دنیا کو سمجھنا آ گیا تھا ویسے بھی عمر کم نہیں رہی تھی وقت کے ساتھ ساتھ کافی آگے بڑھ گیا تھا اور دنیا کو بہت گہری نگاہوں سے دیکھ چکا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ باتیں سمجھ میں آنے لگیں۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ چچی جان اپنا سہاگ لٹ جانے کی وجہ سے دل برداشتہ رہنے لگی تھیں۔ انہوں نے بیوگی خود پر طاری کر لی تھی لیکن شوہر کے سلسلے میں جب بھی کبھی گفتگو ہوتی ان کا لہجہ خفی سے بھرپور نظر آتا تھا۔

بلا خرا یک دن یہ راز بھی کھل گیا۔ جمال بیک تو  
انہی آوارہ گردی میں مصروف رہتا تھا صرف میں تھا جو  
چچی جان کا راز دار ہمدرد مونس اور غم خوار تھا۔ انہوں نے  
کہا۔

”شادی کے بعد آج تک‘ یعنی اس وقت تک جب تک جمیل بیگ زندہ رہا صحیح معنوں میں مجھے یہ احساس ہی نہیں ہوسکا کہ عورت کو زندگی میں کبھی مرد کا تحفظ مل سکتا ہے یا نہیں“ میں ان تمام چیزوں سے محروم ہوں۔ زندگی کے ہر شعبے سے گزرنے کے لیے مجھے ایسے طور پر ہی سب کچھ کرنا پڑا ہے۔“

”لیکن چچی جان بات کیا ہے.....؟“

”بات کیا ہوتی میں خود بھی ایک معمولی سے گھرانے کی فرد ہوں دیکھو بیٹے ہر انسان زندگی اپنے طور پر اپنے انداز میں گزارتا ہے۔ جیسے اس کے وسائل ہوتے ہیں لیکن اگر کوئی وسائل کی تلاش میں زندگی کھو دینے پر تمل جائے تو اس کے لیے کیا کیا جاسکتا ہے۔“

جمہیل بیک ابتداء ہی سے سچھ کرنے کا قائل نہیں تھا بلکہ اسی طرح جیسے اب اس کا بیٹا جمال کچھ نہ کرنے



کا قائل ہے۔ آوارہ گردی کی زندگی بسر کرنے کے بعد اپنے لیے پیٹ بھروٹی حاصل کر لیتا ہے تن پر کپڑا حاصل کر لیتا ہے اور بس اس کے بعد اس دنیا سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”ہاں یہ تو میں دیکھ رہا ہوں۔۔۔۔۔“

”جبکہ زندگی ایسی چیز نہیں ہے۔۔۔۔۔“

”مجھے اندازہ ہے چچی جان۔۔۔۔۔“

”نہی کیفیت جمیل بیگ کی تھی مجھ سے شادی ہو گئی جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا کہ ایک معمولی سے گھرانے کی فردہوں میں بھی میرے ماں باپ نے بھی مجھے یوں سمجھ لو بوجھ بوجھ کر اتار دیا تھا اور یہ بوجھ جمیل بیگ نے بھی قبول نہیں کیا۔ وہ ہمیشہ اپنے مشاغل میں مصروف رہا اور اس نے ساری زندگی سوتا بنانے کے چکر میں گزار دی مجھے بھی اس نے اسی راستے پر لگا دیا نہ جانے کیسے کیسے گندے تعویذ اور ٹیک اور بد میں کچھ نہیں جانتی بس کچی عمر میں آئی تھی اس کے پاس اس کے رنگ میں رنگ گئی لیکن جوں جوں زندگی آگے بڑھی مجھے یہ احساس ہوتا چلا گیا کہ ایک انتہائی نکمے اور بدنیت انسان کے ساتھ زندگی کا یہ سفر کرنا پڑے گا۔ بہر حال جہانؤ انسان کا اپنا ایک ماحول ہوتا ہے۔ میرا بھی یہی ماحول تھا رفتہ رفتہ میں نے یہ سب کچھ قبول کر لیا لیکن جمیل بیگ کی کارکردگی سے مجھے کبھی اطمینان حاصل نہیں ہوا۔ میں بھی چلنے و طیفوں کی عادی ہو گئی اور اپنے طور پر اسی انداز میں کام کرنے لگی۔ پھر یہ کسخت جمال بیگ میری زندگی میں آیا لیکن اس نے بھی جوان ہونے کے بعد جو نوپ اختیار کیا اب وہ تمہارے سامنے ہے۔“

”لیکن چچی جان وہ آگ کیسی تھی جس نے جمیل بیگ کو جھلسا دیا۔۔۔۔۔؟“

چچی جان کے چہرے پر عجیب سی کیفیت پھیل گئی

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد انہوں نے کہا۔  
”اس نے بھیسوں جگانے کی کوشش کی تھی۔“  
”کیا۔۔۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ وہ اپنی کوششوں میں ناکام رہا تھا۔ تمام کوششیں کر لیں اس نے۔ اس کا کہنا تھا کہ کیمیا بنانے کے لیے بس ایک ایسی کسریا ترقی رہ جاتی ہے جو آج تک اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اگر وہ کسر بھی پوری ہو جاتی تو وہ سونا بنا کر دنیا کا امیر ترین انسان بن سکتا تھا۔“

”پھر۔۔۔۔۔؟“ میں نے سوال کیا۔

”پھر میں نے اسے بھیسوں جگانے کی ترکیب بتا دی۔۔۔۔۔“

”کیا؟“

”ہاں۔۔۔۔۔“

”آپ نے بتادی چچی جان۔۔۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ مجھے معلوم تھا۔۔۔۔۔“

”مگر کیسے۔۔۔۔۔؟“

”یہ نہ پوچھو بیٹے۔۔۔۔۔“ چچی جان نے کہا۔  
”لیکن چچی جان اس ترکیب کے بعد تو جمیل بیگ کی زندگی ہی نہ رہی۔۔۔۔۔“

”آسان کام نہیں تھا۔ بہت مشکل کام تھا۔ جن بھوت پریت آسب آسانی سے قابو میں نہیں آتے وہ کسی انسان کی غلامی کیوں پسند کریں گے لیکن ہاں اگر انسان کے پاس طاقت ہو تو وہ یہ غلامی قبول کر سکتا ہے اور یہی پیر دولہامیاں کا کہنا ہے۔۔۔۔۔“

”پیر دولہامیاں۔۔۔۔۔“ میں نے چونک کر پوچھا اور محسوس کیا کہ چچی جان بھی ایک دم چونک گئی ہیں۔  
”بہت زیادہ باتیں نہیں کرتے۔“

”لیکن چچی جان میرے دل میں یہ خیال ہے کہ میں آپ سے اس کے بارے میں تفصیلات معلوم کروں۔“



وہ مجھے غور سے دیکھنے لگیں پھر بولیں۔ ”اس آگ کو کوئی نہیں روک سکتا تھا اور اسے

بجھانے کی کوشش کرنے والا خود بھی اسی آگ کا شکار ہو جاتا۔ اسی لیے میں نے جمال بیگ کو اور تمہیں اس سے منع کیا تھا۔“

”یہ تو بہت بری بات ہوئی۔۔۔۔۔“  
”دیکھو بیٹے ویسے تو انسان بڑی کمزور شخصیت کا مالک ہوتا ہے لیکن بہتر یہی ہوتا ہے کہ اسے اپنے طور پر اپنی زندگی گزارنے کا بندوبست کرنا چاہیے اور ایسے طریقوں سے دولت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔“

”مگر بھیروں سے کیا چیز۔۔۔۔۔؟“

”کالے علم کا ایک دیوتا جو اگر قابو میں آ جائے تو بہت سے کام آسان ہو جاتے ہیں اگر بھیروں جگالیا جاتا تو سونا بنانے کی وہ ترکیب آسانی سے جمیل بیگ کو حاصل ہو جاتی اور اس کے بعد اس کا کام بن جاتا۔ وہ میرے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ بہت عرصے سے پیچھے پڑا ہوا تھا لیکن پیر دولہا میاں نے صاف صاف کہہ دیا تھا۔“

”کیا کہہ دیا تھا۔۔۔۔۔؟“

”یہی کہ بھیروں جگانے میں اگر اُسے ناکامی ہوئی تو پھر وہ زندگی نہ پاسکے گا۔۔۔۔۔“  
”یعنی مرجائے گا۔“

”ہاں۔۔۔۔۔“  
”تو پھر۔۔۔۔۔؟“

”میں نے وہ ترکیب جمیل بیگ کو بتادی۔۔۔۔۔“  
”اور جمیل بیگ اس سلسلے میں مصروف ہو گئے؟“

”ہاں۔۔۔۔۔“  
”آپ کے کہنے کا مطلب یہ ہے چچی جان کہ وہ بھیروں جگانے کی اس ترکیب کو صحیح طور پر استعمال ہی نہیں کر سکے۔“

”یہی بات ہے۔۔۔۔۔“  
”اور ان کے بدن کا آگ لگ گئی۔۔۔۔۔“

196 اگست ۲۰۱۵ء



میری ایک طویل زندگی پڑی ہے۔“  
”چچی جان میں آپ کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں۔“ میں نے کہا اور چچی جان کے ہونٹوں پر ایک پھسکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

”بیٹے میں نے زندگی میں کبھی غیر حقیقی وقت نہیں گزارا۔ میں جانتی ہوں کہ جب اپنا خون ہی اپنے ساتھ وفانہ کر سکے تو دوسروں پر کیا بھروسہ کیا جاسکتا ہے؟“

”چچی جان! کبھی کبھی غیر بھی اپنوں سے زیادہ بہتر ثابت ہوتے ہیں۔“

”ہاں یہ ایک کہانی تو ہے لیکن میں نے صرف کہانی کے طور پر اسے سنا ہے اپنی آنکھوں سے کبھی ایسا نہیں دیکھا۔“

”میں کوشش کروں گا کہ اس کہانی کو حقیقت ثابت کر سکوں۔“ وہ پھسکی سی مسکراہٹ کے ساتھ خاموش ہو گئیں اور میں اس گھرانے کے بارے میں سوچتا رہا۔ واقعی اب سوچنے کا انداز تبدیل ہو گیا تھا۔ عمر اب اس منزل میں پہنچ گئی تھی کہ اپنی آنکھوں سے دنیا کی ان حقیقتوں کو دیکھ سکوں۔

بہر طور اس کے بعد جمال بیگ کا وہی دتیرہ تھا، آوارہ گردی کرتا رات کو واپس آ جاتا۔ کبھی نشے کے عالم میں، کبھی کسی اور کیفیت میں۔ بھلا میں اسے کیا ٹوک سکتا تھا جبکہ اس کی ماں اس کی اصلاح نہیں کر پائی تھی لیکن میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ چچی جان کے چلے اور وظیفوں کا وہی عالم ہے۔ راتوں کو جاگتی رہتی ہیں ویسے میں نے کبھی اسے نماز وغیرہ پڑھتے نہیں دیکھا تھا جبکہ تہجد گزار اور دین دار لوگ اپنی بقاء کے لیے یا اپنی عاقبت کے لیے اس قسم کے وظائف کیا کرتے ہیں۔ چچی جان کا سلسلہ کچھ مختلف ہی تھا اور مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ اس کے راستے بھی درست

نہیں رہے۔ نجانے اب اسے دولت کی خواہش کیوں تھی۔ ہو سکتا ہے اپنے بیٹے کو ایک بہتر مستقبل دینا چاہتی ہو۔ یوں زندگی کا ایک دور بھی گزرا اور ذہن مختلف تبدیلیاں قبول کرتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک دن چچی جان نے کچھ عجیب سے الفاظ میرے سامنے کہے۔

”جہانوں..... اب تم اتنے بڑے ہو چکے ہو کہ تمہیں اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنا چاہیے..... کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے تمہیں..... میں نہیں چاہتی کہ جمال کی طرح تم بھی ایک بے مقصد اور بے نام سی زندگی گزار دو۔“

میں سوچ میں ڈوب گیا۔ ماضی کے جو نقوش میرے ذہن پر چسپاں تھے وہ کبھی کبھی مجھے اپنا گھریا دلالتے تھے لیکن اب میں یہ سوچتا تھا کہ واقعی دنیا میں رہنے والے جس انداز میں زندگی گزارتے ہیں مجھے اس سے مختلف زندگی نہیں گزارنی چاہیے۔ مجھے کچھ سوچنا چاہیے اپنے بارے میں بھی..... لیکن کیا..... یہ ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آ سکا تھا۔ میں نے کہا۔  
”چچی جان میں خود بھی یہی چاہتا ہوں۔“

”صرف چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ ہر کام کے لیے کچھ نہ کچھ عمل کرنا ہوتا ہے۔“  
”میں کیا عمل کر سکتا ہوں؟“

”دیکھو اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ وقت بہت بدل گیا ہے۔ نئی دنیا کے نئے لوگ ذرا مختلف انداز میں سوچنے کے عادی ہو گئے ہیں لیکن ہم ان ضرورتوں کو نظر انداز نہیں کر سکتے جو بہر حال اپنا ایک مقام رکھتی ہیں۔“

”میں سمجھا نہیں چچی جان!“  
”دولت..... دولت..... دولت..... اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس دنیا میں صرف دولت کی عزت کی



جائیں گے۔“

”چچی جان میں جانا چاہتا ہوں۔“

”تو پھر ٹھیک ہے میرے ساتھ چلنا۔“

اور پھر پہلی بار میں نے پیر دولہا میاں کی خانقاہ دیکھی۔ ایک ویران سی جگہ آباد کر رکھی تھی اس نے۔ قرب و جوار میں پہاڑی ٹیلے بکھرے ہوئے تھے۔ تھوڑے سے ناریل کے درخت بھی اُگے ہوئے تھے۔ پانی کا ایک چشمہ بھی تھا اور اس کے درمیان پیر دولہا میاں نے اپنی جھونپڑی بنا رکھی تھی۔ عقیدت مند اپنی کاروں میں بیٹھ کر وہاں جایا کرتے تھے اور نجانے کیا کیا حاصل کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ پیر دولہا میاں ایک بھاری بدن کا آدمی تھا۔ سر گنجا، واڑھی بہت بڑی لیکن چہرے پر ایک ایسی کرختگی ایسی خشونت اور آنکھوں میں ایک ایسی کیفیت نظر آتی تھی کہ اسے دیکھ کر ایک کراہیت کا احساس ہوتا تھا۔۔۔۔۔ حالانکہ چچی جان کا کہنا تھا کہ وہ ایک پہنچی ہوئی شخصیت ہے لیکن یہ نہیں وہ شخصیت کہاں تک پہنچی ہوئی تھی۔ کم از کم مجھے تو اس کا اندازہ نہیں ہو سکا۔

چچی جان نے مجھے ان کے سامنے پیش کرتے ہوئے کہا۔

”یہ جہانوی ہے!“

”میں جانتا ہوں۔۔۔۔۔“ پیر دولہا میاں کے ان الفاظ نے مجھے چونکا دیا لیکن چچی جان کے چہرے پر کوئی خاص بات نہیں پیدا ہوئی۔ البتہ میں نے ہی جرات سے سوال کیا۔

”آپ جانتے ہیں مجھے؟“ میرے ان الفاظ پر پیر دولہا میاں نے نگاہیں اٹھا کر مجھے دیکھا اور بولا۔

”تیرا کیا خیال ہے۔۔۔۔۔ کیا میں نہیں جانتا؟“

”نہیں میں اس لیے پوچھ رہا تھا کہ پہلے میری آپ سے ملاقات نہیں ہوئی۔“

جاتی ہے۔ تم خود کتنی ہی اچھی شخصیت کے مالک کیوں نہ ہو کوئی مقام بھی نہیں حاصل کر سکتے۔ کسی خوبصورت سی عمارت میں داخل ہونے کی کوشش کرو دروازے کا چوکیدار تمہیں دروازے پر ہی روک دے گا۔ ہاں اگر تم کسی اعلیٰ درجے کی کار میں بیٹھ کر اس دروازے تک پہنچو تو وہ تمہیں سلام کرے گا اور اس کے بعد ادب سے گیٹ کھول کر کھڑا ہو جائے گا۔ یہ جانے بوجھے بغیر کہ تم ہوں ہو۔“

”یقیناً چچی جان ایسا ہوتا ہے۔“

”تو کیا تم اپنے آپ کو ان لوگوں میں شامل کرنا چاہتے ہو جو دروازے پر کھڑے ہو کر دروازہ کھلنے کا انتظار کرتے ہیں یا پھر ان لوگوں میں جو کھلے دروازے سے آسانی اندر داخل ہو جاتے ہیں؟“

”چچی جان دنیا کا ہر شخص اپنے لیے تمام دروازے کھلے ہی دیکھنا چاہتا ہے۔“

”لیکن یہ اتنا آسان تو نہیں۔“

”میں جانتا ہوں۔۔۔۔۔“

”اب تمہیں تجربہ بھی ہو چکا ہوگا۔“

”کافی حد تک۔۔۔۔۔“

”تو پھر اس کے لیے کوشش کیوں نہیں کرتے؟“

”میں نہیں جانتا کہ یہ کوشش میں کیسے کر سکتا ہوں۔“

”ہاں۔ میں تمہیں بتا سکتی ہوں۔“

”تو بتائیے۔۔۔۔۔“

”ہر جمعرات کو پیر دولہا میاں کے پاس جایا کرو۔۔۔۔۔“

”یہ پیر دولہا میاں کیا چیز ہیں؟“

”اس انداز میں ان کے بارے میں گفتگو نہ کرو۔ بہت کا آمادہ شخصیت ہیں۔ اگر اس کی نظر تم پر ہو گئی تو یوں سمجھ لو کہ تمہارے بہت سے مسائل خود بہ خود حل ہو جائیں گے۔“



”کس وقت کی بات کرتا ہے..... کیا اس وقت کی جب تو نے وہ کٹھی چھوڑی تھی۔“

”نھیک ہے۔“

”تو پھر اب بھاگ جا تیرا یہاں رکنا اب بے مقصد ہو گیا ہے۔“ پیر دولہا میاں نے کہا اور چچی جان مجھے وہاں سے اٹھا کر لے چلیں۔

میں حیرت سے اب بھی گنگ تھا جو باتیں پیر دولہا میاں نے بتائی تھیں وہ تو چچی جان کو بھی نہیں معلوم تھیں تاہم راستے میں میں نے ان سے کہا۔

”چچی جان..... یہ سب کیا ہے؟ اس شخص کو میرے بارے میں کیسے معلوم ہو گیا؟“

”میں نے تم سے کہا تھا نا جہانو کہ وہ بہت پیچی ہوئی شخصیت کا مالک ہے۔“

”لیکن اتنی ساری باتیں میرے بارے میں جانتا کیسے ممکن ہو سکا؟“

”تم کیا سمجھتے ہو اس قسم کے لوگ حالات سے واقف نہیں ہوتے!“

”نہیں اب تو میں بھی اس کا قائل ہو گیا ہوں۔“

”پیر دولہا میاں تمہیں جو کچھ بتائے یا تم سے جو کچھ چاہے جہانو ہو سکتا ہے وہ سخت ہو لیکن تمہیں وہ سب کچھ کرنا ہوگا۔“

”چچی جان میں نہیں سمجھتا کہ میں وہ کرا پاؤں گا یا نہیں۔“

”یہ بات وہ خود تمہیں بتا دے گا.....“ چچی جان نے کہا۔

بہر حال دوسرے دن میں مقررہ وقت پر اس کے پاس پہنچ گیا۔ اب میرے دل میں بھی لگن پیدا ہو گئی تھی ایک ایسا شخص واقعی قابل حیرت ہوتا ہے جو کسی کو کسی کے ماضی کے بارے میں وہ باتیں بھی بتا دے جو باتیں خود اس کے اپنے ذہن سے نکل چکی ہوں۔

اس وقت پیر دولہا میاں کے پاس کوئی موجود نہیں

”یا پھر اس وقت کی جب تیری نقلی ماں باورچی کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔“ اس نے کہا اور میرے اوسان خطا ہو گئے۔ میں نے خوف بھری نگاہوں سے اس شخص کو دیکھا اور پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔ تو پیر دولہا میاں پھر بولا۔

”اور اب تو یہ سوچ رہا ہے کہ کہیں میں تیری بستی کا کوئی آدمی نہ ہوں؟“

میرے ہوش و حواس جواب دے گئے تھے۔ یہ شخص جو کچھ بتا رہا تھا وہ ایک مکملی کتاب کی مانند تھا اور اب بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ میں اس کے سامنے عقیدت گزار نہ ہو جاؤں جبکہ چچی جان مسکرا رہی تھیں۔ انہوں نے کہا۔

”کہو جہانو کچھ اور بھی جانتا چاہتے ہو.....“

”نہیں..... میں نے جواب دیا۔“

”کیا چاہتی ہے اس کے لیے؟“

”میں چاہتی ہوں کہ یہ کچھ بن جائے.....“

”خدمت کرنا ہوگی اسے ہماری.....“

”کرے گا.....“

”نہیں کر سکے گا.....“

”نہیں پیر صاحب اگر آپ چاہیں تو ضرور کر سکے گا۔“

”تو اگر اس کی سفارش کرتی ہے تو میں کچھ سوچنے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن یہ بھی جان لے کہ اسے جو کچھ کرنا ہوگا وہ رازداری میں رہے گا۔ اس لڑکے کو کل پھر میرے پاس بھیج دینا۔“

”کس وقت پیر صاحب؟“

”کل دوپہر کو ایک بجے.....“ پیر دولہا میاں نے



تھا میں اس کے پاس پہنچا اور میں نے اسے سلام کیا لیکن اس نے میرے سلام کا جواب نہیں دیا تھا۔ اس بات پر مجھے حیرت ہوئی تاہم اس شخص نے جس طرح مجھ پر اپنا اثر قائم کر رکھا تھا اس کے تحت مجھے اس بات کو نظر انداز کرنا پڑا۔ پیر دولہا میاں نے مجھے گہری نگاہوں سے دیکھا تھا۔ نجانے کیوں مجھے اس وقت اس کے چہرے کے خدو خال بدلے بدلے نظر آئے۔

اس نے مجھے اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور میں بیٹھ گیا۔ پھر تقریباً پانچ منٹ وہ آنکھیں بند کئے خاموشی سے کچھ سوچتا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے لیکن بہر طور میں نے خاموشی اختیار کئے رکھی تھی۔ پھر کافی دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں میری جانب دیکھا اور آہستہ سے بولا۔

”زندگی کے یہ راستے بہت کھن ہوتے ہیں لڑکے! کیا تم اپنی زندگی کو ایک بہتر شکل دینے کے لیے ان کھن راستوں سے گزر سکو گے؟“

”میں کوشش کروں گا۔“

”اور اس وقت جب تم اس کام کو سرانجام دے لو گے تو تمہیں بہت سی ایسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا جن سے شاید تم اکتا جاؤ۔“

”میں کوشش کروں گا کہ نہ اکتاؤں۔“

”ہوں..... تو اب ایسا کرو کہ ایک چٹاؤ ہن میں رکھ لو کل تمہیں اس جگہ جانا ہے وہاں تمہیں جو کوئی بھی ملے گا اور تم سے جو کچھ کہے گا تمہیں اس کے مطابق عمل کرنا ہوگا۔“

”آپ مجھے پتہ بتا دیجئے.....“ میں نے کہا۔

”اور سنو! تم جس عورت کے ساتھ آئے تھے وہ اچھی ہے میری تابعدار ہے لیکن اب میرا اور تمہارا براہ راست واسطہ ہے۔ یہاں جو کچھ ہو یا تمہیں جو کچھ کرنا پڑے اس کا کسی سے تذکرہ کرنے کی ضرورت نہیں

ہے۔ وقت لگتا ہے ہر کام میں اور تمہیں بھی اس کام میں وقت لگے گا۔“

”میں جانتا ہوں.....“

”بس تو پھر ٹھیک ہے..... میں تمہیں پتا بتائے دے رہا ہوں۔“ اس نے مجھے جو پتا بتایا وہ میں نے اچھی طرح ذہن نشین کر لیا اور بلاخر اس سے ملنے کا فیصلہ کر لیا پھر دوسرے دن منصوبے کے مطابق میں چل پڑا اس علاقے میں میں شاید پہلی بار آیا تھا۔ شہر سے دور دراز کا علاقہ تھا کچھ تھوڑی سی الگ ہٹ کر آبادی تھی جہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مکانات بنے ہوئے تھے۔ زیادہ تر مکانات ٹوٹے پھوٹے تھے۔ کوئی ایک آدھ ہی مکان ثابت یا دو منزلہ نظر آ جاتا تھا۔ گلیاں گندی تھیں اور یہاں کتوں کی تعداد بھی کافی تھی۔ بہر حال جس گھر کا پتہ مجھے بتایا گیا تھا وہ اس آبادی کے آخری سرے پر تھا۔ میں بلاخر تیز قدموں سے چلتا ہوا اس مکان کے سامنے پہنچ گیا۔ نجانے اندر سے کیسی آواز ابھر رہی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں واپس لوٹ جاؤں اور اس خیال کو دل سے نکال دوں لیکن نجانے کون سے جذبے کے تحت میرے قدم رک گئے۔ دیکھنا تو چاہیے کہ پیر دولہا میاں کے کہے ہوئے اس مکان میں کیا چیز ہے۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازے پر زور سے دستک دی اور انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد قدموں کی ہلکی ہلکی چاپ سنائی دی جو دروازے کے قریب آرہی تھی۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ پھر دروازے کی زنجیر کھلنے کی آواز سنائی دی اور اس کے بعد اس کے دونوں پٹ کھل گئے۔

میرے سامنے دبے پتلے بدن کا ایک بھدی سی شکل کا بوڑھا کھڑا ہوا تھا۔ اس کے بدن پر پیلے رنگ کا چونغا تھا جو گردن سے لے کر ٹخنوں تک تھا۔ وہ کچھ عجیب سی شکل کا مالک تھا گول گول آنکھیں، ناک طوطے کی



”تمہیں میرے ساتھ کچھ وقت قیام کرنا ہوگا.....“  
 ”کتنے وقت؟“ میں نے سوال کیا۔  
 اس کا کوئی تعین نہیں کیا جاسکتا، بس یوں سمجھ لو  
 جب تک مجھے تمہاری ضرورت پیش آئے..... اور اس  
 نے مجھے یہی بتایا تھا۔  
 ”کس نے؟“

”جس کے پاس سے تم یہاں آئے ہو.....“  
 میں خاموش ہو گیا کچھ لمحے سوچنے کے بعد میں  
 نے کہا۔

”تو پھر مجھے میرے قیام کے لیے جگہ بتا دو.....“  
 ”یہ جگہ سب سے بہتر ہے ویسے میٹرھیاں عبور  
 کرنے کے بعد تم باہر بھی آ سکتے ہو۔ یہاں تم پر کوئی  
 پابندی ہے نہ قید سمجھ رہے ہوتا؟“  
 ”ہاں.....“ میں نے آہستہ سے کہا۔

وہ تھوڑی دیر تک میرے پاس بیٹھا رہا اور اس کے  
 بعد کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔

”تو اب تم اس جگہ کے مکین ہو.....“ یہ کہہ کر وہ اٹھا  
 اور باہر نکل گیا ایک عجیب سا احساس میرے دل میں  
 جاگزیں تھا اور اندر کشمکش ہو رہی تھی جو کچھ میں کر رہا  
 ہوں یا چچی جان نے جو کچھ کرنے کے لیے کہا ہے کیا  
 موزوں رہے گا؟ کیا یہ انوکھی زندگی مجھے اس آسکتی ہے  
 کیا یہ سب کچھ جو میرے اپنے ذہن میں بالکل نہیں تھا  
 ممکن ہو سکتا ہے؟ یہ تمام تصورات اور خیالات میرے  
 دل و دماغ کو الجھا رہے تھے لیکن اب تیرکمان سے  
 نکل چکا تھا میں نے وہ سب کچھ تسلیم کر لیا تھا جو اس  
 نے کہا تھا چنانچہ اب کوئی انحراف ممکن نہیں تھا اور وہ بھی  
 ان پر اسرار لوگوں سے جن کی حقیقت سے میں واقف  
 تھا۔ چنانچہ اب حالات کچھ بھی ہوں مجھے وہی کرنا تھا  
 جو میری تقدیر کا ایک حصہ بن چکا تھا اس ویران اور  
 بوسیدہ قید خانے میں زندگی بڑی عجیب و غریب تھی اپنی

چونچ کی طرح مڑی ہوئی اور ہونٹ بھی عجیب سے  
 بدنما ایک ہونٹ نیچے لٹکا ہوا تھا جس سے اس کے نیچلے  
 دانت نظر آ رہے تھے۔ نجانے کیوں میرے دل پر  
 دہشت کا ایک اثر قائم ہو گیا۔ بہر حال وہ آہستہ سے  
 بولا۔

”مجھے معلوم ہے کہ تمہیں پیر دولہا میاں نے بھیجا  
 ہے۔ کیا میرا خیال غلط ہے؟“  
 ”نہیں۔“ میں نے گردن ہلائی۔

”آؤ..... اندر آ جاؤ۔“ اس نے کہا اور میرے  
 دروازے کے دوسری طرف جانے کے بعد دروازے  
 کی کنڈی واپس لگا دی۔ پھر مجھے اپنے پیچھے آنے کا  
 اشارہ کر کے آگے بڑھ گیا۔ مکان باہر سے بالکل  
 بوسیدہ اور بد شکل نظر آتا تھا۔ اندر سے ایسا نہیں بلکہ  
 خاصا وسیع تھا۔ بوڑھا مجھے اندرونی کمرے میں لے گیا  
 اور پھر اس کے آخری سرے پر بنی ہوئی چھ میٹرھیاں  
 طے کرنے کے بعد ایک تہ خانے میں پہنچ گئے تہ خانہ  
 بہت عجیب سا تھا۔ چھتوں سے جالے لٹک رہے تھے  
 پرانا فرنیچر پڑا ہوا تھا جن میں سے بعض کرسیاں ایسی  
 تھیں جن کے نیچے اینٹیں لگا کر ان کے پایوں کی کمی  
 پوری کی گئی تھی۔ وہ مجھے کرسی کی طرف اشارہ کر کے  
 سامنے بیٹھ گیا۔ یہاں اچھی خاصی تاریکی پھیلی ہوئی  
 تھی جبکہ باہر کا ماحول روشن تھا لیکن تہ خانہ ہونے کی  
 وجہ سے اس میں تاریکی تھی کوئی ایسا روشن دان وغیرہ  
 بھی نہیں تھا جس سے روشنی اندر آئے۔ میں اس وقت  
 بوڑھے کے خدو خال بھی نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن وہ اپنی  
 جگہ سے آگے بڑھا اور اس نے ایک طرف رکھے  
 ہوئے مٹی کے تیل کے لمپ کو جلا دیا جس سے  
 کمرے میں زرد روشنی پھیل گئی۔ اس زرد روشنی میں  
 مجھے اس کا چہرہ بے حد بھیانک نظر آ رہا تھا۔ پھر اس  
 نے میرے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔



اس رہائش گاہ کو میں نے بغور دیکھا تو میرے دل میں خوف کا ایک احساس جاگ اٹھا۔

کتنی بھیانک جگہ ہے ہر شے سے خواہست نیکتی ہے پیر دولہا میاں نے نہ جانے مجھے اس شخص کے پاس کیوں بھیج دیا ہے ویسے اب میں نا سمجھ نہیں رہا تھا۔ اپنی عمر ہو گئی تھی کہ نیک و بد کی تمیز کر سکوں۔ پیر دولہا میاں مسلمان تھا اور یہ شخص جس نے مجھے نہ تو اپنا نام بتایا تھا اور نہ ہی اپنے بارے میں کچھ اور۔ ہندو معلوم ہوتا تھا۔ کم از کم اس کی زبان اور حلیے سے مجھے یہی اندازہ ہوتا تھا۔ جانے پیر دولہا میاں کا اس سے کیا گٹھ جوڑ ہے لیکن اب یہ تمام باتیں فضول تھیں۔ بعض اوقات میں سوچنے لگتا کہ چچی جان نے مجھے واقعی مصیبت میں پھنسا دیا ہے۔ ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ پورا گھرانہ ہی محسوس کا گھرانہ تھا۔

جیمیل بیگ اچھی خاصی ملازمت کرتا تھا۔ ایمانداری سے کام کرتا تو تین افراد کا گھرانہ تھا اسے زندگی گزارنے میں کیا وقت پیش آتی، لیکن وہ سونا بنانے کے چکر میں اپنی زندگی کھو بیٹھا تھا۔ جمال بیگ آوارہ شخص تھا اور نجاب نے کہاں کہاں گھومتا پھرتا تھا اور وہ محترمہ چچی جان بھی چکروں میں پڑی ہوئی تھیں۔ آخر وہ اس عمر میں اپنے لیے کیا حاصل کرنا چاہتی تھیں اور پھر وہ پیر دولہا میاں مجھے سارے کا سارا ایک جال سا محسوس ہو رہا تھا جو میرے چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ ساری کڑیاں ایک زنجیر کی کڑیاں ہی معلوم ہوتی تھیں۔ لیکن میں بھی اب تن بہ تقدیر ہو گیا تھا۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔

میں اس قید خانے میں رہنے لگا۔ ہاں میں اسے قید خانہ ہی کہہ سکتا ہوں حالانکہ مجھے بوڑھا کہہ کر گیا تھا کہ میرے اوپر کوئی پابندی نہیں ہے لیکن کچھ ایسی چیزیں مجھ پر سوار تھیں کہ میں خود بھی یہاں سے نکل کر

کہیں جانا نہیں چاہتا تھا کیا فائدہ..... کون ہے میرا کہاں جاؤں۔ کیا واپس چچی جان کے پاس جاؤں تو یہ بھی حماقت کی بات ہے کیونکہ وہ خود ہی مجھے ان لوگوں کے سپرد کر گئیں تھیں۔

چار دن چار راتیں اسی تنہائی میں گزار چکا تھا۔ اس دوران کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی سوائے اس کے کہ بوڑھا آتا تھا اور مجھے کھانے پینے کی چیزیں دے جاتا تھا۔ ترکاری پوریاں اور ایسی ہی چیزیں ہوا کرتی تھیں جو بہر حال پیٹ بھر دیا کرتی تھیں۔ پانچویں دن دوپہر کے وقت جب میرے اندازے کے مطابق دن کا ڈیڑھ بجا ہو گا بوڑھا میرے پاس آیا اور مجھے دیکھنے لگا۔ اس کے دیکھنے کا انداز بے حد عجیب تھا۔ پھر اس نے کہا۔

”نام کیا ہے رے تیرا.....؟“

”جہانو.....“

”ناموں کی پروا کرتا ہے؟“

”میں سمجھا نہیں.....“

”نام کوئی اہمیت رکھتے ہیں.....؟“

”میں نہیں جانتا.....“

”نام ایک دوسرے کو پکارنے کے لیے ہوا کرتے

ہیں ایک دوسرے کی شناخت ہوتے ہیں.....“

”ہوں..... ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔

”اگر میں تیرا نام راما رکھ دوں تو.....؟“

”نہیں یہ ہندو نام ہے.....“

”کیا ہندو..... کیا مسلمان..... یہ سب بے کاری کی

باتیں ہیں جہانو۔“ وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا میں اسے

دیکھنے لگا۔

”کیا کہتا ہے تو.....؟“

”کس سلسلے میں.....؟“

”میں نے جو کہا ہے.....“



”نہیں یہ بات نہیں ہے..... بہر حال انسان کی شناخت تو ہوئی ہے۔“

”تو پھر تو پیر دولہا میاں کے پاس کیوں گیا ہوں..... اچھا تو یہ بتا تیرے پتا کا کیا نام تھا؟“

”میں نہیں جانتا۔“

”مسلمان تھا؟“

”ظاہر ہے۔“

”کیا وہ اپنے دھرم کی ساری باتیں پوری کرتا تھا؟“

”کیا مطلب؟“

”یہی میں کہنا چاہتا تھا کہ منش سب سے پہلے اپنی ذات کے بارے میں سوچتا ہے پھر اپنے دین دھرم کے بارے میں جہانوں کا نام اگر رام ہو جائے تو کوئی ایسی بات بھی نہیں ہے مگر چھوڑو..... میں کون سا دھرم سیوک ہوں کہ تجھے دھرم واس بناؤں جو تیری مرضی آئے اپنا نام رکھ۔ ویسے میرا نام سیوک رام ہے۔“

”جی..... میں نے آہستہ سے کہا۔

”کیا کہے گا تو مجھے.....“

”سیوک رام!“

”بس؟“

”اور کیا کہوں.....؟“

”گرو سیوک رام..... گرو جانتا ہے کسے کہتے ہیں.....؟“

”ہاں!“

”کسے کہتے ہیں؟“

”استاد کو.....“

”ہاں وہ جو کچھ سکھاتا ہے۔“

”بے شک۔“

”تو پیر دولہا میاں نے تجھے میرے پاس جو بھیجا ہے وہ اسی لیے بھیجا ہے کہ میں تجھے کچھ سکھاؤں.....“

”پیر دولہا میاں نے مجھے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا.....“

”اس سے کچھ سیکھنے۔“

”ٹھیک..... ٹھیک..... کیا تجھے اس بات کا علم ہے کہ وہ جو تیرا پیر دولہا میاں ہے نا اس کا بھی کوئی دھرم نہیں ہے۔“

”کیا مطلب.....؟“

”پھر وہی بات..... میں کہہ رہا ہوں نا کہ اس کا بھی کوئی دھرم نہیں ہے۔“

”لیکن وہ تو مسلمان ہے لوگ اس کے پاس بڑی عقیدت سے آتے ہیں۔“ میں نے کہا اور بوڑھا پھر ہنسنے لگا۔

”ناں اس لیے آتے ہیں کہ وہ دوسروں کے کام کر دیتا ہے مگر دھرم کے ذریعے نہیں۔“

”تو پھر.....؟“

”وہ بھی میرا چیلہ ہے!“

”تمہارا.....؟“

”ہاں!“

”گو یا اس نے.....“

”ہاں..... اس نے جو کچھ سیکھا ہے مجھ سے ہی سیکھا ہے مگر چونکہ اس نے اپنا نام پیر دولہا میاں رکھا ہوا ہے اس لیے وہ اس نام سے کام کرتا ہے میں سیوک رام ہوں سو سیوک رام نام سے کام کرتا ہوں۔ تجھے رامو بنا دوں تو رامو کہلائے گا۔ جہانوں بنا چاہتا ہے تو جہانوں بن کر رہ۔ کام جو کرنا ہے اس کا معاملہ الگ ہی ہوتا ہے.....“

”میں اس کی باتیں سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔

”خیر یہ ساری باتیں تو ایک طرح سے بے کار



ہیں۔ یہ بتا من سے اپنا گرومانتا ہے مجھے.....؟“

”اب تو ماننا ہی پڑے گا!“

”کیا مطلب.....؟ مجبوری ہے کوئی؟“

”نہیں.....“

”تو پھر.....؟“

”میں آیا ہی اس لیے ہوں۔“

”دیکھ لڑکے میں کبھی کسی کو اپنا چیلہ نہیں بناتا۔ ورنہ

اگر میں چیلہ بنانے پر تل جاؤں تو یہاں اتنا مجمع جمع ہو

جائے کہ دوسرے آدمی کے بیٹھنے کی جگہ نہ رہے۔ کیا

سمجھتا ہے تو سیوک رام کو۔“

”نہیں گرو جی..... آپ یقیناً مہان ہوں گے۔“

میرے ان الفاظ پر اسے جیسے خوشی ہوئی۔ اس نے کہا۔

”مگر میں نے تیرے اندر بھی کچھ دیکھا ہے۔ یہ

دیکھا ہے میں نے تیرے اندر کہ اگر میں تجھے کچھ

سکھاؤں تو تو سیکھ جائے گا۔“

”یہ تو آپ نے بہت اچھی بات بتائی ہے مجھے۔“

”مگر ایک بات اور سیکھ لے جسے من سے گرو مان

لیا جاتا ہے اس کی کسی بات میں دخل نہیں دیا جاتا اور

اس کی ہر بات کی آنکھیں بند کر کے تعمیل کرنا ہوتی

ہے۔“

”یہ تو میں جانتا ہوں۔ ظاہر ہے آپ مجھے اپنا علم

سکھائیں گے تو مجھے آپ کی عزت کرنا ہوگی۔“

”جو کچھ میں کہوں گا کرے گا.....؟“

”ضرور کروں گا۔“

”وچن دے۔“

”جی وعدہ کرتا ہوں۔“

”نہیں مجھے وچن دے۔“ بوزھے نے اپنا ہاتھ

سامنے پھیلا دیا۔

”میں کیا کروں.....؟“ میں نے سوال کیا۔

”اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دے۔“ اس نے کہا

اور میں نے آگے بڑھ کر اپنا ہاتھ اس کے پھیلے ہوئے

ہاتھ پر رکھ دیا۔ نجانے کیوں مجھے اپنے بدن میں ایک

عجیب سی ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ ویسے بھی بوزھے کا

ہاتھ کوئی انسانی ہاتھ نہیں معلوم ہوتا تھا۔ پتھر کی طرح

سخت اور برف کی طرح ٹھنڈا۔ وہ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ

میں لیے میری آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ پھر اس نے

گردن ہلا کر مطمئن انداز میں کہا۔

”بہت بڑا دل ہے تیرا بہادر ہے دلیر ہے۔ اچھا

خیر اب سن میری بات۔“

”جی گرو مہاراج.....!“

”میں تجھے ایک جاپ بتا رہا ہوں تجھے سات دن

یہ جاپ کرنا ہوگا اس سے جانتا ہے کیا ہوگا.....؟“

”میں نہیں جانتا.....“

”من صاف ہوگا تیرا۔ تیرے من سے یہ ساری

فضول باتیں نکل جائیں گی کہ دین کیا ہے دھرم کیا ہے

انسانیت کیا ہے شرافت کیا ہے۔ جب تو اندر سے

صاف ستھرا ہو جائے گا تب میں تجھے دوسرا جاپ

بتاؤں گا اور تو ایک بات سن لے اگر یہ دوسرا جاپ تو نے

تکمل کر لیا تو پھر تو اتنی بڑی قوت کا مالک بن جائے گا

کہ بعد میں ہماری طرف پلٹ کر بھی نہیں دیکھے گا۔“

”مہاراج..... میں ایسا انسان نہیں ہوں۔“

”تجھے جو کچھ بھی کرنا ہوگا..... ہمارے حکم کے

مطابق کرنا ہوگا۔“

”میں ایسا ہی کروں گا۔“

”یہ نہیں سوچے گا کہ ایسا کرنے سے تجھے فائدہ ہو

رہا ہے یا نقصان۔ یہ بہت بڑا کام ہوتا ہے یہ بہت

بڑی تپسیا ہوتی ہے جو تجھے کرنی ہے۔“

”آپ اس کی بالکل فکر نہ کریں.....“ میں نے

جواب دیا۔

”تو پھر سن.....“ بوزھے نے کہا اور اس کے بعد



اس نے مجھے کسی عجیب و غریب زبان کے کچھ لفظ بتائے اور بار بار انہیں دہرانے لگا۔ میں یہ الفاظ سن رہا تھا۔ اس نے کہا۔  
 ”اب ایسا کر گھٹنوں کے بل بیٹھ جا۔“ میں نے اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے دو زانو بیٹھ کر اسے دیکھا تو وہ بولا۔

”جو الفاظ میں نے کہے ہیں انہیں دہرا۔۔۔۔۔“

وہ ایک ایک لفظ مجھے بتانے لگا اور جب میں نے پہلی بار یہ الفاظ اپنے منہ سے نکالے تو مجھے اپنے اندر ایک گڑگڑاہٹ سی محسوس ہوئی، میرا دل سینے میں زور زور سے دھڑکنے لگا۔ نہ جانے کیوں مجھے یہ محسوس ہوا جیسے کوئی اندر سے مجھے کہہ رہا ہو کہ یہ الفاظ اپنی زبان سے ادا نہ کروں، لیکن میں نے اس آواز پر کان نہ دھرے اور ایک ایک لفظ دہرا کر پوری لائن دہرا دی۔ بوڑھے نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلائی اور بولا۔  
 ”میرے ساتھ تین دفعہ یہ الفاظ دہرا۔“ اور میں بوڑھے کے ساتھ ساتھ وہ الفاظ دہرانے لگا۔

تھوڑی دیر کے بعد میرے اندر سکون پھیل گیا۔ اب وہ کیفیت نہیں رہی تھی مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے لیکن جب تین دفعہ میں نے ان الفاظ کو دہرایا تو سیوک رام نے گردن ہلا کر مسکراتے ہوئے کہا۔

”اب سات دن تجھے اس کا جاپ کرنا ہے لیکن یہاں نہیں۔“  
 ”پھر کہاں۔۔۔۔۔؟“

”اس عمارت کے پیچھے ایک چھوٹی سی پھوکر ہے اس تالاب کے کنارے بیٹھ کر تجھے یہ جاپ کرنا ہے اور شام کو جب سورج چھپ جائے اس وقت سے لے کر جب تک چاند نہ نکلے اس وقت تک تجھے یہ جاپ کرنا ہوگا۔ اس کے بعد واپس آ جانا اور آرام سے

سو جانا بہت مشکل کام نہیں ہے پر ایک بات تجھے بتائے دیتا ہوں۔“  
 ”کیا گرد مہاراج۔۔۔۔۔؟“  
 ”ہمت سے کام لینا ہوگا۔“  
 ”میں نہیں سمجھا۔“  
 ”تجھے بہت سی چیزیں ذرا میں گی اگر ڈر گیا تو سمجھ لے مر گیا۔“

”مطلب؟“

”مطلب صاف ہے۔۔۔۔۔ پھر وہی مطلب مطلب میرے سامنے کرتا ہے۔ مجھے یہ لفظ اچھا نہیں لگتا۔ ایک بات جو زبان سے ادا کی جائے اس کو سننا ہے سمجھنا ہے اور اس کے بعد اس کے بارے میں کوئی سوال نہیں کرنا۔“  
 ”جی گرد مہاراج۔۔۔۔۔“

”اب آ میرے ساتھ میں تجھے وہ جگہ دکھا دوں جہاں تجھے جاپ کرنا ہے۔“  
 میں نے خاموشی سے گردن ہلا دی اور اٹھ کر بوڑھے کے ساتھ باہر نکل آیا۔

☆☆☆

یہ جگہ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ یہ احساس تو مجھے ہمیشہ سے رہتا تھا کہ یہ بے رونق علاقہ ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے آسمانی نحوستوں نے یہاں بسیرا کر رکھا ہے۔

ایک چھوٹا سا تالاب تھا جس کے کنارے لمبی لمبی گھاس اُگی ہوئی تھی۔ کئی درخت تالاب کے آس پاس موجود تھے عام حالات میں یہ ایک خوشنما علاقہ ہونا چاہیے تھا لیکن نجانے کیوں اس پر نحوست نازل تھی اور دُور دُور تک کوئی انسان نظر نہیں آتا تھا۔ ایک عجیب ویران سا میدان پھیلا ہوا تھا اور اس میدان میں یہ تالاب بھی مصنوعی سا ہی محسوس ہوتا تھا لیکن ایک



بات اور بھی میں نے محسوس کی تھی کہ تالاب کے پانی سے ہلکی ہلکی ناگوار بدبو اٹھ رہی تھی جیسے پانی سڑا ہوا ہو۔ حالانکہ اس پر کاہی تھی اور ناہی وہ دور سے یا قریب سے گندنا نظر آتا تھا۔ شاید ایک قدرتی گندگی ہی اس میں موجود تھی۔ درخت بھی اچھے خاصے پھیلے ہوئے تھے لیکن کچھ عجیب سے رنگ کے۔ ان میں وہ سبز رنگ تھا ہی نہیں جو درختوں کا رنگ ہوتا ہے۔ بس یہ میرے محسوسات تھے جنہیں میں نے محسوس کیا۔ بوڑھے نے مجھے ایک جگہ بتائی اور کہا۔

”یہ وہ جگہ ہے جہاں بیٹھ کر تجھے جاپ کرنا ہے۔“ یہ جگہ ایک درخت کے تنے کے پاس تھی اور درخت کا پورا سایہ اس جگہ پھیلا ہوا تھا۔ بوڑھے نے کہا۔

”جب ٹو جاپ کر رہا ہو تو تیرے من میں کوئی اور خیال نہیں ہونا چاہیے اور سن بات کچھ بھی ہو جائے جاپ کے دوران اس درخت کے سائے سے نکلنے کی کوشش مت کرنا ورنہ نقصان اٹھائے گا۔“

”جی کرو مہاراج۔“ اس کے علاوہ ایک بات تھی اور بھی بتا دوں۔ وہ یہ کہ یہاں جو کچھ بھی ہو تجھے اس میں دخل دینے کی ضرورت نہیں ہے چاہے کیسے ہی تیرا من تڑپے مگر تجھے اپنی جگہ سے ہلنا نہیں جب تک کہ جاپ پورا نہ کر لو۔ سمجھ رہا ہے نا.....؟“

”مجھے یہ الفاظ کتنی دفعہ دہرانے ہوں گے؟“

”دوسوا کہتر دفعہ۔“

”یہ تو اہم بات تھی جو میں نے آپ سے پوچھی ہی نہیں کرو مہاراج۔“

”نہ پوچھتا تو میں تجھے خود بتاتا۔“

”دوسوا کہتر دفعہ دہرانے کے بعد مجھے یہاں سے اٹھ جانا ہوگا۔“

”ہاں جب تو اپنا یہ جاپ پورا کر لے تو آرام سے اٹھ جا پھر تیری مرضی ہے مگر سن اس کے بعد بھی یہاں جو کچھ ہوتا ہے اس میں دخل مت دینا۔ ایک بار پھر کہتا ہوں کہ تیرا من تڑپے گا تو چاہے گا کہ کوئی کام کرے لیکن یہاں کچھ مت کرنا یہ سمجھ لینا اچھی طرح اور گرو جب کوئی حکم دیتا ہے تو اس کی پابندی کرنا ہوتی ہے۔“

”میں جانتا ہوں گرو مہاراج۔“

”تو پھر اب میں چلتا ہوں۔“

”آج ہی سے یہ جاپ شروع کر دوں؟“

”ہاں بس آج ہی سے۔“

”ٹھیک ہے..... جیسا آپ کا حکم۔“

”بس تو یہاں بیٹھ جا اور اپنا کام کر۔“

”لیکن ابھی تو وقت ہے گرو مہاراج۔“

”اس..... ہاں وقت تو ہے۔ یہ بات میں بھول گیا تھا۔ چل ٹھیک ہے تھوڑی دیر کے بعد آ جانا۔ لیکن اب تو یہاں گھوم پھر میں تیرا ساتھ نہیں دوں گا۔“

بوڑھے نے کہا اور وہ اپنی رہائش گاہ کی جانب چلا گیا۔

میں نے اس کا تعاقب نہیں کیا تھا بلکہ میری نگاہیں دور

دور تک بھٹکنے لگی تھیں۔ تاحہ نظر انسان کا پتا نہیں تھا۔

ویسے بھی اس دیرانے میں کسی کا آنا بے مقصد ہی ہو سکتا تھا۔

بہت دیر تک میں وہاں گھومتا رہا اور اس کے بعد

واپس اپنے اس تہہ خانے میں پہنچ گیا یہاں آنے کے

بعد پہلی بار باہر نکلا تھا بدن کو ایک عجیب سی کیفیت کا

احساس ہو رہا تھا۔ بہر طور اب جو کچھ شروع کر دیا تھا

اس سے دور ہونا تو مناسب نہیں تھا۔

پھر مقررہ وقت پر میں اس جگہ پہنچ گیا جہاں مجھے

جاپ کرنا تھا۔ جو کچھ سیوک رام نے مجھے بتایا تھا وہ

مجھے اچھی طرح یاد تھا۔ چنانچہ جب سورج چھپا تو میں

اس درخت کے نیچے جا بیٹھا۔ دوسوا کہتر دفعہ وہ الفاظ

اٹھ جانا ہوگا۔“



پرندوں کی زندگی تو بہت ہی مختصر ہوتی ہے تیز ہوا چلتی ہے تو ان کے گھونسلے اڑ جاتے ہیں اور وہ درختوں سے ٹکرائے کر مر جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہر چھوٹے پرندے کو بڑا پرندہ شکار کر لیتا ہے۔

انہی خیالات میں وقت گزر رہا تھا اور زبان سے جاپ کے الفاظ نکل رہے تھے۔ پھر پہلے دن کا جاپ پورا کر کے جب چاند نے آسمان پر سر ابھارا تو میں وہاں سے اٹھ کر اپنی رہائش گاہ کی جانب چل پڑا۔ میں رہائش گاہ کی سیڑھیاں طے کر رہی رہا تھا کہ اچانک ہی کہیں سے ایک نسوانی چیخ میرے کانوں میں ابھری۔ کوئی عورت دلدوز انداز میں چیخ رہی تھی۔

میرے دل میں ایک دم جشیں بیدار ہو گیا، لیکن پھر گرو سیوک رام کے الفاظ کا خیال آیا کہ یہاں جو کچھ بھی ہو اس کی طرف سے آنکھیں اور کان بند ہی رکھنا ہیں۔ ایک بار پھر دل نے اندر سے بغاوت کی کہ کم از کم دیکھوں تو سہی کہ کون مصیبت میں ہے لیکن دو ہی باتیں تھیں یا تو اپنے دل کی بات مان لیتا یا سیوک رام کی بات مان لینا۔ چنانچہ میں نے خاموشی سے اپنی رہائش گاہ کی جانب رخ کیا اور تہہ خانے میں پہنچ گیا۔ لیکن یہ احساس میرے دل میں بہت دیر تک تڑپتا رہا کہ چیخنے والی عورت کون تھی اور اس پر کیا بیت رہی تھی۔

لیکن دوسرے دن جب سورج نکل آیا اور میں اپنے معمولات سے فارغ ہو گیا تو میں سیوک رام کو تلاش کرنے لگا اس نے ویسے بھی مجھ پر کوئی پابندی نہیں لگائی تھی اور کہہ دیا تھا کہ میں جہاں چاہوں گھوم پھر سکتا ہوں حالانکہ اس دوران میں نے اپنی اس رہائش گاہ میں ہی وقت گزارا تھا اور جان بوجھ کر باہر نہیں نکلا تھا۔ بس اپنے سحر میں گرفتار تھا اور اسی کشمکش کا شکار کہ جو کچھ بھی کر رہا ہوں وہ مناسب ہے بھی یا نہیں!

پڑھنا تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر میں تیز رفتاری کا مظاہرہ کروں تو زیادہ سے زیادہ ایک یا ڈیڑھ گھنٹے میں یہ کام کر لوں گا لیکن سیوک رام نے یہ بھی کہا تھا کہ جب تک چاند نہ نکلے میں یہاں سے نہ اٹھوں اس لیے جو کچھ بھی کرنا تھا آہستہ آہستہ اس وقفے کے دوران کرنا تھا لیکن یہ وقفہ بھی خاصا طویل تھا۔

پھر جب چاروں طرف اندھیرا پھیل گیا تو میں نے اس جاپ کو پہلی دفعہ دہرایا میں آنکھیں کھولے بیٹھا ہوا تھا اور وہ الفاظ آہستہ آہستہ میرے منہ سے نکل رہے تھے جن کا مجھے مفہوم نہیں معلوم تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ ایک بار پھر میرے اندر ایک گرمی سی پیدا ہو گئی ہے میرا دل سینے میں پھڑپھڑا رہا ہے لیکن میں نے اپنی ہر کیفیت کو نظر انداز کر دیا۔ سات مرتبہ یہ جاپ پڑھنے کے بعد ایک بار پھر میں مطمئن ہو گیا تھا اور اس کے بعد زیادہ اہتمام سے میں نے اس کا آغاز کر دیا۔ میری نگاہیں اب بھی چاروں طرف بھٹک رہی تھیں۔ ہر چند کہ اندھیرا پھیل گیا تھا لیکن بہر حال میری آنکھیں تاریکی میں بھی دیکھ سکتی تھیں۔

سامنے والے درخت پر چڑیا کا ایک گھونسلہ نظر آ رہا تھا۔ بہت ہی خوبصورت چڑیا تھی اور اپنے گھونسلے میں جا بیٹھی تھی۔ میں ان پرندوں کے بارے میں سوچنے لگا کیا آزاد زندگی گزارتے ہیں فضاؤں میں بسیرا کرتے ہیں۔ جب دل چاہا اپنی جگہ سے پرواز کی اور جہاں دل چاہا پہنچ گئے لیکن انسانی زندگی پر کتنے بوجھ ہیں۔ اسے اپنی کوششوں اپنی کاوشوں سے گھر بنانے پڑتے ہیں اور اس کے بعد نجانے زندگی کے کیسے کیسے مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ بڑا فرق ہے ان پرندوں اور انسانوں کی زندگی میں۔ تب ہی میرے ذہن میں ایک اور خیال بھی آیا۔



لیکن اب جب میں نے ایک دن کا جاپ کر لیا تھا تو پھر یہ میرا آخری فیصلہ ہو گیا تھا کہ اب مناسب اور نامناسب کا تصور ذہن سے نکال دیا جائے اور صرف وہ کیا جائے جو میں شروع کر چکا ہوں۔

سیوک رام مجھے ایک ایسی جگہ ملا جو ایک کھلا ہوا علاقہ تھا اور میں نے یہاں ایک اور منظر دیکھا اس وقت یہاں آٹھ نو افراد موجود تھے اور بڑے ادب سے بیٹھے ہوئے تھے سیوک رام ایک چوکی پر بیٹھا انہیں کچھ بتا اور سمجھا رہا تھا۔ میں نے اسے مصروف دیکھ کر باہر قدم نہیں نکالے اور پیچھے ہی رہ گیا۔ وہ لوگ بڑی عقیدت سے سیوک رام کی باتیں سن رہے تھے۔ پھر خاصی دیر تک میں سیوک رام کا جائزہ لیتا رہا اور اس کے عقیدت مندوں کو بھی دیکھتا رہا۔ ایک ایک کر کے وہ لوگ اٹھنا شروع ہو گئے اور پھر انہوں نے اپنی جیب سے چیزیں نکال کر رکھنا شروع کر دیں یہ نوٹ تھے کھانے پینے کی اشیاء تھیں اور ایسی ہی دوسری چیزیں جو وہ سیوک رام کی نذر کرنا چاہتے تھے۔ سیوک رام نے اٹھا ہاتھ اوپر اٹھایا اور اسے سیدھا کر کے ان لوگوں کو جانے کی اجازت دی۔ تب وہ لوگ باہر نکل گئے اور سیوک رام اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ پھر اسی وقت جب میں عقب سے نکل کر سیوک رام کے سامنے پہنچا تو سیوک رام نے چونک کر مجھے دیکھا پھر مسکرا دیا۔

”جی کرو مہاراج.....“ میں نے جواب دیا پھر میں نے کہا۔  
”آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں گرو مہاراج۔“  
”ہاں پوچھو!“

”رات کو جب میں جاپ کر کے واپس لوٹا تھا تو مجھے کسی عورت کے چیخنے کی آوازیں سنائی دی تھیں.....“ سیوک رام نے چونک کر مجھے دیکھا پھر بولا۔

”ہاں..... تو پھر؟“  
”میرا مطلب ہے کون تھی وہ جبکہ یہاں تو دور دور تک آبادی نہیں ہے؟“ سیوک رام چند لمحے سوچتا رہا پھر اس نے کہا۔

”کچھ سے گزار لے اس کے بعد تجھے یہ سب کچھ بھی معلوم ہو جائے گا تجھے ہمارے ہر کام میں شریک ہونا ہوگا۔ تو اس کی بالکل چٹا نہ کر۔“  
”وہ کوئی ایسی دیسی بات تو نہیں تھی؟“

”دیکھ ابھی بہت کم وقت گزرا ہے تجھے یہاں کوئی ایسی دیسی بات ہو چکی تو ابھی اس پر دھیان مت دھرنا

”تو پہلے دن کا جاپ کر چکا ہے تو!“ اس نے مجھے دیکھ کر کہا۔

”ہاں گرو مہاراج.....“  
”اچھا چل یہ چیزیں اٹھا پھل وغیرہ الگ کر لے نوٹ سمیٹ لے انہیں ایک جگہ کر کے میرے حوالے کر دے۔ اصل میں میں نے تجھے بتا دیا تھا کہ میں نے کوئی چیلہ نہیں بنایا بہت سے لوگوں نے یہ کوشش کی لیکن تو جانتا ہے کہ ایرے غیرے کو کوئی علم نہیں دیا



اور اگر ایسی چیخیں تجھے دوبارہ بھی سنائی دیں تو اس کی فکر نہ کرنا۔“

”جی کرو مہاراج.....“ میں نے جواب دیا۔ لیکن میرے دل میں ایک خلش سی پیدا ہو گئی تھی۔ سیوک رام نے حتمی طور پر یہ بات کہہ دی تھی کہ میں ایسی باتوں پر نظر نہ رکھا کروں مجھے اس کی ہدایت پر عمل کرنا تھا کیونکہ بہر طور اس سے کچھ سیکھ رہا تھا لیکن اندر کی جو کیفیت ہوتی ہے وہ کبھی کبھی انسان کے بس سے باہر ہو جاتی ہے نہ جانے وہ کیسی چیخیں تھیں.....“

بہر حال جو پھل وہاں سے اٹھا کر لایا تھا انہیں کھایا اور اس کے بعد آرام کرنے کے لیے لیٹ گیا پھر دوسری رات میں نے جاپ شروع کیا پھر تیسری رات بھی ایک عجیب واقعہ ہوا۔ سامنے والے درخت پر جو رنگین چڑیاں تھیں اور جنہیں میں نے اب دن میں بھی آ کر دیکھا تھا وہ بے حد خوبصورت تھیں۔ اس وقت جب میں جاپ کر رہا تھا میں نے دیکھا کہ درخت کی اوپری شاخ سے ایک سانپ نیچے اتر رہا ہے میں جاپ کر رہا تھا لیکن کالے ناگ کو دیکھ کر نہ جانے کیوں میرے دل کو خوف کا ایک احساس سا ہوا اگر یہ اتر کر میرے پاس آیا مجھے کیا کرنا چاہیے؟ میں نے دل میں سوچا اور اس کے بعد اس احساس کے ساتھ خاموش ہو گیا کہ کرو سیوک رام نے مجھ سے کہا ہے کہ اگر کوئی ایسی بات ہو تو اپنی جگہ نہ چھوڑنا ہو سکتا ہے یہ سانپ مجھ تک نہ پہنچے لیکن میری نگاہیں سانپ پر جمی رہیں۔ سانپ آہستہ آہستہ نیچے اتر اور اٹھ کر تھوڑی دیر بعد اس گھونسلے کے قریب رُک گیا۔ پھر میں نے سانپ کو اپنا پھن گھونسلے میں داخل کرتے دیکھا اور چند لمحوں کے بعد جو منظر میری نگاہوں کے سامنے آیا اس نے میرا دل تڑپا دیا۔ وہ رنگین اور حسین چڑیا سانپ کے منہ میں دبی ہوئی پر پھڑ پھڑا رہی تھی اور سانپ اسے منہ

میں دبائے پیچھے ہٹ گیا۔ چڑیا پھڑ پھڑاتی رہی میرا دل سینے سے نکلا پڑ رہا تھا اور میری خواہش تھی کہ کسی طرح اس سانپ کو ہلاک کر کے اس چڑیا کو آزاد کرادوں لیکن سیوک رام کے الفاظ بھی میرے ذہن میں تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سانپ چڑیا کو چٹ کر گیا پھر اس نے دوبارہ پھن اندر ڈالا اور دوسری چڑیا نکال لی اسے بھی ہلاک کرنے کے بعد سانپ نے اپنی منزل کی جانب رخ کیا اور درختوں کی شاخوں میں گم ہو گیا حسین چڑیوں کا گھونسلہ خالی ہو گیا تھا اور نہ جانے کیوں میرے دل کو ایک دکھ کا سا احساس ہوا کتنی سکون کی زندگی گزار رہی تھیں وہ لیکن اب ان کا وجود مٹ گیا ایک دشمن انہیں کھا گیا تھا۔ سانپ اپنی جگہ سے غائب ہونے کے بعد پھر نظر نہیں آیا اور میں اطمینان سے اپنا جاپ پورا کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ چاند نے سہرا بھارا اور میں نے جاپ ختم کر کے اپنی جگہ کی راہ لی۔ آج مجھے کوئی چیخ نہیں سنائی دی تھی۔ پھر اسی طرح یہ جاپ کرتے ہوئے مجھے پانچواں دن آ گیا اس دوران عجیب و غریب حالات پیش آئے تھے دیسے جاپ کرنے کے وقت کے لیے میں نے ایک ڈنڈا اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ اگر سانپ میری طرف آئے تو اس سے کم از کم اس درخت کی چھاؤں کے نیچے ہی نمٹ سکوں، موڑی کا کیا بھروسہ کب کس طرح نکل آئے۔ خیر جناب یہ واقعات گزرتے رہے تو میں پانچویں دن کا تذکرہ کر رہا تھا۔ یہ میرے جاپ کا پانچواں دن تھا۔ دو دن باقی رہ گئے تھے۔ میں بیٹھا ہوا جاپ کر رہا تھا موسم خوشگوار تھا آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور آج یہ خطرہ تھا کہ شاید چاند نظر نہ آئے لیکن بہر حال ایک تعین ہو گیا تھا کہ اگر چاند بادلوں کی وجہ سے نظر نہ بھی آیا تو کیا ہو سکتا ہے۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ جوں جوں رات گزرتی رہی بادل چھٹتے چلے



گئے اور چاند پوری آب و تاب کے ساتھ نکل آیا۔ فضا میں چاروں طرف روشنی پھیل گئی، میں اپنے جاپ کے آخری مراحل سے گزر رہا تھا کہ کہیں سے ایک بلی میرے سامنے میاؤں میاؤں کرتی ہوئی آگئی۔ وہ درخت کی چھاؤں کے اس طرف میری جانب رخ کر کے بیٹھ گئی۔ میں چند لمحوں کے لیے رک گیا اور اس بلی کو دیکھنے لگا جو نجانے مجھ سے کیا چاہتی تھی وہ تین بار منہ سے میاؤں میاؤں کی آوازیں نکال چکی تھی۔ بہت خوبصورت بلی تھی میں اسے دیکھ کر مسکراتا رہا نہ جانے کیا سمائی ہے اس کے دل میں؟ لیکن پھر وہ خوفناک لہجہ آگیا جس نے میری روح تک کو لرزادیا۔ اسی سامنے والے درخت سے جس پر میں چڑیوں کا وہ گھونسلہ دیکھتا تھا اور اب وہ گھونسلہ ویران دیکھ کر میرے دل کو دکھ ہوتا تھا اچانک ہی ایک قد آور بلی نے چھلانگ لگائی۔ کالے رنگ کا یہ بلا بڑی لمبی زقند بھر کر بلی پر آکھڑا تھا۔ بلی اپنی جگہ سے اٹھ بھاگی اور بلا غراتا ہوا اس کے پیچھے دوڑا۔ میں نے حیرت سے دیکھا وہ بلا عام جسامت سے کہیں زیادہ تھا اور بہت تندرست و توانا معلوم ہوتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے بلی پر جھپٹا مارا اور اس کی گردن اپنے دانتوں میں دبوج لی۔ میرے ہاتھوں میں لرزش پیدا ہو گئی میں نے ڈنڈے کو مٹھی میں پکڑ لیا اور ایک لمحے کے لیے میرا دل چاہا کہ اٹھ کھڑا ہو جاؤں اور اس خوبصورت بلی کو بچاؤں جو اب بلے کے جبروں میں دبی ہوئی تڑپ رہی تھی۔ زمین پر اچھا خاصا ہنگامہ ہو رہا تھا بلا اس بلی کو بھنبھوڑ رہا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے بلی خون میں نہا گئی۔ بلے نے اس کی ٹانگیں چبا ڈالیں اور تھوڑی دیر کے بعد وہ اس کے پورے بدن کو چٹ کر گیا۔ بلی کو اس نے توڑ مروڑ کر رکھ دیا تھا اور اب زمین پر خون کے چھینٹوں کے علاوہ کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کالے بلے کا منہ خون

سے رنگین ہو گیا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی میں نے یہ محسوس کیا کہ اس کی جسامت پہلے سے بھی کچھ بڑھ گئی ہے۔ بلی کو ہضم کرنے کے بعد وہ لمبی زبان نکال کر اپنے منہ پر لگا خون چاٹنے لگا۔ تب ہی اس کی گول گول خوفناک آنکھیں میری جانب اٹھ گئیں اور وہ اس طرح ٹھٹھک گیا جیسے پہلی بار اس نے مجھے دیکھا ہو۔ نہ جانے کیوں میرے بدن میں سرد لہریں دوڑنے لگیں۔ بلے کی آنکھوں سے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اپنے شکار کو تاک رہا ہو پھر وہ دبے قدموں میری جانب بڑھنے لگا اور میرے اوسان خطا ہو گئے۔ یہ کمبخت بلا آخر کیا چاہتا ہے۔ میں نے سوچا بلا آہستہ آہستہ میری جانب بڑھ رہا تھا اور میں ہاتھ میں ڈنڈا سنبھالے اٹھتا جا رہا تھا۔ اگر اس نے مجھ پر حملہ کیا تو ظاہر ہے مجھے اس سے جنگ کرنی ہے۔ پھر بلا درخت کی چھاؤں کے اس حصار کے قریب آگیا جس سے باہر نکلنے کی مجھے ممانعت تھی اور اب اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ میں اس سے مقابلہ کروں۔ لیکن اس وقت بھی میں نے اپنے ہوش و حواس نہیں کھوئے تھے اور یہ سوچ رہا تھا کہ بلا اگر اندر آگیا تو اس حصار کے اندر ہی اندر میں اس سے جنگ کروں گا لیکن بلا اندر داخل نہیں ہوا تھا۔ وہ اس طرح مجھے تاکتا رہا جیسے موقع ملتے ہی مجھے بھی بلی کی طرح چیر پھاڑ کر چٹ کر جائے گا۔ بلی کو اس نے جس وحشیانہ انداز میں چبا ڈالا تھا وہ اب بھی میرے ذہن پر نقش تھا اور میرا بدن اسے دیکھ کر ہلکے ہلکے کانپ رہا تھا۔

بلا تقریباً دو یا تین منٹ وہاں کھڑا رہا پھر اچانک ہی مجھے خیال آیا کہ چاند نکل آیا ہے اور مجھے اپنا جاب ختم کر لینا چاہیے۔ ویسے بھی صرف چند لمحوں کی بات رہ گئی تھی۔ چنانچہ میں اپنی جگہ بیٹھ گیا لیکن ڈنڈا اب بھی میں نے اپنے ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔



لیے ایک نفرت بھرا انداز تھا یہ ہے کون میں نے پہلی بار اسے دیکھا تھا اور بالکل نہیں جانتا تھا کہ وہ ہے کیا چیز مجھ سے کوئی پانچ گز کے فاصلے پر وہ آ کر کھڑا ہو گیا پھر اس کی کرخت آواز ابھری۔  
 ”مانگ کیا مانگتا ہے؟“

بڑے عجیب سے الفاظ تھے میں نے حیرانی سے سنے لیکن پھر فوراً ہی میرے ذہن کے درتے پچھل گئے اس کا مطلب ہے کہ میرا جاپ پورا ہو گیا ہے اور یہ کوئی ایسا وجود ہے جو میرے تابع ہو چکا ہے لیکن پھر بھی میں نے اس سے پوچھ لینا مناسب سمجھا۔  
 ”کون ہے تو؟“

”بھیروں۔“ اس کی غرغرائی ہوئی آواز ابھری۔

”کیا دے سکتا ہے مجھے؟“

”کچھ بھی نہیں پر ایک سودا کرنا چاہتا ہوں تجھ سے۔“ وہی منحوس آواز ابھری۔

”سودا؟“

”ہاں۔“

”کیسا سودا؟“

”تیرا جاپ ابھی تک پورا نہیں ہوا ہے بڑھے سیوک رام نے خود تو جیواں میں کبھی مجھ پر قابو نہیں پایا لیکن دوسروں کے لیے کوشش کرتا رہتا ہے چار بندے مار چکا ہوں میں جو مجھے قابو کرنا چاہتے تھے مگر تیری بات اور ہے میں تجھے نہیں مار سکتا۔“

میں دلچسپی سے اس کے یہ الفاظ سن رہا تھا میں نے کہا:

”تو مجھے کیوں نہیں مار سکتا؟“

”اس لیے کہ تو مسلمان ہے اور میں کسی مسلمان کو نہیں مار سکتا۔“

میرے دل میں خوشی کی ایک لہر اٹھی یہ تو اچھی بات ہے میں نے دل میں سوچا پھر میں نے اس سے کہا۔

یہاں تک کہ میں نے اپنا جاپ پورا کیا اور جیسے ہی میرے جاپ کی آخری لائن ختم ہوئی میں ڈنڈا لے کر اس بلے کی طرف دوڑا۔ اس نے ایک لمبی چھلانگ لگائی اور بھاگ کر درخت پر چڑھ گیا میں تقریباً دو یا تین منٹ تک درخت کے نیچے کھڑا رہا تھا اور اس کے تنے کو ڈنڈے سے بجاتا رہا تھا.....

”آ کبخت نیچے تو آ میں تجھے دیکھ لوں گا۔“ اب میرے دل سے نہ جانے کیوں خوف نکل گیا تھا۔ بلے پر میرا غصہ بہت شدید ہو گیا تھا۔ یہ درخت ہے ہی نحوست کی جڑ۔ اس کبخت پر ساری خونخوار بلائیں ہی رہتی ہیں۔ وہ سانپ اور وہ بلا..... لیکن اب مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے بلا درختوں کی ٹانگوں میں چھپ کر بیٹھ گیا ہو۔ بہر حال دیر تک میں درخت پر ڈنڈے برساتا رہا لیکن بلے نے اپنی جگہ نہیں چھوڑی تھی۔ وہ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا نا ہی اس کی آنکھیں کہیں چمک رہی تھیں جبکہ میں ان کی تلاش میں تھا۔ ایک لمحے کے لیے دل چاہا کہ درخت پر چڑھ کر اسے تلاش کروں لیکن پھر اپنی اس دلیری کو خود ہی اپنے سینے میں دبا لیا کہ کیا فائدہ کسی مصیبت میں پھنس جاؤں وہاں سانپ بھی ہے اور اس کے بعد میں آہستہ آہستہ گے بڑھنے لگا۔ میں نے سوچا کہ دوبارہ جب بھی وہ نظر آیا میں اس پر ڈنڈا پھینک کر ماروں گا لیکن یہ بھی ایک غلط طریقہ کار تھا۔ میرے ہاتھ سے آڈنڈا نکل گیا تو شاید صرف ہاتھوں سے میں اس کا صحیح طور پر مقابلہ نہ کر پاؤں ورنہ وہ مجھے زخمی کر دے گا۔

میں آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا دفعتاً مجھے اپنے عقب میں سرسراہٹیں محسوس ہوئیں اور میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ ایک انتہائی مکروہ وجود تھا جو میری جانب بڑھ رہا تھا میں رک کر اسے دیکھنے لگا اب مجھے اس کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا اس کی آنکھوں میں میرے



”تو پھر تو مجھ سے یہ کیوں کہہ رہا ہے کہ میں تیرے لیے کیا کر سکتا ہوں؟“  
”بتایا ہے نامیں نے تجھے ایک سودا کرنا چاہتا ہوں تجھ سے۔“

”تو بھیروں ہے نا؟“

”ہاں۔“

”جسے جگانے کے لیے سیوک رام نے مجھے یہ منتر بتایا تھا۔“

”ہاں۔“

”مگر میرا یہ منتر ابھی پورا تو نہیں ہوا۔“

”یہی بات ہے میں چاہتا ہوں کہ تو اپنا یہ منتر کبھی پورا نہ کرے۔“

”یہ کیوں چاہتے ہو تم؟“

”اس لیے کہ میں تیرے قبضے میں نہیں آنا چاہتا۔“

”ارے واہ اور میں جوا تے دن سے محنت کر رہا ہوں وہ۔“

”اسی محنت کا صلہ تو میں تجھے دینا چاہتا ہوں۔“ وہ بولا۔

”وہ صلہ کیا ہوگا؟“

”تین وچن دے جائیں گے تجھے جو تیرے لیے بڑے فائدہ مند ہونگے اگر تو اپنا یہ جاپ پورا کر لے گا تو بے شک بھیروں تیرے قبضے میں آ جائے گا لیکن پھر میری اور تیری دشمنی چلے گی۔ تیرے لیے میں جو کچھ کروں گا وہ مجبوری سے کروں گا جبکہ اگر تو مجھ سے سودے بازی کر لے تو تیرے لیے بڑے فائدے رہیں گے۔“

”اچھا بول کیا سودے بازی کرنا چاہتا ہے تو؟“  
میں نے کہا۔ اصل میں جن حالات سے اب تک گزرا تھا انہوں نے مجھے یہی سکھایا تھا کہ کسی کے ساتھ رعایت مت کرو دنیا بہت بری چیز ہے بہت بری جگہ

ہے یہ دنیا تم اگر کسی کے ساتھ رحم کرو گے تو وہ تم پر کبھی رحم نہیں کرے گا ہاں اگر کسی کا کوئی مفاد تم سے وابستہ ہے تو پھر وہ مفاد کی قیمت لگائے گا میں نے سوچا کہ چلو اگر کوئی کام کی بات ہے تو سنا تو جائے میں نے اس سے کہا۔

”کیا وچن دو گے تم؟“

”چھ بار۔ پورے چھ تو اپنے منہ سے جو بات کہے گا وہ پوری ہو جائے گی تو کسی سے کہے گا کہ وہ تیرا یہ کام کر دے تو سمجھ لے کہ وہ تیرا وہ کام کرنے پر مجبور ہو گا چھ دفعہ اور اگر کوئی بھی تیرا کام نہ کرے تو تو اسے اس کے لیے حکم دے سکتا ہے کیا سمجھا بہت بڑی چیز ہے یہ۔“

”ٹھیک اور۔۔۔۔۔“

”ایک وچن راز میں رہے گا اور سب سے آنے پر دیا جائے گا۔“

”وہ کیوں؟“

”یہ بات بھی راز ہی ہے سمجھ لے کہ اس کا راز میں رہنا تیرے لیے بڑا فائدہ مند ہے۔“

”چس ٹھیک ہے تیسرا۔“ میں نے سوال کیا تو اس نے اپنی جیب سے چاندی کا ایک کڑا نکالا اور اسے میرے ہاتھ میں دینے ہوئے کہا۔

”یہ کڑا تو جس کے ہاتھ میں ڈالے گا وہ جیون بھر تیرا غلام ہوگا۔ تیرے ہر حکم کی تعمیل کرے گا یہ کڑا وہ اپنے ہاتھ سے اتار کر نہیں پھینک سکتا جب تک کہ تو اسے اس کے ہاتھ سے نہ اتارے سمجھ لے وہ کتنا ہی بڑا آدمی کیوں نہ ہو تیرے سامنے بھیگی ملی ہوگا۔“

میرے ذہن میں ایک لکیری تیر گئی اگر یہ ٹھیک کہہ رہا ہے تو پھر بہت بڑی بات ہوگی میں ایک لمحے کے لیے سوچتا رہا پھر میں نے کہا۔

”مگر وہ میرے ہاتھ سے یہ کڑا اپنے ہاتھ میں



کیوں ڈلوائے گا؟“

”اے بتا کر تھوڑی ڈالنا ہوگا کڑا تو اسے کسی بھی بہانے سے ہاتھ سیدھا کرالینا اس سے کہنا اپنا پنچہ جوڑے اور بس پھر پھرتی سے یہ کڑا اس کے ہاتھ میں ڈال دینا۔“

”اتنی آسانی سے تو نہیں ہوگا جیسے میں یہ تیرا ہاتھ پکڑتا ہوں مجھے بتانا کہ اس کے بعد مجھے کیا کرنا ہو گا؟“

اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تو میں نے اسے پکڑ لیا وہ بولا ”بس اس طرح سے ہاتھ کرا کے وہ کڑا اس کے ہاتھ میں ڈال دینا۔“

”ایسے.....“ میں نے کہا اور کڑا اس کے ہاتھ میں ڈال دیا۔ ایک لمحے تک تو وہ کچھ نہ سمجھ پایا لیکن جب اسے میری اس چالاکی کا احساس ہوا تو وہ لڑنے کی طرح تپ کر سرخ ہو گیا اور پھر اس نے وہ غل خپاڑہ مچایا کہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا اس کی چیخیں دھاڑیں بڑی طرح گونج رہی تھیں اور وہ کہہ رہا تھا۔

”ارے پاپی ارے ہتیارے تیرا ستیاناس۔ مر جائے تو کیا کر ڈالا تو نے کیا کر دیا یہ میرے ہاتھ میں ڈال دیا تو نے چالاکی کی ہے میرے ساتھ۔“

جواب میں میرے حلق سے قہقہہ ابل پڑا۔ ”ہاں بھیروں مہاراج“ میں نے تمہیں قبضے میں کرنے کے لیے جس چلنے کا آغاز کیا تھا اور سیوک رام نے جو چلہ مجھے بتایا تھا اس میں تو ابھی کافی محنت کرنی پڑتی تھی لیکن دیکھ لو کس طرح میرا کام ہو گیا یہ تمہاری مہربانی ہے بھیروں مہاراج“ واہ..... اس کا مطلب ہے کہ اب تم میرے غلام بن گئے جو کام کرنے کے لیے مجھے ابھی طویل جا پ کرنا تھا وہ تم نے پورا کر دیا۔“

”دیکھ لے..... دیکھ لے میں تجھ سے تیری اس حرکت کا بدلہ لوں گا جب بھی کبھی موقع ملا تجھے نقصان

پہنچا دوں گا یہ میرا دھن ہے۔“

”وہ بعد کی بات ہے یہ بھی تم نے اچھا کیا کہ مجھے بتا دیا اب میں تم سے ہوشیار رہوں گا۔“ وہ چیختا چلاتا رہا میں نے اس سے اور کوئی بات نہیں کی تھی بلکہ ہنستا ہی رہا تھا۔ تھوڑی دیر تک اس نے اووہم مچایا اور اس کے بعد ڈھیلا پڑ گیا۔

”ٹھیک ہے اب میں تیرا داس ہوں مجھے کوئی حکم دے۔“

”ابھی نہیں بھیروں داس ذرا مجھے سکون لینے دو یہ یقین تو کر لینے دو کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ سچ ہے اور تم وہی کرو گے جیسا کہ تم نے مجھ سے کہا ہے کہ میرے ساتھ تمہاری دشمنی شروع ہو گئی ہے۔“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا بس بڑی نگاہوں سے مجھے گھورنے لگا ”نجانے کیوں مجھے اپنے اندر ایک اعتماد سا محسوس ہو رہا تھا مجھے لگ رہا تھا جیسے میں کوئی بڑی قوت حاصل کر چکا ہوں میں نے اس سے کہا۔

”ٹھیک ہے اب تم جاؤ بھیروں مہاراج“ مجھے جب ضرورت ہوگی تمہیں آواز دے لوں گا۔“

وہ تھوڑی دیر تک کھڑا خونی نگاہوں سے مجھے دیکھتا رہا اس کے بعد مڑا اور پھر چھلانگ لگا کر فضا میں غائب ہو گیا میری خوشی کی انتہا نہیں تھی اگر وہ ٹھیک کہہ رہا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ مجھے تو بڑی شاندار قوت حاصل ہو گئی اور اب اس قوت کے ذریعے میں بہت کچھ کر سکتا ہوں۔ واقعی کمال ہو گیا یہ تو ایک طرح سے یہ کہنا چاہئے کہ میری لائٹری نکل آئی تھی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب اس کا تجربہ کہاں سے کروں کہ جو اس نے کہا ہے وہ سچ ہی ہے بہت دیر تک سوچتا رہا اب چلہ کشی بیکار تھی چنانچہ وہاں سے آگے بڑھ گیا۔

پھر اچانک ہی بالکل پہلے جیسی نسوانی چیخ میرے کانوں میں ابھری اور میں ایک دم چونک کر رُک گیا



تھوڑے فاصلے پر سیوک رام کی جھونپڑی تھی، میرے قدم اس جھونپڑی کی جانب اٹھ گئے، میں جھونپڑی کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ دوبارہ وہی چیخ مجھے سنائی دی اور اس بار کچھ دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز بھی، میں نے سامنے دیکھا جھونپڑی کے احاطے میں ایک سایہ جھونپڑی سے نکل کر باہر آیا تھا اور پوری قوت سے دوڑ رہا تھا، اچانک ہی اس نے ٹھوکر کھائی اور نیچے گر پڑا، لیکن اس کے پیچھے ہی دوسرا سایہ بھی آیا تھا۔ میں نے دور سے اسے پہچان لیا، یہ سیوک رام ہی تھا۔

میں تیزی سے آگے بڑھ کر اس کے پاس پہنچا تب میں نے دیکھا کہ وہ سر یہ جوزمین پر گرا تھا اٹھ کر بیٹھ گیا تھا اور اس کے حلق سے سیکیاں نکل رہی تھیں، وہ رندھی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی۔  
 ”ہائے رام! بے بھگوان سے بھگوان میری سہلنا کر، بچالے مجھے میرے بھگوان، بھیج دے اپنا کوئی دان، میرے لئے میرے بھگوان مجھے بچالے مجھے بچالے نہیں تو مجھے مرنا ہی پڑے گا۔“

اچانک ہی سیوک رام کی نگاہ مجھ پر پڑی اور وہ ٹھٹک گیا، میں نے یہ دیکھ لیا تھا کہ رونے والی اور بھگوان کا نام لینے والی کوئی عورت تھی جو ساڑھی میں ملبوس ہوگی، لیکن اس وقت اس کے نچلے جسم پر ایک پیٹی کوٹ تھا اور پری بدن بھی مختصر سا ڈھکا ہوا تھا، وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے آپ کو چھپائے بیٹھی رو رہی تھی، سیوک رام حیرت سے مجھے دیکھتا رہا پھر آگے بڑھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ بوڑھا شیطان اس لڑکی کے ساتھ کوئی زیادتی کرنے کی کوشش کر رہا تھا میں آگے بڑھ کر اس کے سامنے پہنچ گیا۔

”ہتھیارے پانی تو کہاں سے آرا رہے ابھی تیرا جاپ کہاں ختم ہوا تو نے جاپ اٹھوڑا چھوڑ دیا۔“  
 ”میں نے تو جو کچھ کیا وہ بہتر کیا ہے سیوک رام جی“

”یا آپ کیا کر رہے ہیں؟“  
 ”دفع ہو جا یہاں سے دور ہو جا میری نگاہوں سے“  
 اب تو اپنا وہ جاپ بھی پورا نہیں کر سکتا تو دیکھنا بھیسروں تیرے ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا، اب وہ تجھے جیتا نہیں چھوڑے گا، چل بھاگ جا یہاں سے۔“  
 ”میرے ساتھ تو جو کچھ ہوگا وہ ہوگا ہی سیوک رام جی پر یہ بتاؤ کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟“  
 ”تجھے کیا؟“ وہ بولا۔

”یہ کون ہے؟“ میں نے سوال کیا۔  
 ”تیری ماں ہوگی۔“ سیوک رام نے جواب دیا اور میری آنکھوں میں خون اتر آیا، یہ ایسا جملہ تھا جو میری ذہنی زگ تھا۔  
 ”ماں...“ ماں کے لیے میرے دل میں نجائے کیا کیا خیالات تھے اور اس شخص نے اسے میری ماں کہا تھا، میں ایک قدم آگے بڑھ کر بولا۔

”اگر یہ میری ماں ہے تو یہ رو کیوں رہی ہے؟“  
 ”جائے گا نہیں تو یہاں سے کچھ کروں تیرے خلاف؟“ سیوک رام نے کہا اور میں اس کی طرف کچھ اور قدم بڑھا تب اس نے اچانک ہی دونوں ہاتھ آگے بڑھائے اور اس کی انگلیوں سے شعلوں کی لکیریں نکل کر میری جانب بڑھیں، میں ایک دم زمین پر بیٹھ گیا تھا پھر میں نے کہا۔

”سیوک رام! بالکل خاموشی سے کھڑا ہو جا، ایک قدم آگے نہیں بڑھے گا تو میں تجھے حکم دیتا ہوں۔“  
 میں نے کہا اور اچانک ہی سیوک رام کے ہاتھ اٹھے، اٹھے رہ گئے۔ میں اپنے الفاظ کا رد عمل دیکھنا چاہتا تھا اور نہ زندگی کی بازی تو لگ ہی چکی تھی، سیوک رام پتھر کا بن گیا تھا، میں اس کے قریب پہنچا اور میں نے ایک زوردار پھٹرا اس کے منہ پر رسید کر دیا۔ میرے پھٹنے سے وہ زمین پر گر پڑا تب میں نے اسے اپنی جگہ سے



ساڑھی پڑی ہوئی تھی سادہ سی ساڑھی اس کے ساتھ ہی چپلیس بھی تھیں، میں نے دونوں چیزیں اٹھائیں اور باہر نکل آیا تب میں نے اس سے کہا۔

”لو اپنا لباس پہن لو، بہن..... بھائی کہا ہے تم نے مجھے..... بھائی تمہارا ساتھ دے گا۔“

یہ کہہ کر میں دوسری طرف رخ کر کے کھڑا ہو گیا، پہلے اس نے جائزہ لیا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ پورا کروں گا یا نہیں اور جب اسے اطمینان ہو گیا کہ اس سے یہ الفاظ کہنے والا شخص ایماندار ہے تو اس نے اپنا لباس پہنا اور چند لمحوں کے بعد اس کی لرزتی ہوئی آواز سنائی دی۔

”میں نے ساڑھی پہن لی ہے بھیا جی۔“  
”ہوں آؤ۔“ میں نے کہا اور اسے ساتھ لے کر چل پڑا۔

سیوک رام اب بھی اسی طرح کھڑا ہوا تھا پتہ نہیں اس کے اندر اب بھی جنبش کرنے کی صلاحیت تھی یا نہیں، لیکن میں تیسری خواہش نہیں کر سکتا تھا اس کے ساتھ جو پتہ ہوا وہ جانے ویسے بھی اس نے غلط ہی کیا تھا اب میں سوچ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے فوری طور پر کوئی بات ذہن میں نہیں آرہی تھی پھر اچانک ہی میرے ذہن میں چاچی کا خیال آیا جس نے مجھے یہاں تک بھیجا تھا بہر حال اس سے میرا واسطہ تو تھا کیوں نہ اس معصوم سی لڑکی کو لے کر چاچی کی طرف ہی چلوں۔ چنانچہ میں چاچی کی طرف چل پڑا۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)



اٹھایا اور کہا۔  
”میں تجھے کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا سیوک رام لیکن خبردار تو نے میرا پیچھا کیا، ابھی بھی میرا پیچھا مت کرنا مجھے اپنے ذہن سے نکال دینا۔“

سیوک رام پتھرائی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھتا رہا اس کے جسم میں اب بھی کوئی جنبش نہیں ہوئی تھی گویا میرے دو قول پورے ہو گئے تھے اور اب چار باقی بچے تھے، لیکن یہ دیکھ کر مجھے دلی خوشی کا احساس ہوا تھا کہ تبھیروں کا دیا، واوچن بالکل ٹھیک تھا اور پورا ہو گیا تھا، میرے دل میں مسرت کی ایک لہر اٹھی اب اس کے بعد کوئی تیسری بات سیوک رام سے کہنا بالکل بے مقصد تھا۔ نجانے کیوں میرے دل کو یقین تھا کہ جو کچھ میں نے کہا تھا سیوک رام اس سے ذرا بھی انحراف نہیں کرے گا۔

تب میں اس عورت کی طرف متوجہ ہوا جس کی سسکیاں اب رُک گئی تھیں اس نے گردن اٹھا کر مجھے دیکھا تب میں نے اس کے مدہم سے نقوش دیکھے کوئی نوجوان لڑکی تھی اس کے چہرے مہرے اور بالوں سے یہ پتہ چل رہا تھا لیکن جس عالم میں تھی اس میں وہ شاید کھڑی نہیں ہو سکتی تھی کسی اجنبی کے سامنے اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

”بھیا میری ساڑھی اندر جھونپڑی میں پڑی ہے بھگوان تمہیں جیون کا ہر شکھ دے، تم نے مجھے ماں کہا ہے یا بہن، میری ساڑھی لا دو تمہاری مہربانی ہوگی۔“

میرے قدم جھونپڑی کی جانب بڑھ گئے جھونپڑی میں اچھی خاصی روشنی پھیلی ہوئی تھی، سیوک رام اب بھی اسی جگہ کھڑا ہوا تھا جہاں پہلے کھڑا تھا غالباً اس کے بدن میں جنبش کرنے کی صلاحیت نہیں تھی اب وہ جائے جہنم میں اس پر جو بیتی وہ جانے میرا کام تو ہو چکا تھا چنانچہ میں جھونپڑی میں پہنچا وہاں ایک





READING  
Section

SCA





## عروس آزادی

زرین قمر

کشمیری حریت پسندوں کی جدوجہد سے ایک زمانہ واقف ہے 'کشمیر کی آزادی کے حق میں جہاں دنیا بھر میں آوازیں بلند ہو رہی ہیں وہاں اس خلق خدا پر بھارتی حکومت کے مظالم اب معمول بن چکے ہیں۔ یہ کہانی بھی ان جیالے لوگوں پر مشتمل ہے 'جن کی زندگی کا لمحہ لمحہ اپنے وطن کو آزاد کرانے میں گزر رہا ہے۔ بوڑھے بہن یا جوان 'عورت ہو یا بچہ سب کے سب اپنی مقبوضہ زمین کو آزاد کرانے کی جدوجہد کے عمل سے گزر رہے ہیں۔ زمین کی محبت کیا ہوتی ہے اور زمین کو آزاد کرانے کا خواب کس طرح آنکھوں میں جگمگاتا ہے یہ بات اس کہانی کی سطر سطر میں پیوست ہے۔



READING  
Section

SCANNED BY AMIR



فرناز ڈرائنگ روم میں ٹی وی کے سامنے بیٹھی تھی اور بڑے انہماک سے آج کی بریکنگ نیوز دیکھ رہی تھی۔

”سری نگر آج کشمیری حریت رہنما شبیر شاہ نے اپنی حریت ریلی میں ایک بار پھر پاکستانی پرچم لہرایا اور موقع پر موجود بھارتی فوجیوں نے مشتعل ہو کر ریلی کے متعدد شرکاء کو گرفتار کر لیا۔“

فرناز نے ساری توجہ اس خبر کی طرف تھی وہ سوچ رہی تھی کہ آج اتنی سمنی ہے اور اس ماہ میں یہ تیسری بار ہے کہ پاکستانی پرچم لہرانے پر کشمیریوں کو بھارتی تشدد کا سامنا کرنا پڑا ہے اور نئی لوگ گرفتار بھی ہوئے ہیں اسے اچانک ہی احمد کمال کا خیال آیا تھا جو کشمیر کی اس جدوجہد آزادی کا حصہ تھا اور بڑی باتعدگی سے حریت کی ان ریلیوں میں شرکت کرتا تھا۔ اسے وہ بے انتہا پسند کرتی تھی وہ اس کے خوابوں کا شہنشاہ تھا لیکن اس کی منگنی اس کی بڑی بہن فریال سے ہو گئی تھی اور ایک ماہ بعد ان دونوں کی شادی ہونے والی تھی اور فرناز اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اداس رہنے لگی تھی۔ احمد کمال بھی کافی دن سے ان کے گھر نہیں آیا تھا وہ اداسی سے اٹھ کر باہر لان میں آ بیٹھی جہاں سے اسے گھر کے باہر کشمیر کی دلفریب وادیاں دور دور تک بکھری نظر آ رہی تھیں۔ ان کا گھر ہندو واڑہ کے علاقے میں ایک پہاڑی کے دامن میں واقع تھا گھر کے باہر بنے لان میں بیٹھنے سے ارد گرد کی پہاڑیوں کا دلفریب منظر نظر آتا تھا ان پہاڑیوں میں چکر کاٹی سیاہ ناگن جیسی سڑک کا منظر تو بہت دلکش تھا اس پر آنے والی کوئی بھی گاڑی دور سے چکر کھاتی آگے بڑھتی پہاڑیوں کے دامن میں کبھی کسی موٹر پر چھپتی کبھی ظاہر ہوتی عجیب نظارہ پیش کرتی تھیں اس وقت بھی ایک موٹر سائیکل سوار بڑی تیز رفتاری سے اس سڑک پر

آگے بڑھتا چلا آ رہا تھا اور فرناز خالی الذہنی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

پھر چکراتی بل کھاتی سڑک پر سفر کرتی وہ موٹر سائیکل فرناز کے گھر کے گیٹ پر ہی آ کر رکی تھی اور فرناز کا اداس چہرہ کھل اٹھا تھا کیونکہ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی محبوب ہستی احمد کمال کھڑا تھا۔

”احمد..... احمد کمال۔“ اس نے بے خودی میں سرگوشی کی اور احمد کمال کے استقبال کے لیے گیٹ کی طرف لپکی احمد کمال بائیک کھڑی کر کے اس کی طرف ہی آ رہا تھا۔ اس کے ہر اٹھتے قدم کے ساتھ فرناز کو اپنے دل کی دھڑکنیں رکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں اور وہ سوچ رہی تھی کہ احمد کمال سے کیا بات کرے گی..... اسے پیار سے پکارے گی..... کسی اچھے سے خوب صورت نام سے مخاطب کرے گی وہ دل ہی دل میں تعریفی جملے سوچنے لگی لیکن جب احمد کمال اس کے نزدیک آیا تو اس کے منہ سے ادا ہونے والا جملہ نہایت سادہ اور رسمی سا تھا۔

”آؤ احمد کمال، کیسے ہو، کافی دنوں بعد آئے۔“ اس نے پوچھا۔

”ہاں کچھ مصروفیت تھی۔“ احمد کمال نے بے پروائی سے کہا اس سے بے خبر کہ فرناز کس بے قراری سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔

”کیسی مصروفیت، تمہاری مصروفیت اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ شبیر شاہ کے جلسوں میں شرکت کرو۔“ فرناز نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”جب جانتی ہو تو پوچھتی کیوں ہو؟“ احمد کمال نے بھی اسی کے انداز میں مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”اور یہ تم نے کپڑے کیسے پہن رکھے ہیں؟“ فرناز نے احمد کمال کے میلے سادہ اور سستے سے کپڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ کیونکہ



اب سے پہلے وہ ہمیشہ ہمیشہ عمدہ لباس زیب تن کرتا رہا تھا فرناز کو جھنجھلاہٹ بھی محسوس ہو رہی تھی کہ اس نے اپنے دل میں سوچے ہوئے کئی محبت آفرین جملوں میں سے ایک بھی کمال کے سامنے ادا نہیں کیا تھا کیونکہ وہ مجبور تھی اس کا محبوب کمال احمد اس کی بہن فریال کا منگیترا تھا۔

”میں ایک ضروری کام سے سرینگر گیا ہوا تھا۔“ احمد کمال نے کہا۔

”مجھے معلوم ہے تم یقیناً حریت ریلی میں شرکت کرنے گئے ہو گے میں ابھی ٹی وی پر خبریں دیکھ رہی تھی۔“ فرناز نے کہا۔

”ہاں..... یہی بات ہے..... انڈین فوج نے تو ظلم کی انتہا کر دی وہ تو برداشت ہی نہیں کر سکتے کہ یہاں کوئی پاکستان کا نام بھی لے ہمارا خواب پاکستان ہے ہماری جان پاکستان ہے۔“ احمد کمال نے جوشیے انداز میں کہا۔

”وہ تو ٹھیک ہے احمد کمال، میرے بھی یہی جذبات ہیں لیکن 1947ء سے لے کر اب تک ہم نے کتنی قربانیاں دی ہیں کتنی جدوجہد کی ہے کہ پاکستان کے ساتھ الحاق ہو جائے لیکن بھارتی حکومت ہمیشہ ہمارے ارادوں کو خاک میں ملا دیتی ہے۔“

”لیکن میرا ایمان ہے کہ ابھی نہ کبھی ہماری جدوجہد ضرور رنگ لائے گی۔“ احمد کمال نے پر عزم لہجے میں کہا۔

”ان شاء اللہ۔“ فرناز نے بھی اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

”ہاں یہ تو بتاؤ کس آج یہ پھنچر لباس کیوں پہنا ہوا ہے؟“ فرناز نے اسے چھینرنے والے انداز میں کہا۔

”اس کی وجہ یہ ہے کہ سرینگر میں میری ملاقات ایک شخص شیردل سے ہوئی وہ ایسا ہی موٹا کھدر کا

ڈھیلا ڈھالا لباس پہنتا ہے جب میں اس سے پہلی بار ملا تو میں نے محسوس کیا کہ وہ میرے لباس کو بڑی عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کئی بار مجھے سمجھایا کہ ہمیں سادہ اور سستا لباس پہننا چاہیے اور خاص طور پر اپنا مقامی لباس جو ہماری پہچان ہے اگر واقعی ہم اپنے وطن اور اپنی سرزمین سے پیار کرتے ہیں تو ہمیں اپنی ثقافت اور اپنے لباس کو نہیں بھولنا چاہیے اور دوسروں کی تقلید نہیں کرنا چاہیے۔ میں اس کی باتوں سے بہت متاثر ہوا۔“

”یہ شیردل کون ہے؟“ فرناز نے پوچھا۔

”شیردل بھی ایک حریت لیڈر ہے لیکن وہ بہت

سادہ مزاج اور اپنے وطن پر مرثیے والا ہے۔“

”ہوں تو تم اس سے متاثر ہو گئے ہو؟“ فرناز نے پوچھا۔

”ہاں وہ چند ہی دنوں میں میرا آئیڈیل بن گیا

ہے اس کا کہنا ہے کہ انسان کے دل و دماغ میں جو چیز

رہتی ہے وہی اہمیت رکھتی ہے وہ لباس اہمیت نہیں

رکھتا جو ظاہری شان و شوکت عطا کرتا ہے ہم آزادی

کی جدوجہد کر رہے ہیں ہمیں اپنی نئی نسل کو سوچنے کا

نیا انداز دینا ہے ایسا انداز جس کو اپنا کر ہمارے ہم وطن

عزت سے زندہ رہ سکیں اور ایک ظاہری ٹھٹھاٹ باٹ

والا لباس ہمارے لیے مناسب نہیں ہمارا نصب العین

ایک آزاد مملکت کا قیام ہے جسے ہم سادگی سے رہ کر

بی پاسکتے ہیں سادگی سے زندگی گزاریں اور وطن کے

لیے جدوجہد کریں اس کے لیے ہمیں امیری کے

ٹھٹھاٹ باٹ چھوڑنا ہوں گے۔ جو امیر خاندانوں میں

پیدا ہونے والوں کی میراث ہے۔“

احمد کمال بول رہا تھا اور فرناز سن رہی تھی لیکن اس

کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کیونکہ وہ تو بس والہانہ

انداز میں احمد کمال کے سراپا میں کھوئی ہوئی تھی اس کا



احمد کمال فریال کے ساتھ اس کے کمرے سے باہر آ گیا تھا۔

”فرناز ہم ذرا بازار تک جا رہے ہیں۔ میں فریال کو اس کی پسند کا جوڑا دلوانا چاہتا ہوں۔“ احمد کمال نے مسکراتے ہوئے کہا اور فرناز کا دل جیسے کٹ کر رہ گیا اسے یاد آ گیا کہ فریال اور احمد کمال کی ایک مہینے بعد شادی ہونے والی تھی۔

”ضرور جائیں۔“ اس نے تلخی سے کہا اور پاؤں پینچتی ہوئی برآمدے کی طرف بڑھ گئی۔

”ارے، اسے کیا ہو گیا، ابھی تو اچھی بھلی تھی۔“ احمد کمال نے حیرت سے کہا۔

”یہ احساس کمتری کا شکار ہے اپنی سانولی رنگت، معمولی نقوش کی وجہ سے مجھ سے بھی جلتی ہے۔“ فریال نے اپنی مخروطی انگلیوں سے سیاہ زلفوں کو سنوارتے ہوئے کہا اس کی گلابی رنگت احمد کمال کے قریب سے اور زیادہ نکھر گئی تھی۔

”لیکن کون کہتا ہے کہ وہ بد صورت ہے۔“ احمد کمال نے کہا ”وہ خوب صورت ہے۔“ اس نے فریال کی طرف دیکھا جو اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”وہ خوب صورت ہے اور.....!“

”اور..... اور کیا؟“ فریال نے پوچھا۔

”اور تم..... بہت زیادہ خوب صورت۔“ احمد کمال نے اسے خوش کرنے والے انداز میں کہا۔

”اوہ..... شکریہ جناب عالی۔“ فریال نے سیدھے ہاتھ سے آداب کرتے ہوئے ہنس کر کہا اور پھر اٹھلائی ہوئی احمد کمال کی موٹر سائیکل کی طرف بڑھ گئی تھی۔

چند لمحوں بعد احمد کمال کی موٹر سائیکل مکان کے احاطے سے نکل کر بازار کی سمت روانہ ہو گئی تھی۔

چند لمحوں بعد احمد کمال کی موٹر سائیکل مکان کے احاطے سے نکل کر بازار کی سمت روانہ ہو گئی تھی۔

چند لمحوں بعد احمد کمال کی موٹر سائیکل مکان کے احاطے سے نکل کر بازار کی سمت روانہ ہو گئی تھی۔

چند لمحوں بعد احمد کمال کی موٹر سائیکل مکان کے احاطے سے نکل کر بازار کی سمت روانہ ہو گئی تھی۔

چند لمحوں بعد احمد کمال کی موٹر سائیکل مکان کے احاطے سے نکل کر بازار کی سمت روانہ ہو گئی تھی۔

چند لمحوں بعد احمد کمال کی موٹر سائیکل مکان کے احاطے سے نکل کر بازار کی سمت روانہ ہو گئی تھی۔

چند لمحوں بعد احمد کمال کی موٹر سائیکل مکان کے احاطے سے نکل کر بازار کی سمت روانہ ہو گئی تھی۔

چند لمحوں بعد احمد کمال کی موٹر سائیکل مکان کے احاطے سے نکل کر بازار کی سمت روانہ ہو گئی تھی۔

چند لمحوں بعد احمد کمال کی موٹر سائیکل مکان کے احاطے سے نکل کر بازار کی سمت روانہ ہو گئی تھی۔

چند لمحوں بعد احمد کمال کی موٹر سائیکل مکان کے احاطے سے نکل کر بازار کی سمت روانہ ہو گئی تھی۔

چوڑا چکلا سینہ، روشن آنکھیں، سانولی رنگت اور مردانہ وجاہت وہ مسکوری کھڑی تھی اسے اچھی طرح علم تھا کہ اس نے کبھی احمد کمال کی کوئی بات غور سے نہیں سنی تھی شاید اس لیے کہ اس نے اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی احمد کمال جو کچھ بھی کہتا تھا وہ بلا کسی تنقید یا اعتراض کے اس کے لیے بالکل درست ہوتا تھا اور وہ اپنی طبیعت کے برخلاف بغیر حیل و حجت اس کی ہر بات تسلیم کر لیتی تھی۔

”اچھا یہ بتاؤ سرینگر میں ہونے والی ریلی میں تمہارا کیا کردار تھا۔“ فرناز نے دلچسپی سے پوچھا۔

”یہ میں تمہیں پھر بتاؤں گا تم یہ بتاؤ کہ فریال کہاں ہے۔“ احمد کمال نے برآمدے کی طرف نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھا اور فرناز کے چہرے پر سر دی لہر چھا گئی۔ اس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر اٹھا تھا جیسے کسی ناویدہ قوت نے اٹھایا ہو۔

”اپنے کمرے میں۔“ اس نے فریال کے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اس کی آواز بہت دھیمی تھی۔ احمد کمال اس کے الفاظ سن نہ سکا تھا بس اس کے اشارے کا مطلب سمجھ گیا تھا۔

”اور تمہاری امی۔“ احمد کمال نے برآمدے کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا۔

”وہ خالہ جان کے گھر گئی ہیں۔“ فرناز نے جواب دیا۔

”اچھا، میں فریال سے مل لوں۔“ احمد کمال نے کہا اور فریال کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

فرناز لان میں پڑی کرسی پر جا کر بیٹھ گئی تھی۔

”ہونہہ میں نہیں روؤں گی، ہرگز نہیں روؤں گی۔“ فرناز نے خود سے کہا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے ڈھلک ڈھلک کر اس کے سانولے رخساروں پر بہنے لگے تھے اس نے انہیں جلدی سے صاف کر لیا کیونکہ

فرناز نے خود سے کہا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے ڈھلک ڈھلک کر اس کے سانولے رخساروں پر بہنے لگے تھے اس نے انہیں جلدی سے صاف کر لیا کیونکہ

فرناز نے خود سے کہا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے ڈھلک ڈھلک کر اس کے سانولے رخساروں پر بہنے لگے تھے اس نے انہیں جلدی سے صاف کر لیا کیونکہ

فرناز نے خود سے کہا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے ڈھلک ڈھلک کر اس کے سانولے رخساروں پر بہنے لگے تھے اس نے انہیں جلدی سے صاف کر لیا کیونکہ

فرناز نے خود سے کہا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے ڈھلک ڈھلک کر اس کے سانولے رخساروں پر بہنے لگے تھے اس نے انہیں جلدی سے صاف کر لیا کیونکہ

فرناز نے خود سے کہا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے ڈھلک ڈھلک کر اس کے سانولے رخساروں پر بہنے لگے تھے اس نے انہیں جلدی سے صاف کر لیا کیونکہ

فرناز نے خود سے کہا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے ڈھلک ڈھلک کر اس کے سانولے رخساروں پر بہنے لگے تھے اس نے انہیں جلدی سے صاف کر لیا کیونکہ

فرناز نے خود سے کہا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے ڈھلک ڈھلک کر اس کے سانولے رخساروں پر بہنے لگے تھے اس نے انہیں جلدی سے صاف کر لیا کیونکہ

فرناز نے خود سے کہا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے ڈھلک ڈھلک کر اس کے سانولے رخساروں پر بہنے لگے تھے اس نے انہیں جلدی سے صاف کر لیا کیونکہ

فرناز نے خود سے کہا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے ڈھلک ڈھلک کر اس کے سانولے رخساروں پر بہنے لگے تھے اس نے انہیں جلدی سے صاف کر لیا کیونکہ

فرناز نے خود سے کہا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے ڈھلک ڈھلک کر اس کے سانولے رخساروں پر بہنے لگے تھے اس نے انہیں جلدی سے صاف کر لیا کیونکہ

فرناز نے خود سے کہا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے ڈھلک ڈھلک کر اس کے سانولے رخساروں پر بہنے لگے تھے اس نے انہیں جلدی سے صاف کر لیا کیونکہ

فرناز نے خود سے کہا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے ڈھلک ڈھلک کر اس کے سانولے رخساروں پر بہنے لگے تھے اس نے انہیں جلدی سے صاف کر لیا کیونکہ

فرناز نے خود سے کہا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے ڈھلک ڈھلک کر اس کے سانولے رخساروں پر بہنے لگے تھے اس نے انہیں جلدی سے صاف کر لیا کیونکہ

فرناز نے خود سے کہا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے ڈھلک ڈھلک کر اس کے سانولے رخساروں پر بہنے لگے تھے اس نے انہیں جلدی سے صاف کر لیا کیونکہ

فرناز نے خود سے کہا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے ڈھلک ڈھلک کر اس کے سانولے رخساروں پر بہنے لگے تھے اس نے انہیں جلدی سے صاف کر لیا کیونکہ

فرناز نے خود سے کہا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے ڈھلک ڈھلک کر اس کے سانولے رخساروں پر بہنے لگے تھے اس نے انہیں جلدی سے صاف کر لیا کیونکہ

فرناز نے خود سے کہا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے ڈھلک ڈھلک کر اس کے سانولے رخساروں پر بہنے لگے تھے اس نے انہیں جلدی سے صاف کر لیا کیونکہ

فرناز نے خود سے کہا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے ڈھلک ڈھلک کر اس کے سانولے رخساروں پر بہنے لگے تھے اس نے انہیں جلدی سے صاف کر لیا کیونکہ

فرناز نے خود سے کہا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے ڈھلک ڈھلک کر اس کے سانولے رخساروں پر بہنے لگے تھے اس نے انہیں جلدی سے صاف کر لیا کیونکہ



شفٹ ہو جانا چاہیے لیکن انہوں نے کبھی اس کی بات نہیں سنی تھی۔

کچھ دیر بعد اس کے والد سلمان داؤد آ گئے تھے اور آتے ہی انہوں نے اپنی عادت کے مطابق اس کی والدہ کو آواز دی تھی۔

”جی..... جی ابو.....!“ وہ بھاگتی ہوئی برآمدے میں آ گئی تھی۔

”یہ تمہاری امی کہاں ہیں؟“ انہوں نے پوچھا۔  
”جی وہ تو خالہ جان کے ہاں گئی ہیں۔ تھوڑی دیر میں آئیں گی۔“ فرناز نے جواب دیا۔

”اچھا، اچھا تم ایسا کرو کہ میرے لیے ایک کپ گرم گرم بن چائے بنلاؤ۔“ انہوں نے کہا۔

”جی بہتر۔“ فرناز نے جواب دیا اور تیزی سے باورچی خانہ کی طرف بڑھ گئی۔

پھر جب وہ چائے کا کپ لیے اپنے والد کے اسٹڈی روم میں داخل ہوئی تھی تو ان کی تیوریوں پر بل پڑے۔ کچھ کر پریشان ہو گئی تھی۔

”یہ تمہاری بہن کہاں ہے؟“ انہوں نے قدرے غصے سے پوچھا تو وہ بوکھلا گئی۔

”جی..... وہ..... وہ احمد کمال کے ساتھ بازار گئی ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”حد ہو گئی، خیر غلطی میری ہی ہے۔“ سلمان داؤد نے غصے سے کہا۔

”مجھے ہمیشہ ہی شک رہا تھا کہ وہ نامعقول ضرور کوئی حماقت کرے گا لیکن میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ!“ سلمان داؤد نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔  
”کیا ابو؟ آپ کیا نہیں سوچ سکتے تھے؟“ فرناز نے پوچھا۔

”چھ نہیں بیٹی، کچھ نہیں، تمہارا اس بات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تم یہ کرنا کہ جب وہ احمقوں کا جوڑا

ان دونوں کے جانے کے بعد فرناز اپنے کمرے میں جا کر بیڈ پر لیٹ گئی تھی اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور وہ آہستہ آہستہ سسکیاں لے رہی تھی اس کی نظروں کے سامنے اپنا ماضی گھوم رہا تھا۔

اس نے جب سے ہوش سنبھالا تھا اپنی بڑی بہن فریال کو اپنے مد مقابل پایا تھا فریال بہت خوب صورت تھی سفیدی مائل، گلابی رنگت، بڑی بڑی ہرنی جیسی آنکھیں سیاہ بال اور اس پر چلبلی طبیعت کی مالک ہر کسی کی آنکھوں کا تارا فریال، اسے سب ہی چاہتے تھے جبکہ فرناز سرف قبول صورت تھی اس کی رنگت سانولی تھی اور وہ بہت ناموش طبع تھی۔ اسے اپنے ماں باپ کی محبت بھی فریال سے کم ملی تھی گھر کے کام کاج میں بھی وہی اپنی والدہ کا ہاتھ بٹاتی تھی جبکہ فریال کسی بھی کام کو کبھی ہاتھ نہیں لگاتی تھی اسے اپنے بناؤ سنگھار سے ہی فرصت نہیں ہوتی تھی۔

فرناز کا دل رو رہا تھا۔ وہ احمد کمال میں کتنی بد نصیب ہوں، قدرت نے خوب صورتی کی طرح تمہیں بھی فریال کی جھولی میں ڈال دیا ہے اور میں..... میں کتنی بے بس ہوں میں کسی سے اپنے دل کا حال بھی نہیں کہہ سکتی..... تم سے بھی نہیں۔ فرناز نے ایک سسکی لی اور بستر سے اٹھ گئی وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے والد سلمان داؤد جب دفتر سے گھر آئیں گے یا والدہ واپس گھر آئیں گی تو اسے اس حالت میں دیکھیں چنانچہ منہ دھونے کے بعد وہ اپنے والد کے اسٹڈی روم میں جا بیٹھی اور دیر تک ان کی کتابوں کی ورق گردانی کرتی رہی۔ اس کے والد کشمیر میں ایک اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز تھے اس کے باوجود انہوں نے اپنا پرانا خاندانی گھر نہیں بدلتا تھا فرناز کئی بار اپنی والدہ سے فرمائش کر چکی تھی کہ اپنے دوسرے پڑوسی کی طرح انہیں بھی کسی اچھے سے گھر میں



واپس آئے تو انھیں میرے پاس بھیج دینا۔“ سلمان داؤد نے کہا۔

”جی اچھا ابو۔“ فرناز نے سعادتمندی سے کہا لیکن اس کا دل بے چین ہو گیا تھا وہ سوچ رہی تھی کہ احمد کمال سے کوئی ایسی غلطی سرزد ہوگئی ہے جسے اس کے والد نے برہم کر دیا ہے اور ممکن ہے کہ ان کا غصہ اتنا شدید ہو کہ فریال اور احمد کمال کا ہونے والا رشتہ بھی خطرے میں پڑ جائے۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا اور احمد کمال کا خاندان آپ ہی حیثیت کے حامل تھے اور ان خاندانوں کے درمیان شادی ہونا کوئی مشکل بات نہیں تھی لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس کے والد طبیعت کے بہت سخت اور غصہ والے تھے اگر انہیں احمد کمال کی کوئی بات ناگوار لگتی تو یہ شادی ناممکن ہو جائے گی۔

اپنے والد کے اسٹڈی روم سے نکلنے کے بعد وہ برآمدے میں آ بیٹھی۔ شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا اور اندھیرے کے ساتھ ساتھ اس کے دل میں دسو سے سرائٹھارے تھے اس کے اندازے کے مطابق فریال اور احمد کمال کو اب تک واپس آ جانا چاہیے تھا اگر انہیں دیر ہوگئی تو اس کے والد کا غصہ مزید بڑھ سکتا ہے وہ اس خیال سے پریشان ہو رہی تھی کہ اچانک احمد کمال کی موٹر سائیکل مکان کے احاطے میں داخل ہوئی اور اس سے پہلے کہ احمد کمال فریال کو اتار کر واپس جاتا فرناز دوزخی ہوئی ان کے پاس پہنچ گئی۔

”تم دونوں کو ابوا اسٹڈی میں بلا رہے ہیں۔“ اس نے کہا اور اس کی بات پر احمد کمال کا چہرہ پھیکا پڑ گیا تھا لیکن اس نے اپنی کیفیت کو چھپا لیا تھا۔

”شکریہ فرناز۔“ احمد کمال نے موٹر سائیکل سے اترتے ہوئے کہا پھر وہ فریال کے ساتھ مکان کے اندر دروازے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ فرناز بھی ان کے

پیچھے تھی لیکن اس نے پھر ایک تاریک گوشے ہی میں کھڑے رہنے پر اکتفا کیا تھا وہ جگہ اس کے والد کے کمرے کے قریب ہی تھی اور وہاں سے وہ ان کی گفتگو با آسانی سن سکتی تھی۔ اس وقت اس کے والد اپنی رائٹنگ ٹیبل پر بیٹھے ہوئے تھے اور ٹیبل لیمپ روشن تھا کمرے کا بیشتر حصہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا لیکن فرناز با آسانی اندازہ کر سکتی تھی کہ اس وقت اس کے والد بہت غصے میں تھے۔

”صاحب زادے کیا تم بھی حکومت کے غداروں میں شامل ہو؟“ سلمان داؤد نے احمد کمال کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”اس بات سے آپ کا کیا مطلب ہے جناب؟“ احمد کمال نے پرسکون انداز میں پوچھا۔

”تم میرا مطلب اچھی طرح جانتے ہو آج صبح ہی مجھے اطلاع ملی ہے کہ تمہارے والد اسحاق احمد جو ذہین اور قابل انسان ہیں اور جنہیں اپنا دوست کہتے ہیں فخر محسوس کرتا ہوں۔“

”میں اس کے لیے آپ کا مشکور ہوں جناب۔“ احمد کمال نے سلمان داؤد کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”میری بات مت کاٹو۔“ سلمان داؤد نے غصے سے کہا۔

”میں کہہ رہا تھا کہ آج سچ مجھے بتایا گیا ہے کہ تمہارے والد اگلے ماہ انت ناگ میں ہونے والی ”تحریک آزادی کشمیر“ کی ایک خفیہ میٹنگ میں تحریک کے ایک نمائندے کی حیثیت سے شرکت کرنے والے ہیں، کیا یہ درست ہے۔“

”جی ہاں اور مجھے یہ کہنے میں فخر ہے کہ وہ تحریک آزادی کشمیر کے ایک پروانے ہیں۔“ احمد کمال نے مسکراتے ہوئے کہا اس کا جواب سخت ہی سلمان داؤد کھڑے ہو گئے۔



”تمہیں فخر ہے؟“ انہوں نے تیز آواز میں کہا۔  
 ”اس کا مطلب ہے کہ تمہارے والد کے جو نظریات ہیں تم ان سے متفق ہو؟“  
 ”جی ہاں جناب اور میں بھی کانفرنس میں ان کے ساتھ شرکت کر رہا ہوں۔“  
 ”تو پھر بات ہی ختم سمجھو، اب کہنے اور سننے کو کچھ نہیں رہ گیا۔“ سلمان داؤد نے فریال کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔  
 ”فریال ان صاحبزادے کو ان کی انگوٹھی واپس کر دو۔“ انہوں نے غصے سے کہا اور جیسے فریال پر بجلی گر پڑی۔  
 ”اوہ او۔“ فریال نے بھونپتی ہو کر گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔  
 ”جیسا میں کہہ رہا ہوں ویسا کرو۔“  
 سلمان داؤد نے غصے سے کہا۔ فریال پریشانی سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی وہ تذبذب میں تھی کہ کیا کرے اور فرناز حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی وہ سوچ رہی تھی کہ اس وقت اگر وہ فریال کی جگہ ہوتی تو اپنے والد کا یہ حکم ماننے سے انکار کر دیتی چاہے وہ اسے جان سے ہی کیوں نہ مار دیتے لیکن وہ جانتی تھی کہ فریال اس کی طرح نہیں ہے پھر وہ مسکرائی آنکھوں سے فریال کو مستلنی کی انگوٹھی اتارتے ہوئے دیکھتی رہی تھی۔ فریال نے انگوٹھی اتار کر احمد کمال کے ہاتھ میں تھما دی۔ فریال کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ احمد کمال کچھ دیر تک انگوٹھی کو دیکھتا رہا تھا اور پھر اس نے اسے زمین پر گرادیا تھا۔  
 ”مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے، شب بخیر سلمان صاحب۔“ خدا حافظ فریال۔“ اس نے آہستہ سے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔  
 فرناز دوڑتی ہوئی اس کے پیچھے باہر آئی تھی

اندھیرے کے باعث اسے کوئی دیکھ نہیں سکا تھا۔  
 ”احمد۔“ اس نے سرگوشی میں کہا۔  
 ”کیا بات ہے فرناز؟“ احمد کمال نے رکتے ہوئے پوچھا۔  
 ”میں..... میں تمہارے ساتھ ہوں احمد کمال۔“  
 فرناز نے ہمدردی سے کہا۔  
 ”کیا مطلب۔“ احمد کمال نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔  
 ”میں..... میں کہنا چاہتی ہوں کہ اگر تم سمجھتے ہو کہ تحریک آزادی کشمیر میں کام کرنے والے صحیح راستے پر ہیں تو پھر یہ ٹھیک ہی ہوگا میرا اس پر یقین ہے۔“ فرناز نے کہا تو احمد کمال کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔  
 ”میں اس یقین پر تمہارا مشکور ہوں بنی تھی فرناز۔“  
 ”مجھے بھی مت کہو۔“ فرناز نے زمین پر پاؤں مارتے ہوئے کہا۔  
 ”میں بڑی ہو گئی ہوں، میں پندرہ سال کی ہوں اور اپنا اچھا برا سوچ سکتی ہوں۔“ فرناز نے کہا۔  
 ”تم بڑی ہو گئی ہو؟“ احمد کمال نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔  
 ”اچھا ٹھیک ہے میں آئندہ خیال رکھوں گا۔“ احمد کمال نے مسکراتے ہوئے کہا اور موٹر سائیکل کی طرف بڑھ گیا فرناز بھی واپس آتے کمرے میں چلی گئی تھی لیکن اسے حیرت تھی کہ مستلنی کی انگوٹھی واپس کرنے کے باوجود احمد کمال کا موڈ خراب نہیں ہوا تھا وہ اس کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔  
 فریال کی مستلنی ٹوٹے تیسرا دن تھا۔ فرناز اپنے کمرے میں بستر پر لیٹی احمد کمال کی دی ہوئی ایک کتاب کی ورق گردانی کر رہی تھی اس کے کمرے میں روشنی نا کافی تھی کھڑکیاں بند تھیں جنہیں اس نے اٹھ کر کھولنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی جو کتاب وہ پڑھ



ری تھی وہ بہت سستی سی کتاب تھی وہ اتنی مختصر تھی کہ اسے اگر کتابچہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس کی چھپائی کے لیے نہایت گھٹیا سا کاغذ استعمال کیا گیا تھا اس کا عنوان تھا ”بھارت کی ہٹ دھرمیاں اور کشمیر کا جواب“ اس کتاب پر مصنف کا نام نہیں دیا گیا تھا اور اس کی اشاعت نومبر 1947ء میں عمل میں آئی تھی حکومت وقت نے اس پر پابندی عائد کر دی تھی اور اس کے پڑھنے کو جرم قرار دیا جا چکا تھا اس کی خاطر بہت سے نوجوان جیلوں میں بند کر دیے گئے تھے لیکن یہ کتاب کشمیری نوجوانوں میں بہت مقبول ہوئی تھی۔ احمد کمال نے فرناز کو بتایا تھا اب تک اس کتاب کی پانچ لاکھ سے بھی زیادہ کاپیاں فروخت ہو چکی ہیں۔

فرناز اس کتاب کو تقریباً پورا پڑھا چکی تھی اور یہ بات اس کی سمجھ میں اچھی طرح آ گئی تھی کہ لوگ اسے کیوں پسند کرتے ہیں اس میں یہ نکتہ اٹھایا گیا تھا کہ اگر ریاستی حکومت میں عوام کی نمائندگی نہیں ہے اور اس کی شنوائی نہیں ہوتی ہے تو پھر حکومت کے عائد کیے ہوئے ٹیکس کیوں ادا کریں؟ وہ مسلمان ہیں اور اپنے مذہب کے ناطے اپنے ملک میں اپنی حکومت چاہتے ہیں بھارت کو کیا حق ہے کہ ان پر مسلط رہے اور ان کو اپنا قانون ماننے پر مجبور کرے اب وقت آ گیا ہے کہ بھارت کو اس کا گریہ چہرہ دکھایا جائے اور اپنے لیے آزادی کی جدوجہد کی جائے۔

اس کتاب میں کشمیری عوام کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ سب ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر مختلف سمتوں سے اپنی جدوجہد کا آغاز کریں اور بھارتی حکمرانوں کے قدم کشمیر سے اکھاڑ کر پھینک دیں۔

فرناز نے کتابچہ پڑھتے پڑھتے صفحات سے نظریں ہٹائیں اور کھڑکی کی جانب دیکھنے لگا اس کتابچے کے مطالعے سے وہ خود کو احمد کمال سے اور

زیادہ قریب محسوس کرنے لگی تھی یہ کتابچہ اس کے جذبات کی بھی ترجمانی کرتا تھا وہ بھی یہی چاہتی تھی کہ اس کی حسین دادی بھارتی درندوں کے قبضے سے آزاد ہو جائے یہ کتابچہ احمد کمال انت ناگ سے لایا تھا جو تحریک آزادی کشمیر کے لیے مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جو احمد کمال کی طرف سے فرناز کو ایسا بیش قیمت تحفہ ملا تھا یہ اس کے لیے تحفہ محبت بھی تھا اور تحفہ نجات بھی۔

فریال کے مقابلے میں اس نے فرناز کو زیادہ بہتر تحفہ دیا تھا اس نے فریال کو دو تحفے دیے تھے ایک تحفہ تو وہ تین گڑیاں تھیں جو جدید فیشن کا لباس پہنے ہوئے تھیں اور جنہیں دیکھ کر لباس تیار کیے جاسکتے تھے دوسرا تحفہ ایک بنڈل تھا جس میں رنگین دھاگے اور ہاتھ سے کڑھائی کرنے کی سوئیاں تھیں فرناز کا اندازہ تھا کہ فریال کے تحائف گو کہ قیمت کے لحاظ سے برتر ہوں گے لیکن احمد کمال نے یہ تحفے دے کر ثابت کر دیا تھا کہ وہ فریال کو محض ایک معمولی اور فیشن پسند لڑکی سمجھتا تھا جبکہ فرناز اس کی نظر میں ایک ذہین اور سنجیدہ لڑکی تھی اس خیال ہی نے فرناز کو مسحور کر دیا تھا احمد کمال نے فریال کے تحفے بھی فرناز ہی کو دیے تھے اور انہیں فریال تک پہنچانے کی تاکید کی تھی کیونکہ ان دنوں کی منگنی نو جانے کے بعد ان کے ملنے پر پابندی تھی۔

”فرناز تم نے اپنی کتابیں پورے کمرے میں کیوں بکھیری ہوئی ہیں؟“ اچانک اس کے والد اس کے کمرے میں داخل ہوئے اور وہ ہڑبڑا کر کھڑکی ہو گئی وہ کمرے میں فرش پر بکھری ہوئی کتابوں کو دیکھ رہے تھے والد کے اس طرح اچانک اپنے کمرے میں آ جانے پر وہ بوکھلا گئی تھی اس نے جلدی سے کتابچہ بستر پر ڈال دیا تھا۔ جسے سلمان داؤد نے فوراً ہی اٹھالیا تھا اور جیب سے چشمہ نکال کر آنکھوں پر



لگاتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔  
 ”یہ کیا ہے؟“ اس کی نظریں کتابچے کے عنوان پر  
 تھیں اور ان کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے۔  
 ”تمہیں یہ کس نے دیا؟“ انہوں نے سختی سے

پوچھا۔

”یہ..... مجھے ملا ہے.....!“ فرناز نے گھبرائے  
 ہوئے انداز میں کہا۔

”کہاں سے، کہاں سے ملا ہے؟“ انہوں نے  
 غصے سے پوچھا۔

”یہ..... یہ گھر کے سامنے دروازے کے قریب پڑا  
 تھا۔“ اس نے جھوٹ بولا اس کی زبان لڑکھڑاہی تھی۔  
 ”ہوں، کسی مکار نے اسے خاص مقصد سے  
 یہاں پھینکا ہوگا۔“ سلمان داؤد نے کہا۔

”بھلا کوئی ایسا کیوں کرے گا۔“ فرناز نے بلا  
 سوچے سمجھے سوال داغ دیا۔

”تمہیں نہیں معلوم کوئی دشمن ہوگا جو یہ چاہتا ہوگا  
 کہ میرے گھر کا کوئی فرد اسے اٹھالے لیکن میں تمہیں  
 حکم دیتا ہوں فرناز کہ اس جھوٹ کے پلندے کو فوراً  
 باہر پھینک دو۔“

”کک..... کیا..... یہ سب جھوٹ ہے ابو؟“  
 فرناز نے پوچھا۔ ”اس میں جو کچھ لکھا ہے اس کے  
 بارے میں مجھے زیادہ معلوم نہیں لیکن میرا یہ خیال ہے  
 کہ یہ سچ ہے۔“ فرناز نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

”نہیں یہ کھلا ہوا جھوٹ ہے فرناز۔ یہ درست  
 ہے کہ ہماری حکومت سے غلطیاں سرزد ہوئی ہیں  
 لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم انہیں جواز بنا کر  
 ملک میں انتشار پھیلانے اور ملک کو تباہی کے دہانے  
 پر لا کھڑا کریں۔“

”یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں ابو؟“  
 ”دیکھو فرناز میں تمہیں تفصیل بتاتا ہوں۔“ احمد

کمال نے کمرے میں رکھی ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے  
 کہا۔ فرناز بھی اپنے بستر پر بیٹھ گئی تھی اسے حیرت تھی  
 کہ اس کے والد غصے میں ہونے کے باوجود بھی اسے  
 سمجھانے والے انداز میں بات کر رہے تھے۔

”فرناز احمد کمال جس کھیل میں شریک ہو گیا ہے  
 اور کبھی سرینگر کبھی انت ناگ اور مختلف جگہوں پر جلسے  
 جلوسوں میں شرکت کر رہا ہے۔ کھیل بہت پرانا ہے  
 اور بہت عرصے سے ہماری سرزمین پر کھیلا جا رہا ہے  
 اس کی ابتدا چند عاقبت نا اندیشوں نے کی تھی وادی  
 میں سکون اور خوش حالی تھی کہ چند لوگوں کے سر میں  
 آزادی کا سودا سما گیا یہ تیرہ جولائی انیس سو اکتیس کی  
 بات ہے جب حکومت نے ایک نوجوان عبدالقدیر پر  
 بغاوت کا مقدمہ چلایا اور چند سر پھرے نوجوان اس  
 کی حمایت میں جلوس نکال بیٹھے اس جلوس میں کچھ گڑ  
 بڑ ہوئی اور حکام کو گولی چلانا پڑی اس موقع پر کچھ  
 مسلمان شہید ہوئے اور کچھ زخمی پھر شہر میں مارشل لا  
 لگا دیا تھا یہاں سے ریاست میں بغاوت کی آگ  
 بھڑک اٹھی اور اب ہر سال تیرہ جولائی کو یوم شہداء کشمیر  
 منایا جاتا ہے۔“

سلمان داؤد بیٹی کو تحریک آزادی کی کہانی اپنے  
 انداز میں توڑ مروڑ کر سنارے تھے اسے بتا رہے تھے  
 کہ کشمیر کی حکومت چند جذباتی مسلمانوں کے ہاتھوں  
 تباہی کے دور ہے پر کس طرح پہنچ گئی۔

فرناز خاموشی سے سن رہی تھی اتنا تو اسے بھی پتا تھا  
 کہ 1947ء میں جب پاکستان وجود میں آیا جو کہ  
 صرف اور صرف مسلمانوں کی جدوجہد کے سلسلے میں  
 مسلمانوں کے لیے معرض وجود میں آیا تھا اور جس کی  
 جدوجہد میں ہندوستان کے ہر علاقہ کے مسلمانوں  
 نے حصہ لیا تھا اور اپنی جانوں کی قربانیاں دی تھیں تب  
 کشمیر میں ہندو راجہ کی حکومت تھی ہزارے میں کشمیر



پاکستان کے حصے میں آیا تھا لیکن اس ہندو راجہ نے اس تقسیم کو ماننے سے انکار کر دیا تھا بھارتی حکومت نے اس کا ساتھ دیا تھا اور تب سے ہی کشمیری اپنے حق آزادی کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں فرناز اپنے خیالوں میں گم تھی کہ اس کے والد نے اپنی ادھوری بات دوبارہ شروع کی۔

”تمہیں تو یاد ہوگا۔ ابھی چند ماہ پہلے ہی کی بات ہے کہ آزادی کے متوالوں نے مسلمان سرکاری افسران کو بھی نہ بخشا انہیں تشدد کا نشانہ بنایا۔ بھلا یہ کیسی آزادی کی تحریک ہے جو اپنے ہی مسلمان بھائیوں کو اپنے ہاتھوں مار دینے میں عار نہیں سمجھتی، اس تحریک ہی کی وجہ سے آج کشمیر میں کسی کی جان محفوظ نہیں ہے اور لا قانونیت کا راج ہے۔“

سلمان داؤد آہستہ آہستہ کہہ رہے تھے اور فرناز بغور ان کی باتیں سن رہی تھی۔ اس سے برخلاف کہ وہ کیا بات کر رہے تھے۔ وہ خود کو ان سے بہت قریب محسوس کر رہی تھی کیونکہ اس کے ہوش سنبھالنے کے بعد سے یہ پہلا موقع تھا کہ اس کے والد نے اس سے اتنی توجہ سے بات کی تھی۔

”لیکن ابو آپ کو ایک مسلمان ہونے کے ناتے اس بات سے بھی انکار نہیں ہوگا کہ کشمیر کی حکومت میں مسلمانوں کی نمائندگی ہونی چاہیے۔“

”وہ تو ہے۔“ سلمان داؤد نے کہا۔

”کہاں ہے؟ یہاں اکثریت مسلمانوں کی ہے لیکن سربراہ مسلمان نہیں ہے یہاں بھارتی ایجنٹ مسلط ہیں۔“ فرناز نے پہلی بار زبان کھولی۔ ”آپ جانتے ہیں کہ بھارتی فوجی کتنے سفاک اور ظالم ہیں عورتوں کی عزتیں ان سے محفوظ نہیں ہیں اور وہ کشمیریوں کو بے دریغ گولی مار دیتے ہیں۔“

”لیکن ایسا وہ مجبوراً کرتے ہیں تم خود ہی دیکھو

جہاں کہیں فائرنگ کے واقعات ہوتے ہیں وہاں تحریک آزادی کے متوالوں نے ضرور کوئی گڑبڑ کی ہوئی ہے جس کو کنٹرول کرنے کے لیے فائرنگ کرنا پڑتی ہے میری بات کا یقین کرو ہماری ریاست کا سکون برباد کرنے والے یہ آزادی کے متوالے ہی ہیں۔“

”لیکن میں ایسے بہت سے واقعات دیکھ چکی ہوں جہاں کوئی آزادی کا متوالا نہیں ہوتا لیکن بھارتی فوجی وہاں بھی ظلم کرنے آ جاتے ہیں ابھی پچھلے دنوں ہمارے گھر سے قریب ہی جو شادی ہو رہی تھی وہاں بھارتی فوجی گھس گئے اور لوگوں کو مارا ان میں سے کئی کو پکڑ کر لے گئے تو یہ کہ دولہا کو بھی لے گئے اور بعد میں اسے گولی مار دی۔“ فرناز نے کہا اس کی آواز رندھ گئی تھی۔

”تم کچھ نہیں جانتی ہو، تمہیں حقیقت کا علم نہیں مجھ سے بحث مت کرو۔“ سلمان داؤد نے کہا اور کمرے سے نکل گئے فرناز حیرت سے انہیں جاتے دیکھتی رہ گئی تھی لیکن اس نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اس سلسلے میں احمد کمال سے ضرور بات کرے گی۔

فرنازیوں تو پندرہ سال کی تھی لیکن وہ یہ اچھی طرح جانتی تھی کہ لڑائی میں جب دو فریق شامل ہوں تو دونوں سچے نہیں ہوتے ان میں سے کوئی ایک جھوٹا ہوتا ہے پھر وہ نئی دن موقع کی تلاش میں رہتی ایک روز یہ موقع اسے مل ہی گیا اس کے والد ایک دن کے لیے سرکاری کام سے دوسرے شہر گئے ہوئے تھے اور والدہ بھی اچھے موڈ میں تھیں چنانچہ وہ ان کے پاس آ بیٹھی۔

”امی ایک بات تو بتائیں۔“ اس نے پیار سے ان کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا۔

”کیا بات ہے؟“ اس کی والدہ نے پوچھا

”ابو نے خود ہی احمد کمال کو فریال کے لیے پسند



کیا تھا اور پھر کسی سے مشورہ کیے بغیر ہی اچانک فریال کی منگنی توڑ دی۔ آپ سے بھی نہیں پوچھا۔“ فرناز نے کہا۔

”تم جانتی ہو فرناز تمہارے والد تمام فیصلے خود ہی کرتے ہیں کبھی کسی سے مشورہ نہیں کرتے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن آپ نے ان سے پوچھا بھی نہیں کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟“

”میں نے پوچھا تھا انہیں احمد کمال کی سرگرمیوں پر اعتراض ہے۔“

”سرگرمیاں، کیا مطلب؟“ فرناز نے پوچھا انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ اس بارے میں کچھ بھی نہ جانتی ہو۔

”ہاں دراصل وہ تحریک آزادی کشمیر کا کارکن ہے اور تمہارے والد کو یہ بات پسند نہیں۔“ اس کی والدہ نے افسردگی سے کہا۔

”انہوں نے فریال سے بھی کچھ نہیں پوچھا اور وہ بھی خاموش کھڑی رہی اور کچھ کہے بغیر انگلی اتار کر احمد کمال کو دے دی۔“ فرناز نے حیرت سے کہا۔

”اس نے ٹھیک کیا، ہر فرمانبردار اولاد ایسا ہی کرتی ہے۔“ اس کی والدہ نے کہا۔

”امی آپ نے اتنی زندگی ابو کے ساتھ کیے گزار لی؟“ فرناز نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ایسے ہی گزار لی تا بعداری کے ساتھ ان کے سارے حکم مانتے ہوئے۔“ اس کی والدہ نے جواب دیا۔

”صحیح اور غلط..... سارے حکم۔“ فرناز نے اعتراض والے انداز میں کہا۔

”فرناز وہ تمہارے والد ہیں تمہیں ان کے بارے میں اچھا ہی سوچنا چاہیے وہ جو بھی فیصلہ کریں گے ہم لوگوں کے لیے بہتر ہی ہوگا۔“

”شاید آپ ٹھیک ہی کہتی ہیں۔“ اس نے بات

بڑھانا مناسب نہ سمجھی کیونکہ ابھی اسے ان سے احمد کمال کے گھر جانے کی اجازت لینا تھی۔

”اچھا ایک بات بتائیں کیا میں آج کچھ دیر کے لیے احمد کمال کے گھر چلی جاؤں؟“ اس نے پوچھا تو اس کی والدہ کے چہرے پر پریشانی نظر آنے لگی۔

”کیوں، کس لیے۔“ انہوں نے پوچھا۔

”یونہی آنٹی سے ملنے کے لیے۔“ اس کا اشارہ احمد کمال کی والدہ کی طرف تھا۔

”لیکن اگر تمہارے والد کو پتا چل گیا؟“

”نہیں پتا چلے گا میں جلدی آ جاؤں گی پھر پتا نہیں کبھی ملنا نصیب ہو یا نہ ہو فریال کا رشتہ تو ٹوٹ گیا ہے۔ میں آنٹی کو دلا رہی دے آؤں، وہ ہمیں کتنا پسند کرتی ہیں انہیں افسوس تو ہوا ہوگا۔“ فرناز نے کہا۔

”اچھا جاؤ لیکن جلدی آ جانا۔“ اس کی والدہ نے تاکید کی۔

”ٹھیک ہے۔“ فرناز نے سعادت مندی سے کہا اور پھر وہ تیار ہو کر احمد کمال کے گھر کی طرف روانہ ہو گئی تھی۔

جب وہ احمد کمال کے گھر پہنچی تو اس کی والدہ فرناز کو برآمدے میں الٹ گئیں۔

”آؤ فرناز بہت دنوں بعد آئیں۔“ انہوں نے فرناز کو برآمدے میں پڑے ہوئے پٹنگ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا ان کا انداز بہت مشفقانہ تھا۔

”آنٹی، میں بہت شرمندہ ہوں۔“ فرناز نے بات شروع کی لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح بات مکمل کرے۔

”کیوں..... کیوں شرمندہ ہو؟“ انہوں نے پوچھا۔

”وہ..... دراصل..... ابو نے فریال کی منگنی توڑ دی۔ احمد کمال کو تو بہت دکھ ہوا ہوگا وہ اسے بہت پسند



کرتا ہے۔“ فرناز نے کہا۔

”ہاں..... یہ منگنی بھی ان دونوں کی پسند کو دیکھتے ہوئے ہی کی گئی تھی۔“ احمد کمال کی والدہ نے کہا۔

”وہ کیسا ہے؟“ فرناز نے پوچھا۔

”ٹھیک ہے۔“ احمد کمال کی والدہ نے رکی سا جواب دیا پھر فرناز کی طرف بغور دیکھنے لگی۔

”مجھے زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ یہ منگنی توڑتے ہوئے انہوں نے مجھ سے بھی بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔“

”انہوں نے انی سے بھی بات نہیں کی اور نہ ہی فریال سے کچھ پوچھا۔“ فرناز نے دکھ سے کہا۔

”انہوں نے اچھا نہیں کیا، ہمیں اپنی اولادوں کے جذبات کا خیال رکھنا چاہیے والدین ہی تو ہوتے ہیں جو اولادوں کے دکھ سکھ کے ساتھ ہوتے ہیں۔“ انہوں نے افسوس سے کہا۔

”جی..... وہ..... میں..... میں خود حیران ہوں۔“ فرناز نے رک رک کر کہا اس وقت احمد کمال بھی وہاں آ گیا۔

”آؤ احمد، دیکھو فرناز آئی ہے، تم بیٹھو میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔“ احمد کمال کی والدہ نے اچھتے ہوئے کہا اور احمد کمال فرناز کے سامنے رکھی کرسی پر آ بیٹھا۔

”ہم غریبوں کو کیسے یاد کر لیا۔“ احمد کمال نے فرناز کو چھیڑا۔

”احمد میں تمہارا دیا ہوا لٹریچر پڑھ رہی تھی تو ابو اچانک میرے کمرے میں آ گئے اور یہ دیکھ کر بہت چراغ پا ہوئے کہ میں وہ لٹریچر پڑھ رہی ہوں اور انہوں نے غصے سے کہا کہ میں وہ کتابچہ باہر پھینک دوں کیونکہ وہ جھوٹ پر مبنی ہے ان کے خیال میں تحریک آزادی میں حصہ لینے والے غلطی پر ہیں اور انہوں نے کشمیر کا سکون برباد کر دیا ہے۔“ فرناز نے

احمد کمال کی بات نظر انداز کریتے ہوئے اپنا سوال پیش کر دیا۔

”میں جانتا ہوں فرناز تمہارے والد نے اور کیا کیا کہا ہوگا، دراصل قصور ان کا بھی نہیں ہے وہ ریاست میں ایک سرکاری اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں ان کی وفاداریاں حکومت کے ساتھ ہیں میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہارے والد فطری طور پر ایک اچھے انسان ہیں لیکن مجھے افسوس ہے کہ وہ ہمارے مخالفین کے ہم خیال ہیں۔ وہ غلطی پر ہیں۔“ احمد کمال نے کہا تو فرناز تذبذب میں پڑ گئی۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کون صحیح کہہ رہا ہے اور کون غلط۔“

”کیا مطلب؟“ احمد کمال نے پوچھا۔

”میرے والد کا کہنا ہے کہ تم اور تمہارے ساتھی کشمیر میں قتل و غارت گری کا کھیل کھیل کر خوش ہونے والوں میں سے ہو اور انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ تیرہ جولائی انیس سو اسیس کو جلوس میں ہلاک ہونے والے شخص جذباتی نوجوان تھے۔“

”مجھے یہ مست بتاؤ فرناز کہ تمہارے والد نے کیا کہا یہ بتاؤ کہ تم اپنی کھلی آنکھوں سے کیا دیکھتی ہو؟“ احمد کمال نے پوچھا۔

”میں تو یہی دیکھتی ہوں کہ مسلمان بالکل بھی محفوظ نہیں ہیں ہر طرف قتل و غارت گری ہے۔“ فرناز نے دکھ سے کہا۔

”اور تمہارے ارد گرد آج جو ماحول ہے اس کا ذمہ دار کون ہے ہماری مسلمان خواتین کی کس کس طرح بے عزتی کی جاتی ہے ہمارے مسلمان مردوں سے بیگاری جاتی ہے ہمیں مذہبی آزادی نہیں ہے ہم پر غیر مسلم حکمران مسلط ہیں۔ آخر کیوں، تمہارے والد نے 13 جولائی کو عبدالقدیر کے لیے ہونے والے



پر سکون مظاہرے کو منچلے نوجوانوں کا دادیلا قرار دیا ہے جبکہ عبدالقدیر ایک جانباز تھا جس پر حکمرانوں نے غداری کا مقدمہ چلایا تھا اور مسلمان اس پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلانے کے لیے کہہ رہے تھے وہ نہیں چاہتے تھے کہ عبدالقدیر کو بند کمروں میں حکمرانوں کی مرضی سے ہونے والے یکطرفہ فیصلوں پر سزا دی جائے اور پر سکون مظاہرین پر ظالموں نے گولیوں کی بوچھاڑ کر دی تھی۔ ”احمد کمال کا خوشگوار موڈ یک لخت بدل گیا تھا۔

”ایک بات بتاؤ احمد کمال جب ہندوستان تقسیم ہوا اور پاکستان معرض وجود میں آیا تو کشمیر پاکستان کے حصے میں کیوں نہیں کیا گیا جبکہ یہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی اور تقسیم بھی اسی بنیاد پر کی گئی تھی کہ مسلمانوں کے اکثریتی علاقے پاکستان میں شامل ہوں گے۔“ فرناز نے پوچھا۔

”یہ ایک طویل کہانی ہے جو اب تک ختم نہیں ہوئی۔“ احمد کمال نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

”جس وقت ہندوستان و پاکستان وجود میں آئے اس وقت کشمیر میں ایک ہندو راجہ ہری سنگھ کی حکومت تھی جسے برطانیہ نے ہی یہاں اقتدار میں بٹھایا تھا جب پاکستان بنا تو اس ہندو راجہ نے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا کہ اس کا علاقہ پاکستان میں شامل کیا جائے اس نے یا قاعدہ مخالفت کی اور ہندوستان کی نئی حکومت جو ہندو تھی اس نے بھی اپنی فوج کی مدد سے اس کا ساتھ دیا۔“

”تو کیا ہندوستان کی فوج اور راجہ ہری سنگھ کی فوج کشمیریوں سے لڑتی رہی اور وہ اکیلے اس کا مقابلہ کرتے رہے؟“ فرناز نے پوچھا۔

”نہیں، اس وقت پاکستان کے سربراہ قائد اعظم

محمد علی جناح تھے انہوں نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ وہ اس موقع پر کشمیریوں کا ساتھ دے اس کے علاوہ گلگت اسکاؤٹ اور چترال اسکاؤٹ نے بھی کشمیریوں کا ساتھ دیا۔ انہوں نے کشمیر کے دو تہائی حصہ پر قبضہ بھی کر لیا لیکن پھر برطانیہ بیچ میں کوڑ پڑا اور اس نے اقوام متحدہ کی مدد سے جنگ بندی کرا دی اور ایک کرار داد منظور کرا دی کہ بہت جلد انتخاب کرائے جائیں گے اور کشمیر کا فیصلہ کشمیر کے عوام کی مرضی سے کیا جائے گا۔ لیکن اس پر آج تک عمل نہیں کرایا جاسکا اور ہندوستان کا جو رویہ ہے وہ تمہارے اور ساری دنیا کے سامنے ہے ہم اتنے طویل عرصے سے آزادی کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں لیکن ہماری پکار سننے والا کوئی نہیں۔“ احمد کمال نے کہا۔

”یہ تو سراسر زیادتی ہے۔“ فرناز نے کہا۔

”ہاں اور آپ کے والد فرماتے ہیں کہ ہم لوگ غلطی پر ہیں۔“ احمد کمال نے کہا۔

اس شام احمد کمال نے فرناز کو تحریک آزادی کے بارے میں تفصیل سے بتایا تھا۔

”احمد، میری خواہش ہے کہ کاش میں تمہارا ساتھ دے سکتی لیکن اپنے والد کی وجہ سے میں مجبور ہوں لیکن مجھے یہ کہنے میں کوئی شرمندگی نہیں کہ میں تمہیں پسند کرتی ہوں بلکہ تم سے دیوانگی کی حد تک محبت کرتی ہوں۔“ فرناز نے اپنے دل کی بات کہہ ہی دی۔

”فرناز میں تمہیں پسند کرتا ہوں لیکن محبت تو فریال سے ہے ممکن ہے میں کبھی اس کے خیال سے آزاد ہو جاؤں۔“ احمد کمال نے کہا۔

”آخر ایسی لڑکی سے محبت کرنے کا کیا فائدہ جو کسی کے کہنے پر تم سے منگنی توڑ بیٹھی ہو۔“

”پیار بڑی عجیب چیز ہے تمہیں نہیں معلوم تم اسے موسم ہتی کی طرح بجھا کر دوبارہ روشن نہیں کر سکتیں یہ تو



”ارے بھائی جینھو میں تو ابھی آیا ہوں۔“ اسحاق احمد نے کہا۔

”نہیں انکل اب میں چلوں گی پھر آؤں گی۔“ فرناز نے معذرت طلب لہجے میں کہا۔

”تو چلو میں تمہیں چھوڑ آؤں۔“ اسحاق احمد نے کہا تو فرناز نے انکار نہیں کیا اور اس کے ساتھ ہی گھر سے باہر آ گئی اور ان کی گاڑی میں بیٹھ گئی۔

”فرناز تم بہت پیاری بچی ہو۔“ اسحاق احمد نے کہا۔

”پیری اور میں، نہیں میں پیاری نہیں ہوں یہ بات کمال بھی خوب جانتا ہے۔“ فرناز نے تلخ لہجے میں کہا تو وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

”وہ تو احمق ہے۔“ انہوں نے گاڑی ایک موڑ سے موڑتے ہوئے کہا۔

”تمہیں پتا ہے میں دھاتوں کا بیوپاری بھی ہوں اور دھاتوں کا ہنرمند بھی اور جس کا تعلق دھاتوں سے ہو وہی جانتا ہے کہ سونے کے ٹھوس سکے کی قیمت کیا ہوتی ہے تمہاری بہن خوب صورت ہے لیکن تم اس سے کہیں زیادہ بہتر ہو، دھاتیں ٹھوس ہوتی ہیں اور اپنی اصلیت برقرار رکھتی ہیں تم میرے لیے خالص سونا ہو۔“

”شکریہ جناب۔“ فرناز نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”آؤ، میں تمہیں اپنا شوروم دکھاؤں یہاں تمہارے لیے ایک تحفہ بھی ہے۔“ انہوں نے گاڑی سڑک کے کنارے ایک بڑے سے دھاتی برتنوں کے شوروم کے سامنے کھڑی کر دی۔

”لیکن مجھے دیر ہو جائے گی۔“ فرناز نے کہا۔

”ارے نہیں ہوگی، اسحاق احمد نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا پھر وہ گھوم کر فرناز کی طرف والے

بس جلتا رہنے والا جذبہ ہے چاہے تم چاہو یا نہ چاہو اس کے علاوہ تمہیں ایک بات اور بتاؤں میں تم پر اعتماد کرتا ہوں اس لیے بتا رہا ہوں کہ اس روز انگوٹھی اتارنے کے بعد سے فریال مجھ سے کئی بار مل چکی ہے ہمیں یقین ہے کہ تمہارے والد کا غصہ جلد اتر جائے گا۔“

”نہیں..... احمد کمال نہیں..... تم انہیں نہیں جانتے وہ بہت سخت طبیعت کے مالک ہیں انہیں اپنے اصول بہت پیارے ہیں مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ تم فریال کو بھی نہیں جانتے بہر حال کوئی بات نہیں میں دعا کروں گی کہ تم دونوں خوش رہو۔“ فرناز نے سر جھکا کر کہا اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک کر اس کے رخساروں پر بہہ نکلے تھے جنہیں احمد کمال نے بھی دیکھ لیا تھا لیکن اس نے فرناز سے کچھ نہیں کہا تھا۔

اس وقت احمد کمال کی والدہ چائے لیے ہوئے کمرے میں داخل ہوئیں اور فرناز نے جلدی سے آنسو صاف کر لیے وہ خود کو ر سکون ظاہر کر رہی تھی۔

”لو بھئی مجھے کچھ دیر لگ گئی۔“ احمد کمال کی والدہ نے میز پر چائے رکھتے ہوئے کہا۔

”آپ نے خواجواہ زحمت کی آنٹی اس کی کیا ضرورت تھی؟“ فرناز نے کہا۔

”کیوں بھئی آنٹی کے گھر سے بغیر چائے پیئے چلی جاؤ کیا یہ اچھا لگے گا؟“ انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔ پھر وہ لوگ چائے پی ہی رہے تھے کہ احمد کمال کے والد اسحاق احمد بھی آ گئے اور فرناز کو دیکھ کر انہوں نے خوشی کا اظہار کیا۔

”اچھا تو آج ہمارے گھر فرناز بیٹی آئی ہے۔“

”جی ہاں اور اب واپس بھی جا رہی ہے۔“ احمد کمال کی والدہ نے مسکراتے ہوئے کہا کیونکہ کچھ ہی دیر پہلے فرناز نے واپسی کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔



دروازے پر آئے تھے اور اس کے اترنے کے لیے دروازہ کھول دیا تھا۔

”ہم اس شوروم کے پچھلے حصے میں دھاتوں کے اعلیٰ نمونے بناتے ہیں۔“

”انکل آپ کو پتا ہے ابو بہت غصہ کریں گے۔“  
”میں جانتا ہوں تمہارا باپ اپنے دقیا نوی خیالات پر بڑی سختی سے قائم ہے لیکن بس ذرا سی دیر لگے گی میں دراصل تمہارا تحفہ تمہیں دینا چاہتا ہوں۔“  
”جی۔“ فرناز نے آہستہ سے کہا اور گاڑی سے اتر گئی۔

اسحاق احمد کے ساتھ وہ جو نہی ان کے شوروم میں داخل ہوئی تھی وہاں موجود ایک شخص اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا شوروم میں مختلف دھاتوں کے برتن اور نمونے بڑے قریب سے سجے ہوئے تھے ان میں بعض پیتل، تانبے، اسٹیل کے تھے اور بعض خالص سونے اور چاندی کے بھی تھے بعض میں دھاتوں کے ساتھ ساتھ مختلف قیمتی پتھر بھی استعمال کیے گئے تھے چنانچہ اسحاق احمد نے یہاں کل وقتی ایک چوکیدار رکھا ہوا تھا۔ ہندو وارہ میں یہ سب سے بڑا شوروم تھا۔

”یہ تو بہت قیمتی ہیں۔“ فرناز نے کہا۔  
”ہاں ان میں سے بعض کی قیمتیں تو کئی لاکھ تک جاتی ہیں۔“ اسحاق احمد نے نخر سے کہا۔

پھر انہوں نے فرناز کو شوروم میں ایک سمت بچھے ہوئے صوفے پر بٹھا دیا تھا اور کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے شخص کو اشارہ سے قریب بلایا تھا۔

”جی سر۔“ اس شخص نے قریب آ کر بڑے ہی مودبانہ انداز میں سلام بھی کیا تھا۔

”وہ کل جو پلیٹ والا آٹم تیار کیا ہے وہ لاؤ اور چائے بھی لے آنا۔“ اسحاق احمد نے کہا۔

”انکل ابھی تو چائے پی ہے، چائے کی کیا

ضرورت ہے۔“ فرناز نے کہا۔  
”بھئی میرے شوروم پر تم پہلی بار آئی ہو چائے تو ضرور پینا پڑے گی۔“ اسحاق احمد نے کہا۔

کچھ ہی دیر میں اسحاق احمد کا ملازم ایک خوب صورت ڈبہ لے کر آیا تھا اور اسحاق احمد کے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔

”یہ لیجیے سر چائے بھی آرہی ہے۔“ اس نے کہا اور پھر اپنی جگہ جا کر بیٹھ گیا۔ اسحاق احمد نے وہ ڈبہ فرناز کی طرف بڑھا دیا تھا اور جب فرناز نے اسے کھول کر دیکھا تھا تو وہ حیران رہ گئی تھی اس ڈبے میں چاندی کی ایک خوب صورت پلیٹ بڑے قریب سے سج کر رکھی گئی تھی جس پر فرناز کی شبیہ بنی ہوئی تھی۔

”اوہ، یہ تو بہت خوب صورت اور قیمتی ہے۔“ فرناز نے خوش ہوتے ہوئے کہا لیکن اس نظر سے پلیٹ کے ساتھ ساتھ شوروم میں بیٹھے چوکیدار کی طرف بار بار اٹھ رہی تھیں کیونکہ وہ اسے عجیب نظروں سے گھور رہا تھا پھر فرناز نے اسے پہچان لیا تھا وہ ظفر حسین تھا اور کافی عرصہ پہلے اس کے والد کا ملازم رہ چکا تھا اور اس کے والد نے معمولی رقم چوری ہونے کے شبے میں اسے جیل میں ڈلوادیا تھا فرناز کو یاد تھا کہ اس نے اسے والد کی بہت منتیں کی تھیں کہ وہ ظفر کو معاف کر دیں لیکن انہوں نے اسے معاف نہیں کیا تھا کسی کو معاف کرنا ان کے مزاج کے خلاف تھا فرناز کی نگاہوں کے تعاقب میں اسحاق احمد کی نظر بھی ظفر حسین کے چہرے پر گئی تھی اور اس سے ٹپکتی نفرت کو انہوں نے پڑھ لیا۔

”ظفر تمہارے جیل جانے کا معاملہ اب پرانا ہو چکا ہے تم سن رہے ہو، اب اس بات کو تم بھول جاؤ۔“ اسحاق احمد نے کہا۔

”اسحاق صاحب یہ ٹھیک ہے کہ آپ ایک ایسے



”کیوں بھی تم کیوں خوشی کا اظہار کر رہے ہو؟“ اسحاق احمد نے پوچھا۔  
 ”صحیح ہے یہی ہونا چاہیے۔“ ظفر حسین نے پھر جوشیلے انداز میں کہا۔

”نہیں ظفر، ہمارے نظریات جدوجہد آزادی سے ضرور تعلق رکھتے ہیں لیکن ہمارا طریقہ کار مختلف ہے۔“ اسحاق احمد نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔  
 ”پھر اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے حکومت کی توجہ حاصل کرنے کے لیے صرف مظاہرے کرتے ہیں تاکہ وہ سمجھ سکیں کہ ہم کیا چاہتے ہیں ہمارا مقصد کسی کو تکلیف پہنچانا ہرگز نہیں۔“ اسحاق احمد نے کہا اور پھر احمد کمال کی طرف مڑے۔  
 ”تم جاؤ فوراً فرماؤ اس کے گھر تک پہنچا دو۔“  
 ”جی بہتر۔“ احمد کمال نے سعادت مندی سے کہا۔

”میں آپ سے گھر پر آ کر ملتا ہوں میرا خیال ہے تنظیم کے دوسرے لوگوں سے فوراً رابطہ قائم کرنا چاہیے۔“  
 ”ہاں ٹھیک ہے۔“ اسحاق احمد نے کہا۔

فرناز احمد کمال کے ساتھ شوروم سے نکل گئی تھی اور عجلت میں وہ چاندی کی پلیٹ بھی سات لے جانا بھول گئی جو اسحاق احمد نے اسے تحفے میں دی تھی اسے فکر تھی کہ جلدی گھر پہنچ جائے تاکہ اپنے والد کے گھر آنے سے پہلے وہ وہاں موجود ہو۔

”فرناز اپنے والد سے کہنا کہ ان دنوں سرکاری گاڑی میں سفر کرنے سے پرہیز کریں کیونکہ مظاہرین سرکاری گاڑیوں کو نشانہ بنا رہے ہیں اس کے علاوہ کوئی امیر شخص محفوظ نہیں ہے۔ اپنے والد سے یہ بھی کہہ دینا کہ وہ کسی بھی حالت میں گھر نہیں یا فریال کو ساتھ لے کر گھر سے نہ نکلیں۔“ احمد کمال نے

انسان ہیں لیکن جب میں سلمان داؤد کی کسی بیٹی کو اعلیٰ ریشمی لباس پہنے خوش و خرم دیکھتا ہوں تو مجھے اپنی بیٹی فرزانہ یاد آ جاتی ہے جو فاقوں سے مر گئی تھی کیونکہ اس کا باپ جیل میں تھا اور اس کی ماں اسے روٹی فراہم نہیں کر سکتی تھی۔“ ظفر نے حقارت سے کہا۔

”ظفر۔“ اسحاق احمد نے سخت لہجے میں کہا۔  
 ”نہیں انکل اسے بولنے دیں۔“ فرناز نے کہا اور ظفر کے نزدیک چلی گئی وہ غصے سے کانپ رہا تھا۔

”میرے والد نے تمہارے ساتھ جو زیادتی کی میں اس کے لیے تم سے معافی چاہتی ہوں میں نے اس وقت بھی ان سے التجائیں کی تھیں کہ وہ تمہیں معاف کر دیں لیکن انہوں نے میری بات نہیں سنی تھی اس کے علاوہ غلطی پر تم بھی ہو کیونکہ تمہاری مجرم میں نہیں ہوں۔“ فرناز نے کہا اچانک وہ شوروم کا دروازہ کھلنے کی آواز پر مڑی تو اس کی نظر احمد کمال پر پڑی۔

”خدا کا شکر ہے کہ آپ لوگ یہاں پر مل گئے ہیں تو پریشان ہو گیا تھا۔“ اس نے اندماتے ہوئے کہا۔

”کیوں کیا بات ہے؟“ اسحاق احمد نے پوچھا۔  
 ”سارے شہر میں حالات خراب ہو گئے ہیں آپ کو یاد ہو گا آپ نے کہا تھا کہ کچھ عناصر ایسے ہیں جو

ہمارے ہم نوا بن کر سارے شہر میں تشدد کی وارداتیں کرتے ہیں ان کا نشانہ امیر لوگ اور اعلیٰ سرکاری افسران بنتے ہیں ایسے ہی ایک گروپ نے اعلیٰ سرکاری افسران کے رہائشی علاقوں میں کارروائیاں شروع کر دی ہیں آج صبح انہوں نے امیر گھرانوں کی چند عورتوں کو بھی تشدد کا نشانہ بنایا ہے۔“ احمد کمال نے جلدی جلدی اپنی بات مکمل کی۔

”ابو آپ جلدی کریں اور شوروم بند کر دیں۔“ احمد کمال نے کہا۔

”بہت خوب۔“ ظفر حسین نے خوشی کا اظہار کیا۔



میں گھر سے نکل گئے دونوں بہنیں گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھیں اور سلمان داؤد ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھے تھے گاڑی گھر سے نکل کر اگلی سڑک تک آئی تھی کہ ایک سمت سے پتھر آیا اور گاڑی کا اگلا شیشہ ایک چھناکے سے ٹوٹ گیا سامنے بہت سے لوگوں کا ہجوم تھا جن کے تیور اچھے نہیں تھے اور وہ حکومت کے خلاف نعرے لگا رہے تھے پھر تیزی سے دو پتھر اور آئے جن میں سے ایک گاڑی کا دوسرا شیشہ توڑتا ہوا سلمان داؤد کی پیشانی پر لگا اور خون بہنے لگا۔ فرناز نے باہر نظر دوڑائی تو دیکھا کہ اس ہجوم کا لیڈر ظفر حسین تھا گھبراہٹ میں ڈرائیور نے گاڑی کے بریک پر پاؤں رکھ دیا گاڑی ایک دیوار سے ٹکرا کر رک تو گئی پتھر اہوا ہجوم گاڑی کی طرف بڑھنے لگا کچھ لوگ بازار کی دکانوں میں توڑ پھوڑ کر رہے تھے فرناز اور فریال خوف سے کانپ رہی تھیں کہ اچانک احمد کمال ہجوم سے نکل کر گاڑی کے سامنے آ گیا اس کے ساتھ اس کے کچھ ساتھی تھے پھر وہ لوگ ہجوم کو اپنے ہاتھوں سے پیچھے کی طرف دھکیلنے لگے۔

”رکو، رک جاؤ۔“ احمد کمال دہاڑ رہا تھا اس کے ساتھی بھی چیخ چیخ کر ہجوم کو روکنے کے لیے کہہ رہے تھے۔

”احمد کمال، ہمارا خیال تھا کہ تم ہمارے ساتھ ہو۔“ ظفر حسین نے غصے سے چیخ کر کہا۔

”ہاں..... لیکن بزرگوں اور عورتوں کو ظلم کا نشانہ بنانے کی میں اجازت نہیں دوں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اپنی طاقت بھارتی غاصبوں کے لیے محفوظ رکھو تاکہ یہ ثابت کر سکو کہ تم بہادر جوان ہو اور غیرت اور انسانیت تمہارا طرہ امتیاز ہے۔“ احمد کمال نے کہا۔

مجمع رک گیا تھا اور پھر آہستہ آہستہ چھٹنے لگا تو احمد کمال گاڑی کے قریب آیا۔

اسے تاکید کی۔

”میں کہہ دوں گی۔“ فرناز نے کہا۔

احمد کمال نے اسے اور اور بھی کچھ ہدایات کی تھیں اور پھر گھر کے باہر اسے ڈراپ کر کے واپس چلا گیا تھا جب فرناز گھر پہنچی تو اس کے والد واپس نہیں آئے تھے اس نے اپنی والدہ کو اسحاق احمد اور ان کی بیوی سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا اور چاندی کی اس پلیٹ کے بارے میں بھی بتایا جو اسحاق احمد نے بڑی محنت سے خاص اس کے لیے تیار کی تھی۔

”یہ قیمتی بہت اچھی ہے اسحاق احمد بچپن سے تمہارے والد کے دوست رہے ہیں اب نجانے دونوں میں کیا غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے۔“ فرناز نے والدہ سے اسے بتایا۔

پھر فرناز نے اپنی والدہ کو احمد کمال کی بتائی ہوئی ہدایات کے بارے میں بھی بتایا تھا جس پر انہوں نے کہا تھا کہ مجھے یقین ہے کہ تمہارے والد یہ پابندی نہیں مانیں گے لیکن تم انہیں بتا دینا پھر جب یہ بات فرناز نے اپنے والد کو بتایا تو وہ حسب توقع چراغ پا ہو گئے تھے۔

”بہت خوب تو اب ہم ان تشدد پسندوں سے ڈر کر زندگی گزاریں گے؟“ اس کے والد نے حقارت بھرا قبہ لگاتے ہوئے کہا۔

”لیکن ابو احتیاط کرنے میں کیا حرج ہے؟“ فرناز نے کہا۔

”ہاں تم بھی احمد کمال کی زبان میں بات کرنے لگیں تم سب احمق ہو، ان باتوں سے وہ ہمیں ڈراتے ہیں۔“ اس کے والد نے غصے سے کہا تو فرناز خاموش ہو گئی۔

دوسرے دن اسحاق احمد نے جان بوجھ کر پروگرام بنایا اور فرناز اور فریال کو ساتھ لے کر سرکاری گاڑی



”میں نے منع کیا تھا فرناز میں نے تمہیں سمجھایا تھا۔“ احمد کمال نے کہا اور فرناز اپنے والد کی طرف دیکھنے لگی جنہوں نے اس کا مشورہ ماننے سے انکار کر دیا تھا پھر احمد کمال گاڑی میں بیٹھ گیا اور اس کے ڈرائیور سے گاڑی واپس گھر کی طرف موڑنے کے لیے کہا۔

”حالات ٹھیک نہیں ہیں ابھی کہیں بھی جانے کی ضرورت نہیں۔“ احمد کمال نے سنجیدگی سے کہا وہیں پر سلمان داؤد نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں گاڑی سلمان داؤد کے گھر کے دروازے پر جا رہی تھی۔

”تم نے جو ہم سب کی مدد کی اس کے لیے میں تمہارا مشکور ہوں لیکن جب تک تم اپنے نظریات نہیں بدلو گے تب تک ہمارے درمیان دوستی نہیں ہو سکتی۔“ سلمان داؤد نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا۔

”میرے نظریات اپنی جگہ مستحکم ہیں جناب اور میرا خیال ہے آپ کو اپنے نظریات پر نظر ثانی کرنا چاہیے کیونکہ وہ نہ صرف آپ کے بلکہ فریال کے لیے بھی خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔“ احمد کمال نے کہا اور سلمان داؤد سے رخصتی مصافحہ کر کے روانہ ہو گیا۔

فرناز کے دل کو اچانک دھچکے سا لگا کیونکہ احمد کمال نے صرف فریال کا نام لیا تھا کیونکہ فرناز کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔

اس رات جب وہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر لان کی طرف دیکھ رہی تھی جہاں درختوں اور گھاس پر برف پڑی ہوئی تھی تو اس نے اچانک سرگوشی کی مدہم سی آواز سنی اس نے غور سے دیکھا تو اسے درختوں کے نیچے دو انسانی ہیولے دکھائی دیے وہ کمرے سے نکل کر خود کو چھپاتی ہوئی دبے قدموں سے اس طرف گئی اور ایک درخت کے پیچھے چھپ کر

کھڑی ہو گئی۔

”مت جاؤ احمد۔“ فریال کہہ رہی تھی۔

”میں مجبور ہوں فریال ہمارے لیڈر نے مجھے اتنت ناگ بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ میں وہاں تنظیم کے دوسرے ارکان کے ساتھ رابطہ کر سکوں۔“

”یہ تمہیں تنہا کیوں نہیں چھوڑ دیتے کاش وہ سب..... سب مر جائیں۔“ فریال نے روتے ہوئے کہا۔

”اگر ایسا ہوا تو ان سب میں، میں بھی شامل ہوں گا فریال کیونکہ میں بھی ان میں سے ایک ہوں۔“ احمد کمال نے کہا۔

”کاش میں نے تم سے محبت نہ کی ہوتی تمہیں پتا ہے میں اکثر خواب دیکھتی ہوں کہ تمہیں پولیس والوں نے پکڑ لیا ہے اور وہ تمہیں پھانسی کے تختے کی طرف لے جا رہے ہیں کیا تم اس پاگل پن سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے، دیکھو سب امیر اور بڑے لوگ ہمارے ساتھ ہیں اور تمہاری طرف صرف غریب بھیک منگے، کنگال بکھرے، ملازم پیشہ اور قیدی ہیں آخر تم ان کے ساتھ کھڑے ہونا بھی کیسے گوارا کرتے ہو۔؟“ فریال نے جرح کی۔

”کچھ بھی سہی۔ ہمارے پاس کسی سے چھینی ہوئی ایسی دولت نہیں ہے جس کا حساب دینا ہمارے لیے مشکل ہو۔“

”واقعی تم پاگل ہو میرے والد نے اچھا کیا کہ تم سے میری منگنی توڑ دی۔“ فریال نے کہا۔

”یہ بات ہے تو میرا خیال ہے کہ تمہارے والد کا فیصلہ درست ہے۔“ احمد کمال نے افسردگی سے کہا اور جانے کے لیے مڑا لیکن فریال نے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”چاہے تم پاگل ہو یا غدار، میں تم سے محبت کرتی



ہوں۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔“ اس نے کہا اور احمد کمال نے اس کا چہرہ ہاتھ میں لے کر اوپر اٹھایا فرناز مزید وہاں کھڑی نہ رہ سکی اور تیزی سے اپنے کمرے میں لوٹ آئی وہ بستر پر لیٹی تو ایک بار پھر اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

دوسرے روز سے فریال اپنے والد سے ضد کرنے لگی کہ انہیں اپنے خاندان کے ساتھ انت ناگ منتقل ہو جانا چاہیے کیونکہ حریت پسندوں سے محفوظ رہنے کے لیے وہاں انہیں حکومت کی زیادہ مدد حاصل ہو سکے گی۔ پھر وہاں ان کے کئی رشتہ دار بھی تھے۔ سلمان داؤد کے لیے انت ناگ اپنا تبادلہ کرانا مشکل تھا شہر کے حالات کو دیکھتے ہوئے انہوں نے بیوی اور بیٹیوں کو انت ناگ بھجوا دیا اور خود تھہاروں سے لیس ہو کر تنہا گھر پر رہ گئے۔

انت ناگ میں فریال، فرناز اور ان کی والدہ سلمان داؤد کے رشتے کے بھائی نصیر الدین کے گھر ٹھہری تھیں۔ نصیر الدین خود حکومت کا زبردست حامی تھا اس کا بیٹا نصیر الدین فوج میں کیپٹن تھا بیٹی شاہانہ سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتی تھی۔ فریال اور فرناز جلدی ہی اس سے بے تکلف ہو گئیں اور پہلی تعارفی ملاقات ہی میں فریال نے شاہانہ کو احمد کمال کے بارے میں سب کچھ بتا دیا کیونکہ ان کے انت ناگ پہنچنے سے پہلے ہی سلمان داؤد نیلی فون پر نصیر الدین کو فریال اور احمد کمال کی مکمل نوٹس کے بارے میں بتا چکے تھے انہوں نے سختی سے ہدایت کی تھی کہ اگر احمد کمال انت ناگ میں دیکھا جائے تو اسے کسی حال میں بھی فریال سے ملنے نہ دیا جائے۔

اس تنبیہ کے باوجود احمد کمال فریال اور فرناز کے انت ناگ پہنچنے کے دوسرے ہی دن نصیر الدین کے گھر جا پہنچا دروازے پر اسے فرناز مل گئی اس نے بتایا

کہ اس کے والد نے اس کے لیے اتنے سخت احکامات صادر کیے ہیں۔

”نجانے کیوں تمہارے والد نے مجھ سے مخالفت پال لی ہے۔“ احمد کمال نے کہا۔

”میں انہیں جانتی ہوں اپنی ضد کے لیے اور اپنے اصولوں پر کاربند رہنے والے آدمی ہیں۔“ فرناز نے جواب دیا۔

”مجھے حیرت ہے اتنا اصول پسند شخص جو مسلمان بھی ہے اس غاصب حکومت کا حامی کیسے ہو گیا؟“ احمد کمال نے سوچتے ہوئے کہا۔

”دراصل ان کے سوچنے کا انداز مختلف ہے۔“ فرناز نے آہ بھری۔

”فرناز تم دیکھنا ایک وقت آئے گا جب انہیں اپنا نقطہ نظر بدلنا ہوگا بھارتی غاصب برسوں سے جموں و کشمیر میں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیل رہے ہیں وہ مسلمانوں پر ظلم کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ ظلم و تشدد کے واقعات پہلے اتنے شدید نہیں تھے جتنے اب ہیں اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ اب کشمیری عوام نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ جموں و کشمیر کو غاصب بھارتی حکمرانوں اور فوجیوں سے آزاد کرا کر ہی رہیں گے کشمیر ایک آزاد مملکت ہوگا یا پھر اس کا الحاق پاکستان سے ہوگا اب جگہ جگہ جلسے جلوس ہو رہے ہیں جس کے نتیجے میں وادی میں کشیدگی کی کیفیت ہے بھارتی فوج اپنی پوری قوت کے ساتھ نہتے مسلمانوں کو کچلنے پر تل گئی ہے اور مسلمان محض اپنی چند تنظیموں کی مدد سے ان کا مقابلہ کر رہے ہیں۔“

”احمد کمال مجھے تو ڈر لگتا ہے اب کیا ہوگا؟ اب اس وادی میں جو اپنے حسن اور دلفریب مناظر کے لیے پوری دنیا میں مشہور ہے کیا خون کی ہولی کھیلی



رہے تھے۔ ان کے درمیان کچھ کچھ وقفوں کے بعد فائرنگ کا تبادلہ بھی ہو جاتا تھا اس کے نتیجے میں کسی سمت سے انسانی کراہ بھی سنائی دے جاتی تھی۔ جو کسی مرنے یا زخمی ہونے والے کی نشاندہی کرتی تھی ان میں بھارتی فوجی بھی تھے اور حریت پسند جیالے نوجوان بھی۔

احمد کمال کافی دیر سے ایک گلی کے کونے پر دم سادھے کھڑا تھا اس کے ہاتھ میں رائفل تھی احمد کمال جہاں تھا وہاں سے بھارتی فوجی صرف سو گز کے فاصلے پر تھے اس نے خود کو اور بھی احتیاط سے دیوار کی آڑ میں چھپا لیا پھر جونہی اس نے گردن نکال کر باہر سرک کی طرف جھانکا بھارتی فوجی کی طرف سے فائرنگ پھر شروع ہو گئی تھی احمد کمال مڑ کر گلی میں دوڑنے لگا معالے اپنے سر کے پچھلے حصے میں درد کی شدید لہر محسوس ہوئی اور اس کی آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا جب اسے ہوش آیا تو وہ ایک چھوٹے سے کمرے میں تھا اور فرناز اس کے قریب موجود تھی۔

”تم۔“ احمد کمال نے حیرت سے کہا اور فرناز کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

”خدا کا شکر ہے تم ٹھیک ہو۔“ فرناز نے کہا۔

”لیکن..... میں..... میں تو.....!“

”تم گلیوں میں بھارتی فوجیوں سے آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے بے ہوش ہو گئے تھے۔“ فرناز نے کہا۔

”ہاں شاید میرے سر میں گولی لگی تھی۔“ احمد کمال نے اپنا ہاتھ سر کی جانب لے جاتے ہوئے کہا۔

”گولی لگی نہیں تھی صرف سر کے پچھلے حصے کو چھوتی ہوئی گزر گئی تھی۔“ فرناز نے کہا اسی لمحے کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک شخص کمرے میں داخل ہوا اس کا قد قدرے پست تھا لیکن وہ صحت مند اور سرخ و سفید رنگت کا مالک تھا اس نے بھی احمد کمال

جائے گی۔“ فرناز نے اداسی سے کہا۔

”وہ تو کھیلی جا رہی ہے۔ تم اداس مت ہو اب تو صبح ہو رہی ہے اب آزادی کا سورج طلوع ہو رہا ہے، بس چند گھنٹوں کی رات باقی رہ گئی ہے۔“ احمد کمال نے پر امید لہجے میں کہا۔

”کل آؤ گے؟“ فرناز نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

”ہاں کل اسی وقت آؤں گا فریال کو میرا سلام کہنا۔“ احمد کمال نے معنی خیز انداز میں کہا اور تیزی سے گھر کے باہر نکل کر سڑک کے اندھیرے میں آگے بڑھ گیا۔

وہ کئی بار اس طرح فرناز سے ملا۔ اہمیت ناگ آنے کے بعد سے اس نے فریال سے ملاقات نہیں کی تھی اور فریال کیپشن بصیر الدین سے زیادہ متاثر نظر آتی تھی فرناز کا دل چاہتا تھا کہ احمد کمال کو اس تبدیلی کے بارے میں بتادے لیکن اس میں ہمت نہیں تھی کہ وہ احمد کمال کو اداس کرے وہ نہیں چاہتی تھی کہ احمد کمال فریال کی طرف سے دلبرداشتہ ہو۔ کیونکہ اس طرح اس کا مشن متاثر ہو سکتا تھا۔ جو فرناز کو کسی قیمت پر گوارا نہیں تھا۔

سلمان داؤد کے گھر والوں کو اہمیت ناگ آئے ہوئے ایک ہفتہ ہی ہوا تھا کہ بھارتی فوجیوں اور تحریک آزادی کے رضا کاروں کے درمیان زبردست معرکہ آرائی شروع ہو گئی حریت پسندوں نے اپنے مطالبات کی حمایت میں ایک پرامن جلوس نکالا تھا جس پر بھارتی فوجیوں نے گولی چلا دی تھی اور جس کے نتیجے میں پینتیس مسلمان شہید ہو گئے تھے۔ احمد کمال دوسرے رضا کاروں کے ساتھ گلی کو چوں میں چھپتا پھر رہا تھا اور سفاک بھارتی فوجی باگل کتوں کی طرح اس کی اور اس کے ساتھیوں کی بوسو نکھتے پھر



جیسا خاصا بڑا سا چونہ پہنا ہوا تھا جو جہادیوں کی خاص پہچان تھی۔

”نیا ز احمد تم؟“ احمد کمال نے کہا وہ اس کا جہادی ساتھی اور دوست تھا اور اس گھر میں احمد کمال کئی بار آچکا تھا۔

”میں بھی کتنا احمق ہوں۔“ احمد کمال نے کمرے کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”میں یہاں ہزار بار آیا ہوں لیکن اس وقت اس جگہ کو پہچان ہی نہیں سکا۔“

”ایسا ہی ہوتا ہے۔“ نیا ز احمد نے جواب دیا اور احمد کمال کے سر پر بندھی پٹی کو پھینک دیا۔

”ہمارے لیے خوشی کی بات ہے کہ خدا نے تمہیں بال بال بچالیا ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن فرناز یہاں کیسے؟“ احمد کمال نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں، فائرنگ کی آواز نصیر الدین کے گھر کی طرف بھی آرہی تھی جھگڑے کے بارے میں سن کر اور فائرنگ کی آواز سے پریشان ہو کر یہ تمہیں

ڈھونڈنے نکل پڑی جس وقت تم بے ہوش ہو کر زمین پر گرے یہ وہاں پہنچ گئی تھیں یہ اتفاق ہی تھا کہ اتنی جلدی تم تک پہنچ گئی پھر میں نے دیکھا کہ یہ تمہیں اٹھانے کی کوشش کر رہی تھیں جو ظاہر ہے اس کے بس کی بات نہیں تھی چنانچہ میں نے اس کی مدد کی۔ یہ تو

تمہیں اپنے ساتھ نصیر الدین کے مکان پر لے جانا چاہتی تھیں۔ لیکن میں نے مناسب نہیں سمجھا اور تمہیں اپنے گھر لے آیا انہیں بھی ایسے حالات میں،

میں نے واپس بھیجنا مناسب نہیں سمجھا چنانچہ تمہارے ساتھ انہیں بھی یہاں لے آیا۔“ نیا ز احمد نے بتایا۔

”تم نے بہت اچھا کیا۔“ کمال نے کہا پھر وہ فرناز کی طرف مڑا۔

”تم نے بہت اچھا کیا۔“ کمال نے کہا پھر وہ فرناز کی طرف مڑا۔

”لیکن تمہیں یہ کیا سوچھی یہ ضروری تو نہیں تھا کہ میں تمہیں وہاں مل جاتا۔ اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو کیا ہوتا؟“ احمد کمال نے کہا۔

”تو کوئی فرق نہیں پڑتا احمد، میرا خاندان یہاں صدیوں سے آباد ہے میں اچھی طرح جان گئی ہوں کہ بھارتی فوجی مسلمانوں پر کس طرح ظلم ڈھاتے

ہیں میں تمہارے ساتھ اس جدوجہد آزادی میں شریک ہونا چاہتی ہوں۔“ فرناز نے وہ کہہ دیا جس کی احمد کمال کو اس سے توقع نہیں تھی۔

”نہیں فرناز، یہ ممکن نہیں ہے، تم ہمارا ساتھ نہیں دے سکو گی۔“ اس نے کہا۔

”اگر یہ بات تم اس لیے کہہ رہے ہو کہ میں سلمان داؤد جیسے اعلیٰ افسر کی بیٹی ہوں تو تم غلطی پر ہو تم شاید یہ نہیں جانتے کہ میرے خیالات ان سے بہت مختلف ہیں۔“ فرناز نے کہا۔

”لیکن میں جانتا ہوں کہ تم سلمان داؤد، نصیر الدین، کیپٹن بصیر، فریال اور اپنی والدہ سے الگ نہیں ہو سکتیں اور ان میں سے کوئی بھی یہ پسند نہیں کرے گا

کہ تم جدوجہد آزادی میں شریک ہو۔“ احمد کمال نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

”ان کا معاملہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔“ فرناز نے کہا۔

”ایسا کرو کہ تم اب گھر جاؤ، تمہیں نیا ز چھوڑ آئے گا۔“ احمد کمال نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا فرناز خاموش ہو گئی تھی اور احمد کمال اس کے

رخصت ہونے تک اسے گہری نظروں سے دیکھتا رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ فرناز اسے چاہتی ہے اور اگر وہ فریال کا تذکرہ کرے گا تو اسے دکھ ہوگا جب وہ احت

ناگ آیا تھا تو فریال نے اس سے ملنے کی کوشش نہیں کی تھی جبکہ فرناز گھر والوں کی ناراضگی مول لے کر بھی

بہر حال اس سے ملنا ہی تھی۔



ہو کہ یہ معاملہ میرے بس سے باہر ہے۔“ نصیر الدین نے فرناز کی والدہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔  
”اور میرا فیصلہ ہے کہ دونوں بیٹیوں کو اپنے باپ کی نگرانی میں ہی رہنا چاہیے۔“

”ٹھیک ہے انکل میں اپنا سامان پیک کرتی ہوں۔“ فرناز نے کہا اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

ان کے واپس ہندو وائر جانے کا فیصلہ تین دن بعد کر دیا گیا جانے سے پہلے فرناز ایک بار پھر رات کی تاریکی میں احمد کمال سے ملی وہ نیاز احمد کے گھر پر اس سے ملنے چلی گئی تھی احمد کمال دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔  
”فرناز تم یوں گھر سے تنہا مت نکلا کرو حالات اچھے نہیں ہیں خاص طور پر تمہارے لیے کیونکہ لوگ تمہارے خاندان کو مسلمانوں کا غدار اور حکومت کا وفادار سمجھتے ہیں۔“ احمد کمال نے اسے دیکھتے ہوئے کہا اور فرناز کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

”یہ سب میں بھی جانتی ہوں لیکن میں مجبور ہوں میں تم سے دور نہیں رہ سکتی۔“ فرناز نے جواب دیا۔

”فرناز احماتوں والی بات مت کرو، تم کیا سمجھتی ہو کیا محبت کرنا میرے بس میں نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے احمد، میں تمہیں یہ بتانے آئی تھی کہ اب میں تم سے ملنے نہ آسکوں گی کیونکہ انکل مجھے واپس ابو کے پاس بھیج رہے ہیں۔“ فرناز نے دھیمی آواز میں کہا۔

”تمہارے لیے شاید بہتر بھی یہی ہے کیونکہ کل رات بھارتی فوجیوں نے مسلمانوں کے جو گھر جلائے تھے اس کے جواب میں کل ہی رات کو سرینگر میں حریت پسندوں نے سینٹرل ریزرو پولیس فورس کے مواصلاتی اسٹیشن پر راکٹوں سے حملہ کیا تھا۔ اس حملے میں ایک فوجی ہلاک اور چھ زخمی ہوئے ہیں۔ اب

”فریال ٹھیک ہے اور خوشی بھی ہے۔“ فرناز نے جیسے احمد کمال کے دل کی بات پڑھ لی اور احمد کمال نے آہستگی سے اثبات میں گردن ہلا دی پھر فرناز نیاز کے ساتھ چلی گئی تھی۔

جب وہ گھر پہنچی تو نصیر الدین غصے میں تھے اور اس کی ماں پر گرج رہے تھے کہ انہوں نے فرناز کو گھر سے باہر کیوں جانے دیا۔

”انکل میں آگئی ہوں۔“ اس نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھتے ہوئے کہا اور نصیر الدین تیزی سے اس کی طرف مڑے۔

”میں معافی چاہتی ہوں کہ میرے اس عمل سے آپ کو تکلیف پہنچی لیکن میں مجبور ہوں آپ کو صرف یہ اطمینان دلا سکتی ہوں کہ نے کوئی غلط قدم نہیں اٹھایا، آپ کی پوزیشن محفوظ ہے۔ میں احمد کمال سے محبت کرتی ہوں اور اس سے ہی ملنے گئی تھی۔“ فرناز نے کہہ کر دیا لیکن وہ خود حیران تھی کہ اس میں اتنی جرأت کہاں سے آگئی تھی۔

”کیا کہا؟“ گویا اس کہنے نے یہاں بھی تمہارا پیچھا نہیں چھوڑا۔“ نصیر الدین دباڑے۔

”تم جانتی ہوں کہ وہ فریال کا سنگتیر تھا اور تمہارے والد نے اس سے فریال کی سنگتی توڑ دی تھی اس سے بچانے کے لیے ہی تمہارے والد نے تم لوگوں کو یہاں میرے پاس بھیجا تھا اس کے باوجود.....!“ نصیر الدین غصے سے پاگل ہو رہے تھے۔

”امی، میں جانتی ہوں کہ ہم جیسے امیر گھرانے میں میرا یہ فعل اچھی نظر سے نہیں دیکھا جائے گا لیکن احمد کمال کو چاہنے کا آپ کو بتانے میں نے دھوکے فریب کا سہارا نہیں لیا۔“ فرناز نے کمرے میں موجود اپنی والدہ سے کہا۔

”میرا خیال ہے کہ تم یہ بات آسانی سے سمجھ سکتی



سرینگر، اہست ناگ اور کئی دوسرے علاقوں میں فوجی دستوں اور حریت پسندوں میں جھڑپیں ہو رہی ہیں۔ ایسی صورت میں میں تم سے ویسے بھی نہیں مل سکوں گا کیونکہ میرے سپرد بھی ایک اہم مشن کیا گیا ہے۔“

دوسرے ہی روز نصیر الدین نے فرناز، فریال اور ان کی والدہ کو واپس روانہ کر دیا تھا جس وقت وہ روانہ ہوئیں کمپین بصیر الدین گھر پر موجود نہیں تھا کیونکہ اہست ناگ میں سونے والی گڑبڑ کے سلسلے میں اسے مختلف ذمہ داریاں سونپ دی گئی تھیں۔

اپنے گھر پہنچنے کے بعد انہوں نے اپنے والد سلمان داؤد کی جو حالت دیکھی وہ انہیں حیرت میں ڈالنے کے لیے کافی تھی ان پر نجانے کیا مصیبت آ پڑی تھی کہ وہ اپنی بیٹیوں سے بھی خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئے تھے۔

”کیا بات ہے سلمان تم ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟“ فرناز کی والدہ شوہر کی طرف بڑھیں تو وہ چیخ کر پیچھے ہٹ گئی۔

”جاؤ..... جاؤ..... یہاں سے چلی جاؤ۔“ انہوں نے خوفزدہ انداز میں چیخ کر کہا اور فرناز کی والدہ کے قدم جہاں تھے وہیں رک گئے۔

”ابو کیا بات ہے، آپ کو کیا ہو گیا ہے۔“ فریال نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

”ٹھہرو فریال۔“ فرناز موقع کی نزاکت کو کچھ کچھ سمجھتے ہوئے بولی پھر وہ آگے بڑھی اور دھیمے لہجے میں اپنے والد کو مخاطب کیا۔

”ابو میں آپ کی بیٹی فرناز ہوں، ہم لوگ اہست ناگ سے واپس آ گئے ہیں ابو وہاں آپ کے بغیر ہمارا دل نہیں لگ رہا تھا۔ آئیے ابو..... میں آپ کو آپ کے کمرے میں لے چلوں۔“ وہ آہستہ آہستہ ان سے قریب ہوتی جا رہی تھی اور سلمان داؤد خوفزدہ نظروں

سے اسے دیکھ رہے تھے۔ فرناز نے آگے بڑھ کر ان کا ہاتھ تھام لیا اور سلمان داؤد کو سہارا دیتے ہوئے ان کو ان کے کمرے میں لے گئی۔

کئی روز گزرنے کے بعد ان پر یہ حقیقت آشکارا ہوئی کہ سلمان داؤد کے جانی دشمن ظفر حسین نے انہیں تشدد کا نشانہ بنایا تھا یہ وہی ظفر حسین تھا جس کو ایک بار چوری کے الزام میں سلمان داؤد نے جیل بھجوا دیا تھا وہ تحریک آزادی کشمیر کا رکن ضرور تھا لیکن اس کا تعلق ایک ایسے ٹولے سے تھا جو صرف اور صرف تشدد پر یقین رکھتا تھا اور آزادی کی جنگ لڑنے کے بجائے اپنی ذاتی دشمنی نمٹا رہا تھا۔ سلمان داؤد نے کئی دن کی مشقت کے بعد ٹولے پھوٹے الفاظ میں بس اتنا ہی بتایا تھا کہ ظفر حسین اور اس کے ساتھ انہیں گھر سے رات کی تاریکی میں اٹھا کر ہندو واڑہ کے علاقے کی آبادی سے دور کسی ویران جگہ لے گئے تھے وہ اتنے خوفزدہ تھے کہ اب ان میں اپنے نظریات کا پرچار کرنے یا کسی پر تنقید کرنے کی سکت نہیں تھی یوں لگتا تھا کہ جیسے ان کی ساری بصیرت اور سوچ بوجھ دم توڑ چکی ہو۔

اب سلمان داؤد صرف اپنے خاندان والوں کے رحم و کرم پر تھا اور خاندان بھی وہ جو صرف دولڑکیوں اور ایک بیوی پر مشتمل تھا۔

انہیں گھر آئے ہوئے تیسرا روز تھا کہ رات کو دروازے پر دستک ہوئی دروازہ فرناز نے کھولا اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اس کے سامنے احمد کمال کھڑا تھا۔

”تم۔“ اس نے حیرت سے کہا۔

”ہاں میری بات سنو وقت بہت کم ہے۔“ احمد کمال نے سرگوشی سے کہا۔ ”میں تمہیں یہ بتانے آیا ہوں کہ حریت پسندوں نے ہندو واڑہ میں ان مکانات کو جلانے کا فیصلہ کیا ہے جہاں ہندو یا



حکمرانوں کے وفادار رہتے ہیں تمہارا مکان بھی اس فہرست میں شامل ہے تمہیں یہ اطلاع پہنچانا گو کہ تنظیم کے مفاد کے خلاف ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ تم حریت پسندوں کی حامی ہو اور خود بھی ہمارا ساتھ دینا چاہتی ہو تم لوگ یہاں سے نکل جاؤ۔“

”کیا ابھی، اسی وقت؟“ فرناز نے گھبرا کر پوچھا۔

”ہاں۔“

”لیکن اس وقت ہم لوگ کہاں جائیں گے۔“ فرناز نے کہا اس کے لہجے میں تشویش تھی۔

”یہ سب میں تمہیں تفصیل سے نہیں بتا سکتا میں جلدی میں ہوں اس وقت تم اپنی عقل استعمال کرو۔“ کمال نے غلٹ سے کہا اور فوراً دروازے سے ہٹ گیا۔

فرناز نے جھانک کر گلی میں دیکھا تو تیزی سے آگے گلی کا کونا مڑ گیا تھا فرناز نے دروازہ بند کر لیا اور بھاگی ہوئی اپنے کمرے میں آئی اس نے ساری صورت حال فریال کو بتائی اور فریال آپے سے باہر ہو گئی۔

”دیکھا تم نے..... تم نے دیکھا وہ میری محبت کا دم بھرتا ہے وہ..... وہ ہمیں یوں تنہا چھوڑ کر چلا گیا۔ کیا اسے اس وقت ہماری مدد نہیں کرنا چاہیے تھی۔“

”دیکھو فریال جذباتی مت بنو یقیناً اس کے سپرد کوئی اہم ذمہ داری ہوگی ورنہ وہ ہرگز ہمیں چھوڑ کر نہیں جاتا۔“

”ہونہہ اس کی اہم ذمہ داریاں میں خوب سمجھتی ہوں اس نے اس وقت بھی ہماری مدد کرنے کے بجائے کسی غریب مسکین کی مدد کرنا ضروری سمجھا ہوگا۔ خیر کوئی بات نہیں میں بصیر سے بات کرتی ہوں۔“ فریال تیزی سے اٹھی اور ٹیلی فون کی طرف

بڑھی۔

”نہیں فریال ایسا مت کرو احمد کمال نے یہ اطلاع ہمیں راز داری سے دی ہے اگر تم نے کیپٹن بصیر کو بتا دیا تو اچھا نہیں ہوگا فوج ہوشیار ہو جائے گی اور پھر نہ جانے کتنے حریت پسند مارے جائیں ایسا مت کرو۔“ فرناز نے التجا کرتے ہوئے کہا۔

”تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں آخر تم کیا چاہتی ہو، کیا ہم اپنے بچنے کا انتظام نہ کریں خاموشی سے مرجائیں، ہمارے پاس کیپٹن بصیر سے رابطہ کرنے کے کوئی راستہ نہ رہے تب مدد مانگیں تم پاگل ہو۔“ فریال نے غصے سے کہا پھر اس نے فرناز کے منع کرنے کے باوجود کیپٹن بصیر کو حریت پسندوں کے نئے آپریشن کیا اطلاع دے دی بصیر نے جلد ہی موقع پر پہنچنے کا وعدہ کیا لیکن جب ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ بھاری فوجی کمک کے ساتھ وہاں پہنچا تو ہندو واڑہ کے متعدد مکانات نذر آتش ہو چکے تھے جن میں سلمان داؤد کا مکان بھی شامل تھا فریال، فرناز، ان کی والدہ اور سلمان داؤد پڑوس کے ایک مکان میں تھے۔ سلمان داؤد کی حالت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

”ختم ہو گیا،..... سب کچھ ختم ہو گیا..... اف میں نے یہ سب کچھ کتنی محنت سے کمایا تھا یہ میری ساری عمر کی کمائی تھی مجھے چھوڑ دو جانے دو میں مرجانا چاہتا ہوں اپنے جلتے ہوئے مکان میں جل کر مرجانا چاہتا ہوں۔“ تجھے جانے دو، میں تباہ ہو گیا ہوں۔“ سلمان داؤد چیخ رہے تھے فریال اور فرناز انہیں دونوں طرف سے پکڑے ہوئے تھیں اور فرناز کی والدہ ایک طرف کھڑی آنسو بہا رہی تھیں۔

”ابو چپ ہو جائیں۔“ فرناز نے سلمان داؤد کو دلا سہ دیا فریال خاموش تھی۔

”مجھے افسوس ہے فریال کہ تمہارا گھر جل گیا۔“



رہنے کا انتظام ہے ساتھ ساتھ حکومت کے کچھ اعلیٰ فوجی افسر بھی وہاں رہائش پذیر ہیں بصیر یقیناً وہاں ٹھہرا ہوا تھا اور اس نے فریال کو اپنے ساتھ رکھنے کا انتظام کیا تھا۔

دوسرے روز ہندو واڑہ میں پھر فوجی دستوں اور حریت پسندوں میں جھڑپیں ہوئیں کڑا بل کے علاقے میں ایک پل اڑا دیا گیا۔ ہنگاموں کے بعد بڑے پیمانے پر گرفتاریاں بھی ہوئیں۔ اگلے روز ان گرفتار شدہ حریت پسندوں کو ہندو واڑہ کی مرکزی شاہراہ سے گزرا گیا اس جلوس کو فرناز نے بھی دیکھا اور یہ دیکھ کر اس کے پیروں تلے زمین نکل گئی کہ ان لوگوں میں احمد کمال بھی تھا۔

وہ رات فرناز نے جیسے کانٹوں پر بسر کی۔ ساری رات اسے نیند نہیں آئی تھی اور وہ بے چینی سے کروٹیں بدلتی رہی تھی دوسرے دن وہ ہر کام چھوڑ کر کیپٹن بصیر سے ملی اور فریال کو ساری صورت حال سمجھا کر اس سے بھی اپنی سفارش کرائی تب بڑی مشکل سے بصیر اس بات پر رضامند ہوا کہ وہ فرناز کو احمد کمال سے ملوانے کا انتظام کر دے گا جب تک یہ انتظام نہیں ہوا۔ وہ بار بار کیپٹن بصیر سے ملتی رہی اور جب اس کے احمد کمال سے ملنے کی گھڑی آئی تو وہ جیل میں اس کے لیے کھانا اور چند رسالے لے کر پہنچی بصیر نے فرناز کے لیے احمد کمال سے ملنے کا جیل پاس بنا دیا تھا اب وہ آزادی سے اس سے ملنے جاسکتی تھی۔ احمد کمال اسے وہاں دیکھ کر حیران رہ گیا۔

”فرناز تم یہاں؟“ وہ اپنی حیرت چھپانے سے کھانسی فرناز نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا وہ اپنا لایا ہوا کھانا احمد کمال کے سامنے رکھ کر خاموش بیٹھ گئی احمد کمال حیرت سے کبھی اسے اور کبھی اس کی لائی ہوئی چیزوں کو دیکھ رہا تھا۔

کیپٹن بصیر نے رمی جملہ کہا اور فریال کا ایک پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”یہ سب تو یہاں کا معمول بن گیا ہے۔“ بصیر نے کہا۔

”اوہ، اب ہم لوگ کیا کریں گے۔“ فریال نے ہلکتے ہوئے کہا۔

”تم فکر مت کرو میں ابھی کچھ کرتا ہوں۔“ بصیر نے اسے تسلی دی اور وہ اسی وقت وہاں سے چلا گیا۔

”کچھ دیر بعد جب وہ واپس آیا تو سلمان داؤد کے خاندان کے لیے رہائش کا انتظام اس طرح کر کے آیا کہ وہ لوگ ایک ساتھ نہیں رہ سکتے تھے ایک فیملی نے سلمان داؤد اور ان کی بیوی کو اپنے ہاں پناہ دی تھی فرناز کے رہنے کے لیے ایک ڈاکٹر کی فیملی کے ہاں انتظام ہوا تھا اور فریال کے لیے ایک بیوہ فاروق جہاں کے ہاں انتظام ہوا تھا۔ بصیر حسین جس طرح سلمان داؤد کو بتاتا رہا وہ اسے اسی طرح مانتے رہے شاید اب ان میں مخالفت کرنے کی سکت نہیں تھی۔ انہیں اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہوا تھا کہ ان کی دونوں بیٹیوں کو بھی ایک جگہ نہیں رکھا گیا تھا اس کے برعکس فرناز کو تشویش تھی اور اس کے ذہن میں فاروق جہاں کا نام سن کر کچھ جڑی سی کینے لگی تھی اسے یہ نام جانا پہچانا سا لگا تھا لیکن اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس نے یہ نام کہاں سنا تھا جب اسے یاد آیا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔

بصیر اسے اس ڈاکٹر کے گھر چھوڑ گیا تھا جس نے فرناز کو اپنے گھر والوں کے ساتھ رکھنا قبول کیا تھا جب وہ اپنے کمرے میں پہنچی تو اچانک اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور اسے یاد آیا کہ فاروق جہاں وہ بیوہ سے جس کا بڑا اور عالیشان گھر ہے اس میں بہت سے کمرے ہیں جن میں بھاتی فوجیوں کے



”فرناز تم..... تم یہ سب کیوں کر رہی ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”میں اپنے دوستوں کو تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔“ فرناز نے اطمینان سے جواب دیا۔

”تو تم مجھے اپنا دوست سمجھتی ہو۔“

”ہاں اگر میں ایسا سمجھنے کی غلطی کر رہی ہوں تو میری حماقت کے ذمہ دار تم نہیں ہو تم نے کبھی مجھ پر یہ بھی تو ظاہر نہیں کیا کہ تم میرے متعلق کیا سوچتے ہو پھر میں تم سے نفرت کیسے کر سکتی ہوں جبکہ تم میرے وطن کی آزادی کی جنگ لڑ رہے ہو۔“ فرناز نے کہا۔

”مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی کہ میرے رویے کے باوجود تم مجھ سے نفرت نہیں کرتیں۔“

”خدا حافظ احمد، میں پھر آؤں گی۔“ فرناز نے کہا اور واپسی کے لیے مڑی۔

”شکر یہ فرناز، میں تمہارا انتظار کروں گا۔“ احمد کمال نے بھی اس کے انداز میں جواب دیا۔

وہ کئی بار احمد کمال سے ملنے جیل گئی اور ہر بار اسے احساس ہوا کہ احمد کمال کے وجود میں رچے ہوئے جذبات آزادی میں مزید اضافہ ہی ہوا ہے۔ دشمن کی تیدو بند نے اس کے حوصلے پست نہیں کیے تھے۔

پھر ایک روز احمد کمال نے اسے ایک ایسی خبر سنائی کہ خوشی سے اس کا انگ انگ جھوم اٹھا۔

”فرناز تمہیں پتا ہے مجھے آزاد کیا جا رہا ہے۔“ احمد کمال کی یہ بات سن کر فرناز چند لمحوں کے لیے سکتے میں آ گئی۔

”تم نے سنا مجھے اور میرے چند ساتھیوں کو آزاد کیا جا رہا ہے۔“ احمد کمال نے اس کے شانے پکڑ کر اس کو جھنجھوڑا۔

”لہلہ..... لیکن..... کیسے..... ان بھارتیوں سے ہم کسی قسم کی رعایت کی امید نہیں رکھتے۔“ فرناز نے

دھیسے لہجے میں کہا

”وہ ہمیں کوئی رعایت نہیں دے رہے ہیں بلکہ ہمارے مجاہدین نے ایک معرکے میں ان کے چند اعلیٰ افسران کو گرفتار کر لیا ہے جنہیں وہ آزاد کرانا چاہتے ہیں اور ہمارے ایریا کمانڈر دو راب بٹ نے یہ شرط رکھی ہے کہ اگر وہ ہمارے چند اہم رہنماؤں کو چھوڑ دیں تو اس کے بدلے میں ان کے بھی اعلیٰ افسر چھوڑ دیے جائیں گے یہاں کی انتظامیہ نے یہ بات مان لی ہے اور کل مجھ سمیت یہاں سے آٹھ حریت پسند آزاد کیے جا رہے ہیں۔“

”اس کا مطلب ہے یہاں تم سے یہ میری آخری ملاقات ہے۔“ فرناز نے پوچھا اور احمد کمال نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”فرناز تم نے میرا بہت ساتھ دیا ہے میں بد نصیب ہوں کہ میں نے تمہاری قدر نہیں کی۔“ احمد کمال نے تاسف سے کہا۔

”نہیں احمد، میں کسی ذاتی جذبے کے تحت تمہاری مدد نہیں کر رہی ہوں بلکہ میں تو اپنے وطن کی آزادی کی خاطر حریت پسندوں کے کام آنا چاہتی ہوں۔“ فرناز نے دل پر جبر کر کے کہا اور احمد کمال کے لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

دوسرے روز احمد کمال اور اس کے ساتھ ساتھیوں کو آزاد کر دیا گیا تھا اور پھر کافی عرصے فرناز کی اس سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ بس اتنا سنا تھا کہ حریت پسند تنظیم کی طرف سے احمد کمال کو اس کے ساتھیوں کے ساتھ پہاڑی علاقوں کی طرف کسی مشن پر بھیج دیا گیا تھا اس کے لبوں پر ہر دم احمد کمال کی کامیابی کے لیے دعائیں تھیں اسی عالم میں دو ماہ گزر گئے اور پھر ایک دن فریال اس سے ملنے آ گئی۔

”فرناز مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“ فریال



”اوہ فریال تمہیں اندازہ ہے کہ جب امی اور ابو کو یہ پتا چلے گا تو انہیں کتنا دکھ ہوگا؟“

”مجھے پتا ہے لیکن بصیر بھی مجبور ہے کیونکہ انکل نصیر الدین بہت سخت طبیعت کے مالک ہیں انہوں نے بصیر کے لیے ایک مال دار لڑکی کا انتخاب کر رکھا ہے اور اگر ان کے کانوں تک یہ خبر پہنچ گئی تو بصیر ان کی تمام جائیداد سے محروم ہو جائے گا۔“

”گو یا تم ابھی امی کو اور پریشان رکھو گی۔“

”مجبوری ہے فرناز، لیکن جب وقت آنے پر امی کو معلوم ہوگا اور یہ بھی پتا چلے گا کہ میں نے یہ قربانی اس لیے دی کہ میں اور بصیر جائیداد سے محروم نہ ہو جائیں تو ہمیں ضرور معاف کر دیں گی۔ اپنی سچائی کے ثبوت کے لیے میرے پاس ہماری شادی کا نکاح نامہ موجود ہے۔“ فریال نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا اور فرناز نے بے پروائی سے شانے اچکا دیے۔

”مجھے یہ بتاؤ کہ تم مجھ سے کیا مدد چاہتی ہو؟“

فرناز نے پوچھا۔

”تم میرے ساتھ چلو بصیر ہمارے ٹھہرنے کا وہاں انتظام کر دے گا میں تنہا کیسے رہوں گی میری طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے تم میرے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتیں کہ مجھے تنہائی سے بچالو۔“ فریال نے اپنا حق جتایا۔

فرناز چاہتی تھی کہ جانے سے منع کر دے لیکن پھر اسے احمد کمال کا خیال آ گیا جو انہی پہاڑی وادیوں میں سخت سردی اور بھوک کا مقابلہ کر رہا تھا اس کے لیے یہ بہترین موقع تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح اس تک بھی پہنچ سکتی تھی۔

”ٹھیک ہے مجھے منظور ہے میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔“ فرناز نے ہامی بھر لی اور فریال کا چہرہ کھل اٹھا۔

اگلے روز فرناز، فریال کے ساتھ پہاڑی وادیوں

نے بغیر کسی تمہید کے کہا۔ فرناز نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی تھی۔

”میں جانتی ہوں تم میرے متعلق کیا سوچتی ہو گی؟“

”میں خود تنگ آ چکی ہوں اگر میں نے بصیر سے وعدہ نہ کر لیا ہوتا تو.....!“

”کیا..... تم نے اس سے یہ وعدہ کر لیا ہے کہ تم بلا سوچے سمجھے اپنے خاندن کی عزت و ناموس اس کے ہاتھوں برباد کرنی رہو گی تمہیں پتا ہے کہ جس گھر میں تم بصیر کے ساتھ رہتی ہو وہاں بھارتی فوجیوں کے علاوہ صرف تم واحد عورت ہو یا پھر وہ بیوی جو اس گھر کی مالک ہے تمہیں احساس ہے کہ لوگ کیسی کیسی باتیں بنا رہے ہیں کیا میں ان لوگوں کی باتوں کو نظر انداز کر دوں۔“

”نہیں فرناز یہ بات نہیں ہے میں ہرگز یہ نہیں چاہوں گی کہ تم مجھ سے نفرت کرو۔“

”اب تم مجھ سے کیا چاہتی ہو۔“

”دیکھو فرناز بصیر کو پہاڑی علاقوں میں بھیجا جا رہا ہے وہ مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے میں بھی اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔“

”گو یا میرا اندیشہ درست تھا لیکن فریال تم یہ سوچو اس کے ساتھ بغیر کسی رشتے کے تم کیسے جا سکتی ہو؟“

”بہت آسانی سے اسی طرح جیسے کوئی بیوی اپنے شوہر کے ساتھ جا سکتی ہے۔“ فریال نے کہا اور فرناز حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

”بیوی۔“ تمہارا مطلب ہے تم اور بصیر شادی کر چکے ہو۔“

”ہاں دیکھو فرناز یہ بات خفیہ ہے بصیر نے مجھے سختی سے منع کیا ہے کہ میں ابھی کسی کو اس کے بارے میں نہیں بتاؤں گی۔“



پوچھا۔

”وہ ہم نے باہر پہرا دینے والوں کو دے دیے ہیں انہیں ان کی زیادہ ضرورت تھی۔“ احمد کمال نے جواب دیا۔

”ہمیں آزادی کے لیے کتنی بڑی قیمت ادا کرنا پڑ رہی ہے۔“ فرناز نے روہاسی ہو کر کہا اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

”رونا مت فرناز، یقین کرو..... اگر یہ شدید سردیاں ہم نے گزار لیں تو ان شاء اللہ فتح ہمارا مقدر ہوگی۔“

”میرے پاس کچھ راشن ہے میں لاتی ہوں۔“ فرناز نے کہا اور جھونپڑی سے نکل گئی وہ واپس آئی تو اس کے پاس کھانے کو جو کچھ تھا وہ ساتھ لے آئی تھی راشن لاتے ہوئے اس نے فریال کو صرف اتنا بتایا تھا کہ وہ مجاہدین آزادی کے لیے یہ چیزیں لے جا رہی ہے اس نے احمد کمال کا ذکر نہیں کیا تھا اس نے ڈرائیور کو ہدایت کی کہ وہ فریال کو اس مقام پر پہنچا کر واپس آ جائے جہاں بصیر نے ان کی رہائش کا انتظام کیا تھا اس نے احمد کمال کو بھی فریال کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔

جھونپڑی میں روشن آگ پر اس نے ایک برتن میں انڈے تلے اور ڈبل روٹی کے ساتھ احمد کمال کو کھلانے لگی اس نے اپنے بارے میں صرف اتنا بتایا کہ وہ قریبی بستی میں آئی تھی تو مجاہدین کی موجودگی کے بارے میں سن کر اس تک پہنچ گئی کھانا کھانے کے بعد احمد کمال میں کچھ طاقت آگئی تھی۔

”فرناز، کیا میں نے تم کو کبھی بتایا ہے کہ تم فرش ہو۔“ اس نے فرناز سے کہا۔

”نہیں تم نے کبھی نہیں بتایا۔“

”تم یہاں تک کیسے پہنچی، چار دن سے شدید

کی طرف روانہ ہو گئی تھی ان کے ساتھ ضرورت کی چند اشیاء کھانے پینے کا کچھ سامان اور اس جیب کا ڈرائیور تھا جس میں وہ سفر کر رہی تھیں۔ یہ سارا انتظام کیپٹن بصیر نے کیا تھا وہ دو دن کی مسافت طے کرنے کے بعد پہاڑی وادیوں کے برفانی علاقوں میں پہنچ گئی تھیں حدنگاہ تک برف ہی برف تھی معاً اسے ایک شخص نظر آیا جس کے ہاتھ میں رائفل تھی اور جسم پر گئی جوڑے کپڑے پہنے ہوئے تھا شاید سردی سے بچنے کے لیے اس کا چہرہ نیلا پڑ گیا تھا جیب کو دیکھ کر اس نے کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن اس کی آواز نے اس کا ساتھ نہیں دیا تھا فرناز نے ڈرائیور کو جب رکنے کا اشارہ کیا اور اس شخص کی طرف متوجہ ہوئی اس نے پھر بولنے کی کوشش کی لیکن اس کی آواز محض ایک خرخراہٹ کی طرح سنائی دی پھر اسے سب تھما شہ کھانسی آئی جس کی شدت سے اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے وہ برف پر گر گیا فرناز نے اس کے لباس سے اندازہ لگایا تھا کہ وہ کشمیری مجاہد تھا۔

”احمد کمال کہاں ہے؟“ فرناز نے اس شخص سے پوچھا تو اس نے انگلی سے دور نظر آنے والی چند خیمہ جیسی جھونپڑیوں کی طرف اشارہ کیا۔

”شکریہ۔“ اس نے کہا اور پھر ڈرائیور یا فریال سے کچھ کہے بغیر ہی جیب سے اتر کر ان خیمہ نما جھونپڑیوں کی طرف بڑھ گئی۔

قریب پہنچ کر وہ ہر جھونپڑی میں جھانکنے لگی کہ ایک جھونپڑی میں اسے احمد کمال نظر آیا جو ایک کمبل میں لیٹا ہوا بیٹھا تھا اس نے فرناز کو دیکھ کر کھڑے ہونے کی کوشش کی لیکن وہ اٹھ نہ سکا اس کے پیروں میں جوتوں کی جگہ کالے کپڑوں کی دھجیاں لپٹی ہوئی تھیں اور اس کے جسم پر صرف کپڑوں کا ایک جوڑا تھا۔

”احمد کمال، تمہارے گرم کپڑے۔“ اس نے



برفاری ہو رہی ہے۔ تمہیں کھانے کا سامان کہاں سے ملا اور رقم کہاں سے آئی۔“ احمد کمال نے ایک ساتھ کئی سوال کر دیے۔

”تم کچھ دیر خاموش بیٹھو۔“ فرناز نے اس کی بات ٹالتے ہوئے کہا وہ جانتی تھی کہ احمد کمال کو یہ بتانا کہ وہ رقم جس سے راشن خریدا گیا ہے بصیر الدین کی ہے اسے افسردہ کر دے گا۔

”فرناز۔“

”ہاں۔“

”کیا میں تمہارا ہاتھ چوم سکتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے اب محبت نہیں کرتی لیکن تم نے یہاں تک آ کر اور میری مدد کر کے جس بہادری کا ثبوت دیا ہے میرے دل میں تمہاری قدر اور بڑھ گئی ہے۔“

”تم میرا ہاتھ چوم سکتے ہو۔“ فرناز نے مسکراتے ہوئے کہا لیکن جب احمد کمال کھڑا ہو کر اس کے قریب آیا تو فرناز کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

”نہیں فرناز۔۔۔۔۔ رونا مت۔“

”یہ میرے بس میں نہیں ہے۔“ فرناز نے بے بسی سے کہا اور اس کے پاس سے ہٹ گئی۔

”کھانے پینے کا یہ سامان بہت کافی تو نہیں لیکن اس سے بہت سے کمزور اور لاغر مجاہدین کو ڈھارس مل جائے گی۔“ احمد کمال نے کہا۔

”نہیں احمد، تم اس راشن کو دوسروں میں نہیں بانٹو گے تمہارے لیے تمام سردیوں میں کافی ہوگا لیکن اگر تم نے اسے تقسیم کر دیا تو یہ ایک ہفتے میں ختم ہو جائے گا اور تم کیا کرو گے۔“ فرناز نے کہا۔

”فرناز یہ بات تم اچھی طرح جانتی ہو کہ اگر ہم کچھ کھارے ہوں اور کوئی بھوکا جانور بھی ہمارے نزدیک آ کر کھڑا ہو تو ہم اسے کچھ نہ کچھ دیتے ہیں کیونکہ ہمیں اس کی بھوک کا اندازہ ہوتا ہے پھر

### جواہر پارے

بقائے صحت کے لیے جسمانی صفائی اور پاکیزگی نہایت ضروری ہے اور یہ غسل سے ہی حاصل ہو سکتی ہے تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم زمانے سے غسل کو بہت اہم سمجھا گیا ہے قدیم اہل روم و اہل یونان غسل کو مذہبی فرض سمجھتے تھے اور یہودی و اہل ہنود بھی اسے عبادت کے برابر درجہ دیتے ہیں۔ کھانا کھانے کے فوراً بعد بھی غسل نہیں کرنا چاہیے اور محنت یا تکان کے بعد یا صحبت سے پہلے یا اس کے فوراً بعد بھی غسل کرنا بہت مضر ہے اور حاملہ مستورات کو بھی کم نہانا چاہیے بہتر یہ ہے کہ موسم سرما میں ہفتے میں دو تین مرتبہ اور موسم گرما میں روزانہ غسل کرنے کی عادت ڈالنا چاہیے اور زیادہ دیر حمام یا گرم پانی کے ٹب یا حوض میں بیٹھنا بہت مضر ہے اس سے بدن بہت کمزور ہو جاتا ہے۔

سید امجد علی..... لاڑکانہ

میرے دوسرے ساکھی تو انسان ہیں اور میرے ساتھ آزادی کی جدوجہد میں شریک ہیں وہ بھی نامساعد حالات کا میری طرح مقابلہ کر رہے ہیں۔“

”لیکن میرے پاس جتنی رقم تھی میں نے خرچ کر دی اب شاید میں مزید راشن نہ لاسکوں۔“

”کوئی بات نہیں فرناز تم نے جو کچھ بھی کیا ہے میں اس کے لیے تمہارا شکر گزار ہوں۔“

”لیکن راشن نہ ملا تو، تو تم مر جاؤ گے میں تمہیں مرنے نہیں دوں گی احمد، تمہیں دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے طاقت کی ضرورت ہے جو خوراک سے ملتی ہے بھوکے رہ کر تم دشمن کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔“

”اگر اس کائنات میں انصاف نام کی کوئی چیز ہے تو میں نہیں مروں گا۔ میں سمجھتا ہوں ہم اس امتحان سے کامیابی سے گزر جائیں گے۔ خدا ضرور ہماری مدد کرے گا جیسے اس نے انہی کی۔“ احمد کمال



”ہاں۔“ دوراب بٹ نے کافی دیر بعد جواب دیا۔ وہ اس کے چہرے پر بغور دیکھتا رہا تھا۔  
”فتح ہماری ہوگی کیونکہ یہ بہت ضروری ہے ہمیں ہر حال میں جیتنا ہے۔“

فرناز اس کی بات سن کر مبہوت سی ہو گئی تھی۔  
”آؤ فرناز میں تمہیں کیمپ کے بانی مجاہدین سے ملواؤں میں جانتا ہوں تم بہادر ہو، زخمی اور بھوک سے ہلکتے ہوئے لوگوں کو دیکھ کر بے ہوش نہیں ہو جاؤ گی آؤ میرے ساتھ آؤ۔“ دوراب بٹ نے کہا۔  
”لیکن آپ مجھے ان لوگوں سے کیوں ملوانا چاہتے ہیں کمانڈر۔“ فرناز نے پوچھا۔

”اس لیے کہ میں تمہیں ایک مشن پر بھیجنے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔“ دوراب بٹ نے کہا اور فرناز حیرت سے ابھی اسے اور کبھی احمد کمال کو دیکھنے لگی اسے یاد تھا کہ اس نے ایک بار احمد کمال سے کہا تھا کہ وہ بھی اس کی تحریک آزادی میں شریک ہونا چاہتی ہے تو احمد کمال نے اسے ٹال دیا تھا اور آج اسے یہ اعزاز بن گئے مل رہا تھا۔

”میں تمہیں اپنی ہائی کمان کے پاس بھیجوں گا تاکہ تم ان کے لیے امداد کی بات کر سکو اور ہماری حالت کے بارے میں نہیں بتا سکو ہمارا رابطہ ان سے ٹوٹ گیا ہے اور ہم میں سے کوئی ان تک نہیں پہنچ سکتا کیا تم یہ کام کرو گی؟“

”یس سر! میں آپ کی کمانڈ میں ہوں۔“ فرناز نے جو شیلے لہجے میں کہا اور دوراب بٹ کے ساتھ اس کے خیمے سے نکلی۔

اس نے کیمپ میں موجود مجاہدین کی جو حالت دیکھی اس سے اسے بے حد تکلیف ہوئی بہت سے مجاہدین زخمی تھے جن کے لیے دواؤں یا ڈاکٹر کا انتظام نہیں تھا سردی سے بچنے کے لیے ان کے پاس

کے لہجے میں بے پناہ اعتماد تھا۔ فرناز بڑے غور سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی واقعی خدا نے ان کی مدد کی تھی جب فرناز اس علاقے کی طرف آنے کے لیے روانہ ہوئی تھی تو اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ جو رقم اور کھانے پینے کا سامان لے کر جا رہی ہے وہ احمد کمال کے کام آئے گا اسے تو احمد کمال کے اتنی جلدی ملنے کی امید بھی نہیں تھی۔

”تم ٹھیک کہتے ہو احمد، خدا ضرور ہماری مدد کرے گا۔“ اس نے بھی یقین سے کہا تھا۔  
”آؤ فرناز میں تمہیں اپنے لیڈر سے ملواؤں جو ہمارا ایریا کمانڈر ہے۔“ احمد کمال نے کہا۔

جب فرناز ایریا کمانڈر کے پاس پہنچی تو وہ اس کے استقبال کے لیے کھڑا ہو گیا فرناز کے وہاں پہنچنے اور راشن فراہم کرنے کی اطلاع اس تک پہنچ گئی تھی۔

”خدا تمہاری حفاظت کرے بہادر لڑکی۔“ ایریا کمانڈر دوراب بٹ نے کہا۔

”تم نے ہماری مدد کر کے اس وقت ہم پر احسان کیا ہے کاش ہم میں تم جیسے چند اور ہو جائیں تو ہمارا کام بہت آسان ہو جائے گا۔“

فرناز کی نظر میں دوراب بٹ کے چہرے پر جی تھیں اس نے اتنا اداس چہرہ کبھی نہیں دیکھا تھا اس کے سامنے وہ حریت پسند کھڑا تھا جس کا مقابلہ دشمن ملک کی طاقتور فوج سے تھا اور جس کے پاس نہ کھانے کو کچھ تھا نہ اس کے مجاہدین کے لیے گرم کپڑے تھے مناسب اسلحہ تھا نہ رقم تھی سپلائی کے کوئی بھی ذرائع نہیں تھے۔ وہ چند سو ایسے مجاہدین کا کمانڈر تھا جو بھوک اور سردی کی وجہ سے موت کے دورا ہے پر آ کھڑے ہوئے تھے۔

”جناب کیا آپ سمجھتے ہیں کہ فتح آپ کی ہوگی؟“ فرناز نے پوچھا۔



ہیں۔“ احمد کمال کی والدہ نے اسے دیکھتے ہی گلے سے لگالیا اور شوہر کو آواز دی۔

”احمد کے ابو، دیکھیں کون آیا ہے۔“

ان کی آواز سن کر اسحاق احمد فوراً ہی برآمدے میں آگئے تھے۔

”ارے فرناز آؤ آؤ۔“ انہوں نے اسے برآمدے میں رکھے تخت پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی قریب رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئے۔

”میں تمہارے کھانے کو کچھ لاتی ہوں۔“ احمد کمال کی والدہ نے اسے تخت پر بٹھاتے ہوئے کہا اور وہ باورچی خانے کی طرف چلی گئیں۔

”میں خاص طور سے آپ سے ملنے آئی ہوں۔“ فرناز نے اسحاق احمد سے کہا۔

”میری خوش قسمتی ہے ورنہ تمہارا باپ تو مجھے بات کرنے کے قابل نہیں سمجھتا۔“ اسحاق احمد نے ہنستے ہوئے کہا پھر وہ سنجیدہ ہو گئے۔

”مجھے اطلاع ملی ہے کہ تمہارے گھر کو آگ لگا دی گئی تھی۔ اس روز ہمارے علاقے میں بھی خاصا ہنگامہ تھا۔ احمد کمال بھی گھر پر موجود نہیں تھا چنانچہ میں تمہاری طرف نہ جا سکا بعد میں گیا تو پتا چلا کہ تمہارے کزن کیپٹن اسیر الدین تم لوگوں کو یہاں سے لے گئے ہیں میں یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا کہ تم اپنوں میں ہو۔“

”جی انکل۔“ فرناز نے کہا وہ اسحاق احمد کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔

”انکل آپ کو معلوم ہے احمد کمال کہاں ہے۔“

”میں اس کے لیے خود پریشان ہوں۔“ اسحاق احمد نے کہا ان کے لہجے میں افسردگی تھی۔

”میں احمد کمال سے مل کر آئی ہوں۔“ فرناز نے کہا تو اسحاق احمد حیرت سے اس کا منہ تکتے لگے۔

گرم کپڑے نہیں تھے وہ پانچ پانچ اور چھ چھ کی ٹولیوں میں ایک دوسرے سے چمٹے بیٹھتے تھے تاکہ ان کے جسموں کی گرمی انہیں زندہ رکھ سکے وہ بھوکے تھے اور کمزور ہو چکے تھے یہ سب دیکھ کر فرناز کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں اس کے بعد وہ واپس ایریا کمانڈر کے خیمے میں آگئے تھے جہاں دوراب بٹ نے فرناز کو ہدایت کی کہ وہ ہندو وارہ جائے اور وہاں اسحاق احمد سے ملے جو احمد کمال کے والد ہیں دوراب بٹ نے اسے ایک پرستے پر اپنا پیغام لکھ کر دیا اور فرناز نے وہ پرچہ سنبھال کر رکھ لیا۔

”فرناز اب ہمارا سارا انحصار تم پر ہے۔“ دوراب بٹ نے کہا۔

”میں آپ کو مایوس نہیں کروں گی۔“ فرناز نے جواب دیا تو دوراب بٹ نے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی پھر وہ اسے رخصت کرنے کی جیب تک آیا تھا جو کچھ دیر پہلے وہاں پہنچی تھی۔

”احمد کمال خدا حافظ۔“ فرناز نے جیب میں بیٹھنے کے بعد بے ساختہ احمد کمال کا ہاتھ چومتے ہوئے کہا۔

”فرناز میں نے تمہیں بہت نظر انداز کیا لیکن اب میں اس کا تدارک کروں گا۔“ احمد کمال نے جذبات سے لبریز آواز میں کہا۔

”ابھی ان باتوں کا وقت نہیں ہے احمد کمال یہ باتیں اس وقت کے لیے اٹھا رکھو جب تم فتح مند ہو کر واپس آؤ گے تب مجھے بتانا کہ میرے لیے تمہارے جذبات کیا ہیں؟“ فرناز نے کہا پھر اس نے ڈرائیور کو چلنے کا اشارہ کیا اور جیب آگے بڑھ گئی۔

اسحاق احمد کے گھر میں جب اس نے قدم رکھا تو سہ پہر ہو چکی تھی۔

”ارے فرناز تم تمہیں تو دیکھنے کو آنکھیں ترس گئی



”فرناز تم لڑکی نہیں ہمارا بیٹا ہوا احمد کمال نے کتنی غلطی کی کہ فریال کو چاہا کاش وہ تمہیں اپنی زندگی کا ساتھی بناتا۔“ احمد کمال کی والدہ نے کہا اور فرناز کی نظریں جھک گئیں۔

”اب تم کہاں جاؤ گی؟“

”میں فریال کے پاس واپس جاؤں گی۔“

”لیکن موسم خراب ہے ایک دو روز یہیں رک جاؤ۔“

”نہیں مجھے جانا ہے وہ اکیلی ہوگی۔“ فرناز نے جواب دیا۔

پھر وہ زیادہ دیر وہاں نہیں رکی چائے پیتے ہی واپسی کے لیے روانہ ہو گئی تھی۔

دو دن کی مسافت طے کر کے جب وہ فریال کے پاس پہنچی تو ایک نئی مصیبت اس کے لیے منہ کھولے کھڑی تھی۔ فریال کا رنگ زرد پڑ گیا تھا اور وہ بہت کمزور نظر آ رہی تھی۔

”فریال کیا بات ہے؟“ فرناز نے پوچھا۔

”فرناز بصیر نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔“ فریال نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

”کیا تمہیں چھوڑ دیا ہے؟“ فرناز نے حیرت سے کہا۔

”ہاں فرناز کل اطلاع آئی کہ انکل نصیر کا انتقال ہو گیا میں نے جب اس سے کہا کہ اب ہم واپس

امت ناگ جائیں گے اور سب کو بتا دیں گے کہ ہم شادی کر چکے ہیں تو اس نے کہا کہ وہ مجھے بیسی عورت کو

اپنی بیوی کہنا بھی باعث شرم سمجھتا ہے اور..... اور نے مجھے بتایا کہ وہ شادی شدہ ہے اس کی بیوی اور دو بچے

ہیں یہ شادی بھی اس نے انکل سے چھپ کر کی تھی لیکن اسے اپنی پہلی بیوی سے محبت ہے وہ مجھ سے

حیل رہا تھا۔ فرناز وہ مجھ سے حیل رہا تھا۔“ فریال

”کیا، کیا تم وہاں گئی تھیں۔“

”جی لیکن میں خاص طور سے اس سے ملنے نہیں گئی تھی بلکہ فریال کے ساتھ تھی۔“

”فریال کے ساتھ کیا وہ اب بھی احمد کمال سے اتنی محبت.....!“

”نہیں انکل یہ بات نہیں ہے۔“ فرناز نے اسحاق احمد کی بات کاٹ دی۔ ”اس نے احمد کمال کو کبھی بھی

اتنی شہرت سے نہیں چاہا اس نے حالات کا رخ دیکھتے ہوئے کمپنیشن بصیر سے خفیہ طور پر شادی کر لی ہے کمپنیشن

بصیر کو اس علاقے میں خاص مشن پر بھیجا گیا ہے جہاں احمد کمال بھی ہے اور فریال بصیر کے بغیر نہیں رہ سکتی

چنانچہ وہ مجھے اپنے ساتھ وہاں لے گئی۔ مجھے سن گئی تھی کہ احمد کمال ان وادیوں میں ہے اور میں نے اسے

ڈھونڈھ نکالا۔ انکل اس کی اور اس کے ساتھی مجاہدوں کی حالت بہت ناگفتہ بہ ہے یہ اس کے ایریا کمانڈر

دوراب بٹ نے آپ کے لیے پیغام دیا ہے۔“ اس نے اپنے لباس میں سے پرچہ نکال کر اسحاق احمد کو دیا

اور وہ اسے فوراً پڑھنے لگی۔

”اوہ، فرناز تم واقعی سونا ہو۔ میں نے تمہیں ہمیشہ صحیح سمجھا ہے تم نے بہت بڑا کام کیا ہے۔ تمہاری

بدولت احمد کمال اور اس کے ساتھی پھر ان شاء اللہ زندگی کی طرف لوٹ آئیں گے۔ تم بیٹھو میں باقی کمان سے

مشورہ کر کے سب کچھ سنبھال لوں گا۔“ اسحاق احمد نے کہا اور بغیر کسی تاخیر کے گھر سے نکل گئے۔

”ارے تم اکیلی بیٹھی ہو احمد کے ابو کہاں ہیں؟“

احمد کمال کی والدہ نے پوچھا جو مڑے اٹھائے بمائدے میں آئی تھیں۔

”آپ یہاں بیٹھیں میں آپ کو بتاتی ہوں۔“

فرناز نے کہا پھر اس نے احمد کمال کی والدہ کو ساری بات بتا دی۔



نے روتے ہوئے کہا۔

”چپ ہو جاؤ فریال، تم نے بھی تو اپنی قدر کھودی تھی تم کسی ایک ڈال پر آشیانہ نہیں بنا سکیں۔ احمد کمال تم سے سچی محبت کرتا تھا لیکن تم نے دولت اور مرتبے کے لیے اسے ٹھکرا دیا اور آج بصیر الدین نے تمہیں آسمان سے زمین پر پھینک دیا۔ چپ ہو جاؤ رونے سے کوئی فائدہ نہیں۔ صبح ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے میں تمہیں انکل اسحاق احمد کے گھر لے چلوں گی پھر وہاں سے ہم اپنے امی ابو کے پاس جائیں گے۔ اللہ بہت بڑا ہے ہم مایوس مت ہو۔ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔“ فرناز دیر تک اسے دھیرے دھیرے سمجھاتی رہی اور فرناز سسکیاں لیتے ہوئے سو گئی۔

فرناز کی بھی آنکھ لگ گئی تھی لیکن کچھ ہی دیر بعد دھماکے سے اس کی آنکھ کھل گئی تھی پہلے تو اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا لیکن دوسرے ہی لمحے فریال کا جسم فرش پر پڑا دیکھ کر وہ ہڑا کر اٹھ بیٹھی فریال کے ایک ہاتھ میں بصیر کا پستول تھا اس کی کنپٹی سے خون کی لکیر بہہ رہی تھی فرناز سر پکڑ کر اس کے قریب بیٹھ گئی۔ اس کی بہن بھی اس کا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔

”میں تمہارا بدلہ لوں گی فریال میں بصیر کو جین سے نہیں بیٹھنے دوں گی۔ تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا وہ تو بہت کم ہے یہاں نجانے کتنے فدائین کشمیر بھارتی فوجیوں اور پٹھوؤں کے ظلم کا نشانہ بنے بے یار و مددگار پڑے ہیں۔ میں نے جو جدوجہد آزادی کو کامیاب بنانے کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی ہے“ فرناز کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور وہ بے خودی کے عالم میں بولے جا رہی تھی۔

تقریباً ایک ہفتے بعد جب وہ دوبارہ پہاڑی وادیوں میں احمد کمال سے ملی تو وہاں کی حالت ہی بدلی ہوئی تھی رضا کار مداخلت جانے کے بعد بہت پر

جوش تھے ان کے پاس گرم لباس، جوتے، راشن اور اسلحہ سب کچھ تھا اسحاق احمد نے ہائی کمان سے امداد ملنے کے بعد تمام سامان پہنچوا دیا تھا ایریا کمانڈر، فرناز کا بہت مشکور تھا کہ اس کی کوششوں کی بدولت اس کے بہادروں کو نئی زندگی ملی تھی اس نے فرناز کی درخواست پر اسے اپنے ساتھیوں میں شامل کر لیا تھا۔ ”اب ہم دیکھیں گے کہ ہمیں آزادی حاصل کرنے سے کون روک سکتا ہے بھارتیوں نے ہندو واڑہ، اہنت ناگ اور دوسرے قصبوں میں ظلم کی انتہا کر دی ہے لیکن وہ ہماری تحریک کچلنے میں ناکام رہے ہیں انہوں نے بہت سے کشمیریوں کو بے گھر کر دیا ہے اور ہزاروں کو ہلاک کیا ہے۔“ فرناز سے دور اب بٹ نے کہا۔

”اس بے سروسامانی کے عالم میں جب آپ کی سپلائی رکی ہوئی تھی آپ تک حالیہ اطلاعات نہیں پہنچ رہی تھیں۔“ فرناز نے دور اب سے پوچھا۔

”ہاں تمہاری مدد کے بعد جب سپلائی پہلی بار بحال ہوئی تو اس کے ساتھ ہی یہ اطلاع بھی ملی کہ اب بھارتی فوجی کشمیریوں کے مکانوں اور دکانوں کو آگ لگا رہے ہیں۔

27 اکتوبر کو انہوں نے ایک گھناؤنا ڈرامہ کھیلا اہنت ناگ میں فائر بریگیڈ کے سربراہ شہید عباسی کو اطلاع ملی کہ کپڑا چوک پر آگ لگی ہوئی ہے۔ وہ اپنی ٹیم کے ہمراہ موقع پر پہنچے مگر بھارتی فوجیوں نے ان کا استقبال گولیوں سے کیا دو گولیاں فائر بریگیڈ کے ایمل کار غلام محسن کو لگیں جب فائر بریگیڈ کی گاڑی وہاں پہنچی تو بھارتیوں نے اس پر قبضہ کر کے اسے تباہ کر دیا بھارتی فوجی کشمیر کے گلی کوچوں میں آزادانہ گھومتے ہیں وہ پیٹرول ساتھ رکھتے ہیں اور جو مکان جلنے سے بچ جائیں ان پر پیٹرول چھڑک کر آگ لگا دیتے ہیں



”اس ذکر کو چھوڑو فرناز، تمہیں پتا ہے کہ تم کتنی اچھی ہو۔“ بصیر نے نئی چال چلی۔

”بکومت مجھ سے چالاکی نہیں چلے گی میں جانتی ہوں تم کیا ہو، ایک فریال ہی کیا تمہارے ہاتھوں بہت سی عورتیں موت کے گھاٹ اتری ہیں تمہارے جیسے کئی فوجیوں نے میری بہنوں اور میری دھرتی کی بہنوں کی عصمت دری کر کے انہیں درپائے جہلم میں پھینک دیا ہے میں تم جیسے شخص کو معاف نہیں کر سکتی۔“ فرناز نے کہا اور بصیر پر فائر کر دیا اسی لمحے وہ زمین پر گر پڑا اور تڑپنے لگا کچھ ہی دیر بعد اس کا جسم بے جان ہو گیا تھا۔ فرناز چند لمحے اسے دیکھتی رہی اور پھر اسے حقارت سے دیکھتی ہوئی آگے بڑھ گئی ابھی چند قدم ہی آگے گئی تھی کہ چند فوجی اسے راہداری کی طرف آتے دکھائی دیے ان کی نظریں فرناز اور بصیر کی لاش پر تھیں انہوں نے شاید فرناز کی رائفل کے فائر کی آواز سن لی تھی ان میں سے ایک فوجی نے اپنی رائفل سے فرناز پر گولی چلا دی گولی فرناز کے بازو پر لگی اور لڑکھڑا کر گر گئی۔ اس کے ساتھ ہی فرناز کے عقب سے کسی نے مشین گن سے ان فوجیوں پر فائر کھول دیا لیکن فرناز اس سے زیادہ نہیں دیکھ سکی اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا اچھا گیا تھا۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ ایک تاریک کمرے میں ایک بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی اس کے بازو کے علاوہ سر پر بھی پنی بندھی ہوئی تھی اس کے قریب ایک کرسی پر احمد کمال بیٹھا ہوا تھا۔

”احمد کمال میں..... میں تو..... میں تو میرا خیال ہے مجھ پر بھارتی فوجیوں نے گولی چلائی تھی۔..... پھر..... پھر کیا ہوا.....؟“ فرناز نے اپنے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”پھر میں وہاں پہنچ گیا تھا میں نے مشین گن

یعنی شاہدوں کا کہنا ہے کہ وہ کہتے ہیں ”دیکھو..... آزادی دیکھو..... یہ تمہاری آزادی ہے۔“

ایریا کمانڈر دراب بٹ کی کمان میں فرناز بھی شامل ہو گئی تھی اور اکثر موقعوں پر حریت پسندوں کے ساتھ ہوتی تھی ایسے ہی ایک موقع پر کیپٹن بصیر بھی اس کے ہاتھ لگ گیا تھا اس روز حریت پسندوں نے ایک سرکاری عمارت کو نشانہ بنایا تھا اور اس حملے کے بعد جب وہ واپس جا رہے تھے تو اس عمارت ہی کی راہداری میں فرناز اور کیپٹن بصیر کی مڈ بھڑ ہو گئی بصیر اس وقت نہتا تھا اور فرناز کے ہاتھ میں رائفل تھی جو اس نے بصیر پر تان لی بصیر کے بازو سے خون بہہ رہا تھا۔

”اوہ فرناز..... تم..... تم تو میری کزن ہو..... ہے نا تم..... تم تو بہت اچھی ہو..... میں دراصل..... میں تمہیں.....!“

”بکو اس بند کرو۔“ فرناز اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی چیختی۔

”میں فریال نہیں ہوں جو تمہاری بکو اس پر یقین کر لوں تم نے اس کا دل توڑ دیا اور اس نے خود کشی کر لی کیا میں تمہیں معاف کروں گی۔“ فرناز نے غصے سے کہا۔

”دیکھو فرناز میری بات سنو، میرا ارادہ اس سے اس طرح علیحدہ ہونے کا نہیں تھا یقین کرو میں نے سوچا تھا کہ میں اسے آہستہ آہستہ علیحدگی کے بارے میں بتاؤں گا۔“ بصیر نے کراہتے ہوئے کہا اس نے سیدھے ہاتھ سے اپنا پایاں بازو پکڑا ہوا تھا۔

”وہ تمہاری قانونی بیوی تھی۔ اسے یوں بلا وجہ چھوڑنے کا تمہیں حق نہیں تھا۔“ فرناز نے کہا۔

”تو اس نے تمہیں شادی کے بارے میں بتا دیا؟“ بصیر نے کہا۔

”تمہارا خیال ہے کہ اسے نہیں بتانا چاہیے تھا؟“



سے ایک ہی برسٹ مارا اور ان فوجیوں کو ٹھکانے لگا دیا پھر میں تمہیں یہاں لے آیا اب تم محفوظ ہو۔“ احمد کمال نے اسے بتایا۔

”محفوظ“ فرناز کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ ابھری۔

”بے سرو سامانی کے عالم میں اپنی ہمت سے زیادہ کام کر رہے ہیں لیکن آخر کب تک اس طرح لڑیں گے ہماری مدد کرنے والا کوئی نہیں ہم تنہا ہیں۔“ فرناز نے اداسی سے کہا۔

”نہیں فرناز یہ بات نہیں ہے حالات بدل رہے ہیں۔ اب ہم اکیلے نہیں ہیں اب بہت سے بھارتی عوام بھی ہمارے ساتھ ہیں۔“

”بھارتی عوام؟“ فرناز نے حیرت سے پوچھا۔  
 ”ہاں بھارت میں رہنے والے سکھ خاص طور پر وہ بھی ہماری طرح اپنی آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں بھارتی حکومت نے ان کا بھی جینا حرام کیا ہوا ہے اور انہوں نے بھی ایک علیحدہ آزاد ملک کا مطالبہ کر دیا ہے۔“

”کیا واقعی؟“ فرناز نے حیرت سے کہا۔  
 ”ہاں، اس کے علاوہ میں نے خبریں سنی ہیں پاکستان میں بھی عوام کی طرف سے ہمارے حق میں مظاہرے ہو رہے ہیں اور پاکستانی عوام مطالبہ کر رہے ہیں کہ اقوام متحدہ بھارت کو مجبور کرے کہ وہ اس قرارداد پر عمل کریں جس میں کشمیریوں کو ان کا حق رائے دہی دینے کا کہا گیا ہے۔“ احمد کمال نے بتایا۔  
 ”اوہ احمد..... کیا یہ سب کچھ سچ ہے۔“ فرناز نے کہا۔

”ہاں فرناز یہ سب کچھ سچ ہے۔ بھارت کے شہروں علی گڑھ اور حیدرآباد میں کرفیو کے باوجود فرقہ وارانہ فسادات جاری ہیں ہندوؤں نے مسلمانوں کی

مسجدوں کو شہید کرنا شروع کر دیا ہے اور مسلمان ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں دوسری طرف آزاد کشمیر میں بھی بھارت کا جارحانہ رویہ سنگدانہ ہے اور اب ہماری جدوجہد آزادی ہمارے لیے آسان ہو جائے گی۔ اب ہم اکیلے نہیں ہیں۔“

احمد کمال کی آواز میں جوش تھا۔  
 ”واقعی تم سچ کہہ رہے ہو؟“

”ہاں تم خود دیکھ لینا ابھی کچھ دیر میں ریڈیو سے آزاد کشمیر کی ایک اہم شخصیت کی تقریر نشر ہونے والی ہے تم خود ہی سن لینا۔“ احمد کمال نے کہا پھر اس کے قریب رکھا ہوا ریڈیو آن کر دیا اور کچھ دیر بعد تحریک آزادی کے رہنما کی تقریر نشر ہونے لگی جس کے دوران فرناز کے چہرے پر سکون پھیلتا گیا اور ہونٹوں پر پراطمینان مسکراہٹ کھیلنے لگی تقریر ختم ہوئی تو اس کے کانوں میں احمد کمال کی تیشھی آواز اتری۔

”فرناز.....!“ احمد کمال کے لہجے میں وہ پیار تھا جس کی آرزو فرناز ہمیشہ سے کرتی تھی۔  
 ”ہوں۔“

”عروں آزادی اب ہم سے زیادہ دور نہیں اس سے ہمکنار ہونے پر تم میری بن جاؤ گی فرناز، یہ ہمارے لیے عروں آزادی کی سوغات ہوگی۔“ احمد کمال نے کہا اور فرناز نے شرما کر نظریں جھکا دیں اسے اپنے ارمانوں کی منزل مل گئی تھی۔





# ذوقِ آگاہی

## سب سے گل

(اس ماہ کا انعام یافتہ اقتباس)

### کچھ باتیں یاد رکھنے کی

☆ ماں سے بہترین کوئی دوست نہیں۔ ماں ماں بھی ہوتی ہے اور اولاد کی بہترین دوست بھی۔  
☆ اپنے آنسوؤں کو سنبھال کر رکھنا یہ تنہائی کے ساتھی ہوتے ہیں۔

☆ کسی کو بھی رُلا ناست کیونکہ اگر تم نے کسی کو رلایا تو کل کو تم کو بھی کوئی ضرور رلائے گا۔

☆ جسم پر لگے ہوئے زخموں کا علاج تو ہو سکتا ہے لیکن دل کے زخموں کا علاج ناممکن ہے۔

☆ دنیا کے اس بازار میں سب چیزیں تو خریدی جاسکتی ہیں لیکن ماں باپ، بہن بھائی دوستی اور محبت ایسا رشتہ ہے جو بازار سے نہیں خریدار جاسکتا۔

☆ زندگی بہت کم ہے دوسروں سے نفرت کی بجائے محبت کرنا سیکھو۔

☆ اگر کسی کو خوشیاں نہیں دے سکتے تو اسے دکھ بھی مت دو۔

☆ دوسروں کی خامیوں پر نظر رکھنے سے بہتر ہے کہ انسان اپنے اندر اچھائیاں پیدا کرے تاکہ وہ بھی دوسروں کی نظروں میں معتبر بن جائے۔

☆ دوستی بہت پاکیزہ رشتہ ہے اس پر کیچڑ مت اچھالو۔

☆ رات کو سونے سے پہلے اپنے گناہوں کی معافی مانگ لیا کرو کیونکہ ہو سکتا ہے کہ تمہیں موت آجائے کیونکہ موت کسی کا انتظار نہیں کرتی۔

عبید ایوب..... میر پور خاص

### اللہ کی شان

میں بھی کتنا "عجیب" ہوں!

صحت یاب ہوں تو "اللہ پاک" کو بھول جاتا ہوں۔

مصرف ہوں تو "تمناز" بھول جاتا ہوں۔

برائی کروں تو "انجام" بھول جاتا ہوں۔

دیکھوں کو "حیا" بھول جاتا ہوں۔

کھاتا ہوں تو "بسمہ اللہ" بھول جاتا ہوں۔

کھالوں تو "الحمد للہ" کہنا بھول جاتا ہوں۔

کسی سے ملوں تو "سلام" بھول جاتا ہوں۔

سوتے ہوئے "توبہ" بھول جاتا ہوں۔

غصے میں ہوں تو "برداشت" بھول جاتا ہوں۔

سفر پر جاؤں تو "دعا" بھول جاتا ہوں۔

کیا شان ہے میرے "اللہ پاک" کی وہ پھر بھی مجھے

نوازتا ہے اور مجھے نہیں بھولتا۔ سبحان اللہ۔

فائقہ سکندر حیات..... لنگڑیال

### سنہریے بول

☆ بے وجہ دعائیں دینے والی ہستی صرف ایک ہے اور وہ ہے ماں۔

☆ جب دوست مانگے تو کل کا سوال ہی نہیں۔ (ہر برٹ)

☆ جو لوگ تعریف کے بھوکے ہوتے ہیں وہ باصلاحیت نہیں ہوتے۔ (پلوٹارچ)

☆ پیش کرنے کا انداز تحفے سے زیادہ قیمتی ہے۔ (پیری کارنیل)

☆ سوال سے خودی ضعیف ہوتی ہے۔ (علامہ اقبال)

☆ لہجے کا اثر الفاظ سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ (الغزالی)

☆ انتخاب: اکبر چوہدری..... گجرات

### معلومات

+ انسانی بدن میں پسلیوں کے 12 جوڑ ہوتے ہیں۔

+ انسانی ہاتھ میں 27 ہڈیاں ہوتی ہیں۔

+ انسانی جسم میں تقریباً پچیس لاکھ مساموں کی تعداد ہے۔

+ انسانی سر میں تقریباً پندرہ ہزار بال ہوتے ہیں۔

اگست ۲۰۱۵ء



کشمور شاہین..... جھنگ صدر

## سہنری اقوال

• جو لوگ صبح کو فیصلے کرتے اور شام کو بھول جاتے ہیں وہ زندگی میں کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔  
• زندگی کو سادہ مگر خیالات سے بلند رکھو۔  
• بے وقوف کی پہلی نشانی یہ ہے کہ وہ خود کو واحد عقل مند سمجھتے ہیں۔  
• تنہائی میں اپنے خیالات پر اور محفل میں اپنی زبان پر کنٹرول رکھو۔

شاہد دیز..... راولپنڈی

## قیمتی موتی

☆ دوست سو بھی تھوڑے ہوتے ہیں دشمن ایک بھی بہت ہوتا ہے۔  
☆ ایک اچھا دوست اگر سو بار بھی رو نہ لے تو ہر بار مناؤ کیونکہ قیمتی موتیوں کی مالا جتنی بار بھی ٹوٹے اسے ہر بار پروا پڑتا ہے۔  
☆ دوستی کا رشتہ نازک کچے دھاگے کی طرح ہوتا ہے دھاگانوٹ جاتا ہے مگر اس میں گرہ آ جاتی ہے۔  
☆ ہر شخص سچا دوست تلاش کرتا ہے لیکن سچا دوست بننے کی رحمت گوارا نہیں کرتا۔

ماہ نور..... لاہور

## جمعہ کی سنتیں

اچھا لباس.....

غسل.....

خوشبو.....

مسواک.....

مرمہ.....

سورۃ کہف کی تلاوت۔

گل فاطمہ..... گوجرانوالہ



• انسان کے مرنے کے بعد اس کا دماغ 2 سے 4 گھنٹے تک کام کرتا ہے۔

• انسانی جسم میں 61 فیصد حصہ پانی ہے۔

• انسانی آنکھ ایک منٹ میں 25 بار پلک جھپکتی ہے۔

سیدہ زینب..... ملتان

## جدید اقوال

• گھنٹہ ساٹھ منٹ کا ہوتا ہے لیکن لوڈ شیڈنگ کا گھنٹہ ایک سو ساٹھ منٹ کا ہوتا ہے۔  
• پاکستان میں عوام حکمران پالتے ہیں۔  
• لیڈر شیڈنگ شروع ہوگی تو لوڈ شیڈنگ ختم ہوگی۔  
• ہم نے پچھلے سال سے خیالی پلاؤ کی دیکیں چہ ہمارے ہیں اور احمقوں کی جنت میں ہر خوان بچھائے ہوئے ہیں۔  
• ہمارے اعضاء ہمارے خلاف وعدہ معاف گواہ ثابت ہوں گے اس لیے اپنے اعضاء سے چھپ کر گناہ کرو۔  
• سرگوشی سسکی اور چیخ سسکی بہنیں ہیں۔  
• بدبو کی ریح خوشبو سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے۔  
• کوئلہ صابر نہ ہوتا تو کبھی ہیرا نہ بنتا۔

مشاہیر: حسن ثار

انتخاب: حماد خان..... ضلع لیاقت پور

## انمول موتی

• تیرا نفس تجھ سے وہی کام کرائے گا جس کے ساتھ تو نے اسے مانوس بنایا ہے۔ (حضرت علیؓ)  
• تمہاری عمر روزانہ مسلسل کم ہوتی جا رہی ہے تو پھر تیئیسوں میں کیوں سستی کرتے ہو۔ (حضرت عمر بن العزیز)

• انسان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ اپنا دل اور زبان کو قابو میں رکھے۔ (امام محمد غزالی)

• علم ایک ایسا بادل ہے جس سے رحمت ہی رحمت برتی ہے۔ (حضرت بابا فرید شکر بنج)

• اس آدمی تو لیا مہی کا مجموعہ ہے جب ایک روز نہ ر جائے تو یوں سمجھ تیری زندگی کا ایک حصہ بھی مزر گیا۔

(حضرت حسن بصری)



## خوشبو سخن

نوشین اقبال نوشی

(اس ماہ کا انعام یافتہ کلام)

غزل

بھ گئی تھی شمع جو اسے پھر سے جلاؤں گا  
امید خدا پر ہے کہ کچھ کر کے ہی جاؤں گا  
دورخ میں نہیں میرے کچھ خوف نہ کرنا تم  
یک طرفہ آئینہ ہوں برعکس دکھاؤں گا  
بے نیازی طبیعت میں حد درجہ ہے لیکن دوست  
گر قول دیا ہے تو سر کے بھی نبھاؤں گا  
جرم اپنا خود ہی تم تسلیم کرو ورنہ  
میں بولا تو پھر سارے جگ کو سناؤں گا  
اجازت ہے تمہیں پوری من مرنی کرو اپنی  
جتنا مجھے بھولو گے یاد اتنا ہی آؤں گا  
وہ حامی تو بھرے فاروق کتا گے گا میرے گھر  
میں خود کو بیچ کر اپنا گھر سجاؤں گا  
عمر فاروق ارشد..... فورٹ عباس  
بے سبب باتیں

بہت سی بے سبب باتیں  
یونہی آغاز ہوتی ہیں  
جو اکثر تم سے کہتا ہوں  
کھانا کھا لیا تم نے

باہر نہ جانا آج گرمی بہت  
سنو آج موسم کیسا ہے  
خدا حافظ کچھ کہنا تو نہیں

اور  
بارش میں بھیکنا مت  
تھیں بیمار کر دے گی

اور  
اس تمہید میں جاؤں

کچھ بھی بے سبب نہیں ہوتا  
گزر جاتے ہیں جب لمحے  
بیت جاتے ہیں سب لمحے  
میری سوچوں میں ایک جملہ محفوظ رہتا ہے  
جانے کب کہوں گا میں  
انہی بے سبب باتوں میں  
مجھے تم سے محبت ہے  
بہت زیادہ محبت ہے

ریحانہ سعیدہ..... لاہور

غزل

میرے دل کی بستی اجاڑ کر جانے والے  
کبھی نہ بھلا سکوں گا تجھے مجھ کو بھلانے والے  
دن کو ترپتا ہوں راتوں کو غیند نہیں آتی  
تو بھی نہ سکوں پائے گا مجھ کو ستانے والے  
ایسا جلایا دل کہ جلتا ہی رہتا ہے  
تیرا دل رہے سلامت میرا دل جلانے والے  
میں بھاگتا ہوں تیرے پیچھے تو کرتا ہے بہانے  
خوش رہے تو ہمیشہ مجھ سے جان چھڑانے والے  
کبھی کھیلتا ہے کبھی توڑ دیتا ہے میرا دل  
بنے تو رحماں مجھ پر ستم ڈھانے والے  
میں ہوں وفا کا پیکر کروں گا وفا عمر بھر  
بنے تو وفا دار مجھ کو بے وفا کہنے والے  
ڈاکٹر خادم حسین کھوکھر

غزل

ظلم کی تمثیل باقی ہے ابھی  
درد کی تشکیل باقی ہے ابھی  
مجھ کو رسوائی ملی ہر موڑ پر  
کیا میری تذلیل باقی ہے ابھی  
عصمت انسانیت لنتی رہی  
کیا کوئی کھیل باقی ہے ابھی  
ہم جہاں ملتے رہے ہیں عمر بھر  
گاؤں میں جھیل باقی ہے ابھی

اگست ۲۰۱۵ء



ایک ہی رخ سے مجھے رانا بڑھا  
تھہریے! تفصیل باقی ہے ابھی  
قدیر رانا..... راولپنڈی

سپنوں کا چاند نیچے کی طرح مجھ سے چھپتا ہے  
ہر پھول، ہر گل تجھے دیکھ کر خوشبوؤں کی مہک بکھیرے  
بھنورے قطار در قطار تیرے چہرے کا طواف کرتے  
اماؤں کی راتوں میں

ملاقات کی خواہش کو زندہ کیا  
تمہاری طبیعت پر شاعری کی کتاب لکھنے کو من چاہا  
لیکن، ہاں مگر  
میں بھول گیا میرے نصیب میں تو ازل سے گروش ہے  
من کے تاج محل میں دائمی لرزش ہے  
اچانک کوئی اجنبی تجھے اپنے ساتھ لیے  
ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلا گیا  
اور میں  
وہیں کا وہیں رہ گیا

ساحل ابڑو..... بلوچستان  
لحہ.....!

اک لحہ جو  
گزرے تو پل میں گزر جائے ہے  
اور جوڑے کے تو  
طویل صدیوں پر محیط ہو جائے ہے  
اس اک لمحے میں کچھ بھی ممکن ہے  
کبھی خوشی کے بے کراں سمندر ملتے ہیں  
تو کبھی دکھ کے طویل سلسلے  
کبھی لمن رت کی خوشیاں  
تو کبھی جدائی کے حائل طویل فاصلے  
بس اک "لحہ" پر منحصر ہے  
زندگی انسان کی  
وہ اک لحہ جو  
یوں بھی گزرتا ہے  
کہ خوشی ملے تو جلدی  
اور غم ملے تو طویل

مینا سید..... قصور

غزل  
لب پہ جو آرزو نہیں آتی  
گھر پر فوج عدو نہیں آتی  
احتراماً خموش ہیں ہم لوگ  
ورنہ کیا گفتگو نہیں آتی  
لاکھ کھنچوائے تصویر مگر  
ہاں کبھی ہو بہو نہیں آتی  
بے ادب لاکھ کاوشیں کر لے  
پر بزرگوں کی خو نہیں آتی  
چھیننے میرے دل کے تاروں کو  
کیوں نظر روز تو نہیں آتی  
اپنی ناکامیاں یہ کہتی ہیں  
کہ ہمیں جستجو نہیں آتی  
سچ تو ہر بات ہے مگر نیر  
دل کے جلنے کی بو نہیں آتی  
نیر رضوی..... لیاقت آباد، کراچی

سپنوں کا چاند  
تم جو مجھ سے مسکرا کر الوداع کرتے  
ہم زندگی کی اس کتاب سے محروم نہ ہوتے  
تھامر مائی بادلوں کا پہرہ آسمان پر  
شام سندر زرا لی تھی  
مغرب کنارے سورج کی کرنیں  
جیسے تمہارے لبوں کی لالی تھی  
مدہوش جوانی، چاندنی بدن  
سرخ لباس، چوڑیاں کی کھٹکناہٹ  
محبت کی تلاش  
نئی دنیا، نئی کائنات  
کہاں او جھل ہیں تم سے حالات  
میرے دل کا سورج تم سے اجازت لے کر طلوع ہوتا





SCA

READING  
Section



## فلسطین

### الماس ایم ای

بیت المقدس مسلمانوں کا قبلہ اول ' وہ شہر جہاں ہمارے  
پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ والہ وسلم معراج پر  
تشریف لے گئے۔ وہ شہر جسے سیکڑوں نبیوں نے اپنی آخری آرام  
گاہ کے طور پر چنا۔ وہ شہر جو تین مذاہب کے ماننے والوں کے لیے  
مقدس ترین ہے۔

اسی تاریخی شہر کے پس منظر میں لکھا جانے والا ایک ایسا  
ناول جسے آپ بار بار پڑھنے پر مجبور ہو جائیں گے۔  
الماس ایم ای کے قلم سے تاریخی کہانیاں پسند کرنے والوں کے  
لیے بطور خاص۔



READING  
Section

SCANNED BY AMIR



خوفزدہ ہوئے کہ انہوں نے لڑے بغیر شہر خالی کر دیا۔ شاہ فرانس دمیاط پر قبضہ کر کے آگے بڑھا مگر مصری لشکر ابھی صلیبیوں سے خبر نہ آتا تھا لیکن سلطان مصر کا انتقال ہو گیا۔ ملک الصالح کا بیٹا توران شاہ دار السلطنت سے باہر تھا لیکن ملک الصالح کی بیوی شجرۃ الدر نے دانائی سے کام لیتے ہوئے ملک الصالح کی موت کو پوشیدہ رکھا۔ اہم اہم عہدے داروں کو اعتماد میں لیا اور ملک الصالح کے نام سے احکام جاری ہوتے رہے۔

کچھ ہی دن گزرے تھے کہ ملکہ کو سلطانی افواج کے دریائے نیل کے کنارے پسپا ہونے کی خبر ملی۔ اُس نے فوراً ملک بھرس کو ایک لشکر کے ساتھ میدان میں بھیجا۔ اس لشکر نے میدان میں پہنچتے ہی جنگ کا پانسہ پلٹ دیا۔ پندرہ سو صلیبی گرفتار ہوئے۔ ہزاروں مارے گئے۔ صرف چند لوگ جانیں بچا کر دمیاط واپس پہنچ سکے۔ اس شکست نے صلیبیوں کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ شاہ لوئیس مسلمانوں کے حسب منشاء شرائط پر صلح کرنے پر تیار ہو گیا اور صلح نامہ تیار ہو گیا۔

اس معاہدہ کے بعد شاہ چار سال تک ساحل عکہ پر رہ کر یروشلم کو آزاد کرانے کے لیے تڑپا رہا اور آخر ۱۲۵۴ء میں نامراد واپس ہو گیا۔ اس جنگ میں تیس ہزار عیسائی مارے گئے۔ اس کے ۲۲ جہاز مسلمانوں نے پکڑے۔ خود شاہ لوئیس مع اپنے بھائی اور امراء لشکر کے مسلمانوں کے ہاتھوں قید ہوا اور دس ہزار زریر سرخ ادا کر کے رہائی حاصل کی۔

تاتاری اور فرنگی گٹھ جوڑ

ہلاکو خان کا تاتاری سیلاب ۱۲۵۷ء میں بغداد پہنچا۔ ظالم ہلاکو خان نے آخری عباسی خلیفہ مستعصم باللہ کو قالینوں میں لپیٹ دیا۔ اس طرح اس کا دم گھٹ گیا اور وہ مر گیا۔ دار الخلافہ کا سرنگا ہو گیا اور عظمت کا جھومر ماتھے سے گر گیا۔

پھر ۱۲۴۰ء میں ڈیوک آف کارلائل ساحل عکہ پر لشکر انداز ہوا اور فرانسیسی لشکر کے ساتھ یافا کی طرف بڑھا۔ اس وقت مصر اور دمشق میں ایک بار پھر ٹھن گئی تھی۔ یہاں تک کہ اہل دمشق نے صلیبیوں کے ساتھ مل کر مصر پر حملے کا فیصلہ کیا۔ سلطان نے طبرہ، عتقان اور بیت المقدس صلیبیوں کو دے کر صلح کر لی لیکن یہ قبضہ صرف دو سال رہا اور خوارزمیوں نے بیت المقدس کو بحال کر لیا۔

یہاں ”خوارزمی“ کی وضاحت ضروری ہے۔ پس جاننا چاہیے کہ خوارزمی وہ لوگ تھے جو چنگیز خان کے خوف سے خوارزم سے مصر بھاگ آئے تھے اور خانہ بدوشوں کی طرح ادھر ادھر پھرتے تھے۔ سلطان مصر نے انہیں پیش کش کی کہ اگر وہ صلیبیوں اور شامیوں کے خلاف اسے مدد دیں تو وہ انہیں آباد ہونے میں مدد دے گا۔ چنانچہ جب تاتاری غول بلاد فلسطین اور شام سے لوٹ گئے تو خوارزمی، ملک مصر کی فوجوں کے تعاون سے بیت المقدس پر قابض ہو گئے۔

اس سلسلے میں جو جنگ ہوئی اس میں سلطان دمشق اسماعیل نے عیسائیوں کا ساتھ دیا لیکن غزہ کے میدان میں ملک المصیر کے سالار رکن الدین بھرس کی قیادت میں رومی اور شامی فوجوں کو زبردست شکست ہوئی اور خوارزمی آگے بڑھ کر بیت المقدس پر قابض ہو گئے اور بیت المقدس سلطان مصر کے تابع ہو گیا۔ اس بار پھر یورپ میں کھرام برپا ہو گیا۔

ادھر پاپائے روم نے فرانس پہنچ کر صلیبی جہاد کی تبلیغ شروع کر دی اور القدس کے نام پر یورپ کے مختلف ممالک میں ”عشر“ وصول کیا جانے لگا۔ پس ۱۲۴۹ء میں صلیبی لشکر شاہ فرانس لوئیس کی زیر کمان ساحل عکہ پر اترا۔ مسلمان اس وقت باہمی جنگوں میں مشغول تھے۔ شاہ لوئیس کی آمد سے مسلمان اس قدر



کی۔ بحریہ کو ذلیل کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امراء نے  
توران شاہ کو ٹھکانے لگا دیا اور ملکہ شجر کو تخت پر بٹھا دیا۔  
ملکہ شجر نے اپنے سپہ سالار معز الدین سے شادی کر لی  
مگر معز الدین کو بھی جلد ہی قتل کر دیا گیا اور اس کے  
بیٹے کو تخت پر بٹھایا گیا۔ اس تمام عرصہ میں سردار بھیرس  
بندقدار نے جو ایک جرنیل تھا۔ سب حاکموں کی  
اطاعت اور فرماں برداری کی پھر جب نور الدین کے  
بعد سیف الدین قطر تخت نشین ہوا تو بھیرس بندقدار  
نے عمان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ پھر اس نے  
۱۲۶۳ء میں بامر اللہ کو خلیفہ قرار دے کر مصر میں عباسی  
خلافت کو زندہ کر دیا۔

غزہ میں شکست کھانے کے بعد صلیبیوں کے  
پاس ساحل سمندر پر صرف تیس قلعے بچ گئے تھے۔  
ملک لظاہر نے جب اندرونی حالات پر قابو پا لیا تو اس  
نے صلیبیوں پر کاری زخم لگانے کا فیصلہ کیا۔ تاریخ سے  
معلوم ہوتا ہے کہ سردار بھیرس بندقدار کو بھی صلاح  
الدین کی طرح ہر وقت جہاد کا خیال ستایا کرتا تھا۔  
چنانچہ اس نے ۱۲۶۵ء میں صلیبیوں سے قیصریہ، حیفہ  
اور ارسوف کے قلعے چھین لیے اور دوسرے سال یافا،  
مافورٹ، اٹھاکیہ اور بعض دوسرے قلعوں پر بھی  
قابض ہو گیا۔ جب یہ اطلاع یورپ والوں تک پہنچی تو  
شاہ فرانس لوئیس نہم نے بڑے پیمانے پر جنگی تیاریاں  
شروع کر دیں اور وہ ۱۲۷۰ء میں ٹیونس کے ساحل پر اترا  
مگر قدرت کا کرنا ایسا ہوا کہ اس کے لشکر کو طاعون نے آ  
گھیرا اور شاہ فرانس اس مرض سے مر گیا۔ اس مہم میں  
شاہ انگلستان بھی شریک تھا اور وہ عکہ پہنچ چکا تھا۔ جہاں  
اسے شاہ فرانس کی موت کی خبر ملی اور وہ بد دل ہو کر  
واپس چلا گیا۔

ادھر بھیرس بندقدار نے ۱۲۷۱ء میں حصن الاکراد  
اور عکہ کے سامنے ٹاؤن فورٹ کے قلعے بھی فتح کر

ہیر الدلیم لکھتا ہے۔  
”ابھی کچھ ہی عرصہ پہلے صلیبیوں نے مملوک مصر  
کے ہاتھوں شکست کھائی تھی۔ اس کا بدلہ انہوں نے  
اس طرح لیا کہ شاہ آرمینیا اور شاہ اٹھاکہ نے ہلاکو خان  
کو اکسایا کہ وہ مصر پر حملہ کرے اور خود بھی اپنا لشکر لے  
کر عکہ پہنچے۔ ہلاکو خان نے اسی تعاون اور دوستی کے  
تحت دمشق کی کئی مسجدوں کو عیسائیوں کے حوالے کر دیا  
جنہوں نے ان مسجدوں کو گرجوں میں تبدیل کر دیا۔ یہ  
۱۲۵۹ء کا زمانہ تھا۔ ابھی ہلاکو خان فلسطین کی سرحد تک  
پہنچ پایا تھا کہ اسے منگو خان خاقان اعظم کے مرنے کی  
اطلاع ملی۔ ہلاکو خان واپس ہو گیا مگر دس ہزار تاتاری  
عیسائیوں کی مدد کے لیے چھوڑ گیا۔ پس ہلاکو خان کی  
اس مدد کے زور پر عیسائی لشکر اور تیزی سے یروشلم کی  
طرف بڑھا مگر غزہ کے میدان میں الملک لظاہر بھیرس  
بندقدار نے عیسائیوں اور تاتاریوں کے متحدہ لشکر کو وہ  
مار ماری کہ وہ بلاد فلسطین اور شام سے نکل بھاگے۔  
بھیرس بندقدار نے آگے بڑھ کر دمشق پر قبضہ کر لیا اس  
سے اس کا ستارہ ساتویں آسمان پر چڑھ گیا۔ یہ واقعہ  
۱۲۶۰ء کا ہے۔

مملوک مصر:  
ملک لظاہر بھیرس بندقدار، ملک العادت کے  
پوتے ملک الصالح کا غلام تھا۔ جس وقت ملک الصالح  
کا انتقال ہوا اس وقت صلیبی قاہرہ کے قریب منصورہ  
میں مصری فوجوں سے دست و گریباں تھے۔ جیسا کہ  
پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ ملک الصالح کی بیوی ملکہ  
شجرۃ الدرد نے اپنی دانائی اور جرأت سے صورت حال کو  
سنجھا لے رکھا اور اس نے ملک الصالح کی موت کو اس  
وقت تک پوشیدہ رکھا جب تک اس نے ملک الصالح  
کے بیٹے کی امیروں سے بیعت نہ لے لی۔

لیکن توران شاہ نالایق نکلا۔ اس نے ماں کی توہین



لیے۔ پھر بیبرس، عیسائیوں کے غرور کو توڑنے کے لیے آرمینیا اور ایشیائے کوچک کی طرف چلا اور وہاں پہنچ کر اس نے جنگ چھیڑ دی۔ وہ اس جنگ میں مصروف تھا کہ ۱۲۷۵ء میں منگول پھر دریائے فرات کے اس پار سے حملہ آور ہوئے مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے اور انہیں بیبرس بند قدار کے ہاتھوں دوسری شکست اٹھانا پڑی۔ مگر افسوس کہ ایک مجاہد یعنی بیبرس بند قدار اس جنگ میں ایسا زخمی ہوا کہ اسے جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔ اس عظیم سردار اور مجاہد کا ۱۲۷۷ء میں انتقال ہو گیا۔ بیبرس کے بعد اس کا بیٹا تخت نشین ہوا مگر سلطان قلاؤں نے اسے الگ کر کے تخت سلطنت پر خود قبضہ کر لیا۔

عثمانی ترک

مسلمانوں اور منگولوں کی جنگ بلکہ جنگوں میں عثمانی ترکوں نے مسلمانوں کا ساتھ دیا تھا۔ چنانچہ قدرت نے ”ترکان عثمان“ کو ایشیائے کوچک کی سلطنت بخش دی۔ دوسری طرف ایران میں ایل خانی سردار ابا قاخان نے حکومت بنالی۔ سلطان قلاؤں کے عہد میں ابا قاخان نے یروشلم کی طرف پیش قدمی کی۔ اس نے مسلمانوں کے خلاف عیسائیوں کو بھی شرکت کی دعوت دی۔ چنانچہ آرمینیا اور جارجیا کے تیس ہزار عیسائی اس کے پرچم تلے جمع ہو گئے۔ شام کے عیسائی بھی اس کے ساتھ ہو گئے اور یہ مشترکہ لشکر ۱۲۸۱ء میں حمص میں نمودار ہوا۔ حمص کے قریب سلطان قلاؤں کی فوجوں سے معرکہ آرائی ہوئی لیکن خون ریز جنگ میں ابا قاخان شکست کھا کر بھاگ گیا۔

اس موقع پر سلطان قلاؤں نے کہا۔ ”اگر فرشتے مدد نہ کرتے تو فتح ممکن نہ تھی۔“

ابا قاخان کی واپسی پر صلیبیوں کی شامت آگئی اور ۱۲۸۵ء میں سلطان نے الرقب اور طرابلس کے عیسائی

قلعوں پر قبضہ کر لیا۔ پھر عکہ کی طرف پیش قدمی جاری تھی کہ سلطان کا انتقال ہو گیا۔ اس کا بیٹا ملک الجلیل جانشین ہوا۔ اس نے باپ کی مہم کو زور و شور سے جاری رکھا اور عکہ پہنچ کر محاصرہ کر لیا۔ صلیبیوں نے پہلے تو مقابلہ کیا مگر جب انہیں اپنی شکست نظر آنے لگی تو جہازوں میں سوار ہو کر بھاگنے لگے۔ ان میں کئی جہاز ساحل کے قریب ہی غرق ہو گئے۔ کئی جہازوں کو مسلمانوں نے پکڑ لیا اور عکہ فتح ہو گیا۔

اس جنگ میں تیس ہزار عیسائی مارے گئے۔ ادھر عکہ صلیبیوں سے خالی ہوا اور اس کے ساتھ ہی پورا فلسطین عیسائیوں سے خالی ہونے لگا۔

اس کے چھ سال بعد یعنی ۱۲۹۱ء میں پوپ نکولس نے اٹلی کا بحری بیڑا بھیجا اور قبرص سے شاہ ہنری نے فلسطین کی طرف قدم بڑھائے مگر دونوں ہی ناکام و نامراد واپس لوٹے، یہی نہیں بلکہ ان کے حوصلے اس قدر پست ہوئے کہ وہ ساحل فلسطین پر عملیہ اور طریقوں کے قلعے بھی مسلمانوں کے حوالے کر گئے۔

اس کے بعد ۱۲۹۹ء میں منگول تیسری مرتبہ ایل خانوں کی قیادت میں فرات کو عبور کر کے حملہ آور ہوئے اور مملوکوں کو شکست دے کر دمشق پہنچ گئے۔ ایل خانیوں کو بھی صلیبیوں نے بلایا تھا لیکن صلیبی نہ پہنچ سکے اور وہ مایوس ہو کر فروری ۱۳۰۱ء میں مفتوحہ علاقے خالی کر کے لوٹ گیا۔ ۱۳۰۳ء میں ایل خان غزن مر گیا اور یوں بیت المقدس کو منگولوں کے خطرے سے مستقل طور پر نجات مل گئی۔

صلیبیوں کے حوصلے پست ہو گئے تھے مگر وہ کوشش کرتے رہے۔ شاہ انگلستان اور شاہ فرانس اس کے بعد بھی اپنی کوشش میں لگے رہے لیکن انہیں کامیابی نہ ہوئی۔ اس دوران ترکوں نے والگا سے ایشیائے کوچک تک اور دریائے فرات سے دریائے نیل تک اپنا دفاع



مضبوط کر لیا۔

پس ہیر الذہیم مایوسی کے عالم میں لکھتا ہے۔  
”ہم یروشلم کی صلیبی ریاست بحال نہ کر سکے  
جس کے لیے صدیوں تک ہمارے آباؤ اجداد برسر  
پیکار رہے اور آج بھی وہ مزارِ مسیح کے سائے تلے محو  
خواب ہیں۔“

۱۳۶۵ء سے ۱۳۶۷ء تک پیٹر آف ساہرس  
وغیرہ مجاہد بن کر مصر و شام میں لڑتے رہے مگر ناکام  
رہے۔ ۱۳۵۳ء میں محمد ثانی نے قسطنطنیہ فتح کیا تو  
پیونانی نے قسطنطنیہ کی واپسی کے لیے جنگ کو مذہبی  
رنگ دیا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ ۱۵۱۶ء میں ترکان عثمان  
نے مصر و فلسطین پر قبضہ کیا تو بیت المقدس بھی ترکوں  
کے زیرِ کمان آ گیا۔

ترک دورِ حکومت میں بیت المقدس اپنی شان  
وشوکت کے لحاظ سے عروج پر پہنچ گیا۔ ۱۵۳۶ء میں  
سلطان سلیم اعظم نے شہر کی تفصیل کی تعمیر شروع  
کرائی۔ یہ سات سال میں مکمل ہوئی۔ تفصیل کا گھیراؤ  
ڈھائی میل ہے اور وقتی پیمائش کے لحاظ سے تفصیل  
۱۳۵۰ فٹ لمبی ہے۔

جولائی ۱۸۱۸ء میں ترکی نے ایک فرمان کے ذریعہ  
مزارِ مقدس شاہِ فرانس کی تحویل میں دے دیا۔ ۱۸۰۸ء  
میں گرجا میں آتش زنی کی واردات ہوئی جس کے  
بارے میں عام خیال ہے کہ یہودیوں کی سازش تھی۔

۱۸۳۱ء میں برطانوی وزیرِ اعظم بیت المقدس آیا۔  
اس کے دورہ کے بعد اس علاقے میں فتنے جنم لینے  
لگے جو بعد میں خلافت عثمانیہ کی تباہی کا باعث ہوئے۔  
۱۸۳۲ء میں مصر کے محمد علی پاشا کے بیٹے ابراہیم  
نے قونیہ میں ترک فوجوں کو شکست دے کر بیت  
المقدس پر قبضہ کر لیا۔ مئی ۱۸۳۳ء میں ایک صلح نامہ  
کے ذریعہ محمد علی پاشا نے شام و فلسطین اور مصر کی گورنری

کے عوض سلاطین ترکی کو خراج ادا کرنا منظور کیا۔  
۱۸۳۹ء میں پہلا برطانوی قونصل بیت المقدس  
آیا۔ اس کے ایک سال بعد فرانس کی شاہ پر محمد علی نے  
خلافت عثمانیہ سے بغاوت کر دی۔ مگر شکست کھا کر  
شام و فلسطین سے ہاتھ اٹھانے پر مجبور ہو گیا۔

۱۸۵۶ء میں سلطان ترکی نے اپنی غیر مسلم رعایا  
کی حفاظت کا خود ذمہ لیا۔ اسی سن میں ایک شاہی  
فرمان کے ذریعے مسلم اور غیر مسلم رعایا کے حقوق برابر  
قرار دیے گئے۔ عیسائیوں اور یہودیوں کو حرم شریف  
میں آنے کی اجازت دی گئی لیکن وہ مسجد اقصیٰ اور قبۃ  
الصخرہ میں داخل نہیں ہو سکتے تھے۔

چالاک یہودی

یہودیوں کو حرم شریف میں آنے کی اجازت ملی  
تو انہوں نے ایک قدم آگے بڑھایا اور یہی وہ قدم ہے  
جس کے زور پر یہودیوں نے سازشیں کرنا شروع  
کیں۔ عالمی صیہونیت نے انہیں شہ دی اور انہوں  
نے وہاں اپنی نوآبادیاں بنانا شروع کر دیں۔  
مسلمانوں نے ہمیشہ اپنے دورِ اقتدار میں نصرانیوں اور  
یہودیوں سے انتہائی فراخ دلانہ سلوک روا رکھا مگر اس کا  
احسان ماننے کی بجائے ان دونوں اقوام نے  
مسلمانوں کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔

سلطان محمود ثانی ۱۸۵۹ء میں بیت المقدس آئے  
اور مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کی۔ اس وقت سلطان  
نے یہودیوں کی ان شکایات کی چھان بین کی جو وہ  
سلطانی عمال کے خلاف کرتے تھے مگر تحقیقات کرنے  
پر معلوم ہوا کہ وہ تمام شکایات جھوٹی اور بالکل بے بنیاد  
تھیں۔ اسی طرح ۱۸۶۲ء میں ایڈورڈ ہفتم بیت  
المقدس کی زیارت کو آیا تو اس نے بیت المقدس میں  
تائیدناؤں کے لیے ایک اسکول جاری کیا۔ یہ پہلا غیر  
ملکی ادارہ تھا۔ اسی وقت یہودیوں کو پیش کش کی کہ اگر



یہودیوں کو فلسطین میں زمین خریدنے کی اجازت دی جائے تو وہ نہ صرف ترکی کے تمام قرضے ادا کر دیں گے بلکہ آئندہ ضرورت پڑنے پر ان کی حسب ضرورت مدد بھی کریں گے۔ اس پیش کش کا سلطان عبدالحمید نے برا منایا اور یہودی رہنما کرزل کوختی سے جواب بھجوایا کہ وہ اس خیال کو اپنے ذہن سے نکال دے۔ کیونکہ عثمانی سلطنت کا ہر فرد بشر اس طرح کی پیش کش کو اپنی توہین سمجھتا ہے اور اگر یہودی اپنی ساری دولت بھی پیش کریں تو بھی ان میں فلسطین میں ایک انچ زمین بھی نہیں دی جاسکتی۔

ادھر سے مایوس ہو کر یہودیوں نے قیصر جرمنی کا دامن پکڑنے کی کوشش کی کیونکہ وہ سلطان مرحوم کا ذاتی دوست تھا۔ پس قیصر نے یہودیوں کے لیے کوشش بھی کی لیکن سلطان نے اس کی بات رد کر دی۔ آخری جنگ

تاریخ کا ایک بیان یہ بھی ہے کہ جب سلطان نے یہودیوں کا مطالبہ یکسر رد کر دیا تو قیصر جرمنی کو یہ بات بہت ناگوار گزری۔ اس نے سلطان کو انجام بد کی دھمکی دی۔ پھر وہ وقت بھی آ گیا کہ ترکی کی انجمن "اتحاد و ترقی" نے سلطان کو معزول کر کے محمد ارشاد کو خلیفہ بنا دیا۔ اسی دور میں خلافت ترکی نے نیا آئین بنا کر شام اور فلسطین کی خود مختاری تسلیم کر لی۔ لیکن اس وقت تک برطانیہ نے لارنس آف عربیہ کے ذریعے ترکوں کے زیر اقتدار عرب علاقوں پر اپنا اثر و رسوخ قائم کر لیا تھا۔ لارنس نے یہودیوں کو بھی ملا لیا اور پھر عربوں نے ہر جگہ ترکوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ اس صورت حال کے پیش نظر آٹھ اور نو دسمبر ۱۹۱۷ء کی درمیانی شب ترکوں نے بیت المقدس خالی کر دیا۔ پھر دس دسمبر ۱۹۱۷ء کی صبح جنرل شیا بیت المقدس پہنچا۔ ترکوں نے دوپہر کے وقت چابیاں اس کے حوالے کر دیں اور

گیارہ دسمبر کو جنرل ایلن بائی، مصری اور فلسطینی افواج کے ساتھ یافہ گیٹ سے بیت المقدس میں داخل ہوا۔ اس طرح سلطان صلاح الدین ایوبی کا مقدس شہر ایک بار پھر عیسائیوں کے قدموں تلے آ گیا۔ اس مرتبہ مصری اور فلسطینی ان کی مدد کر رہے تھے۔ برطانیہ کے انگریز اسے آخری صلیبی جنگ قرار دیتے ہیں جسے تیرہویں صلیبی جنگ کا نام دیا جاسکتا ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ ایلن بائی کے یروشلم میں داخلے سے پہلے سات سو پچیس سال تک یروشلم نے کبھی کسی عیسائی فاتح یا برطانوی سپاہی کی صورت نہ دیکھی تھی۔ برطانیہ کے وزیر اعظم چرچل نے اپنی تاریخ "جنگ عظیم" میں لکھا ہے۔

۸ دسمبر ۱۹۱۷ء کو ترک بیت المقدس سے دست بردار ہو گئے۔ ان کے چار سو سالہ منحوس دور کے بعد برطانوی کمانڈر انچیف باشندگان بیت المقدس کے واہ واہ اور مرحبا کے نعروں کی گونج میں شہر میں داخل ہوا۔ اسی طرح مسٹر نلسن تاریخ جنگ جلد ۲۳ میں پرست الفاظ میں یوں رقم طراز ہے۔

"آخری صلیبی جنگ اب اپنے عروج پر تھی اور اگر سینٹ لوئیس اور رچرڈ شاہ انگلستان اس جرات افزا افواج کو دیکھتے تو ان کی رو میں حیران رہ جاتیں۔ کیونکہ بہت ہی قلیل حصہ مغربی اقوام (یورپین) پر مشتمل تھا۔ الجزیری اور ہندی مسلمان، عرب قبائل، ہندوستان کے ہزار ہا فرقوں کے ماننے والے افریقی، حبشی اور یہودی افواج ان لوگوں میں شامل تھی جنہوں نے نصاریٰ کے مقدس شہر کو آزاد کرایا۔"

افسوس کہ وہ مسلمان جنہیں بیت المقدس کی حفاظت کرنی تھی وہ یہود و نصاریٰ کے ساتھ مل گئے تھے۔ جنگ عظیم اول میں شام، عراق اور فلسطین وغیرہ میں مسلمان سپاہی برطانوی فوج کی کل تعداد کا



جارج ٹاؤن، گرانڈ ورک آف برٹش ہسٹری میں لکھتا ہے۔

”بیت المقدس ۱۱۸۷ء کے بعد پہلی مرتبہ ایک عیسائی ملک کے قبضہ اور تصرف میں آیا۔ جنرل ایلن بائی بڑے دن سے پندرہ دن پہلے بیت المقدس میں داخل ہوا۔“

یہی مصنف آگے جا کر لکھتا ہے۔

”قریب قریب اسی وقت جنرل ایلن بائی نے فلسطین میں شاندار پیش قدمی کی اور اس پیش قدمی کا سہرا خاص طور پر ہندوستانی افواج کے سر ہے۔“

اسی طرح ٹامسن نے اپنی کتاب ”عرب میں لارنس کے ساتھ“ میں لکھا ہے۔

”ایلن بائی نے فلسطین کو آزاد کرایا جو یہودیوں اور عیسائیوں کی مقدس سرزمین ہے۔ لارنس نے عرب کو آزادی دلوائی جو لاکھوں مسلمانوں کی متبرک زمین ہے۔“

اسی طرح برطانوی وزیراعظم لائیڈ جارج نے چیخ کر پارلیمنٹ میں اعلان کیا۔

”آج ہم نے مسلمانوں سے صلیبی جنگوں کا بدلہ لے لیا ہے۔“

فتح بیت المقدس کے بعد جنرل ایلن بائی کو حکومت برطانیہ نے دیگر اعزازات کے علاوہ پچاس ہزار پونڈ کا نقد انعام دیا اور جارج پنجم نے اس کی خدمات کا خاص طور پر اعلان کیا۔

جلال الدین سیوطی ایک مستند حوالے سے لکھتا ہے کہ۔

”بیت المقدس حضرت عمرؓ کی فتح سے ۳۹۱ھ تک مسلمانوں کے قبضے میں رہا۔ اس سال عیسائیوں نے اسے فتح کیا اور مسلسل سات دن تک مسلمانوں کی

بڑی تعداد کو بے دریغ تہ تیغ کر کے جام شہادت پلایا۔ انہوں نے مسجد اقصیٰ میں ۷۰ ہزار مسلمانوں کو شہید کیا اور صحرہ سے سونے چاندی کے برتن اور بے شمار دولت جو محفوظ صندوقوں میں بندھی، نکال کر لے گئے۔ لیکن سلطان صلاح الدین ایوبی کو خدائے تعالیٰ نے بیت المقدس کی آزادی کے لیے مامور کیا۔ کیونکہ وہ سب سے زیادہ شیردل اور دہکتی ہوئی آگ کا پتلا تھا۔ مگر آہ! بیت المقدس پھر غلام ہو گیا اور اس کے سقوط نے ترکی کے زوال کو سہارا دیا۔“

تاریخ شاہد ہے کہ بیت المقدس نے ترکوں کے عہد میں زبردست ترقی کی اور اس مقدس شہر میں مکروہات پر مکمل پابندی عائد رہی تھی۔

مقدس یروشلم کا امریکی مصنف اس دور کے بیت المقدس کی تصویر کشی کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

”قدیم شہر ۱۳۱۰ یکڑ پر پھیلا ہوا ہے۔ جس میں مسجد بھی شامل ہے۔ شہر کا محل وقوع بیروں اور اس کے جانشینوں کے دور سے مختلف ہے۔ گلیاں تنگ اور عمارتیں قریب قریب واقع ہیں۔ بعض مقامات پر قدیم محراب اور عمارتیں اب تک قائم ہیں لیکن انسان ان کے قریب سے بے خطر گزر جاتا ہے۔ وہ اہم شاہراہیں جن کا تذکرہ کرنا ضروری ہے ان میں سے ایک داؤد اسٹریٹ، یافہ گیٹ سے مشرقی جانب چلتی ہوئی شہر کے دوسری طرف سینٹ اسٹیفن گیٹ سے جا ملتی ہے۔ کرچین اسٹریٹ، داؤد اسٹریٹ سے کلیسائے نشور تک جاتی ہے اور ایک تیسری گلی شمالی کے باب دمشق کو جنوب کے صہیون گیٹ سے ملاتی ہے۔ قدیم شہر میں بہت کم زمین خالی نظر آئے گی۔ گو یہ شہر ۱۳۱۰ یکڑ پر پھیلا ہوا ہے لیکن ۱۳۵ یکڑ رقبہ مسجد اقصیٰ میں گھرا ہے۔ اتنی ہی جگہ فوجی بیرکوں میں گھری ہوئی ہے اور اس سے دو گنی زمین مختلف مذاہب کی



عالم وجود میں آ گیا ہے۔ اس نئے یروشلم نے مختصر عرصہ میں بہت ترقی کر لی ہے۔ اس نئے شہر یروشلم میں یہودیوں کی کئی کالونیاں ہیں اور ان میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔ اس وقت یہودیوں کی آباد کاری پر پابندی ہے اس کے باوجود مسلسل چلے آ رہے ہیں۔ ڈاکٹر رائسن کے مطابق ۱۸۳۸ء میں شہر کی آبادی

گیارہ ہزار تھی۔ ان میں تین ہزار یہودی تھے۔ ۱۸۴۹ء میں ولیم کے مطابق یہودیوں کی تعداد تین ہزار سے بڑھ کر سات ہزار ہو گئی تھی۔ پھر ۳۵ سال بعد اس کی آبادی میں دس گنا اضافہ ہوا۔ یہودی اپنے آبائی شہر کو پھر سے یہودی شہر بنانے کی فکر میں رات دن کوشاں رہتے تھے۔ یہودی ہاتھ پیر پھیلاتے رہے تھے مگر عربوں نے حالات کا رخ نہ پہچانا اور اپنی سادہ لوحی میں لارنس کا شکار ہو گئے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ برطانیہ نے عربوں کو اس جنگ میں فریب دے کر اپنے ساتھ ملا لیا تھا اور ان سے وعدہ کیا تھا کہ جنگ کے بعد ان پر ان کی مرضی کے مطابق حکومت قائم کی جائے گی مگر ۱۹۲۰ء کی صلح کانفرنس میں فلسطین کو برطانیہ کے زیر اثر کر دیا گیا اور سربراہرٹ فلسطین کا پہلا ہائی کمشنر بن کر بیت المقدس پہنچا۔ رابرٹ خود یہودی تھا اور اس نے کھل کر صیہونیت کا ساتھ دیا۔

برطانیہ کے اس مصنف نے لکھا ہے۔  
”اگر حکومت یہ سمجھتی ہے کہ دنیا رابرٹ کو برطانوی ہائی کمشنر کے طور پر بیت المقدس کے لیے جو سازش پس منظر میں پوشیدہ ہے۔ اس سے بے خبر ہے تو یہ اس کی حماقت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ رابرٹ کی تقرری نے برطانیہ کی حیثیت کو نازک بنا دیا ہے۔“

رابرٹ کے آتے ہی بیت المقدس میں یہودیوں کے آنے کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوا اور وہ

عبادت گاہوں مساجد، گر جا گھروں اور دوسری عمارتوں نے گھیری ہوئی ہے۔ یہ بطور رہائش گاہ استعمال نہیں ہوتیں اس لیے بلا جھجک کہا جاسکتا ہے کہ ۵۵ ہزار آدمی ایک سوا یکڑ زمین پر آباد ہیں۔ اس کے بازاروں میں ہر رنگ و نسل اور ہر زبان و مذہب کے لوگ چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔“

بیت المقدس کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ اس شہر میں ہر طرف مینار ہی مینار دکھائی دیتے ہیں۔ کوئی گلی یا کوچہ ایسا نہیں جہاں مسجد یا گر جانہ ہو۔ مسجد اقصیٰ کے علاوہ ۳ مساجد اور ہیں اور چھوٹے بڑے گرجوں اور راہب خانوں کی تعداد ۲۰ کے قریب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر گنبد بعد شہر کی فضا عبادت کے لیے بلاتی ہوئی گھنٹیوں سے گونج اٹھتی ہے۔ اس کے علاوہ مسجد کے بلند میناروں سے دن میں پانچ مرتبہ اللہ اکبر کی صدا مسلمانوں کو اللہ کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دیتی ہے۔“

شہر کے انتظام کے لیے سلطان ترکی نے ”پاشا“ کو مقرر کر رکھا ہے جس کی انتظامی کوسل ۹ مسلم، ایک یہودی اور ایک عیسائی رکن پر مشتمل ہے۔ اس شہر میں ہر ملک کے قوانین صلیٹ موجود ہیں اور وہ تمام امور جن میں فریقین غیر ملکی ہوں، مقدمہ کی سماعت اسی ملک کا قوانین صلیٹ کرتا ہے لیکن اگر فریق مقدمہ ترک ہو تو مقدمہ کی سماعت مقامی عدالت کرتی ہے۔

پورے شہر میں نہ کوئی اوچرا ہے اور نہ کسی کھیل یا کنسرٹ کی اجازت ملتی ہے۔ تمام بازار آفتاب غروب ہوتے ہی بند کر دیے جاتے ہیں۔ وہاں کے لوگ جلد سو جاتے ہیں اور صبح کو جلدی اٹھنے کے عادی ہیں۔ زمانہ کی تہذیبی ترقیوں کا ابھی اس شہر پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ یہ ضرور ہے کہ قدیم شہر کی دیواروں سے باہر شمال و مغرب میں پچھلے کئی برسوں سے ایک نیا یروشلم



برطانیہ کی شہ پر اور کھل کھیلے۔ آخر ۱۹۳۶ء میں ”عرب بائی کمیٹی“ قائم ہوئی جس کی اپیل پر برطانیہ کے ”مسلم کنس“ رویہ اور یہودی داخلہ کے خلاف چھ ماہ تک ہڑتال رہی۔ اس کمیٹی کے صدر یروشلم کے مفتی اعظم الحاج امین الحسینی آفندی تھے۔ حکومت برطانیہ نے مفتی صاحب کے وارنٹ گرفتاری جاری کر دیے۔ آپ مسجد اقصیٰ میں اعتکاف میں بیٹھ گئے۔ برطانوی سپاہیوں نے مسجد کا محاصرہ کر لیا لیکن مفتی اعظم بھیس بدل کر اس محاصرے سے نکلے اور شام سے ہوتے ہوئے لبنان پہنچ گئے۔ یہ وہی سال تھا جب یہودیوں نے حکومت برطانیہ کے تعاون سے اپنی سازشوں کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا۔ یہودی فلسطین کو یہودی ریاست بنانا چاہتے تھے۔ پس ملک گیر فسادات شروع ہو گئے اس طرح بیت المقدس کی گلیاں بار بار انسانی خون سے رنگین ہوئیں۔ یہودی برطانیہ کے تعاون سے روز بروز طاقت پکڑ رہے تھے۔

الحاج الیاس برنی اپنے سفرنامہ میں لکھتے ہیں۔

”القدس میں یہودیوں کے نئے نئے محلے بن رہے ہیں۔ جبل زیتون پر یہودیوں کی یونیورسٹی بن رہی ہے۔ انگریزوں نے عربی کے پہلو پہ پہلو عبرانی کو سرکاری زبان قرار دیا ہے اور ریلوے ٹائم بھی عبرانی زبان میں شائع ہونے لگے ہیں۔“

محمد عاشق میرٹھی لکھتے ہیں۔

”قدس کی آبادی دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ اندرون شہر فصیل سے محصور ہے جس کے سات دروازے ہیں۔ باب داؤد اور باب المغاربہ، مشرق میں باب الاسباط اور شمال میں تین دروازے باب الساحرہ، باب النصرہ اور باب الجدید ہیں۔ فصیل سے باہر نیا شہر آباد ہے۔ مسجد اقصیٰ اور مسجد عمر کے علاوہ شہر میں شیخ محمد البصری، شیخ قمری، شیخ محمد المصنبت، شیخ

بایزید بسطامی، شیخ جلال الدین رومی، شیخ فرید اور شیخ حسن کے مزارات ہیں۔ جو زیارت گاہ عوام ہیں۔ مسجد اقصیٰ کی مشرقی دیوار کے بالمقابل سیدنا شہداء بن اویس انصاری اور عبادہ بن ثامت کے مزارات ہیں۔ کوہ طور الزیت کے دامن میں سید محمد علمی کا مزار ہے۔ اس کے متصل قبر شہداء، غربی جانب حضرت رابعہ عدویہ اور مشرقی جانب حضرت سلمان فارسی دفن ہیں۔ شہر کے شمالی جانب سیدنا عکانہ، سیدنا قیم اور مسجد کی شمالی فصیل کے قریب غار میں سیدنا سلطان ابرہیم ادھم اور شیخ حسن راغی کے مزارات ہیں۔“

اس سلسلے میں مولانا حفظ الرحمن نے ”راہ وفا“ میں جو ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی اس طرح لکھا ہے۔

”ترکوں نے تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے زمینوں کے ٹکڑے وقف کر دیے تھے جن پر ان ملکوں کے آنے والے زائرین کے قیام و رہائش کے لیے مسافر خانے تعمیر ہوئے جو اب تک قائم ہیں۔ ۱۹۲۲ء میں مولانا محمد علی جوہر کی تحریک پر ہندوستان کے مخصوص قطعہ اراضی پر خواجہ ناظر حسن انصاری نے ”زاویہ ہندی“ کے نام سے مسافر خانہ تعمیر کیا۔ قبرستان شہداء میں سلطان صالح الدین ایوبی کے شہید ساٹھی دفن ہیں۔ محکم حرم میں مولانا محمد علی جوہر مدفون ہیں۔ اقتصادی، انفرادی، سیاسی اور مذہبی شعبوں پر حکومت برطانیہ کا اثر ہے جس کی وجہ سے اس سرزمین قدس پر ہنگامہ دارو گیر برپا ہے اور مسلمانوں کے حقوق ان کی معبد گاہیں، جائیدادیں اور جان و مال خطرے میں ہیں۔ جس وقت سے برطانیہ کا قبضہ ہوا ہے یہودیوں کی آبادی میں اضافہ ہونے لگا اور حکومت برطانیہ نے چاروں طرف سے یہودیوں کو لالاکر یہاں آباد کیا۔ مسلمانوں کی زرخیز زمینیں اور آباد محلے آج یہودیوں کے قبضے میں ہیں۔ حالانکہ آج سے ستر



کریم ﷺ کے حکم سے بیس آدمیوں کے ساتھ مکہ سے مدینہ کی طرف اعلانیہ ہجرت کی۔ مدینہ میں آپ تمام غزوات میں شریک ہوئے اور ہر جنگ میں اپنی بہادری کا ثبوت دیا۔ عہد صدیقی (حضرت ابو بکرؓ کا زمانہ) میں آپ صلاح کار کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ آپ کی قابلیت اور اسلام کی بے لوث خدمت کے پیش نظر حضرت ابو بکر صدیقؓ نے آپ کو اپنا جانشین مقرر کیا۔

عراق و ایران

اس وقت ایران کی مجوسی (آتش پرست) سلطنت کا شمار دنیا کی عظیم اور طاقت ور سلطنتوں میں ہوتا تھا۔ عراق اس وقت ایران کا ایک حصہ تھا۔ ایرانی سلطنت اور عرب کی اسلامی سلطنت کی حدود میں چند نیم آزاد ریاستیں تھیں جن میں عیسائی آباد تھے۔ ایرانیوں کے ظلم سے تنگ آ کر ان عیسائیوں نے پہلے حضرت ابو بکر صدیقؓ سے امداد کی درخواست کی جس کے جواب میں حضرت ابو بکر صدیقؓ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کی کمان میں ایک چھوٹی سی فوج بھیجی۔ حضرت خالدؓ نے ابھی دریائے فرات تک کا علاقہ فتح نہیں کیا تھا کہ انہیں ملک شام کے محاذ پر بھیج دیا گیا۔

پھر جب حضرت عمرؓ نے خلافت سنبھالی تو انہوں نے ایک بڑا لشکر ایرانیوں کے مقابلے کے لیے بھیجا یہ لشکر قادیسیہ تک پہنچا۔ ادھر ایران نے رستم کی ماتحتی میں ایک عظیم لشکر مسلمانوں کے خلاف روانہ کیا۔ اس وقت اسلامی لشکر کے سالار مسعود بن ابی وقاص تھے۔ انہوں نے رستم کے سامنے اسلام پیش کیا مگر رستم نے اس پیش کش کو ٹھکرا دیا تھا۔ چنانچہ جنگ شروع ہوئی۔ اس جنگ میں رستم مارا گیا اور ایرانی لشکر بابل تک ہٹ گیا۔ اس کے بعد حضرت سعدؓ نے بابل، مدائن اور جلولاء پر قبضہ کر لیا۔ اب شہنشاہ ایران یزدجرد خود خراسان پہنچا

برس قبل النخیل (حمر ون) کو جاتے ہوئے قدس سے باہر یہودیوں کی ایک چھوٹی سی آبادی ماء شوم (یعنی سو گھر) تھی۔ قدیم شہر میں بیس نسلوں کے لوگ آباد ہیں اور شہر میں مسجد اقصیٰ کے علاوہ ۳۸ مساجد ہیں لیکن جو عظمت اور حرمت مسجد اقصیٰ کو حاصل ہے اس کے مرتبہ کو کوئی اور مسجد نہیں پہنچتی۔“

خليفة ثانی:

خليفة ثانی یعنی حضرت عمرؓ کا زمانہ اسلامی تاریخ کا بہترین دور ہے۔ چند برس کے اندر مسلمانوں نے عراق، ایران، شام، فلسطین اور مصر کے علاقے فتح کر لیے۔ ان تمام جنگوں کا احوال اس جگہ تفصیل سے تو بیان نہیں کیا جاسکتا کہ یہ کتاب یہ ناول یہ تاریخی صحیفہ صرف فلسطین اور بیت المقدس تک محدود ہے لیکن اس کا ایک اجمالی جائزہ پیش کرنا ضروری ہے تاکہ بیت المقدس کی تمام و کمال عظمت کا نقشہ آپ کی نظروں کے سامنے آجائے۔

حضرت عمر فاروقؓ کا دور خلافت ۶۳۲ء سے ۶۴۵ء تک بیان کیا گیا ہے۔ آپ نے ستائیسویں برس میں اسلام قبول کیا۔ آپ قریش کے قبیلہ بنی عدی سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کو جوانی میں شہسواری، پہلوانی، خطابت اور فنون سپہ گری میں کمال حاصل تھا اور آپ کی اس غیر معمولی قابلیت کی بناء پر قریش مکہ نے آپ کو عہدہ سفارت پر مامور کیا تھا۔ آپ کی عظمت و جبروت کا ثبوت یہ ہے کہ آپ کے اسلام لانے سے پہلے مسلمان پوشیدگی سے نماز ادا کرتے تھے مگر آپ کے اسلام لانے کے وقت مسلمانوں نے پہلی مرتبہ کھلے میدان میں نماز ادا کی۔ ہر چند کہ اس وقت حضرت حمزہؓ اور حضرت علیؓ ان میں موجود تھے مگر مسلمان پھر بھی فریضہ نماز پوشیدگی میں ہی ادا کرتے تھے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ چند سال بعد آپ نے حضور نبی

ﷺ



طرح لیبیا سے ابی سینیا تک مصر کے تمام ملک پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

مورخ واقدی کے بیان کے مطابق مٹی بھر صحرا نشینیوں نے حضور اکرم ﷺ کی وفات کے بعد بارہ برس کے قلیل عرصہ میں چھتیس ہزار شہر اور قلعے، ایک ایک دن میں نو نو شہر فتح کیے۔

واقعہ جسر کے سوا مسلمانوں نے کہیں بھی شکست نہ کھائی۔ مسلمانوں کی ان حیرت انگیز فتوحات کا سبب عیسائیوں نے یہ بتایا کہ ایران و روم کی سلطنتیں اپنی خانہ جنگیوں، باہمی آدیزشوں اور مذہبی اختلافات کے باعث اتنی کمزور ہو چکی تھیں کہ مسلمانوں کے لیے ان کو مغلوب کرنا آسان امر تھا۔ مگر یہ بات حقیقت سے بعد ہے۔ خانہ جنگیوں کے باوجود ایران اور روم کی سلطنتیں اپنے مادی ذرائع، اسلحہ و ہتھیار اور سپاہیوں کی تعداد کے لحاظ سے عربوں پر فوقیت رکھتی تھیں۔ عرب جیسی بے مایہ قوم کسی جنگی معرکہ میں بیالیس ہزار سپاہیوں سے زیادہ جمعیت فراہم نہ کر سکی اور ان کا مقابلہ ڈھائی لاکھ سے چالیس لاکھ سپاہیوں کے لشکر جرار سے ہوتا تھا۔ فوجی تنظیم و تربیت اور آلات جنگ کے لحاظ سے ایرانیوں اور رومیوں کی برتری ایک مسلمہ حقیقت تھی۔

اس وقت کے آلات جنگ مثلاً زرہ بکتر، جوشن، خود، چار آئینہ وغیرہ کے استعمال سے ان کے سپاہی بخوبی واقف تھے۔ اس کے برعکس مسلمان سپاہی چمڑے کی زرہیں استعمال کرتے تھے۔ ان کے تیر معمولی اور نیزے معمولی قسم کے ہوتے۔ جنگ قادسیہ کے شروع ہونے سے پہلے ایک ایرانی افسر نے عربوں کے تیروں کو دیکھ کر حقارت آمیز لہجے میں کہا تھا کہ ”یہ تکلیے ہیں۔“

ٹھوس حقائق کے پیش نظر خلفاء اربعہ کے زمانہ

اور اس نے مسلمانوں کے خلاف ڈیڑھ لاکھ کا لشکر روانہ کیا۔ ادھر حضرت عمرؓ نے تیس ہزار فوج مسلمانوں کو کمک کے طور پر بھیجی۔ چنانچہ نہاوند کے مقام پر ایک شدید میدان کارزار گرم ہوا جس میں مسلمان کمک کے کمانڈر حضرت نعمانؓ نے شہادت حاصل کی مگر اسلامی لشکر کو فتح حاصل ہوئی اور مسلمانوں کا سلطنت ایران پر قبضہ ہو گیا۔

اس جنگ کے نتیجے میں کوفہ، بصرہ اور موصل کے شہر آباد ہوئے۔ فلسطین اور شام

ادھر حضرت خالد بن ولیدؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد خلافت میں اجنادین کے میدان میں رومی لشکر کو زبردست شکست دی اور اپنی پیش قدمی جاری رکھی۔ اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ کا انتقال ہو گیا۔ پھر حضرت عمرؓ نے اسلامی لشکر کو آگے بڑھنے کا حکم دیا اور اسلامی لشکر نے دمشق، اردن اور حمص پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت شاہ روم ہرقل نے ایک متحدہ لشکر مسلمانوں کے خلاف روانہ کیا۔ اس کا مقابلہ مسلمانوں سے یرموک کے میدان میں ہوا اور حضرت خالد بن ولیدؓ نے رومیوں کو شکست دے کر سارے شام پر قبضہ کر لیا۔

دوسری طرف فلسطین کے محاذ پر حضرت عمرؓ بن العاص نے چند مقامات پر قبضہ کرنے کے بعد ”بیت المقدس“ کا محاصرہ کر لیا۔ رومیوں نے صلح کے لیے اپنی آمادگی ظاہر کی اور ان کی درخواست پر خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ تشریف لے گئے اور معاہدہ صلح مرتب فرمایا۔ بیت المقدس کی فتح کے بعد شام اور فلسطین دونوں پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہو گئی۔

فلسطین کے بعد مصر جہاں شہنشاہ روم کا باجگزار مقوقس حاکم تھا۔ مسلمانوں کے قبضے میں آیا۔ اس



مقابلے میں ایرانیوں اور رومیوں کی شکست ان کے طبقاتی نزاع کی وجہ سے یقینی تھی۔

۴۔ شام میں غسانی قبیلے کے لوگ اور سلاطین حیرہ (علاق) قومیت کی بناء پر عرب تھے۔ یہ لوگ قیصر روم اور ایران کے کسریٰ کے مظالم سے نالاں تھے۔ عیسائی ہونے کے باوجود ان لوگوں نے مسلمانوں کے ساتھ ابتدائی جھڑپوں کے بعد تعاون کیا اور انہیں اپنا نجات دہندہ سمجھتے ہوئے ان کے معاون بن گئے۔ ان کے تعاون سے مسلمانوں کو فتوحات حاصل کرنے میں آسانی ہو گئی۔

۵۔ مسلمان جرنیلوں میں مکمل اتفاق و اتحاد تھا۔ ان کی اطاعت امیر کے جذبے کا یہ عالم تھا کہ جب حضرت عمرؓ نے حضرت خالدؓ کو سپہ سالاری کے عہدے سے معزول کیا تو انہوں نے بخوشی سالاری کے بجائے حضرت ابوعبیدہؓ کی ماتحتی میں کام کرنا پسند کیا۔ حضرت عمرؓ ذاتی طور پر تمام محاذات جنگ اور فوجوں کی نقل و حرکت کے متعلق احکام جاری کرتے تھے۔ اس کے برعکس ایرانی اور رومی جرنیلوں میں آپس میں نفاق اور بغض تھا۔ اس لیے ان کی ریشہ دوانیاں ان کی شکست کا باعث ہوئیں۔

حضرت خالدؓ کی معزولی

حضرت عمرؓ کے دور میں حضرت خالدؓ بن ولید کی معزولی بھی ایک تاریخی واقعہ ہے۔ اس واقعہ یا حکم میں علم و حکمت، تسلیم و رضا اور حقوق اور ان کے استعمال کے کتنے ہی پہلو پائے جاتے ہیں۔

حضرت خالدؓ کی معزولی ۶۳۸ء مطابق ۱۷ ہجری میں ہوئی۔ کیونکہ ملک شام کی فتوحات اور واقعات میں حضرت خالدؓ کی معزولی کے مختلف پہلو نکلتے ہیں جن پر مورخین نے طرح طرح کے حاشیے چڑھائے ہیں۔ عام مورخین کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے عمان حکومت

میں عربوں کی فتوحات کے اسباب مندرجہ ذیل تھے۔  
۱۔ مسلمانوں کی فتوحات کا حقیقی راز ان کے جذبہ ایمان میں مضمر تھا۔ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کو وہ سعادت ازلی سمجھتے تھے اور اس کے حصول کی خاطر وہ ہر قسم کے مصائب جھیلنے پر کمر بستہ رہتے تھے۔ مسلمانوں کے آہنی عقیدہ اور عزم باجزم کے سامنے پہاڑوں کی حقیقت رائی کے برابر تھی۔ اس عظیم الشان ہتھیار سے مسلح ہو کر مسلمان سپاہی اپنے حریفوں کے جرات کشکروں کو گاجر مولیٰ کی طرح کاٹ کے رکھ دیتے تھے۔

۲۔ مسلمانوں کا اخلاق حسنہ ان کی عظیم الشان فتوحات کا دوسرا راز تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی ۲۳ سالہ تربیت نے عرب قوم کے افراد کو بے چوں و چرا اطاعت، عزم و استقلال، سردار بننے کی قابلیت اور اعتماد نفس کا سبق پڑھایا تھا۔ آخری فتح حاصل کرنے میں کسی قوم کا بلند اخلاق اور مصیبتوں کے جھیلنے کا عزم سب سے پہلے اپنا کام کرتے ہیں۔ قوم کے مالی ذرائع یا ہتھیاروں کی کثرت کا مقام دوسرے یا تیسرے درجہ پر ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے عرب کے مسلمان ایرانیوں اور رومیوں سے کہیں بڑھ چڑھ کے تھے۔ اس لیے ان کی آخری فتح یقینی تھی۔

۳۔ مسلمانوں کا جذبہ اتحاد و اتفاق ان کی فتوحات کا تیسرا سبب تھا۔ حضور نبی کریم ﷺ کی بے نظیر تعلیم کے باعث عرب کے جنگ جو قبیلے ایک ایسی متحدہ قوم بن گئے تھے جس کے افراد ایک ہی جسم کے مختلف اعضاء کی مانند تھے۔ وہ دکھ سکھ میں ایک دوسرے کے ساتھی ہوتے تھے۔ اس کے برعکس مخالفوں میں بغض و عناد تھا۔ ایران اور روم کی رعایا آقا و غلام اور امیر و غریب کی تمیز تھی۔ محکوموں اور حاکموں کے درمیان نفرت اور نفاق کی خلیج تھی۔ عربوں کے قومی اتحاد کے



خالدؓ نے ایک شاعر کو خوش ہو کر دس ہزار روپے انعام میں عطا کر دیے۔ چنانچہ اسی وقت پرچہ نویسوں نے حضرت عمرؓ کو پرچہ کے ذریعے اطلاع دی۔ اس اطلاع کی بناء پر حضرت عمرؓ نے حضرت ابو عبیدہؓ کو لکھا۔

اگر خالدؓ نے شاعر کو دس ہزار انعام میں دیے ہیں اور اپنی گرہ سے دیے ہیں تو اسراف کیا ہے اور اگر اس نے بیت المال سے لے کر دیے تو خیانت کی۔ دونوں صورتوں میں وہ معزولی کے قابل ہیں۔“

خالد بن ولیدؓ جس کیفیت سے معزول کیے گئے وہ بھی قابل ذکر ہے۔ وہ قاصد جو معزولی کا خط لے کر دربار خلافت مدینہ پہنچا تھا۔ اس نے مجمع عام میں خالدؓ سے دریافت کیا۔

”یہ انعام تم نے کہاں سے دیا؟“

خالد اگر اقرار کر لیتے تو حضرت عمرؓ کا حکم تھا کہ انہیں درگزر کیا جائے۔ لیکن حضرت خالدؓ خطا کے اقرار پر رضا مند نہ ہوئے۔ مجبوراً قاصد نے معزولی کی علامت کے طور پر حضرت خالدؓ کے سر سے ٹوپی اتار لی اور ان کی سربانی کی سزا کے لیے انہی کے عمامہ سے ان کی گردن باندھی۔

یہ واقعہ انتہائی حیرت انگیز ہے۔ ایک ایسا سپہ سالار جس کی نظیر لشکر اسلام میں موجود نہ تھی۔ جس کی تلوار نے عراق و شام کا فیصلہ کر دیا تھا۔ اس طرح ذلیل کیا جا رہا ہے اور وہ دم نہیں مارتا۔ یہ واقعہ ایک طرف تو حضرت خالدؓ کی نیک نفسی اور حق پرستی کی کھلی ہوئی شہادت ہے اور دوسری طرف خلیفہ اسلام کی سطوت و جلال کا بھی ایک کھلا ہوا نقشہ پیش کرتا ہے۔

اس کے بعد حضرت خالدؓ نے حمص پہنچ کر ایک تقریر کی جس میں انہوں نے کہا۔

”امیر المؤمنین عمرؓ نے مجھے شام کا افسر مقرر کیا اور جب میں نے تمام شام کو زیر کر لیا تو مجھے معزول

سنجھاتے ہی حضرت خالدؓ کو معزول کر دیا اور شاید یہ ان کی خلافت کا سب سے پہلا حکم تھا۔ ابن اثیر نے اس سلسلے میں یہ غلطی کی ہے کہ انہوں نے خود ہی ۱۳ ہجری میں خالدؓ کی معزولی بیان کی ہے اور پھر ۱۷ ہجری میں ان کی معزولی کا ایک الگ عنوان قائم کیا ہے اور دونوں جگہ ایک ہی طرح کے واقعات نقل کیے ہیں۔

اصل بات یہ تھی کہ حضرت عمرؓ جناب خالدؓ کی بعض بے اعتدالیوں کی وجہ سے ان سے ناراض ہوئے تھے مگر آغاز خلافت میں انہوں نے اس سے درگزر کیا تھا مگر خالدؓ بن ولید کی یہ عادت تھی کہ وہ حساب کے کاغذات دربار خلافت نہیں بھیجتے تھے۔ اس لیے ان کو تاکید کی گئی کہ وہ آئندہ اس کا خیال رکھیں مگر حضرت خالدؓ نے صاف جواب دینے کے بجائے بات کو الجھا دیا۔ انہوں نے خلیفہ حضرت عمرؓ کو لکھا۔

”میں حضرت ابو بکرؓ کے زمانہ سے ایسا ہی کرتا آیا ہوں اور اب اس کے خلاف نہیں کر سکتا۔“

حضرت عمرؓ کو حضرت خالدؓ کا یہ سخت جواب پسند نہیں آیا۔ وہ رقم کے معاملے میں بہت سخت تھے۔ پھر بھلا وہ بیت المال کی رقم کو اس طرح بے دریغ کیوں خالدؓ کے ہاتھ میں دے سکتے تھے؟ چنانچہ انہوں نے حضرت خالدؓ کو لکھا۔

”تم اس شرط پر سپہ سالار رہ سکتے ہو کہ فوج کے مصارف کا حساب ہمیشہ بھیجتے رہو۔“

حضرت خالدؓ نے خلیفہ کی یہ شرط منظور نہیں کی اور اس بناء پر انہیں سپہ سالاری کے عہدے سے معزول کر دیا گیا۔ اس واقعہ کو ابن حجر نے کتاب الاصابہ میں تفصیل سے لکھا ہے۔

حضرت عمرؓ نے حضرت خالدؓ کو بالکل معزول نہیں کیا بلکہ انہیں ابو عبیدہؓ بن الجراح کے ماتحت کر دیا گیا۔ اس کے بعد ۱۷ ہجری میں یہ واقعہ پیش آیا کہ حضرت



کر دیا گیا۔“  
حضرت خالدؓ کے اس کلام پر ایک سپاہی نے  
کھڑے ہو کر کہا۔

”اے سردار! چپ رہ، ان باتوں سے فتنہ پیدا ہو  
سکتا ہے۔“  
خالدؓ نے جواب دیا۔

”ہاں، مگر عمرؓ کے ہوتے ہوئے فتنہ کا کیا احتمال  
ہے۔“

پھر حضرت خالدؓ مدینہ آئے اور حضرت عمرؓ کی  
خدمت میں حاضر ہو کر شکایت کی۔

”اے عمرؓ... خدا کی قسم تم میرے معاملے میں  
نا انصافی کرتے ہو۔“

حضرت عمرؓ نے جواب دیا۔  
”تمہارے پاس اتنی دولت کہاں سے آئی؟“

خالدؓ نے جواب دیا۔  
”مال غنیمت سے۔“ اس کے ساتھ ہی کہا۔

”ساتھ ہزار سے زیادہ جتنی رقم نکلے وہ میں آپ کے  
حوالے کرتا ہوں۔“

چنانچہ بیس ہزار زیادہ نکلے اور وہ بیت المال میں  
داخل کر دیے گئے۔

حضرت عمرؓ نے حضرت خالدؓ سے کہا۔  
”خالد تم مجھ کو محبوب بھی ہو اور میں تمہاری عزت

بھی کرتا ہوں۔“  
یہ کہہ کر حضرت عمرؓ نے عمالان ملکی کو ایک سرکلر بھیجا

جس میں لکھا گیا تھا کہ۔  
”میں نے خالدؓ کو ناراضی یا خیانت کی بناء پر

معزول نہیں کیا۔ لیکن چونکہ میں دیکھتا تھا کہ لوگ ان  
کے مفتون ہوتے جاتے ہیں اس لیے میں نے ان کو

معزول کرنا بہتر سمجھا۔ تاکہ لوگ یہ سمجھ لیں کہ جو کچھ  
کرتا ہے اللہ کرتا ہے۔“

ان واقعات سے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ خالدؓ  
بن ولید کی معزولی کے کیا اسباب تھے اور اس میں کیا  
مصلحتیں تھیں۔

معزولی کے بعد حضرت خالدؓ مدینہ سے واپس  
حمص چلے گئے اور آپ نے بقیہ زندگی وہیں گزاری  
اور وفات پا کر وہیں دفن ہوئے  
عمواس کا طاعون  
۷ ہجری کے آخر میں عراق اور شام میں طاعون کی  
وبا پھوٹ پڑی۔ اس کا زور ۱۸ ہجری تک رہا۔ عمواس،  
ملک شام کا ایک شہر ہے جہاں سے یہ وبا پھیلی تھی۔  
اس وبا نے اسلام کی بہت سی مقتدر اور عظیم ہستیوں کو  
موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ان میں مقتدر صحابہ حضرت  
ابو عبیدہؓ، معاذ بن جبلؓ، یزید بن ابی سفیانؓ، حارث بن  
ہشام اور عقبہ وغیرہ شامل تھے۔ ان کے علاوہ تقریباً  
پچیس ہزار مسلمان اس وبا کا شکار ہوئے۔ ہزاروں  
غور میں بیوہ اور بچے یتیم ہو گئے۔ حضرت عمرؓ کو اس وبا  
کی خبر سے بڑا تردد ہوا اور خود انہیں بھی حفاظتی تدبیر کی  
خاطر وہاں سے شام جانا پڑا۔ لیکن مقام سرخ پہنچ کر  
انہیں معلوم ہوا کہ وبا کا زور بڑھتا جا رہا ہے۔ چنانچہ  
آپ صحابہؓ کے مشورے سے ملک شام سے واپس آ  
گئے۔ تاہم آپ نے ابو عبیدہؓ کو حکم دیا کہ شیمی مقام کو  
چھوڑ کر بلند مقام پر افواج کو لے جائیں۔ چنانچہ وہ  
افواج کو جابیہ لے آئے۔ مگر وہ خود اس وبا کا شکار  
ہو گئے۔ وہ معاذ بن جبلؓ کو اپنا جانشین بنا گئے۔ مگر معاذؓ  
بھی اس وبا کا شکار ہو گئے۔ انہوں نے عمرو بن عاصؓ کو  
اپنا جانشین بنایا تھا۔

وبا کے فروغ ہونے کے بعد حضرت عمرؓ نے پھر شام کا  
سفر اختیار کیا کیونکہ اس وبا نے کئی نئے حالات پیدا کر  
دیے تھے۔ یہ اندیشہ بھی پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں قیصر روم  
شام پر دوبارہ قبضہ کرنے کی کوشش نہ کرے۔ فوج کے



ہزاروں افراد اس وبا کا شکار ہوئے جس سے کئی عہدے خالی ہو گئے۔ خلیفہ نے اکثر مقامات کا دورہ کر کے خالی جگہوں پر نئے افسر مقرر کیے۔ حضرت امیر معاویہ بن ابوسفیان کو اپنے بھائی یزید بن ابوسفیان کی جگہ شام کا گورنر مقرر کیا۔ ان انتظامات کے بعد آپ مدینہ واپس آ گئے۔

اس وبا سے نجات ملی تو دوسرے سال یعنی ۱۸ ہجری میں مدینہ اور اس کے نواحی علاقوں میں قحط پڑ گیا۔ حضرت عمرؓ نے نہایت مستعدی سے انتظامات کیے اور ہزاروں مسلمانوں کو بھوکوں مرنے سے بچالیا۔ آپ نے مفتوحہ علاقہ سے غلہ حاصل کیا اور اسے غرباء میں مفت تقسیم کرایا۔ انہوں نے اپنے گھر کے لیے اناج کا کوئی ذخیرہ نہ کیا۔ جب تک دوسروں کو کھانا نہ مل جاتا وہ خود بھی بھوکے رہتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر میرا پیٹ بھر جائے تو مجھے ان کی تکلیف کا کیسے احساس ہوگا؟ چنانچہ آپ نے قسم کھائی کہ جب تک لوگوں کو سیر ہو کر کھانا نہ ملے گا وہ گھی، دودھ اور گوشت نہیں چکھیں گے۔

قیاریہ کی فتح

قیاریہ، بحر روم پر ملک شام کی ایک اہم بندرگاہ تھی۔ شام فتح ہو چکا تھا لیکن یہ شہر اب تک رومیوں کے قبضے میں تھا۔ یہاں سے رومی، شام میں فساد برپا کر سکتے تھے۔ پس ۱۷ھ میں عمرو بن العاص نے اس کا محاصرہ کیا مگر وہ شہر کو فتح نہ کر سکے۔ اگلے سال یزید بن ابوسفیان نے حملہ کیا مگر وہ بھی کامیاب نہ ہوئے۔ پھر ۱۹ھ میں امیر معاویہؓ نے کئی ماہ کے محاصرہ کے بعد اس پر قبضہ کر لیا۔ اب ملک شام کی فتح مکمل ہو گئی تھی۔

بلا زری لکھتا ہے کہ قیاریہ میں تین سو بازار تھے۔ آبادی مخلوط تھی۔ یہاں سے بہت سا مالی غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ لگا۔ اس کے بعد فرما، بلعیس، قلعہ

بابلیون اور فسطاط فتح ہوئے۔ اسکندریہ، مصر کا دارالسلطنت تھا اور رومی طاقت کا ایک اہم مرکز تھا۔ ساحل پر واقع ہونے کی وجہ سے اسکندریہ رومی بحریہ کا مستقر بھی تھا۔ یہاں سے ساحل شام پر بحری حملہ کا خطرہ تھا۔ سکندر اعظم کے مسکن کے علاوہ یہاں عیسائیوں کا سب سے بڑا گرجا سینٹ مارک کی تھذرل بھی تھا۔ اس کی عمارت کو ملکہ قلوپٹرہ نے تعمیر کرایا تھا۔ اگرچہ وہ رومی مذہب کی عبادت گاہ تھی لیکن عیسائیوں نے اسے گرجا میں تبدیل کر لیا تھا۔

اسکندریہ میں رومی فوجیں بڑی تعداد میں جمع تھیں۔ جب رومیوں کو بابلیون میں شکست ہوئی تو اسکندریہ میں ہر طرف سے فوجیں آ کر جمع ہونے لگیں۔ رومیوں کو اس مضبوط قلعہ پر بڑا ناز تھا۔ رومی بحری بیڑہ بھی یہیں مقیم تھا۔ اسلامی لشکر اسکندریہ کی طرف بڑھا۔ اسکندریہ سے پندرہ میل مشرق کی جانب رومیوں کے ہراول دستوں نے اسلامی لشکر کی پیش قدمی کو روکنا چاہا لیکن شکست کھا کر اسکندریہ میں پناہ گزیں ہوا۔ عمرو بن العاص نے آگے بڑھ کر اسکندریہ کا محاصرہ کر لیا۔ مسلمانوں کے پاس بحری بیڑہ نہ تھا اس لیے وہ رومیوں کو بحری راستے سے ملنے والی فوجی مدد کو نہ روک سکے۔ دوسرے یہ کہ مسلمانوں کے پاس سامان حرب کی بھی کمی تھی اس لیے اسکندریہ کا محاصرہ طویل پھینچ گیا۔

حضرت عمروؓ کو محاصرہ کے طویل ہو جانے سے پریشانی لاحق ہو گئی۔ انہوں نے جناب عمرو بن العاص کو حکم بھیجا کہ جس دن میرا خط پہنچے تمام فوج کو اکٹھا کر کے جہاد پر خطبہ دو اور فوراً حملہ کر دو۔ عمرو بن العاص نے ایسا ہی کیا۔ اس طرح ۲۰ھ میں چودہ ماہ کے محاصرے کے بعد اسکندریہ فتح ہوا۔ عمرو بن العاص نے اسکندریہ فتح ہونے کی خبر مدینہ بھیجی تو حضرت عمرؓ



جنگ کے اور کہیں دھوکا بازی، فریب اور بد عہدی کی سخت ممانعت تھی۔

فتوحات فاروقی کے دوران مسلمانوں نے جس ملک میں بھی قدم رکھا۔ اپنے عدل و انصاف اور حسن اخلاق سے وہاں کے باشندوں کو اپنا ایسا گرویدہ بنالیا کہ وہ اپنی قوم کے بجائے مسلمانوں کے معاون و مددگار بن گئے۔ انہیں شہری اور معاشرتی حقوق عطا کیے جاتے تھے۔ ان کے مذہب میں دخل نہ دیا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کو اپنا دشمن سمجھنے کی بجائے رحمت کا سایہ سمجھتے تھے اور ان کا ساتھ دیتے تھے۔ جنگ یرموک کے موقع پر جب مسلمانوں کو شام کے کچھ علاقے ایک قلیل عرصہ کے لیے خالی کرنا پڑے تو وہاں کے عیسائی روتے تھے اور دعا کرتے تھے کہ مسلمان پھر وہاں واپس آئیں۔ یہودی ہاتھ میں ریت لے کے کہتے تھے کہ اب ہمارے جیتے جی قیصر یہاں نہیں آسکتا۔

یہ درست ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے فاتح مثلاً سکندر، چنگیز خان، امیر تیمور اور نپولین جیسے عظیم فاتحین نے ایک قلیل عرصہ میں کئی کئی ممالک ضرور فتح کیے ہیں لیکن ان کی فتوحات کو حضرت عمرؓ کی فتوحات سے نسبت دینا ایسا ہے جیسے زمین کو آسمان سے نسبت دی جائے۔ سکندر اور چنگیز خان وہ فاتح تھے جنہوں نے انسانیت کا بے دریغ قتل عام کیا اور انہوں نے ممالک کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی فتوحات دیر پا ثابت نہ ہوئیں۔ وہ پانی کے بیلے کی طرح آئیں اور مٹ گئیں۔ بے شک چنگیز خان اور سکندر ایک طوفان کی طرح دنیا پر چھا گئے لیکن جب طوفان تھا تو انسانی لاشوں اور عمارتوں کے کھنڈرات کے علاوہ کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ اس کے برعکس اسلامی فتوحات میں ایک قطرہ خون بلا وجہ نہیں بہایا گیا اور یہ

فاروق نے مسجد نبوی میں نماز شکرانہ ادا کی۔ اسکندر یہ مصر کی کنجی تھا اس لیے مسلمانوں نے تمام ساحلی علاقوں پر قبضہ کر لیا۔

حضرت عمرؓ سے پہلے اور بعد میں بڑے بڑے فاتح گزرے ہیں لیکن جو جذبہ ہمت و شجاعت، عدل و انصاف اور حسن اخلاق کا فتوحات فاروقی میں نظر آتا ہے وہ کسی اور فاتح کے یہاں نظر نہیں آتا۔ ان فتوحات کا اگر جائزہ لیا جائے تو دس سال کے قلیل عرصہ میں صرف چین سے لے کر طرابلس تک تمام ممالک کی تسخیر کے واقعات ہی پڑھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے۔ مسلمانوں نے ایک ہی وقت میں اپنے وقت کی دو عظیم (مجموعی اور نصرانی) سلطنتوں کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عربوں جیسی حقیر اور بے سروسامان قوم کا روم اور ایران جیسی عظیم سلطنتوں کو دیکھتے ہی دیکھتے تہہ و بالا کر دینا تاریخ کا ایک انتہائی حیرت انگیز واقعہ ہے۔

فتوحات فاروقی کا دوسرا نمایاں پہلو یہ ہے کہ امیر المومنین حضرت عمرؓ نے ان ممالک کو زیرِ غلبہ کرنے کے لیے وہ ہتھکنڈے ہرگز استعمال نہیں کیے جو فاتحین عالم مفتوحہ علاقوں کو زیرِ تسلط رکھنے کے لیے عام طور پر استعمال کیا کرتے ہیں۔ یعنی وحشت و بربریت کا مظاہرہ، عام شہریوں کا قتل عام، بستیوں اور آبادیوں کو تاراج کرنا اور دشمن کو بے دست و پا کرنے کے لیے ان کے علاقے کو بالکل پامال کر دینا۔ فصلوں اور عمارات کو نذرِ آتش کرنا۔ اس کے برعکس فتوحات فاروقی میں شہروں کو تاخت و تاراج کرنا تو درکنار، درختوں اور فصلوں کو کاٹنے اور پامال کرنے کی اجازت نہ تھی۔ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں پر تلوار اٹھانا قطعی ممنوع تھا۔ سوائے میدان جنگ کے دشمن کا کوئی شخص نہیں قتل نہیں کیا جاسکتا تھا۔ دشمن سے سوائے میدان



اس قدر دیر پا ثابت ہوئیں کہ چودہ سو سال گزرنے کے بعد بھی اسلامی پرچم مفتوحہ علاقوں پر آج بھی لہرا رہا ہے۔

”میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک لال رنگ کے مرغ نے مجھے تین ٹھونکیں ماریں۔“

علامہ طبری اور ابن اثیر وغیرہ کا بیان ہے کہ انہی دنوں آپ ایک دن بازار کا گشت لگانے نکلے۔ راستے میں حضرت مغیرہ بن شعبہ کا غلام فیروز جسے ابو لولو کہا جاتا تھا آپ کو ملا۔ اس نے شکایت آپ سے کہا۔

”مجھے میرے آقا مغیرہ بن شعبہ سے بچائیے۔ وہ مجھ سے بہت زیادہ ٹیکس (خراج) وصول کرتے ہیں۔“ حضرت عمرؓ نے دریافت کیا۔ ”تم کتنا ٹیکس ادا کرتے ہو؟“

اس نے جواب دیا۔ ”روزانہ دو درہم ادا کرتا ہوں۔“

حضرت عمرؓ نے دریافت کیا۔ ”تم کام کیا کرتے ہو؟“

اس نے بتایا۔ ”میں بڑھئی، لوہار اور نقاش ہوں۔“ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔

”تمہارے پیشوں کے پیش نظر خراج زیادہ معلوم نہیں ہوتا۔“

وہ منہ بنا کے جانے لگا تو حضرت عمرؓ فاروق نے پوچھا۔

”سنا ہے تم ہوا سے چلنے والی بہت اچھی چکی بنا سکتے ہو؟“

اس نے ”ہاں“ میں جواب دیا تو آپ نے فرمایا۔ ”تو پھر ایک چکی میرے لیے تیار کر دو۔“

وہ بولا۔ ”اگر میں زندہ رہا تو آپ کے لیے ایسی چکی بناؤں گا جس کا چرچا مشرق سے مغرب تک ہوگا۔“

حضرت عمرؓ سمجھ گئے کہ یہ قتل کی دھمکی ہے۔ لیکن آپ نے کوئی توجہ نہ دی۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ حضرت عمرؓ فاروق صرف ایک فاتح نہ تھے بلکہ ایک اعلیٰ پائے کے جہانگیر اور جہاندار بھی تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ جہاں جہاں بھی اسلامی افواج پہنچیں وہاں فوراً نظم و نسق بحال ہوا اور حق و انصاف کا بول بالا ہو گیا۔

تمام بڑے بڑے فاتحین عالم مثلاً سکندر، چنگیز، تیمور، سیزر اور نیپولین وغیرہ صرف سپاہی تھے اور انہوں نے اپنی عمریں جنگ کی نذر کر دیں۔ وہ لوگ خود فوجوں کی کمان کرتے تھے۔ برخلاف اس کے حضرت عمرؓ فاروق ایک تجارت پیشہ انسان تھے۔ آپ اپنے دور خلافت میں ایک بار بھی کسی جنگ میں شریک نہیں ہوئے اور نہ آپ نے کبھی فوج کی کمان کی لیکن ان کا لشکر اسلام میدان جنگ میں یوں لڑتا تھا جیسے اس لشکر کی پشت پر کوئی تجربہ کار سالار اس کی رہنمائی کر رہا ہو۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت عمرؓ فاروقؓ اپنی جوانی میں ایک بہترین شمشیر زن اور اعلیٰ قسم کے سپاہی تھے۔ آپ نے تمام غزوات میں حصہ لیا تھا لیکن یہ سب کچھ خلافت کے زمانے سے پہلے ہوا تھا۔ جبکہ خلیفہ ہونے کے بعد آپ نے کبھی تلوار کو ہاتھ تک نہ لگایا۔ اس لیے ہم اگر حضرت عمرؓ فاروقؓ کو دنیا کا ایک عظیم بلکہ سب سے بڑا فاتح کہیں تو یہ غلط نہ ہوگا۔

حضرت عمرؓ کی شہادت ۲۳ ہجری میں آپ حج سے واپس آئے تو جمعہ کے خطبہ میں فرمایا۔

”اے لوگو!..... میں نے ایک خواب دیکھا ہے جسے میں اپنی موت کا پیغام سمجھتا ہوں۔“



دوسرے دن ۲۶ ذوالحجہ ۲۲ھ فجر کی نماز کے وقت جو نبی حضرت عمرؓ فجر کی نماز کی امامت کے لیے کھڑے ہوئے تو فیروز ابولولونے دفعۃً پیچھے سے آکر آپ پر خنجر کے پے در پے چھ وار کیے۔ ایک وار پیٹ کے زیریں حصے میں پڑا۔ حضرت عمرؓ نے فوراً حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ کا ہاتھ پکڑ کر اپنی جگہ کھڑا کر دیا اور خود زخموں کے صدمے سے نڈھال ہو کر گر پڑے۔ عبدالرحمن بن عوفؓ نے نماز پڑھائی مگر اس طرح کہ حضرت عمرؓ سامنے زخموں سے نڈھال پڑے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ فیروز کو گرفتار کرنے کے لیے بڑھے۔ اس نے ان میں سے تیرہ آدمیوں کو زخمی کر دیا۔ جن میں سے چھ شہید ہو گئے۔ آخر ایک شخص نے کھیل ڈال کر اسے پکڑا مگر اس نے گرفتار ہوتے ہی خنجر سے خودکشی کر لی۔

حضرت عمرؓ نے پوچھا۔ ”میرا قاتل کون تھا؟“

لوگوں نے عرض کیا۔ ”فیروز۔“

حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ ”الحمد للہ... میرا قاتل ایسا شخص نہیں جس نے اللہ کو ایک بھی سجدہ کیا ہو۔“

نمازی آپ کو گھر لے گئے۔ زخم کاری تھا۔ جب دوا دارو سے کوئی افادہ نہ ہوا تو اکابر ملت نے درخواست کی۔

”اپنا جائشیں نامزد کر جائیے۔“

انہوں نے فرمایا۔

”اگر میں کسی کو نامزد کر دوں تو کر سکتا ہوں کہ

حضرت ابوبکرؓ نے اپنا خلیفہ نامزد کیا تھا۔ اور اگر خلیفہ

نامزد نہ کروں تو ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ حضور نبی

کریم ﷺ نے اپنا خلیفہ نامزد نہیں فرمایا تھا۔

آخر لوگوں کے اصرار پر حضرت علیؓ، حضرت عثمان بن

عقاف، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت عبدالرحمنؓ،

حضرت سعد بن عوفؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، یہ

چھ صحابہ کرام جن کی اسلام کے لیے بڑی خدمات تھیں

اور جنہیں حضور پاک ﷺ نے جنت کی بشارت دی

تھی۔ نامزد کر کے فرمایا۔

”ان میں سے جس پر کثرت رائے ہو جائے

اسے خلیفہ بنالیا جائے۔“

اور یہ تاکید کی کہ میرے بعد تین دن کے اندر اندر

یہ مرحلہ طے ہو جانا چاہیے اور حضرت صہیب رومی کو حکم

دیا کہ میری تجہیز و تکفین کے بعد ان چھ اصحاب کو ایک

مکان کے اندر بند کر دینا اور جب تک وہ کسی ایک پر

متفق نہ ہو جائیں اس وقت تک نہیں کھولنا۔ پھر اپنے

صاحب زادے عبداللہ کے متعلق فرمایا کہ وہ مشورے

میں شریک رہیں۔ مگر خلافت سے انہیں کوئی تعلق نہ

ہوگا۔ اگر ارکان دو گروہوں میں بٹ جائیں تو عبداللہ

کا فیصلہ ناطق ہوگا۔ نیز کثرت رائے کے بعد اگر کوئی

شخص خلافت کا مدعی رہے تو اسے قتل کر دینا۔ فیصلہ

ہونے تک صہیب رومی نماز پڑھا میں گئے۔

حضرت طلحہؓ اس وقت مدینہ میں نہ تھے۔ ان کے

لیے فرمایا کہ تین روز تک انتظار کیا جائے۔ آجائیں تو

بہتر ہے ورنہ مزید انتظار نہ کیا جائے۔ اس کے بعد

اپنے جائشیں کے لیے کچھ نصیحتیں اور کچھ وصیتیں

فرمائیں۔ مہاجرین اور انصار اور ذمیوں کے ساتھ حسن

سلوک کی خصوصی ہدایات تھیں۔ لوگوں کو حضرت عمرؓ

کے اس فیصلے کا علم ہوا تو وہ مطمئن ہو گئے۔

جب حضرت عمرؓ گونپنے کی کوئی امید نہ رہ گئی تو

آپ نے اپنے فرزند حضرت عبداللہ کو حجرہ نبوی میں

حضرت ابوبکرؓ کے پہلو میں دفن ہونے کی اجازت

حاصل کرنے کے لیے بھیجا۔ عبداللہؓ، حضرت عائشہؓ

کے پاس آئے۔ وہ بیٹھی رو رہی تھیں۔ جب عبداللہؓ

نے مدعا بیان کیا تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا۔

”یہ جگہ میں نے اپنے لیے رکھی تھی۔ لیکن آج عمرؓ

اپنے اوپر ترجیح دوں گی۔“

عبداللہؓ نے واپس آ کر بتایا کہ حضرت عائشہؓ نے



اجازت دے دی ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔  
”الحمد للہ۔ یہی سب سے بڑی آرزو تھی۔“ بعد  
ازاں فرمایا۔

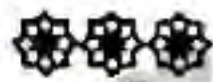
”میرے مرنے کے بعد جنازہ اٹھا کر لے جانا۔  
حضرت عائشہ کے دروازے پر کھڑے ہو کر سلام کرنا  
اور کہنا کہ عمرؓ داخلہ کی اجازت چاہتا ہے۔ وہ اجازت  
دیں تو بہتر ورنہ مسلمانوں کے عام قبرستان میں دفن  
کر دینا۔“

اس کے بعد ذاتی معاملات کی طرف متوجہ ہوئے  
اور اپنے فرزند عبداللہؓ کو وصیت کی کہ میرے بعد میرا  
قرض ادا کر دینا۔ اگر میرے متروک مال سے ادا نہ ہو تو  
خاندان عدی سے درخواست کرنا۔ ان سے نہ ہو تو کل  
قریش سے۔ قریش کے علاوہ کسی اور سے نہیں۔“ اس  
کے علاوہ بیٹے سے فرمایا۔

”مجھے اوسط درجہ کا کفن دینا۔ کیونکہ اگر اللہ کے  
نزدیک مجھ میں کوئی بھلائی ہوگی تو وہ اسے اچھے لباس  
سے بدل دے گا۔ اور اگر اس کے برعکس ہو تو وہ مجھ  
سے چھین لے گا اور بہت تیزی سے چھین لے گا۔  
میری قبر بھی معمولی ہونی چاہیے۔ عورتیں میرے  
جنازے کے ساتھ نہ چلیں۔ اور میری تعریف میں وہ  
باتیں نہ کہی جائیں تو مجھ میں نہیں ہیں۔ اس لیے کہ  
اللہ مجھے زیادہ جانتا ہے۔ جب تم میرا جنازہ لے کر نکلو تو  
تیز تیز قدم چلنا کیونکہ اگر مجھ میں اللہ کے نزدیک کوئی  
بھلائی ہے تو تم مجھے اس جگہ جلدی پہنچا دو گے جو  
میرے لیے زیادہ بہتر ہے اور اگر میں اس کے برعکس  
ہوں تو تم اپنے کندھوں سے وہ برائی اتار پھینکو گے جو تم  
اٹھائے پھرتے ہو۔“

ان وصیتوں کے بعد اور بروز بدھ ۲۶ ذی الحجہ ۲۳  
ہجری مطابق ۳ نومبر ۶۳۳ء کو زخمی ہونے کے تین روز  
بعد حضرت عمرؓ نے بروز ہفتہ ۹ ذی الحجہ وفات پائی اور

بروز شنبہ یکم محرم الحرام ۲۴ ہجری کو اپنی خواہش کے  
مطابق جناب سرور کائنات ﷺ اور حضرت ابوبکر  
صدیقؓ کے پہلو میں دفن ہوئے۔ نماز جنازہ حضرت  
صہیب روئیؓ نے پڑھائی اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ،  
حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت عبدالرحمنؓ بن  
عوفؓ، سعد بن ابی وقاصؓ اور حضرت زبیر بن عوامؓ نے  
آپؓ کو قبر میں اتارا۔ حضرت ابوبکرؓ کا سر شانہ  
رسالت ﷺ کے متوازی تھا۔ حضرت عمرؓ کا سر شانہ  
صدیقیؓ کے متوازی رکھا گیا۔ وفات کے وقت آپؓ کی  
عمر تریسٹھ برس سے کچھ زیادہ تھی اور مدت خلافت دس  
سال چھ ماہ چار دن، وہ سب سے زیادہ عادل، سب  
سے زیادہ خدا سے ڈرنے والے امیر تھے۔



اب ہم ایک بار پھر فلسطین اور بیت المقدس کی  
طرف آرہے ہیں مگر اس سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا  
ہے کہ پچھلے صفحات میں جو کچھ بیان ہوا ہے۔ اس کی  
دوبی مولی باتوں کو ایک بار پھر دہرایا جائے اور کتاب  
پڑھنے والے کو کسی طرح کی الجھن نہ محسوس ہو۔

یہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ حضرت خالد بن ولیدؓ  
نے حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں رومی  
لشکر کو جنگ اجنادین میں شکست دی تھی۔ جنگ  
اجنادین جیتنے کے بعد اسلامی فوجوں نے اپنی پیش  
قدمی جاری رکھی۔ اس لڑائی کے تقریباً ایک ماہ بعد  
حضرت ابوبکرؓ کا انتقال ہو گیا۔ پھر حضرت عمرؓ کے  
زمانے میں بھی اسلامی فوجیں بدستور بڑھتی رہیں اور  
انہوں نے دمشق، اردن اور حمص کے مقامات پر قبضہ  
کر لیا۔

ہرقل شاہ روم نے مختلف صوبوں سے فوجیں اکٹھی  
کر کے مسلمانوں کے مقابلے پر بھیجیں مگر یرموک کی  
فیصلہ کن جنگ میں حضرت خالدؓ نے انہیں شکست



یلغار کرتے گھس جاتے ہیں۔ توڑ پھوڑ اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کرتے ہیں۔ انہیں کوئی روکنے یا منع کرنے والا نہیں۔

مسلمانوں کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یہودیوں نے بیت المقدس پر مسلمانوں کا قبضہ کبھی قبول نہیں کیا۔ آج سے چودہ سو سال پہلے جو حال مسلمانوں کا تھا وہی حال آج بھی ہے اور اس کا ثبوت ٹی وی کے وہ خوف ناک مناظر ہیں جو روز اسکرین پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہودیوں کے بلندوزر مسلمانوں کے مکانات، دکانیں توڑ پھوڑ کر ملبہ بنا رہے ہیں۔ مگر وہ یہودی عمال کو دکھائی نہیں دیتے۔ اس لیے کہ طاقت کا توازن یہودیوں کے حق میں ہے۔ اس لیے کہ برطانیہ اور امریکا یہودیوں کے ساتھی ہیں۔ اس لیے کہ امریکا یہودیوں کا سرپرست ہے۔ اس لیے کہ امریکا کی پارلیمنٹ میں یہودیوں کا پورا پورا اثر و رسوخ ہے۔ اس لیے کہ امریکا کی حکومت دراصل امریکا کی نہیں بلکہ یہودیوں کی حکومت ہے۔ بظاہر حکومت میں عیسائی بھی ہیں مگر مسلمانوں کے خلاف عیسائی بھی یہودی بن جاتے ہیں۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ امریکا میں نصرانی حکومت نہیں بلکہ یہودی حکومت ہے اور وہاں یہودی قانون چلتا ہے۔

امریکا کے اس جانب دارانہ قانون نے امریکا کے رہائشی مسلمانوں کو دوسرے درجہ کا شہری بنادیا ہے۔ پاکستان کے ایک سابق ممتاز سفارت کار نے جن کا نام قطب الدین عزیز ہے، برطانیہ اور امریکا سے واپسی پر حکومت کی توجہ بھارت، اسرائیل اور انتہا پسند عیسائی لابی کے گٹھ جوڑ کی طرف مبذول کراتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ حکومت پاکستان اپنے شہریوں سے بدسلوکی کے واقعات سے امریکا کو آگاہ کرے اور پاکستان اور مسلمانوں کے خلاف سہ

دے کر منتشر کر دیا۔ اس لڑائی کے بعد مسلمانوں کا سارے شام پر قبضہ ہو گیا۔ ادھر محاذ فلسطین کے سپہ سالار عمرو بن العاص نے چند اہم مقامات پر قبضہ کرنے کے بعد بیت المقدس کا محاصرہ کر لیا۔ رومیوں نے صلح کے لیے آمادگی ظاہر کی اور ان کی درخواست پر حضرت عمرؓ خود بیت المقدس تشریف لے گئے اور معاہدہ صلح مرتب فرمایا۔ اس طرح بیت المقدس کی فتح کے بعد شام اور فلسطین دونوں پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہو گئی۔

فلسطین کی مہم سے فارغ ہونے کے بعد عمرو بن عاص نے حضرت عمرؓ کی اجازت سے چار ہزار فوج کے ساتھ مصر پر حملہ کیا۔ ان دنوں مصر پر مقوقش کی حکومت تھی جو شہنشاہ روم کا باجگزار تھا۔ مسلمانوں نے چھوٹے چھوٹے شہر فتح کرنے کے بعد قسطنطین کے مضبوط قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ پھر سات ماہ کے محاصرے کے بعد مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ قسطنطین سے فارغ ہو کر اسلامی فوج نے اسکندریہ اور طرابلس پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس طرح لیبیا سے ابی سینا تک مصر کے تمام ملک پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ دشمنوں کے گٹھ جوڑ

ترقی کے اس دور میں دشمنوں کی کارروائیاں کسی سے پوشیدہ نہیں رہ سکتیں۔ آج کل بیت المقدس میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ اسے ہم اپنی کھلی آنکھوں سے روزنی وی پر دیکھتے ہیں۔ یہودی بے دھڑک فلسطینیوں کے احتجاجی جلسے، جلوسوں، مکانوں، دکانوں اور مسلم محلوں پر بمباری کر رہے ہیں۔ بڑے کیا، بچے کیا، عورت کیا، ان یہودیوں کو کسی پر ترس نہیں آتا۔ یہ ٹینکوں کے زور پر محلوں کو بم مار کر ملبہ بنا دیتے ہیں۔ اسکول کے بچے بچیوں پر مشین گنیں کھول دیتے ہیں۔ روز صبح سے شام تک بیت المقدس کے کسی نہ کسی محلے میں مسلح یہودی



جماعتی گٹھ جوڑ اور اس کے زہر آلود پروپیگنڈے کا توڑ کیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ اس زہرے پروپیگنڈے کا توڑ سفارتی اور ابلاغ عامہ کی سطح پر کرنا پورے عالم اسلام کی ذمہ داری ہے۔

پاکستانی سفارت کار نے اکتوبر کے واقعات کے بعد پاکستان کے علاوہ عام مسلمانوں اور اسلام کے خلاف اسرائیل، امریکا، برطانیہ اور بھارت کی انتہا پسند لابی کے حوالے سے جن حالات کی نشان دہی کی ہے وہ کوئی راز نہیں۔ یہی لابی حال ہی میں ایک کنونشن کے دوران فلسطین کو مکمل طور پر اسرائیل کے حوالے کر کے عربوں کو فلسطین سے نکالنے کا مطالبہ کر چکی ہے اور اسرائیل آج کل اسی پالیسی پر عمل پیرا ہے۔

حکومت مصر کے مطابق ہزاروں فلسطینی ہجرت کر کے مصر پہنچ چکے ہیں اور اسرائیلی فوج مسلمانوں کے قتل عام اور ان کی املاک کی تباہی میں مصروف ہے۔ امریکا اور تمام بڑی عیسائی طاقتیں اس پر مہربا لب ہیں اور اقوام متحدہ بھی خاموش ہے۔ مغربی ذرائع ابلاغ پاکستان میں ”دینی جماعتوں“ کی کامیابی کو مغرب کے خلاف خطرے کی گھنٹی قرار دے رہے ہیں۔ امریکا، آسٹریلیا، فرانس اور برطانیہ میں مسلمانوں کے ساتھ نہایت ناخوشگوار واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ مساجد پر چھاپے اور شک و شبہ کی بناء پر گرفتاریاں، مسلمانوں کے ساتھ توہین آمیز رویہ اور خواتین کی تذلیل نے ان ملکوں میں جمہوریت اور انسانی حقوق کے احترام کا پول کھول دیا ہے۔

اس حوالے سے سفارت کار کا یہ مطالبہ درست ہے کہ پاکستان کی حکومت کو جرأت مندی سے اپنے شہریوں سے بدسلوکی کے واقعات سے امریکا کو آگاہ کرنا چاہیے اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف

پروپیگنڈے کا جواب دینے کے لیے پورے عالم اسلام کو اپنی ذمہ داری کا احساس کرنا چاہیے ورنہ ذرائع ابلاغ کی دروغ گوئی اور الزام تراشی مسلمانوں کے لیے مزید مشکلات پیدا کرے گی۔ اس لیے ہنود، یہود اور نصرانیوں کی طرف سے عالم اسلام کے خلاف کی جانے والی سازشوں اور سیاہ کاریوں کا جواب دینے کے لیے سفارتی سطح پر کی جانے والی کوششوں کے ساتھ ساتھ امریکا اور یورپ میں دانش وروں اور اسکالروں کے ایسے وفد بھیجنے کی ضرورت ہے جو ان ممالک میں پاکستانیوں اور مسلمانوں کے ساتھ کی جانے والی زیادتیوں کا موثر اور مستقل سدباب کر سکیں۔

ورنہ اگر امریکا نے ہوش کے ناخن نہ لیے تو اختلاف کی یہ تلخ بڑھتے بڑھتے پھر کسی دوسرے ”ستمبر“ کا پیش خیمہ بن سکتی ہے۔ جہاں تک مسلمانوں، یہودیوں اور نصرانیوں کے مذہبی اختلاف کا مسئلہ ہے تو یہ آج کا نہیں بلکہ بہت پرانا جھگڑا ہے۔ یہ اختلاف آغاز اسلام میں پیدا ہوا جب نبی کریم ﷺ نے ”خدا کے واحد“ کا نعرہ بلند کیا اور دنیا کے تمام بتوں کو سرنگوں کر دیا۔

بھرس بند قرار

آئیے تیرھویں صدی میں جھانک کر دیکھتے ہیں۔ ہلاکو خان اور فرنگی متحدہ لشکر پیش قدمی کرتا ہوا ۱۲۵۹ء میں سرحد فلسطین تک پہنچا تھا کہ خاقان اعظم منگو خان اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ یہ خبر ہلاکو خان تک پہنچی تو وہ واپسی کے لیے مجبور ہو گیا۔ جاتے ہوئے وہ دس ہزار تاتاری فوج صلیبیوں کی مدد کے لیے چھوڑ گیا اس کا سردار کتغا خان تھا۔ یہ یروشلم سے ہوتا ہوا آگے بڑھا مگر غزہ کے میدان میں بھرس بند قرار نے تاتاریوں کے متحدہ لشکر کو زبردست شکست سے دوچار کیا اور تاتاری بلاد فلسطین سے نکل گئے اور بھرس بند



قدار آگے بڑھ کر دمشق پر قابض ہو گیا اور اس کا ستارہ چمکنے لگا۔ یہ واقعہ ۱۲۶۰ء کا ہے۔

غزہ کے میدان میں شکست کھانے کے بعد صلیبیوں کے پاس اٹھاکہ سے حمص الکرار تک ساحل سمندر پر تیس قلعے بچ گئے تھے۔ ملک لظاہر بھیرس بند قرار اندرونی اصلاحات اور انتظامات سے فارغ ہوا تو اس نے صلیبیوں پر کاری ضرب لگانے کا فیصلہ کیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ بھیرس بند قرار کو بھی سلطان صلاح الدین ایوبی کی طرح ہر وقت جہاد کا شوق لگا رہتا تھا۔ چنانچہ اس نے ۱۲۶۵ء میں صلیبیوں کے قیصر یہ عسکریۃ دینیہ اور ارصوف کے قلعے چھین لیے اور دوسرے سال یافا، اٹھاکہ، ہنبورٹ اور انش دوہرے قلعوں پر قابض ہو گیا۔

یہ خبر جب یورپ پہنچی تو شاہ فرانس کو بھی غم نے زبردست چھتی تیار کیاں شہر میں مردیں گھیسے گئی اور سبھی تیلوس پر اترے۔ اسے اور اس کی فوج کو طاعون نے گھیر لیا۔ شاہ فرانس اس مرض کا شکار ہو گیا۔ اس مہلک شہداء انگلستان ایدورڈ اول بھی شریک تھے۔ دو مہینے پہنچے کہ اسے شاہ فرانس کی موت کی خبر ملی جس سے وہ بدول ہو کر واپس چلا گیا۔

ادھر بھیرس بند قرار نے ۱۲۷۱ء میں حمص الکرار اور ملک کے سامنے نائنٹ فورٹ کے قلعے بھی فتح کر لیے اور عیسائی حملہ آوروں کے غرور کو توڑنے کے لیے آرمینیا اور ایشیائے کوچک کی طرف بڑھا۔ وہ ایشیائے کوچک میں مصروف تھا کہ ۱۲۷۵ء میں منگول پھر دریائے فرات کے اس پار سے حملہ آور ہوئے لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے اور ملک لظاہر بھیرس بند قرار کے ہاتھوں انہیں دوبارہ شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ ملک لظاہر بھیرس بند قرار اس جنگ میں زخمی ہو گیا۔ افسوس کہ وہ ان زخموں سے جانبر نہ ہو سکا اور ۱۲۷۷ء میں انتقال کر

گیا۔ اس کا بیٹا تخت نشین ہوا لیکن سلطان قلاوون نے اسے الگ کر کے خود تخت و تاج سنبھال لیا۔

بار بار کی شکستوں سے صلیبیوں کے حوصلے پرست ہو گئے لیکن ان کے دلوں میں بیت المقدس کو مسلمانوں سے چھڑانے کی اب بھی آرزو تھی پس ۱۲۹۱ء سے ۱۳۱۰ء تک صلیبی جہاد کے نعرے لگاتے رہے۔ اس سلسلے میں انگلستان اور فرانس نے صلیبی جہاد کے لیے عشر بھی وصول کیا۔ نئے نئے منصوبے بنائے گئے مگر انہیں جنگ کی ہمت نہ ہوئی۔ ادھر ترکوں نے دریائے والگا سے ایشیائے کوچک تک دور دریائے فرات سے دریائے نیل تک اپنی دفاعی حیثیت خوب مضبوط کر لی۔

ایک صلیبی مورخ انتھانی مایوسی کے عالم میں لکھتا ہے۔

”ہم یروشلم کی صلیبی ریاست بچال نہ کرا سکے جس کے لیے ہماری آہوا اجداد ہر ہر پیکار کرتے۔ اور آج بھی وہ مزارع کے سائے تلے ٹھوٹا رہا ہے۔“

اس کے بعد ۱۳۱۵ء سے ۱۳۶۷ء تک سائپرس، دارا، نیکیلیا، پاس و غیرہ مجاہدین ہر مسر و شام میں لڑتے رہے لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ اس کے بعد بھی بہت سے پوپوں نے مذہبی جنگ کی تبلیغ کی مگر یورپ میں کسی جگہ کوئی حرارت نہ پیدا ہوئی۔

تیرہویں صدی عیسوی میں تاتاریوں کی بلغار نے ترکی قبائل کو اس قدر پریشان کیا کہ وہ ایشیائے مختلف علاقوں میں بھاگ نکلے۔ ان کا ایک قبیلہ جس کا سردار ارطغرل تھا اس نے ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے کمزور فریق کا ساتھ دے کر اسے جنگ جہادی اور تاتاری بھاگ گئے۔ ارطغرل نے جس گروہ کی مدد کی تھی وہ سلطان علاؤ الدین سلجوقی کی فوج تھی جسے ارطغرل نے مدد دے کر تباہی سے بچایا تھا۔



بہر حال نام میں کیا رکھا ہے۔ آپ اسے کوئی بھی نام دے سکتے ہیں۔ اب میں اس رومان کا آغاز کرتا ہوں۔

شاہی ہرکارہ گھوڑا دوڑاتا ہوا قیصران کے پاس پہنچا۔

قیصران اپنے فوجی دستے کے ساتھ بروصہ کے میدان میں نیزہ بازی کی مشق کر رہا تھا۔ ہرکارے نے استغیا صہ دیا۔

”یہ وہ خالی میں آپ بوجھ کیا گیا ہے۔“  
چاہیک اور سب وقت تین قیصران کے لیے تھے۔ قیصران نے اپنے سپاہیوں کو مشق کرنے کا حکم دیا اور ہرکارے کے ساتھ قیصر سلطان کی خدمت روانہ ہوا۔

دست عثمانیہ ترکی کا سلطان اور خان دربار خاص کے عہدے پر فائز تھے۔ قیصران نے اسے اس کے عہدے پر فائز کیا۔ اس کا چہرہ فخر مند تھا۔ قیصران نے اسے اس عہدے پر فائز کیا۔

قیصران نے اس عہدے پر فائز کیا۔ اس کا چہرہ فخر مند تھا۔ قیصران نے اسے اس عہدے پر فائز کیا۔

قیصران نے اس عہدے پر فائز کیا۔ اس کا چہرہ فخر مند تھا۔ قیصران نے اسے اس عہدے پر فائز کیا۔

اس زمانہ میں قسطنطنیہ کو باب المارت کہا جاتا تھا۔ یوریشیا کے تمام سلاطین اور بادشاہوں کا خیال تھا کہ قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے والا یورپ اور ایشیا کا شہنشاہ ہوتا ہے۔

قیصران نے ادب سے جواب دیا۔  
”خانی جاہ! اس غلام کا بچپن تو قسطنطنیہ کی فضاؤں میں پروان چڑھا ہے۔“

”بہت خوب۔“ یہ کہہ کر سلطان نے اس طرح سانس دیا جیسے اس کے دل کا بوجھ ہٹ گیا ہو۔ پھر

چنانچہ سلطان نے ارطغرل کو اس بروقت مدد کے صلہ میں دریائے سقاریہ کے بائیں جانب سفوت کا زرخیز علاقہ بطور جاگیر عطا کیا۔ ارطغرل نے اپنی شجاعت کے ایسے جوہر دکھائے کہ دو ترکوں کے حلیف بن گئے۔ پھر اپنی قوت بازو سے ترقی کر کے سلطان سلجوق کا نائب بن گیا۔ پھر ارطغرل نے تاتاریوں اور ہزنشینوں کی ایک متحدہ فوج کو زبردست شکست دی۔ اس سلطان نے اس کی جاگیر میں اضافہ کیا۔

ارطغرل نے اپنی قوم پر فخر کیا اور مرتے وقت تمام جائیدادیں اور زمینیں ارطغرل کے مرنے پر اس کا بیٹا عثمان خان تختیش بنواں اتی عثمان خان نے اس وقت عثمانیہ کی بنیاد رکھی۔ سلطان علاؤالدین نے خوش ہو کر قسطنطنیہ کا قلعہ اور لواحق مضافات عثمان خان کو سونپ دیے اور اپنا مکان جوہری کہتے، خصبہ میں اپنا نام شمس مرنے کی اجازت دے دی۔ پھر جب ۱۲۹۹ء میں عثمان خان کا انتقال ہوا تو اس کا چھوٹا بیٹا اور خان ۱۳۰۲ء کی عمر میں تخت پر بیٹھا۔ اس کا بیٹا عثمان خان تھا۔ اس نے تو چاہتا ہے کہ اس خاندان کی پوری تفصیل بیان کی جائے مگر مجبوری یہ ہے کہ ہمارے اس ناول کا نام فلسطین (بیت المقدس) ہے اس لیے ہم اپنے موضوع کی طرف آتے ہیں۔ مگر اس عثمانی سلطان اور خان کے زمانہ میں ایک ایسا تاریخی ساز اور رومان انگیز واقعہ پیش آیا جسے تقریباً ہر مورخ اور تاریخی ادیبوں نے کم و بیش پوری تفصیل سے پیش کیا ہے۔ چنانچہ ہم بھی اس رومان کو اپنے قارئین کے گوش گزار کرنے میں فخر محسوس کر رہے ہیں۔

اس رومانی کہانی کا نام بعض مورخین نے ”تختہ رومانی“ اور بعض نے ”جوزیفائن قیصران“ لکھا ہے۔



وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ سلطان کی زبان سے قسطنطنیہ کا نام سن کر قیصران کا دل سینے میں اچھل پڑا تھا۔ پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ اس کے ساتھ ہی دبا ہوا زخم ہرا ہو گیا۔

اس نے قسطنطنیہ میں آنکھ کھولی۔ پل بڑھ کر جوان ہوا۔ ماں بچپن میں ہی داغ مفارقت دے گئی تھی۔ خالہ نے قیصران کی پرورش کی تھی۔ خالہ کی بیٹی جوزیفائن اس کی منگیترا اور دل کی ملکہ تھی۔ دونوں کے باپ قسطنطنیہ سے دور ریاست نائیمسا کی نصرانی فوج میں ملازم تھے۔ جس وقت عثمانی لشکر نے نائیمسا پر حملہ کیا۔ قیصران اس وقت باپ اور خالو کے ساتھ آیا ہوا تھا۔ وہ بھی فوج میں بھرتی ہونے کا خواہش مند تھا لیکن سلطان اور خان نے نصرانی فوج کو تہ تیغ کر کے نائیمسا پر قبضہ کر لیا۔ اس دارو گیر میں قیصران کا باپ اور خالو دونوں ہی مارے گئے اور وہ گرفتار ہو کر ترکوں کے صدر مقام ”بروصہ“ پہنچا دیا گیا۔

قیصران مسلمانوں کی بہادری سے پہلے ہی متاثر تھا۔ یہاں ان کا اخلاق دیکھا تو مسلمان ہو گیا اور خان کی نئی تنظیم سینی جری (انکشاری) میں شامل ہو گیا۔ انکشاریہ میں صرف وہ جوان قیدی شامل کیے جاتے تھے جو مسلمان ہو کر فوجی خدمات انجام دینا چاہتے تھے۔

سلطان کے خیالات کا سلسلہ شاید ٹوٹ گیا۔ اس نے سراٹھا کر قیصران کو مخاطب کیا۔

”قیصران! ہم تمہیں ایک اہم کام سونپنا چاہتے ہیں۔“

”یہ ظل سبحانی کی بندہ پروری ہے۔“ قیصران نے جواب دیا۔ اس کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا اعزاز ہو سکتا تھا؟ سلطان کو یقیناً اس پر اعتماد تھا۔

سلطان کے چہرے پر کچھ بشاشت آئی۔ اس نے

قیصران کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی ایک کوچ نما کرسی پر بیٹھ گیا۔ سلطان نے ٹھہر ٹھہر کر پراعتماد لہجے میں کہا۔ ”قیصران! آج کل قسطنطنیہ اور سلطنت بازنطین کے حالات ٹھیک نہیں۔ شہنشاہ قسطنطنین کے مرنے کے بعد اس کی بیوہ ملکہ اینا نے کمن شہزادہ جان پلیوگس کو تخت نشین کیا۔ حکومت نادان بچوں اور نا تجربہ کار عورتوں سے نہیں چلا کرتی۔ ملکہ نے مجبور ہو کر ایک سردار کنفا کوزین کو شہزادے کا ولی مقرر کیا۔ اب نام تو ملکہ اور شہزادے پلیوگس کا ہے لیکن تمام امور سلطنت بلاشبہ کنفا کوزین کے سپرد ہیں۔ اب ملکہ اور کنفا کوزین میں اختلاف پیدا ہو گیا ہے اور کنفا کوزین نے ”نیکوینکا“ پہنچ کر علم بغاوت بلند کیا ہے۔ اس وقت ملکہ کو ہماری مدد کی ضرورت ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے قسطنطنیہ کے حالات سے پوری طرح آگاہ ہو جائیں۔ ہمارا فیصلہ سلطنت قسطنطنیہ کی بازنطینی حکومت کی قسمت کا فیصلہ ہوگا۔“

سلطان خاموش ہو کر قیصران کو دیکھنے لگا۔ قیصران کو خیال گزرا کہ شاید سلطان اس کے جواب کے منتظر ہیں۔

”سلطان عالم ارشاد فرمائیں۔ میں اس سلسلے میں کیا خدمت انجام دے سکتا ہوں؟“

”ہم تمہیں اپنا سفیر بنا کر قسطنطنیہ بھیج رہے ہیں۔“ سلطان نے قیصران کو بغور دیکھا۔ ”تم ملکہ سے مل کر یہ معلوم کرو گے کہ اس مدد کے معاوضہ میں وہ ہمیں کیا اور کہاں تک مراعات دیں گی؟“

قیصران نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد عرض کیا۔ ”غلام اس حکم کی بجا آوری کے لیے کب روانہ ہوگا؟“ مگر سلطان نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے ایک اور سوال کیا۔

”قیصران! تم نصرانی ہو؟“



”نہیں سلطان عالی مقام۔ میں الحمد للہ مسلمان ہوں۔“ قیصران نے سنبھل کر مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

”ہم تمہارے جواب سے خوش ہوئے۔“ سلطان بولا۔ ”اور ہاں۔ قسطنطنیہ میں ٹھہر کر تمہیں یہ اندازہ لگانا پڑے گا کہ ملکہ کا عوام پر کس حد تک اثر ہے؟“ قیصران کی تو جیسے دل کی مراد برآئی۔ ہر چند کہ اس نے قسطنطنیہ واپس جانے کا خیال دل سے نکال دیا تھا مگر کسی وقت اس کا دل قسطنطنیہ کو ایک نظر دیکھنے کے لیے بے پیم ہو جاتا تھا۔ اس نے دل کے ایک کونے میں جوزیفائن کی یاد چھپا رکھی تھی۔ مسلمان ہو جانے اور عثمانی لشکر میں ایک ہزار انکشاری سردار ہو جانے کے باوجود وہ دل سے جوزیفائن کی یاد کو ختم نہ کر سکا تھا۔ اس کے دل میں کسی کسی وقت خیال آتا۔

”کیا جوزیفائن اب بھی میرا انتظار کر رہی ہوگی؟“ پھر خیال آتا چار سال کا عرصہ بہت ہوتا ہے۔ اتنی دیر میں دنیا ہی بدل جاتی ہے۔

دوسرے دن قیصران کو قسطنطنیہ جانے کا پروانہ مل گیا۔ اس کے ساتھ ہی اسے یہ بھی حکم تھا کہ روانگی سے پہلے وہ ایک بار سلطان کے سلام کو حاضر ہو۔ قیصران کو تنہا قسطنطنیہ جانا تھا۔ اس لیے کسی خاص تیاری کی ضرورت نہ تھی مگر وہ یہ سوچ کر ضرور الجھ رہا تھا کہ سلطان نے اسے دوبارہ گفتگو کے لیے کیوں بلایا ہے۔

دوسری شام قیصران حسب الحکم پھر سلطان کی ملاقات کو قصر شاہی پہنچا۔ سلطان کو اس کی حاضری کی اطلاع دی گئی اور سلطان نے اسے فوراً طلب کر لیا۔ قیصران جب شاہ کے حضور پہنچا تو اس وقت سلطان بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ سلطان نے قیصران کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود سنگ سرخ کے ایک ستون پر ہاتھ رکھ کر

کھڑا ہو گیا۔ قیصران کے لیے یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔ لوگ تو سلطان کی صورت دیکھنے کے لیے ترستے تھے مگر اس کی دودن میں یہ سلطان سے دوسری ملاقات تھی۔

سلطان نے گفتگو کا آغاز کیا۔ اس نے کہا۔ ”قیصران! ہم نے کل رات ایک ہزار شکرانے کے نفل کا نذرانہ اللہ کے حضور پیش کیا۔ تم پوچھو گے کیوں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس ذوالجلالی نے آج سلطنت عثمانیہ کو یہ عزت و عظمت بخشی ہے کہ شہنشاہ بازنطین کی ملکہ ہم سے فوجی مدد کی خواستگار ہے۔“

قیصران کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ پس اس نے شاہی ادب ملحوظ رکھتے ہوئے سلطان کی ہاں میں ہاں ملائی۔

سلطان، ستون سے ہٹ کر بالکل قیصران کے قریب آ گیا۔ قیصران پاس ادب سے جھک گیا۔ سلطان مسکرایا اور بولا۔

”قیصران! تمہیں مبارک ہو۔ اس بات کا خیال رہے کہ ملکہ سے دوران گفتگو کوئی ایسی بات نہ کی جائے جس سے سلطنت عثمانیہ ترکی کے وقار کو ٹھیس پہنچے۔ ہم نے اپنے امراء پر تمہیں اس وجہ سے فوجیت دی ہے کہ تم ان سے زیادہ خلوص اور دیانت کے مالک ہو۔“

قیصران دراصل سلطان کے خیردانہ سلوک کی وجہ سے دبتا جا رہا تھا اس لیے وہ اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح سلطان کے سامنے سے ہٹ جائے مگر سلطان کی باتیں ختم ہونے کو ہی نہیں آرہی تھیں۔ چنانچہ قیصران نے سلطان کی توجہ ہٹانے کے لیے کہا۔

”اگر سلطان کا حکم ہو تو میں انکشاریوں کے لباس کے بجائے عام کپڑوں میں قسطنطنیہ کا سفر اختیار کروں؟“

سلطان نے چند لمحے قیصران کی تجویز پر غور کیا۔



پھر کہا۔

”بے شک..... بے شک۔ بلکہ یہ اور زیادہ بہتر ہو گا کہ تم ایک عام شہری کے لباس میں قسطنطنیہ میں داخل ہو۔ قیصران! ہم تمہاری عقل کے ابھی سے قائل ہو گئے ہیں۔ جو بات ہم بھول رہے تھے وہ تم نے یاد دلادی۔“

سلطان اور خان کے عہد میں سلطانی فوج میں دو طرح کے لشکر تھے۔ ایک تو عام ترکوں کا لشکر اور دوسرا انکشاریوں کا جو نصرانی اسیران جنگ پر مشتمل تھا۔ جس وقت اور خان نے انکشاریہ کا لشکر ترتیب دیا تو شیخ المشائخ بکماش کی خدمت میں حاضر ہو کر دعا کا طالب ہوا۔

شیخ نے اس نئے لشکر کے لیے دعا فرمائی اور خود انہوں نے اس کا نام ”سینی چری“ رکھا جو عربی میں انکشاری ہے۔ حاجی بکماش اوپچی ٹوپی پہنتے تھے جس کا رنگ سفید ہوتا تھا۔ چنانچہ ان کی تقلید میں سلطان نے حکم دیا کہ انکشاری لشکر کا ہر فرد سفید اوپچی ٹوپی پہنے گا۔

قیصران جانتا تھا کہ اگر وہ اپنی وردی یعنی سفید اوپچی ٹوپی پہن کر قسطنطنیہ میں گیا تو فوراً پہچان لیا جائے گا کہ وہ نصرانی النسل ہے۔ اس لیے اس نے سلطان سے دوسرا لباس استعمال کرنے کی اجازت مانگی تھی اور سلطان اس وجہ سے اس کی دورانہ نشی کا قائل ہوا تھا۔

پھر رات سونے سے پہلے قیصران ان تین باز نطینی سرداروں کے ساتھ قسطنطنیہ روانہ ہوا جو ملکہ اینا کا پیغام عثمانی سلطان کے پاس لے کر آئے تھے۔



قیصران عام ترکی لباس میں باز نطینی سرداروں کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ انہیں کسی طور پر بھی شبہ نہ ہوا کہ

ان کا نیا ساتھی نہ صرف نصرانی النسل ہے بلکہ ان کا ہم وطن بھی ہے۔ باز نطینی سرداروں نے کئی بار قیصران سے گفتگو کرنے کی کوشش کی مگر قیصران صرف ہاں، ہوں کر کے خاموش ہو جاتا تھا۔

قیصران عثمانی تربیت کی وجہ سے تیز رفتاری کا عادی تھا۔ اس کا گھوڑا بار بار ساتھیوں سے آگے نکل جاتا تھا اور اسے رک کر باز نطینی سرداروں کا انتظار کرنا پڑتا۔

باز نطینی اس کے قریب پہنچ کر پہلے اپنا سانس درست کرتے پھر آگے قدم بڑھاتے تھے۔ ایک بار تو قیصران کا گھوڑا اسے اس قدر آگے لے گیا کہ اسے ایک چشمے کے پاس ٹھہر کر کافی دیر تک ساتھیوں کا انتظار کرنا پڑا۔

باز نطینی قریب آئے تو وہ بری طرح ہانپ رہے تھے۔ ان کے پیٹ میں سانس نہ سمائی تھی اور منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ قیصران کو ان کی حالت پر ہنسی آگئی۔ اس نے سوچا مسلمانوں اور نصرانیوں میں سب سے بڑا فرق یہی ہے۔ پھر دوسرے ہی لمحے اسے یہ بات منہ سے نکالنا پڑی۔ جب نصرانیوں کے حواس درست ہوئے تو ان میں سے ایک سردار نے کہا۔

”قیصران! کیا تمہارا گھوڑا اتنی ہی تیز رفتاری سے دوڑتا ہے یا تم ہمیں پریشان کرنے کے لیے اسے تیز بھگا رہے ہو۔“

قیصران کو آخر دل میں آئی ہوئی بات کہنا پڑی۔ پس اس نے ہنس کے کہا۔

”معزز سردار! نصرانی سپاہی اور عثمانی سپاہی میں یہی سب سے بڑا فرق ہے۔ جو فاصلہ آپ تین دن میں طے کرتے ہیں وہ ہم ایک دن میں طے کر لیتے ہیں۔“

باز نطینی سردار کیا جواب دیتا۔ وہ تو بس قیصران



کا منہ دیکھ کر رہ گئے۔ ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ اب بات آہی پڑی تھی تو قیصران نے خود ان سے کہا۔

”میرا نام قیصران ہے۔ مگر آپ کو یہ میرا نام کس نے بتایا؟“

ان سرداروں میں سے ایک نے جواب دیا۔ ”ہمیں تو یہ بھی معلوم ہے کہ آپ ایک ہزار دستوں کے سردار ہیں۔“

قیصران کو بڑی حیرت ہوئی اور اب وہ سوچنے لگا کہ کہیں ان سرداروں کو یہ تو نہیں معلوم ہو گیا کہ میں نصرانی ہوں لیکن قیصران نے اپنے جذبات چہرے پر نہ آنے دیے اور صرف حیران نظروں سے انہیں دیکھ کر رہ گیا۔

اور آخر ان سرداروں میں سے دوسرے سردار نے خود ہی اس معرکہ کو حل کر دیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”قیصران! آپ پریشان نہ ہوں۔ یہ باتیں ہمیں خود آپ کے سلطان نے بتائی ہیں۔“

قیصران کو قدرے اطمینان ہوا لیکن اس نے اپنے دل کی خلش دور کرنے کے لیے ان سے سوال کیا۔

”سلطان معظم نے میرے بارے میں آپ کو اور کیا کچھ بتایا ہے؟“

قیصران کے سوال پر سرداروں نے ایک دوسرے کا منہ دیکھا پھر ان میں سے ایک بولا۔

”ہمیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ آپ سلطان کے بہت قریب ہیں۔ اتنے قریب کہ سلطان نے ملکہ قسطنطنیہ کی درخواست پر جو کچھ فیصلہ کیا۔ آپ اس سے بھی آگاہ ہیں۔“

قیصران فوراً سمجھ گیا کہ مخالف سردار بڑی چالاکی سے سلطان کی آڑ لے کر اس کے منہ سے کوئی ایسی بات معلوم کرنا چاہتے ہیں جو ان کے مطلب کی

ہو۔ چنانچہ جواب دینے سے پہلے قیصران جست لگا کر گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھا اور اس کے فوراً بعد گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ اب قیصران کا گھوڑا آگے آگے اور مخالف سردار اس کے پیچھے پیچھے گھوڑے بھگاتے آرہے تھے۔

بازنطینی سردار اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ وہ قیصران سے کچھ بھی نہ پوچھ سکے۔ قیصران نے کچھ آگے جا کر گھوڑا آہستہ کر لیا اور جب بازنطینی سردار اس کے پاس پہنچ گئے تو وہ سب ایک ساتھ جلنے لگے۔

قیصران کو قسطنطنیہ پہنچنے کی جلدی تھی۔ اس نے اس سے پہلے سوچا بھی نہ تھا کہ اسے اپنا وطن دیکھنے کا موقع مل سکے گا یا وہ اس ارمان کو اپنے ساتھ ہی لے کر دنیا سے اٹھ جائے گا۔ یہ ضرور تھا کہ اس کا دل بھی کبھی یہ ضرور کہتا تھا کہ قیصران صبر کر۔ تو اپنی محبوبہ سے ضرور ملے گا۔ جو یقیناً بھی اسی آگ میں جل رہی ہے جس آگ میں تو سلگ رہا ہے۔

قیصران کو خود قسطنطنیہ پہنچنے کی بہت جلدی تھی۔

اس کا تیز رفتار گھوڑا بار بار زور کرتا کیونکہ وہ اور اس کا سوار اس سست روی کے عادی نہ تھے۔ قیصران مختلف راستوں سے بھی واقف تھا لیکن اسے اپنے ساتھیوں کے ساتھ چلنا پڑ رہا تھا۔ بازنطینی سواروں نے صاف اور طویل راستہ اختیار کیا تھا حالانکہ وہ اگر بحر اسود کے ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کرتے تو آبنائے باسفورس تک بہت جلد پہنچ سکتے تھے لیکن وہ بازنطینیوں کو شارٹ کٹ (مختصر راستہ) بتا کر کسی قسم کے شک و شبہ کا موقع نہ دینا چاہتا تھا۔

آخر یہ لوگ خدا خدا کر کے تیسرے دن آبنائے باسفورس پر پہنچے۔ یہ آبنائے ایشیا اور یورپ کی حد فاصل ہے۔ آبنائے کے مشرقی جانب براعظم ایشیا اور مغرب میں براعظم یورپ ہے۔ اس وقت



اور کارگیری کو اطمینان سے دیکھ کر اپنی آنکھیں سینکتا۔  
شاہی محل پر جگہ جگہ پہرہ لگا تھا۔ بازنطینی سرداروں  
کو کئی جگہ رکنا پڑا۔ مگر دم کے دم میں پورے محل میں یہ  
بات پھیل گئی کہ ایک جوان رعنا سلطنت عثمانیہ  
کا سفیر بن کر قسطنطنیہ میں آیا ہے اور ملکہ عالیہ سے  
ملاقات کا خواہش مند ہے۔ محل کی لونڈیاں، باندیاں،  
کنیریں اور تمام ملازم ترک سفیر کو دیکھنے کے لیے  
روشنوں، راہداریوں کے پاس آکھڑے ہوئے تھے۔  
کنیروں کا یہ عالم تھا کہ وہ خوب صورت سفیر کو دیکھنے  
کے لیے ایک دوسرے پر گری پڑ رہی تھیں۔

قیصران نے قبول اسلام کے بعد چھوٹی سی مگر  
خوب صورت داڑھی رکھ لی تھی۔ ہلکی ہلکی نوک دار  
مونچھوں نے اس کے چہرے کے رعب کو بڑھا  
دیا تھا۔ جنہوں نے منگولوں کو دیکھا تھا ان کے خیال  
میں ترک بھی منگولوں کی طرح بے ڈول اور بھیانک  
چہروں کے مالک ہوں گے۔ لیکن قیصران کو دیکھنے  
کے بعد انہیں اپنا خیال بدلنا پڑا۔ کیونکہ ان میں  
اور ترکوں میں صورت و شکل کے اعتبار سے کچھ زیادہ  
فرق نہ تھا۔ اگر قیصران کی داڑھی کو نظر انداز کیا جاتا تو وہ  
بالکل نصرانی نظر آتا۔ انہیں کیا پتا تھا کہ وہ واقعی حقیقت  
میں نصرانی اور اسی شہر کا خاص باشندہ تھا۔

پتا نہیں قیصران کو کس کس نے دیکھا۔ لونڈیوں اور  
کنیروں کا تو دیکھنے والوں میں میلہ سنا لگ گیا تھا۔  
پھر جب قیصران کو بازنطینی سردار اپنے ساتھ ایک  
آراستہ و پیراستہ کمرے میں لے گئے تب بھی قیصران  
کو دیکھنے آنے والوں کا تانتا سا بندھا رہا۔ قیصران  
نئے دلہا کی طرح سر جھکائے بیٹھا تھا۔ وہ اگرچہ دلہانہ  
تھا مگر مردانہ حسن و وجاہت کا پیکر ضرور تھا۔

اس دوران قیصران کو مطلع کیا گیا کہ ملکہ اینا اس  
سے کل ملاقات کریں گی۔ ادھر قیصران اپنا گھر اور

بازنطینیوں کے تمام ایشیائی علاقوں پر ترکوں کا قبضہ ہو  
چکا تھا۔ یورپ میں بازنطینی حکومت مقدونیہ اور یونان  
کے ایک مختصر اور محدود علاقے پر قابض تھی۔

قیصران کے پاس سلطنت عثمانیہ ترکی کا پروانہ  
راہداری تھا اور بازنطینی سرداروں کے پاس ملکہ  
قسطنطین کا اجازت نامہ تھا۔ اس لیے انہیں بارڈر پار  
کرنے میں کوئی دقت نہ ہوئی اور وہ آبنائے باسفورس  
پار کر کے قسطنطنیہ کے علاقے میں داخل ہو گئے۔ اس  
کے ساتھ ہی قیصران کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔  
وہی کوچہ و بازار، وہی رونقیں اور چہل پہل۔ پچھلے چار  
سال کے دوران قسطنطنیہ میں کوئی نمایاں فرق نہ  
آیا تھا۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ شہر میں کہیں کہیں فوجی نقل و  
حرکت دکھائی دیتی تھی۔ امن کے زمانہ میں فوجی  
سواریاں یا گاڑیاں سڑکوں پر دکھائی نہ دیتی تھیں۔ لیکن  
آج کل فوجی سوار اور پیادے ادھر ادھر پہرہ دیتے  
اور گھومتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ جنگ قسطنطنیہ  
سے ابھی بہت دور تھی۔ کنفاکوزین نے نیکوٹیکا میں اپنا  
مستقر بنایا تھا اور فوجیں اکٹھی کر کے قسطنطنیہ پر ایک  
بڑے حملے کی تیاریوں میں مصروف تھا صرف  
اتنا ضرور تھا کہ چھوٹی چھوٹی جھڑپیں کہیں نہ  
کہیں ہو جاتی تھیں۔

شہنشاہ قسطنطین کا شاہی محل ایک ایسی شان دار اور  
دیدہ زیب عمارت تھی جس کی تفصیل کے لیے ایک  
دفتر درکار ہے۔ صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ ایک زمانہ  
میں بازنطینی سلطنت یوریشیا (یورپ اور ایشیا) کی عظیم  
ترین حکومت تھی۔ اس لیے وہاں کے شہنشاہ کا محل بھی  
اس دور کے عظیم محلات میں سے ایک تھا۔ قیصران کو  
اس محل کو دیکھنے کا پہلی بار موقع ملا تھا۔ لیکن کام کی  
اہمیت اور خیالات کے ہجوم نے قیصران کو اتنی مہلت  
نہ دی تھی کہ وہ اس تابیاب اور نادیر روزگار محل کی صناعیوں



محلہ دیکھنے کے لیے بے تاب تھا مگر اب مجبوری تھی۔ وہ ملکہ سے ملے بغیر اور شہر میں گھومنے پھرنے کی اجازت حاصل کیے بغیر محل سے باہر نہ جاسکتا تھا۔ اس لیے اسے صبر کرنا پڑا۔ یایوں کہیے کہ سینہ پر صبر کا پتھر رکھنا پڑا۔

اسی وقت محلات شاہی کا داروغہ حاضر ہوا اور اس نے ادب سے عرض کیا۔

”اے عالی مرتبت شاہی مہمان! مہمان خانہ میں تشریف لے چلیے۔“

قیصران کینروں کی تاک جھانک سے پریشان ہو رہا تھا۔ اس نے داروغہ کی دعوت کو پذیرائی بخشی اور اس کے ساتھ ہولیا۔ وہ اگرچہ داروغہ محلات کے ساتھ جا رہا تھا مگر کینریں تھیں کہ اس کے اوپر ٹوٹی پڑتی تھیں۔ چنانچہ قیصران، کینروں کی بے تابی کا لطف اٹھاتا ہوا شاہی مہمان خانہ میں پہنچا۔ مہمان خانہ دیکھ کر قیصران کا دماغ گھوم گیا۔ ایسا سجا اور آراستہ دیراستہ کمرہ اس نے اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ فرش، دیواریں اور چھتیں ایسی کہ نظر نہ ٹھہرتی تھی۔ دنیا جہان کے نوادرات سے مہمان خانہ کو مزین کیا گیا تھا۔

قیصران کو تھکن محسوس ہو رہی تھی۔ اس لیے اس نے کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کرنے کی خواہش کا اظہار کیا مگر داروغہ بضد ہوا اور اس نے انتہائی خوشدلانہ انداز میں التجا کی۔

”اے معزز مہمان۔ شاہی حکم کے مطابق آپ کی دل بستگی کے لیے رقص و موسیقی کا کھوڑا سا انتظام کیا گیا ہے۔ آپ اجازت دیجیے تاکہ رقاصائیں اور مغنیاں حاضر ہو کر مہمان کی دل بستگی کا سامان کریں اور آپ کی تھکن دور ہو سکے۔“

قیصران کو رقص و موسیقی سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس

لیے اس نے ہنگامہ ”ہاؤ وہو“ کے بجائے داروغہ سے تنہائی کی درخواست کی۔ داروغہ نے مہمان کے حکم کے مطابق رقص و موسیقی کا پروگرام ختم کر دیا اور ذرا دیر میں کمرے میں سناٹا چھا گیا اور مہمان گاؤ تکیوں کے سہارے آرام کرنے لیٹ گیا۔

دراصل ملکہ نے حکم دیا تھا کہ مہمان کی تھکن دور کرنے کے لیے رقص و موسیقی کا دور ہو۔ پھر جام چھلکیں اور شراب و شباب کی محفل برپا ہو۔ یہ سب کچھ ملکہ کے حکم پر کیا جا رہا تھا تا کہ مہمان خوش ہو اور ملکہ کی عظمت کا اعتراف کر لے۔ مگر قیصران نے محفل ہاؤ ہو اور شراب و کباب سے انکار کر کے ملکہ کو پہلے ہی قدم پر شکست دے دی تھی۔ ملکہ بڑی جہاں دیدہ اور عیار عورت تھی۔ وہ قیصران کے انکار سے دل برداشتہ نہیں ہوئی اور دوسرے حملہ کے طور پر اس نے یورپ کی اعلیٰ ترین مہنگی شراب گنگا جنسی صراحیوں میں بھروا کر یونان کی حسین و جمیل کینروں کے ہاتھ مہمان کے لیے بھجوائی۔

قیصران، ملکہ کے ان بے درپے حملوں سے قدرے گھبرا گیا۔ اس نے شراب و کباب اور محفل رقص و موسیقی سے پہلے ہی انکار کر دیا تھا۔ اب جو کینریں ساغر و مینا کے ساتھ مستانہ دار مہمان خانے میں داخل ہوئیں تو قیصران گھبرا کے کھڑا ہو گیا۔ حسن بے باک کے اس چمکتے دیمکے نظارے سے اس کا دماغ گھوم رہا تھا مگر اس نے فوراً خود کو سنبھالا اور مستقبل کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس نے اس حسن بے باک کی انکھیلیوں سے بھی نظریں چرا لیں اور داروغہ سے بڑی عاجزی کے ساتھ تنہائی اور قطعی تنہائی کی درخواست کی۔ یہاں تک کہ داروغہ کو مجبور ہونا پڑا۔ اس نے مہمان خانہ کو فوراً خالی کرنے کا حکم دیا اور صاف الفاظ میں اعلان کیا کہ معزز مہمان کی طبیعت مکر رہے۔ اس



لیے انہیں تنگ نہ کیا جائے۔ قیصران کو ایک جھٹکا سا لگا اور اس کی آنکھ کھل گئی۔

خواب میں اس کے سینے سے لپٹی ہوئی جوزیفائن اس پر جھٹکی ہوئی کہہ رہی تھی۔

”ہوش میں آؤ قیصران۔۔۔ مجھے پہچانو۔۔۔ میں ہوں تمہاری جوزیفائن۔ تمہاری جوزی۔“

قیصران کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا تھا۔ اس نے سر کو کئی بار جھٹکے دیے۔ آنکھیں ملیں۔ دانتوں میں انگلی دبا کر زور سے کائی مگر جوزیفائن اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہوئی۔ قیصران کو پھر بھی یقین نہ آیا۔ اس نے تیراں نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”جوزیفائن۔۔۔ کیا واقعی تم جوزی ہو؟“  
جوزیفائن مسکرا کر اس کے بستر پر بیٹھ گئی۔ آخر قیصران کو یقین کرنا پڑا۔ وہ بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اب قیصران نے سر کو جھٹکا دے کر کہا۔

”جوزی! تم یہاں کیسے آ گئیں؟ یہ تو شاہی مہمان خانہ ہے۔ پہرے داروں کو خبر ہو گئی تو غضب ہو جائے گا۔“

جوزیفائن نے قیصران کو محبت بھری نظروں سے دیکھ کر بولی۔ ”خبر دو نہیں۔ کسی میں اتنی ہمت نہیں کہ اندر آئے۔“

”لیکن تم۔۔۔“ قیصران کہتے کہتے رک گیا۔

”میں جوزیفائن ہوں۔ اور تمہاری آنکھوں کے سامنے بیٹھی ہوں۔ تم کوئی خواب نہیں دیکھ رہے ہو۔“  
جوزیفائن نے اس کے شک کو دور کرنے کی کوشش کی۔ قیصران کو یقین تو آ گیا کہ یہ خواب نہیں بلکہ کھلی حقیقت ہے لیکن اس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ شاہی مہمان خانے کے اس کمرے میں جہاں ترکوں کا سفیر آرام کر رہا ہے۔ وہاں جوزیفائن کیسے پہنچی؟ کیا سارے پہرے دار اندھے ہو گئے ہیں یا پھر جوزیفائن انسانی پیکر کے بجائے۔۔۔

داروغہ محلات نے احتیاط کے طور پر دو جہتی غلاموں کا مہمان خانہ پر پہرہ لگا دیا اور سخت تاکید کی کہ کوئی کنیز مہمان خانہ میں نہ جانے پائے۔ کیونکہ قیصران نے داروغہ محلات سے صاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ اگر اسے شراب و کباب میں زبردستی الجھایا گیا تو وہ اس کی شکایت ملکہ سے کر دے گا۔ کیونکہ وہ مسلمان ہے اور مسلمان اس قسم کی باتوں سے دوسوں دور رہتے ہیں۔ مسلمانوں کے مذہب میں شراب حرام ہے اس لیے وہ یہ نہ کرنے پر آمادہ نہیں۔

قیصران کو تیناکی میسر آئی تھی مگر نیند اس کی آنکھوں سے دوسوں دور تھی۔ ایک تو اس کا دھن، دوسرا اس کے محبوب کا دیار۔ کھلے ہوئے درجے سے آئے والدہر جھونک اس کے دل میں جوزیفائن کی یاد اور پھر کا دیتا۔ کیونکہ وہ اس کے دل کی ملکہ اور منگھیر تھی۔ بروصہ میں محبت کی چنگاری دبی ہوئی تھی۔ لیکن یہاں آ کر وہ چنگاری شعلہ بن کر اسے جا رہی تھی۔

جوزیفائن کے خیالوں میں مگر قیصران نہ جانے کب خواب کی خیم و نازک گود میں پہنچ گیا۔ مگر جوزیفائن نے خواب کی دنیا میں بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ اس نے دیکھا کہ وہ ایک پرفشیا بان میں ایک درخت کے نیچے بیٹھا ہے۔ سامنے قوس قزح کے رنگوں کی ایک بارہ درری ہے۔ پھر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے جوزیفائن اس بارہ درری سے نکلی اور نازک نازک قدم اٹھائی اس کی طرف آ رہی ہے۔ جوزیفائن کو دیکھ کر قیصران بے تاب ہو گیا اور جلدی سے اٹھ کر اس کی طرف بڑھا۔ سنگ مرمر کی نہر کے کنارے دونوں ایک دوسرے کے بالکل قریب ہو گئے اور قیصران نے ”میری جوزیفائن“ کہہ کر اسے اپنے سینے سے لپٹا لیا۔

”ہوش میں آؤ قیصران! ہوش میں آؤ۔“



”اچھا تو میں جا رہی ہوں۔ تم سوچتے رہو۔“  
جوزیفائن بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔  
قیصران کو جیسے ہوش آ گیا۔ اس نے پھر سر کو ذرا سا  
جھٹکا دیا اور بولا۔ ”اب مجھے بالکل یقین آ گیا ہے  
جوزی۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ میں تمہارا تصور لیے  
ہوئے سو گیا۔ خواب میں تم سے ملا اور اب وہ خواب  
حقیقت بن کر میرے سامنے ہے۔ لیکن مجھے تمہیں  
اس جگہ دیکھ کر جتنی خوشی ہوئی ہے اتنی ہی حیرت بھی  
ہے۔“

جوزیفائن مسکرائی اور بجلیاں گراتی ہوئی بولی۔  
”تمہاری یہ حیرت بھی دور ہو جائے گی مگر پہلے یہ بتاؤ  
کہ تم کیسے ”قیصران“ اس طرح بن گئے؟“  
قیصران نے ادھر ادھر دیکھ کر جوزیفائن کو اپنے سے  
اور قریب کر لیا اور جواب دینے کی بجائے خود اس سے  
سوال کیا۔

”یہ تو میں بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے تم یہ بتاؤ کہ  
تمہیں میرے آنے کی خبر کیسے ہوئی اور تم نے مجھے  
کیسے پہچان لیا؟“

جوزیفائن نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ پھر اپنا سر  
قیصران کے سینے سے لگا دیا۔ جوزیفائن کو افسردہ دیکھ کر  
قیصران بھی افسردہ ہو گیا اور اس نے کہا۔

”جوزی! اب نہ گھبراؤ۔ اب ہم مل گئے ہیں تو کبھی  
جدا نہ ہوں گے۔ میں تمہیں اپنے ساتھ لے  
چلوں گا۔“

”یہ اتنا آسان نہیں قیصران۔“ جوزی نے نرم لہجے  
میں جواب دیا۔ ”تم سلطان ترکی کے سفیر ہو اور میں  
قسطنطین کے ولی عہد شہزادہ پلیوگس کی گرانڈ سسٹر  
جوزیفائن ہوں۔“

”شہزادہ پلیوگس کی گرانڈ سسٹر؟“ قیصران نے  
دہرایا اور سوالیہ نظروں سے جوزیفائن کو دیکھنے لگا۔

جوزیفائن نے قیصران کے سینے سے سر اٹھایا  
اور آنکھوں سے نکلتے ہوئے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔  
”قیصران! پہلے تمہیں اپنی مختصر کہانی سنا دوں تاکہ  
تمہاری حیرانی دور ہو جائے اور تم اطمینان سے باتیں  
کر سکو۔“

قیصران گھبرا کے بولا۔ ”ایسا نہ ہو کہ کہانی سناتے  
سناتے تمہارے جانے کا وقت ہو جائے اور میں کچھ  
بھی نہ کہہ سکوں۔“

جوزیفائن بولی۔ ”اس کی فکر نہ کرو۔ جب تک تم کہو  
گے۔ میں تمہارے پاس رہوں گی۔ ہاں تو میں نے  
کہا تھا کہ میں شہزادہ پلیوگس کی گرانڈ سسٹر ہوں اور  
شاہی محل میں میرا مرتبہ ملکہ ایسا کے برابر ہے۔“

قیصران کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ وہ حیران حیران  
نظروں سے جوزیفائن کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے الجھتے  
ہوئے کہا۔ ”مگر تم شاہی محل میں پہنچی کس طرح؟“

اور جوزیفائن نے اپنی کہانی شروع کی۔ اس نے  
بتایا۔

تائیساک کی جنگ میں خالو اور ابا کے مارے جانے  
کی خبر ہمیں ایک سپاہی کے ذریعہ ملی جو اس جنگ میں  
زخمی ہو کر یہاں آ گیا تھا۔ تمہاری اور دوسرے لوگوں کی  
گرفتاری کی خبر بھی ہمیں اسی شخص نے سنائی تھی۔ ہمیں  
بتایا گیا تھا کہ عثمانی لشکر جس علاقے کو فتح کرتا ہے۔

وہاں بچوں، بوڑھوں اور خواتین کو معاف کر دیتا ہے  
مگر جوانوں کو نہیں بخشا۔ ان کا سر قلم کر دیا جاتا ہے۔  
اس لیے مئی نے ابا کے ساتھ تمہیں بھی رو دھو کر  
صبر کر لیا تھا۔ مگر میرا دل اندر سے کہتا تھا کہ تم زندہ ہو  
اور ایک بار ہم ضرور ملیں گے۔“

(بقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)





زبانیں تاریخ مرتب کرتی ہیں اور تہذیب کا عکس ہوتی ہیں برصغیر میں ہر شہر اور صوبے کی اپنی زبان تاریخ اور ثقافت رہی ہے انگریزوں نے برصغیر میں قدم رکھتے ہی سب سے پہلے مسلمان اکثریت والے علاقوں اور شہروں میں زبان اور ثقافت پر حملے کر کے سب سے پہلے فارسی کو دیس نکالا کیا۔ پھر عربی کو مدارس تک محدود کر دیا۔ مقامی زبانوں کو گنوار اور جاہلوں کا کلچر قرار دیا اور خود ہندو بیٹے کی مدد سے حکومت کرتے رہے۔ دلی کے کرخنداروں کی بولی میں کیا لطافت، چاشنی اور خوب صورتی تھی اس کا اندازہ تو پاکستان تو دور کی بات ہے اب خود دلی میں پیدا ہونے والی نسل بھی نہیں لگا سکتی۔ اس زبان پر عبور رکھنے اور سمجھنے والی اب آخری نسل کے چند بزرگ ہی رہ گئے ہیں آج کی نسل کو اس بولی سے آشنا کرنے کے لیے ہمارے بے حد اصرار اور ضد پر جناب مشتاق احمد قریشی قلم اٹھانے پر تیار ہوئے ہیں۔ یہ ایک صفحہ ابتدا ہے امید ہے قارئین کو یہ انداز تحریر پسند آئے گا اور محترم مشتاق احمد قریشی کو بھی ہمیں اور حوصلہ ملے گا کہ وہ اس بولی سے اپنے پڑھنے والوں کو محفوظ کرتے رہیں۔

”میاں زری سننا۔“ آواز میرے پیچھے سے آئی تھی میں نے پلٹ کر دیکھا تو ایک بزرگ نما، سستی سفید براق کرتا پا جامہ میں نظر آئی پہلے تو میں انہیں دیکھتا ہی رہ گیا کیا شان تھی باریک ٹمل کا یا دائل کا کرتا، جس پر خوب صورت کڑھائی سے نیل بوٹے سجے تھے اس کے نیچے کروٹیا سے بنا ہوا جالی دار بنیان سفید لٹھے کا پا جامہ چمک دار پمپ کا دلنش والا جوتا، جب وہ چلتے ہوئے قریب آئے تو جوتے کی چمچہ کرتی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

”میاں آپ کس طرف جا رہے ہیں؟“

”کیوں۔“ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”میاں آپ تو ناراض ہو رہے ہیں۔ میں تو بس ذرا یہ پتا معلوم کرنا چاہ رہا تھا۔“ اتنا کہہ کر انہوں نے ایک پرچہ میرے سامنے کر دیا جس پر کسی بھائی خلو (خلیل احمد) کا پتہ درج تھا۔ میں نے پرچہ دیکھ کر اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تو بزرگوار ناراض ہو گئے۔

”میاں عجب آدمی ہو بھائی خلو کو نہیں جانتے، یہاں بڑے مشہور آدمی ہیں، دلی میں تو پورا محلہ انہیں جانتا تھا یہاں کا تو باوا آدم ہی نرالہ ہے جس سے پوچھو کچھ بتاتا ہی نہیں سب کے سب اپنی کھال میں مست چلے جا رہے ہیں کسی کو کسی کا ہوش ہی نہیں ہے۔ میاں ہماری دلی میں تو لوگ پورے شہر کے لوگوں کو اچھی طرح جانتے ہیں اگر کسی سے کوئی پتا معلوم کرنا ہو تو وہ نہ صرف پتا بتا دیتا ہے بلکہ پوچھنے والے کو اجنبی جان کر اس پتے پر پہنچا بھی دیتا ہے۔ یہاں کی لنکا ہی نرالی ہے۔ یہاں تو سب ہی باون گز کے ہیں کسی کو کسی کا پتا ہی نہیں ہے۔ اچھا ان کا تو پتا ہوگا۔“ اتنا کہہ کر انہوں نے اسے ہاتھ میں پکڑے پرچے کو پلٹ کر ہمارے سامنے کر دیا اور ساتھ گویا ہوئے یہ بھائی آشوا تو گھڑی ساز کا پتا ہے لیکن پرچے پر اشتاق احمد گھڑی والے لکھا تھا۔ کہنے لگے۔



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)



”میاں یہ گھڑیاں مرمت کرتے ہیں بڑے پہنچے ہوئے کاریگر ہیں انہیں تو جانتے ہوں گے۔“ ہم نے گردن گھما کر چاروں طرف دیکھا تو سامنے ہی سڑک کے پاس ایک گھڑی والے کی دکان نظر آئی جس پر ایک تختی پر لکھا تھا یہاں گھڑیوں کی تسلی بخش مرمت کی جاتی ہے۔ میں نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بزرگوار سے کہا۔

”جناب آپ سامنے والی گھڑیوں کی دکان سے پتا کر لیں شاید انہیں پتا ہو۔“ انہوں نے گردن گھما کر اس طرف دیکھا۔

وہ ایک دم سے چپک کر بولے۔

”میاں! لواء سے کہتے ہیں بغل میں بچہ شہر میں ڈھنڈورا، وہ جو کہتے ہیں نہ دو گام چلو اور سامنے منزل آ جائے۔ اس وقت تو یہاں وہی معاملہ ہوا ہے ہم اتنی دیر سے جھک مار رہے ہیں لوگوں سے پوچھتے پھر رہے ہیں کوئی بتلاتا ہی نہیں، چلو میاں اللہ تمہیں خوش رکھے تم نے بڑا کام کیا ہے ہماری مشکل آسان کر دی ہے آدھی بات پر ایک پیالی چائے کی ہو جائے۔“ اتنا کہتے ہوئے بزرگوار نے میرا ہاتھ پکڑا اور سڑک پار چلنے کی کوشش کی۔ ہم نے لاکھ سمجھایا حضرت ہمیں آگے جانا ہے ضروری کام ہے۔

”تو میاں ہم کون سا تمہاری راہ کھولنی کر رہے ہیں دو گھونٹ چاء کے بھر لینے میں کون سی دیر لگے گی کون سی قیامت ٹوٹ پڑے گی آؤ آ جاؤ تمہاری ملاقات بھائی اشواق سے بھی کرادیں گے کبھی اگر کوئی گھڑی درست کرانا ہو یا خریدنا ہو تو تمہارا وہ بڑا خیال کریں گے آخر تم نے ہماری مدد کی ہے میاں ہم تو صبح سے پریشان ادھر ادھر پھر رہے تھے رستہ ہی نہیں مل رہا تھا حالانکہ ہم آس پاس ہی گھوم پھر رہے تھے۔ میاں اسے کہتے ہیں چراغ تلے اندھیرا۔“

اب میں حیرانگی سے انہیں دیکھ رہا تھا وہ مسلسل بولے جا رہے تھے اور اسی اثنا میں وہ ہمارا ہاتھ پکڑے بلکہ کھینچتے ہوئے سڑک پار دکان تک پہنچے تھے ہمیں دیکھ کر خود دکاندار بھی زیر لب مسکرا رہے تھے پھر انہوں نے مجھے اور ان بزرگوار کو شوگیس کے ساتھ رکھے اسٹول پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اپنے ملازم کو چائے لانے کو کہا۔ میں نے تکلفاً اجازت چاہی کہ مجھے آگے اپنے کام سے جانا ہے دیر ہو رہی ہے وہ بزرگ پچھٹ سے بولے۔

”میاں زری چھری تلے دم تو لو ایسی بھی کیا ہے مروتی کہ ابھی آئے ابھی چل دیے۔“ تھوڑی ہی دیر میں مجھے معلوم ہو گیا کہ بزرگ موصوف انڈیا کے شہر دہلی سے اپنے رشتہ داروں سے ملنے کے لیے تشریف لائے ہیں اور دکاندار کے وہ رشتہ میں ماموں لگتے ہیں۔ دلی میں وہ زردوزی کے کارخانے کے مالک ہیں ان کے کارخانے میں پندرہ بیس کاریگر کرتے کام کرتے ہیں دکاندار نے ان کا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ وہ دہلی کے بڑے کر خنداروں میں شمار ہوتے ہیں درمیان میں بزرگوار بھی لقمہ دیتے رہے۔ انہوں نے بتایا کہ ان کے کارخانے میں چھ کارچو میں لگتی ہیں جس پر پچیس سے تیس زردوز کام کرتے ہیں اور اگر کبھی زلدی (جلدی) کا کام ہوتا ہے تو اور کاریگر لگا دیے جاتے ہیں۔ پوری دہلی میں چند ہی کارخانے ہیں جنہیں انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے ان میں ہی ایک بڑا کارخانہ ہمارا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہاں سے کیسے اٹھ کر بھاگ نکلوں مجھے اپنے کام کے بارے میں تشویش ہو رہی تھی بلکہ آخر میں اچانک اٹھا اور سلام کہتا دکان سے نکل گیا۔

